UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222986

UNIVERSAL
LIBRARY

TIGHT BINDING BOOK

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۱۶۳۰۵ Accession No. ۱۳۵۱۹۰

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

ہندستانی زبان میں آزادی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ حیدرآباد نمبر (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے اعظم پورہ شرقی۔پی۔او جوبلی۔حیدرآباد دکن

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

جلد (۱۳) ایڈیٹر نمبر (۱-۲)

جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا)

آذر۔دے ۱۳۶۲ف اکتوبر۔نومبر ۱۹۵۲ء

چندا سالانا چھ روپے قیمت ایک چوآنی

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	امریکا کے تفریحی مقامات	ا۔یس	۱۸
حجاج بن یوسف	ڈاکٹر میر سیادت علی خان	۹	غزل	مہر (لکھنوی)	۱۹
حقایق و معارف	افقر موہانی وارثی	۱۵	کالا گلاب	شہباز پرویز	۲۰
لندن یونیورسٹی اور اس کی اہمیت	ج۔ا	۱۶	غزل	شیدا (امیٹھوی)	۲۵
غزل	معجز (لکھنوی)	۱۷	فعالعہد	ارشد افضلی	۲۶
کہے صنم بھی ہری ہری	قمرالدین قمر	۲۹			

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ حیدرآباد نمبر (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے اعظم پورہ اشرقی۔پی۔او جوبلی۔حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

جلد (۱۳) ایڈیٹر نمبر (۱-۲)

جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا)

آذر۔دے ۱۳۶۲ف اکتوبر۔نومبر ۱۹۵۲ء

چندا سالانا چھ روپے قیمت ایک چوآنی

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	امریکا کے تفریحی مقامات	ا۔لیس	۱۸
حجاج بن یوسف	ڈاکٹر میر سیادت علی خان	۹	غزل	مہر (لکھنوی)	۱۹
حقائق و معارف	افقر موہانی وارثی	۱۵	کالا گلاب	شہباز پرویز	۲۰
انڈین یونیورسٹی اور اس کی اہمیت	ج۔ا	۱۶	غزل	شیدا (امیٹھوی)	۲۵
غزل	معجز (لکھنوی)	۱۷	فعالبعد	ارشد افضلی	۲۶
کہے صنم بھی ہری ہری	قمرالدین قمر	۲۹			

ہمارے خیالات

ہندستانی ادب تیرویں سال میں

جوں توں کرکے "ہندستانی ادب" کی بارویں جلد تو ختم ہو گئی اور اب اس نمبر سے تیرویں جلد شروع ہوتی ہے۔

وہم کی دنیا میں ۱۳ کا عدد اپنی نحوست کے سبب بدنام ہے وہم پرست اس عدد سے برا شگون لیتے ہیں۔ اس عدد کو نقصان اور تباہی کا باعث سمجھتے ہیں۔ بعض تو اس سے بھوت سے بھی زیادہ اگھڑتے ہیں۔ اگر ۱۳ تاریخ کو سفر شروع کیا جائے یا ۱۳ افراد مل کر سفر کریں تو وہمی لوگوں کو اس بات کا پکا یقین ہو جاتا ہے کہ ایسا سفر کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی ناکامی ضروری اور اس میں نقصان لازمی ہے سچ پوچھیے تو یہ سب سے اور کمزور دل دماغ والوں کی باتیں ہیں۔

ہم اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کیے دیتے ہیں جس سے ۱۳ کے عدد کو منحوس قرار دینے کی جڑ بخد نفی ہو جائے گی۔

اوایل ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۵ء تک ہم انجمن اتحاد طلبائے جامعہ عثمانیا کے صدر رہے۔ انجمن اتحاد کی گوناگوں مصروفیتوں میں تعلیمی تفریحی بھی ایک بھاری مصروفیت ہوا کرتی تھی۔ طلبا کی ہر وزارت اس کو اہم سے اہم تر بنانے کی کوشش کرتی تھی۔ چنانچہ اسی نظریے کے تحت ہم نے بھی اپنے دور صدارت میں اس کو خاصی اہمیت دی۔ یہاں تک کہ دو تعلیمی سفر کرکے ایک ریکارڈ ہی قایم کر دیا۔ ہمارا پہلا تعلیمی سفر ۳۰ عدد طلبا کے ساتھ دسمبر ۱۹۳۴ء میں شمالی اور مشرقی ہندستان کا ہوا تھا اور دوسرا سفر اپریل ۱۹۳۵ء میں جنوبی ہندستان کا رہا۔ اس سلسلے میں خاص بات جو کہنے کی ہے وہ یہ کہ یہ سفر اپریل کی ۱۳ تاریخ کو شروع ہوا۔ اور مزا یہ کہ سفر کرنے والوں کی تعداد بھی ۱۳ ہی تھی جنوبی ہندستان کے چھوٹے بڑے شہروں کی سیر کرتے ہوئے ہم ۵ مئی ۱۹۳۵ء کو سیلون کے پایۂ تخت کولمبو پہنچ گئے۔ ۵ مئی کو جارج پنجم کا سلور جوبلی کا دن تھا۔ شہر میں اطراف و اکناف سے ہزاروں ہی آدمی آئے ہوئے تھے۔ اس لیے غیر معمولی چہل پہل تھی۔ وہاں کے لوگ کہتے تھے کہ سیلون میں ایک عرصے سے زرد بخار کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے یہاں آئے دن اموات ہوتی رہتی ہیں۔ چونکہ شہر میں ٹریفک کی گڑبڑ بہت زیادہ تھی اس لیے ہمیں اس وبا کی کچھ پتا چلا اور نہ جنازے نکلتے نظر آئے مگر یہ ضرور ہے کہ سیلونی ہماری منحوس تعداد کے سبب ہمیں زرد بخار کی وبا یا کسی نہ کسی حادثے سے قریب تر سمجھتے تھے چنانچہ کولمبو شہر کے مشہور ظاہرا کالج (جہاں ہم لوگ مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے۔) کے انتظام اور طالب علم اس کے علاوہ سیلون مسلم لیگ کے اکثر ارکان نے بھی ملاقات کے دوران میں اسی قسم کے شبے ظاہر کیے۔ مسلم لیگ کے صدر جایا (جو آج کل حکومت سیلون کے ایک وزیر ہیں) نے بھی مذاحیا انداز میں اپنے اس فضری وہم اور روسو سے کو ظاہر ہی کر دیا۔

کولمبو میں آٹھ روز قیام کے بعد ہم اندرون سیلون کے سفر پر چل پڑے۔ اور جب سیلون کے قدیم پایۂ تخت کنڈی پہنچے ہیں تو ہر ٹرک اور گلی کوچے میں جدھر سے بھی ہم گذرتے ایک ایک جنازہ ہمارے سواگت کے لیے موجود نظر آتا تھا۔ ہمارے بارہ رفیق ساتھیوں کے ہوش اڑ گئے اور ایک آدھ تو اتنا بڑا نفسیاتی اثر ہوا کہ بے چارے کو ہمارے ہیبت کے بخار ہی آ گیا۔ ہم نے کہا معاملا نازک ہے ایسا نہ ہو کینڈی ہی میں ۱۳ کی نحوست کا ثبوت مل جائے اس لیے کینڈی سے دوسرے ہی روز ہم چل پڑے اس کے بعد سیلون کے دوسرے مقامات کی سیر کرتے ہوئے ہندستان کے جنوبی

ساحل پر اترتے ہے۔ یہاں سے جنوبی ہندستان کے شہروں میں ٹھہرتے ٹھہراتے اوٹی (نلگری) پہنچکر آٹھ روز قیام کیا۔ میسور سے ہیلی ہوتے ہوئے براہ اونڈ اکیشن گوا کا سفر کیا۔ پونا اور بمبئی میں چند روز گذار کر اورنگ آباد کی سیر کی اور آخر صحی سلامت ۱۳ کے عدد کے ساتھ حیدرآباد لوٹے۔ کوئی حادثہ ہی پیش آیا اور نہ ہم میں سے کوئی مرا۔ یعنی ۱۳ کے مشہور عدد نے اپنی نحوست کا کوئی بھی اثر نہ دکھایا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۳ اور نحوست یا اسی قسم کے اور بھی فضول خیالات وہم وسو سے اور آدمی کی عقلی کمزوریوں کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔

اوپر کی اس لمبی چوڑی مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اگر ۱۳ کے عدد میں واقعی کوئی منحوس اثر ہوتا تو ہماری جماعت اس سے ضرور متاثر ہونی چاہیے تھی اور اسی طرح "ہندستانی ادب" پر بھی تیرویں سال میرے اثرات منفی ہونے چاہئیں تھیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ یہ رواں ہی سال اس کے حق میں بیحد مفید اور مبارک ثابت ہوا۔ اس لیے ہم وہمی دنیا کے باسیوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ آیندہ سے وہ ۱۳ کی بجائے ۱۲ کے عدد کو منحوس قرار دیں۔

مختصر یہ کہ نحوست کے کسی غیر ارادی عمل اور اثر کے قابل ہونا بجائے خود ایک قسم کی نحوست ہے گویا نحوست آدمی نہیں بلکہ اور دلیعنی خدانحوس آدمیوں کی لائی ہوئی چیز ہے اس لیے ہم تہ ۱۳ کے عدد کی نحوست کے قابل ہیں اور نہ ۱۲ کے عدد کی۔ یہ سب باتیں کہنے کی حد تک اور محض بطور طنز اور مزاح تھیں۔ اب حقیقت حال سن لیجیے کہ خریداروں کے توجہ نہ کرنے سے یہ نحوست لپٹ جاتی ہے اور جب خریدار اس طرف توجہ کرتے ہیں تو یہ ہوا کی طرح رفو چکر ہو جاتی ہے اس لیے ہم:—

اپنے ہمدردوں سے

عرض کریں گے کہ ان کی اوناسی توجہ سے ہمیں نحوست کے ڈراونے اور بھیانک بھوت سے صرف اسی وقت نجات مل سکتی ہے جبکے "ہندستانی ادب" کا ہر ہمدرد اس بات کا بیڑا اٹھالے کہ وہ اس سال زیادہ سے زیادہ خریدار فراہم کرے گا۔ ہم اس کے منتظر رہیں گے جبکے ہمارے ہمدرد اپنے تحریری وعدے بھیجکر ہماری ڈھارس بندائیں۔

۱۲ کی بجائے صرف (۸) نمبر

افسوس ہے کہ پچھلے سال ہم پورے ۱۲ نمبر نہ نکال سکے بلکے صرف (۸) ہی نمبر پیش کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ (۸) نمبر بھی وجود میں نہ آتے اگر ہم لے اپنے خون سے "ہندستانی ادب" کی آبیاری نہ کی ہوتی۔ یہ پودا پھلا پھولا بڑا ہوا۔ مگر افسوس کہ جوانی کی بار ابھاریں بھی دیکھنے نہ پایا کہ زمانے کے بدلے حالات نے اس کو بری طرح سے مفلوج کر دیا۔ آپ خود بھی تو بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ ایک مفلوج پر کیا کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا اس کی بقا اور زندگی کے لیے ہم نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ اور اب اپنے قیمتی خون کے انجکشنوں سے اس کی حیات کے دنوں میں اضافا کیے جارہے ہیں۔

آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے یہ سب کچھ کیوں کیا اور کس لیے کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ آج سے پانچ سال پہلے جبکے ہم نے "ہندستانی ادب" کے جاری کرنے کا خیال کیا تھا تو ہمارے سامنے مالی فائدے سے بڑکر علم و ادب اور دیس کی ملی جلی بھاشا ہندستانی کی سیوا تھی۔ جس پر ہم آج تک بھی قایم ہیں۔ شروع ہی سے ہمارا یہ وچار رہا ہے کہ ہندستان میں جہاں سیکڑوں ہی بھانت بھانت کی بولیاں اور بھاشائیں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہیں وہاں صرف ایک ہی بھاشا پورے دیس کے لیے ملی جلی ہو سکتی ہے اور وہ ہے "ہندستانی"، چنانچے گاندھی جی مرحوم کا بھی یہی وچار تھا اور آخر دم تک وہ اسی خیال پر اڑے رہے یہ ہندستانی بھاشا کی بدقسمتی ہے کہ وہ اچانک سورگ باش ہو گئے ورنہ اگر زندہ رہتے تو لازمی طور پر "ہندستانی" ہی راج بھاشا بھی ہو جاتی۔

یہ ایک کھلی بات ہے کہ ہندی راج بھاشا ہے اس لیے وہ حکومت کی گودیوں میں پھل پھول رہی ہے اس کو دولت کی دیوی لکھمی کی سرپرستی حاصل ہے۔ ہندی کے پرچے اور پجاری اس کی سیوا میں اندھا دھند پیسا پانی کی طرح بہائے چلے جارہے ہیں اور ان کی یہ کوشش ہے کہ ہندی کے روپ میں دیوبانی بھاشا سنسکرت جنم لے

گھر گھر اس کے چرچے ہوں اور ہندستان کے ۳۰ کروڑ باسیوں کی زبان پر صرف سنسکرت ہی ہو۔ مگر یہ یاد رہے کہ

این خیال است و محال است و جنون است

ہمیں ویتا کی کسی بھی بھاشا سے بیر نہیں۔ اس لیے سنسکرت سے بھی کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر سال کروڑوں روپیا خرچ کرنے کے بعد بھی ہندی یا سنسکرت کو وہ ستائی نصیب نہیں ہو رہی ہے جو مقلس، نادار اور کنگال "ہندستانی" کو حاصل ہے وجہ یہ ہے کہ یہ جنتا کی بھاشا ہے کروڑوں ہی اس کو بولتے اور سمجھتے ہیں ہر شخص بلا جبر اس کو اپنا رہا ہے اور وہ اپنانے پر مجبور بھی ہے اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔ اس تفصیل میں جانے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ انہیں صفحوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ہم نے ان اسباب و علل پر کافی روشنی ڈالی ہے آپ یقین جانیے کہ ہندی کی بجائے "ہندستانی" راج بھاشا ہوتی۔ اور دیس کا مالدار طبقہ اس کی سرپرستی اور سیوا کرتا تو تناسبی اعتبار سے جہاں ہندی نے ایک انچ بھی قدم آگے نہیں بڑھایا ہے "ہندستانی" ایک سو قدم آگے نکل جاتی، اور دیکھتے دیکھتے پورے دیس پر گہرے بادلوں کی طرح چھا جاتی۔ پھر نیچے کے طور پر جو مینہ برستا تو پورا دیس ہندستانی کی کھیتی سے لہلہاتا نظر آتا، مگر یہ سب کچھ نہ ہونے پایا اب بھی "ہندستانی" کا بول بالا ہے۔ اگر دیس کے گنوان اور سمجھدار لوگ اس طرف دھیان دیں تو یہ دیس بھاشا بہت جلد ترقی کے زینے طے کر سکتی ہے

——— چنانچہ ہم ایک ایسی ہی بھاشا کی سیوا میں اپنا تن من دھن سب کچھ لٹائے جا رہے ہیں ہم نے پورے طور پر اور ہر طرح سے اپنے آپ کو "ہندستانی" کی سیوا کے لیے وقف کر دیا ہے ——— مگر اکیلے ہم کب تک اس کی سیوا کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہندستانی کے پریمیوں سے ہماری

پرزور اپیل

ہے کہ آپ بھی اس نیک اور مفید کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ ہر ممکن طریقے پر ہماری سہایتا کریں۔ رسالہ "ہندستانی ادب" کی سرپرستی قبول کریں۔ اس کی مالی امداد کریں۔ زیادہ سے زیادہ انتعداد میں خریدار بنائیں تاکہ "ہندستانی ادب" باقی رہے۔ دیس اور جنتا کی ملی جلی بھاشا ہندستانی کو پروان چڑھا سکے۔ اگر آپ کی توجہ اور مدد امداد سے ایسے اسباب پیدا ہو جائیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ سال میں معمولی بارہ نمبروں کے سوا ہم "ہندستانی ادب" کے بعض خاص نمبر بھی آپ کی سیوا میں پیش کریں گے۔ اور اس کی موجودہ حالت اور معیار کو بہتر سے بہتر اور بڑھیا بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

ہمیں آشا ہے کہ ہماری یہ دردبھری آواز "صدا بصحرا" ثابت نہ ہوگی بلکہ دیس اور جنتا کی ملی جلی بھاشا ہندستانی سے لگن رکھنے والوں کے دلوں پر ضرور اثر کرے گی۔ آخر میں ہم آپ کو دیس بھاشا "ہندستانی" کی۔

دہائی

دیتے ہیں کہ آپ "دامے، درمے، سخنے" گویا کہ ہر طرح سے "ہندستانی ادب" کی سیوا کا بیڑا اٹھائیں تاکہ آپ کے ہمت بڑھانے سے ہمارے سوئے ہوئے جذبے پھر سے جاگ اٹھیں اور اس طرح سے آپ ہم سب ہی مل کر دیس بھاشا کی سیوا کر سکیں۔

ہمیں اعتراف ہے اس بات کا کہ پچھلے سال صرف (۸) نمبر چھپنے کے باعث ہم مضامین، افسانوں نظموں اور غزلوں کا کم سوا دیش کر سکے لیکن پھر بھی ہم نے اس بات کی کوشش کی کہ سوا دیس کمیابیاں طور پر کمی نہ ہونے پائے اس کی ایمانداری ہم نے اس طرح پر کی کہ مضامین وغیرہ کی لکھائی بہت ہی گھٹی ہوئی لکھی تاکہ ہر صفحے میں زیادہ سے زیادہ مضمون کی کھپت ہو سکے اسی طرح پر نظمیں اور غزلیں بھی زیادہ انتعداد میں دی جاتی رہیں اس طریقے سے رسالے کے نمبروں کی کمی کا بدلا ایک حد تک تو پڑنے والوں کو مل ہی گیا مگر تعداد کی کمی کا پورا پورا بدلا ظاہر ہے کہ ممکن ہی نہ ہو سکتا تھا۔

اس کمی کو ہم اس سال پورا کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ "ہندستانی ادب" کے ہمدرد اس کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے اس بات کا بیڑا اٹھائیں کہ زیادہ سے زیادہ انتعداد میں خریدار بنائے جائیں۔ ہم نے کبھی نفع کی سوچی ہے اور نہ آیندہ اس طرف دھیان ہے ہم تو صرف

یہی چاہتے ہیں کہ رسالہ اپنا آپ خرچ نکال لے اور جتنی بھی آمدنی ہو اس کی بھلائی اور بہتری پر خرچ کر دی جائے ہماری یہ اچھا ہے کہ رسالے کو ۵۰ جنتک پہنچا دیا جائے یہ معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی ظاہر داری کا بھی خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ رسالے میں فوٹو بھی دیے جائیں۔ اور ٹائٹل آرٹ پیپر کا ہو۔ بہر حال ہماری من بھاتی یہ تمنائیں اور آرزوئیں اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں جبکے آپ زیادہ التعداد میں خریدار بنا کر "ہندستانی ادب" کے حقیقی اور سچے ہمدرد ہونے کا ثبوت دیں۔

مضمون نگار اور شاعر "ہندستانی ادب" آپ کی بھی خصوصی توجہ کا محتاج ہے جب تک آپ اور میعاری لکھنے والوں کا تعاون حاصل نہ ہو کوئی رسالہ کیسے میعاری بن سکتا ہے۔ شروع ہی سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ رسالے کے میعار کو گرنے نہ دیا جائے۔ حق کی بات ہے کہ آج تک بھی ہم اپنی اس سعی میں کامیاب رہے۔

اس سے پہلے ہم نے کئی ایک علمی، ادبی تاریخی، سماجی اور معاشی مقالے پیش کیے۔ یہ تمام مقالے ایم۔ اے کی تیاری کے سلسلے میں لکھے گئے تھے اور سبکے سب اول یا دوسرے درجہ میں کامیاب قرار دیے گئے تھے ظاہر ہے کہ ایسے مستند مقالوں کا لٹریچر بھی میعاری اور مانا ہوا ہوتا ہے ان مقالوں کے سوا جو انفرادی مضامین پیش کیے گئے ان کے لکھنے والے بھی اکثر و بیشتر ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی ہی ہوا کرتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ "ہندستانی ادب" میں افسانے کم چھپا کرتے ہیں اس کے دو سبب ہیں پہلے یہ کہ یہ رسالہ خالص علمی ادبی ہے جس کا سب سے پہلا اور پہلا مقصد علم و ادب اور زبان کی سیوا کرنا ہے اس لیے ہم اس قسم کے مضامین زیادہ سے زیادہ التعداد میں پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ دوسرے یہ کہ میعاری افسانے بہت کم وصول ہوا کرتے ہیں۔ ہم پھر پوچ قسم کا افسانوی لٹریچر پیش کر کے اس رسالے کے میعار کو گرانا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ رطب یابس کو چھوڑ چھاڑ اور پاکیزہ لٹریچر پیش کیا کرتے ہیں۔

نظموں اور غزلوں کے بارے میں ہمیں بڑی حد تک تشفی رہی۔ شاعروں کا یہ تعاون عمل "ہندستانی ادب" کے تعلیمی معیار کا محافظ بنا رہا۔ ہمیں آشا ہے کہ آئندہ بھی شاعر حضرات اپنی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے۔

مضمون نگاروں کو ہدایت "ہندستانی ادب" کے جنم دن سے اس کی یہ پالیسی رہی ہے کہ مضمون نگاروں میں چھوٹے اور بڑے کا فرق نہ کرے۔ یعنی "ہندستانی ادب" نے لکھنے والوں کو ان کے بھاری بھرکم نام یا مخصوص شخصیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ ان کے کام کی وجہ سے جانچا ہے۔ اگر "ہندستانی ادب" ہمیشہ ہی مشہور مشہور لکھنے والوں کا لحاظ کرتا تو نئے لکھنے والوں کو کبھی موقع ہی نہ ملتا۔ اور وہ نہ معلوم کب تک گم نامی اور اندھیرے میں پڑے رہتے۔ یا سالہا سال کے لمبے چوڑے عرصے میں "ہندستانی ادب" نے کئی ایک نئے لکھنے والوں کو جنم دیا جن میں مضمون نگار، افسانا نویس اور شاعر وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ یہ لوگ اس وقت تک اس رسالے کی سیوا کرتے رہے جب تک انہوں نے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل نہ کر لی۔ اس کے بعد ان کا دماغ پھر گیا جس کے نتیجے کے طور پر وہ محض کش ثابت ہوئے۔ حالانکہ ان کا یہ فعل بڑے درجہ کی بداخلاقی اور انتہائی قسم کی بے ادبی ہے ایسے ہی لوگوں کو انگریزی میں بجا طور پر (UPSTARTS) کہا گیا ہے جو اپنی کم مائگی کی وجہ سے اوچھے پن کا ثبوت دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس وقت ہم ان لوگوں کو چھوڑ کر "ہندستانی ادب" کے موجودہ مضمون نگاروں سے مخاطب ہیں آپ میں سے بعض حضرات کو ہم نے خطوں کے ذریعے بھی اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مضمون وغیرہ اس یقین کے ساتھ نہ بھیجا جائے کہ پہنچتے ہی چھپ جائے گا جو مضامین وصول ہوتے ہیں دیکھ بھال کے بعد ان کا سلسلہ قایم کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب کے ساتھ ان کی چھپائی عمل میں آتی ہے۔ گوناگوں مجبوریوں اور مالی مشکلات کے سبب چونکہ رسالے کا حجم بہت ہی کم ہے اس لیے کم تعداد میں مضامین کی کھپت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مضامین کا نمبر دیر سے آتا ہے جس

باعث صاحب مضمون جلد چھپائی یا اس کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔

بعض مضمون نگار اپنے طویل مضامین کی ایک ایک قسط بھجوایا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ طریقہ سراسر غلط ہے۔ ایسے مضمون نگاروں کو چاہیے کہ وہ پورا مسودہ ارجنٹری کے ذریعے بھجوا دیں تاکہ ضروری دیکھ بھال کے بعد ہم اس کے حصے قایم کر کے قسط وار چھاپ سکیں۔ پہلی قسط والا رسالہ آپ کی نظروں سے گذرنے کے بعد اگر آپ دوسری قسط بھجوائیں گے تو دوسرے ہی نمبر میں اس کی چھپائی کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ اور اگر مضمون ہر مہینے مسلسل نہ چھپے تو پڑھنے والوں کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ بہر حال ایسے چھوٹے مضامین کا اکٹھا آنا ضروری ہے۔

مضمون کو دوبارہ دیکھنے کے بعد بعض لوگ ضروری کاٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ یہ فعل ہمارا نہیں اس لیے کہ بغیر ضروری چیزوں کا نکل جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں شکایت اس بات کی رہی ہے کہ مسودے سی بے ترتیب حالت میں بھیجے دیے جاتے ہیں۔ چاہے ہم ہوں یا کاتب دونوں ہی کو پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس لیے کہ پاکر کے آپا نپا مضمون صاف اور خوش خط لکھ کر بھجوایا کیجیے۔ مضامین کاغذ کے صرف ایک ہی رخ پر لکھے جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

بعض مضمون نگار صفحوں کے نمبر لگانا پسند نہیں کرتے نہ معلوم کیوں، حالانکہ اصولاً ہر صفحے پر نمبر لگانا چاہیے۔

"ہندستانی ادب" شروع ہی سے ام۔ اے اور پی ایچ ڈی کے مقالے چھاپتا آیا ہے اور ایک ہی وقت میں دو، دو مقالے ساتھ ساتھ چھپتے رہے ہیں۔ ایسے اہم علمی ادبی قسم کے مقالے چھاپنا ہی "ہندستانی ادب" کا سب سے پہلا اور اہم فرض ہے اس لیے جو حضرات اپنے مقالے مسلسل چھپوانا چاہیں وہ بلا تکلف ہمارے ہاں بھجوا سکتے ہیں اور ایسے کارناموں کو دوسرے تمام مضامین پر ہر وقت اور ہر حالت میں ترجیح حاصل رہے گی۔

بعض مضمون نگار ہم سے معاوضے کے بارے میں دریافت کرتے رہتے ہیں۔ ان سے ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ صورت میں حالت پیرس اگر ہندستانی ادب کی اندرونی حالت ٹھیک ہوتی تو لازمی طور پر اس کی صورت یعنی ظاہر بھی بہتر ہوتا گویا ظاہر کا بہتر نہ ہونا اس کی حالت کے بدتر ہونے کی دلیل ہے۔ جس کا جواب اس دکھڑے میں موجود ہے جو انہیں صفحوں کے شروع میں رویا گیا ہے۔

معاصروں سے شکایت

"ہندستانی ادب" کا شروع ہی سے یہ طریقہ رہا ہے کہ ایک بنا بنایا کسی رسالے سے تبادلا شروع کرنے کے بعد اس سلسلے کو برابر قایم رکھا جائے۔ ہمیں اس برابر بھی اس کی چنتا نہیں ہوتی کہ ایک ماہوار رسالا تین چار مہینے میں ایک بار چھپ رہا ہے۔ یا یہ کہ کوئی ہفتہ وار مہینے میں ایک بار تبادلا وصول ہوتا ہے اگر کوئی اخبار یا رسالا پابندی کے ساتھ وصول نہ ہو تو ہم متعلقہ ادارے کو توجہ ضرور دلاتے ہیں۔ بعض ادارے فوری جواب دے دیتے ہیں اور بعض تو بلبل ہی گونگا کر جاتے ہیں۔ بس ایسے ہی اداروں سے ہمیں سخت ترین شکایت ہے اس لیے کہ یہ ایک قسم کی نہ صرف ادارتی بلکہ اخلاقی بھی کمزوری ہے جو صحافت جیسے باعزت اور باوقار پیشے کے شایان شان نہیں۔

آج کل تو خدا "ہندستانی ادب" کا حال پتلا ہو گیا ہے اور اس غریب کی ہڈی پسلیاں نکل آئی ہیں۔ ورنہ پہلے جبکہ اس کی ضخامت دگنی تھی۔ اور چکنے کاغذ پر چھپا کرتا تھا۔ ایسے سمے ہم نے بعض دو وقتی نام نہاد ہفتہ وار اخباروں سے بھی اس کا تبادلا گوارا رکھا اس لیے کہ ہم پلڑوں میں رکھ کر یا تول تول کر تبادلے کا بھاؤ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمارے سامنے تو صرف صحافت کا پاک پیشا تھا یعنی چھوٹے بڑے کمزور اور زوردار کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور نہیں اس کی بھی پروا نہ ہوتی کہ کوئی ہفتہ وار مہینے ڈیڑھ مہینے میں صرف ایک بار نکل رہا ہے ہم اپنا رسالا برابر بھیجے چلے جاتے تھے۔

ان حالات کی روشنی میں ہمیں اس حقیقت کا اظہار کرتے تکلف ہو رہا ہے کہ جب سے "ہندستانی ادب" موجودہ حجم پر آیا ہے بعض موٹے تازے اور بھاری بھر کم قسم کے رسالوں نے اپنا رشتا نا توڑ لیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایسے لوگ علم و ادب کے معنوی وزن کا صحیح اندازا نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ تو صرف کاغذ کے

پلندوں کو تولنے کے عادی ہیں صحافت کا یہ عیب پیشا کم سے کم ایسی تنگ نظری اور کوتاہ دامانی کو روا نہیں رکھ سکتا۔ اسی سلسلے میں ایک اور عجیب بات بیان کرنے کے قابل یہ ہے کہ بعض خاص مجبوریوں اور چند درچند مشکلوں کے سبب "ہندستانی ادب" چند مہینوں سے دو دو مہینوں کے ملے جلے نمبروں کی شکلوں میں نکل رہا ہے چنانچہ بعض معاصروں نے اس کا بھی بڑی طرح سے اثر لیا جس کے نتیجے کے طور پر انہوں نے قطع تعلق کر لیا ہے ان حضرات کی اس پست ذہنیت پر ہم افسوس اور ندامت کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

آخر میں ہم ان تمام معاصروں سے جن سے "ہندستانی ادب" کا تبادلہ ہے یہ کہے بغیر نہ رہیں گے کہ اپنا اپنا رسالہ نہایت پابندی کے ساتھ روانہ کیا کریں مجبور رسالے پابندی سے وصول نہیں ہوتے ان کے فائیل نامکمل رہ جاتے ہیں اس لیے ایسے رسالوں کو چن کر رکھنا نہ رکھنا دونوں برابر ہے۔

خریداروں سے دو دو باتیں۔

جی ہاں! اس کا افسوس ضرور ہے آج کل کے حالات نے مجبور کر دیا ہے، معاشی پستی، آمدنی کم اور خرچ پورا بھلا آپ ہی بتایئے گذر بسر ہو تو کیسے ۔۔۔ بس کہنے کی حد تک جی رہے ہیں ورنہ سچ پوچھو تو زندہ درگور ہیں"۔

یہ ہیں وہ وچار جو ایک خریدار کسی رسالے کے منیجر کو لکھ بھیجتا یا سناتا ہے ایک نظر میں تو آپ بھی خریدار کے ہمدرد اور ہم خیال ہو جائیں گے لیکن اگر ان وچاروں کا حقیقی تجزیہ کیا جائے اور ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہ سب باتیں صرف کہنے کی حد تک ہیں۔ اس لیے کہ سال میں چھ روپے یا مہینے کو آٹھ آنے ہرگز ہرگز کسی کی معیشتوں میں اضافے کا باعث نہیں بنتے۔ دنیا جانتی ہے کہ ایسے کہنے والے مختلف قسم کی فضولیات پر پیسا خرچ کیے چلے جاتے ہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے تو صرف ایک علمی ادبی رسالے کے چندے کے سلسلے میں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں علم و ادب اور دیس بھاشا سے کوئی لگاؤ یا ہمدردی نہیں ہے۔ اگر ان حضرات کو اپنی زبان سے تھوڑی سی بھی محبت ہوتی تو وہ سب سے پہلے رسالوں کی خریداری قبول نہ کر کے اپنے دلی انس کا ثبوت دیتے اس قسم کی بدذوقی کا ثبوت اگر جاہلوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں سے ملتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی ایسے مہمل بہانے تراش کر اپنی کو ذہنیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

پڑھے لکھے لوگوں کو ہمارا یہ مشورا ہے کہ وہ اپنے ہر مہینے یا ہر سال کے موازنے میں ادبیات کی خریدی کی بھی ایک مد رکھیں۔ اور اس فنڈ سے ہر سال چند معیاری کتابیں اور رسالے خریدا کریں۔ اگر ایسے لوگ اس طرف توجہ نہ کریں تو کم پڑھے لکھے افراد سے کیا خاک آشنا ہو سکتی ہے۔ آج کل جتنے بھی علمی ادبی رسالے جاری ہیں ان سب کو یہی شکایت ہے کہ ان کا کوئی پرسان حال ہی نہیں۔ ہو گا کون! کیا آسمان کے فرشتے ان کے خریدار بنیں گے یا جن پریت اور بھوت ان سے ہمدردی کریں گے؟ جب لکھے پڑھوں کی دلچسپی کا یہ حال ہو تو جاہلوں کو علم و ادب سے کیوں ہمدردی ہونے چلی۔ مختصر یہ کہ بدذوقی کی وبا عام ہو گئی ہے اسی لیے بے چارے علمی ادبی خدمت گذاروں کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

آپ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہو گا کہ "ہندستانی ادب" کے بعض خریدار ایسے بھی ہیں جنہوں نے تین تین سال اور دو دو سال سے چندا ادا نہیں کیا ہے بار بار لکھنے اور توجہ دلانے کے باوجود یہ ہمدرد ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہم نے اس بات کی تک کوشش کی کہ ان کی طرف سے اگر کوئی قطعی جواب مل جاتے تو اس کی یکسوئی کر دیں لیکن جب جواب ہی نہ ملے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ رسالا برابر جاری ہے اور چندا ہضم۔

ہماری کارگذاری

ہندستانی ادب اور بھاشا کے سلسلے میں ہم نے جو بھی سوا کی ہے اس کو ہم ہمیشہ ہی حقیقت کی روشنی میں پیش کرتے رہے ہم نے کبھی وقت بھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اپنی غیر معمولی سوجھ کو ظاہر کیا جائے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے زبان اور ادب کی واقعی خدمت تھی جس کو ہم اپنی جانب سے خشی اور دل سے انجام دینے چلے آئے ہیں یہ بھی وجہ تھی کہ ہم نے اس کا بدلا تعریف کی شکل میں کبھی بھی گوارا نہیں کیا۔

ہماری انتھک خدمات کے سلسلے بہت سے لوگوں نے لکھا اس حقیقی تعریف میں بھی تعقل و بعض مشکلوں میں بڑی چڑی باتیں بھی لیکن ان خطوں یا تحریروں سے خوش ہو کر کبھی بھی ہم نے ان کو منظر عام پر لانا گوارا نہ کیا ان ان گنت تعریفی خطوں میں ایک خط ہندستانی ادب کے ایکامی اور قدیم کرم فرما اتنا متعزز لبن حضرت مولانا اقتدر موہانی وارثی لکھنوی کا بھی تھا جس کے ہر جملے ہر فقرے اور ہر لفظ سے حقیقت اور صداقت ٹپکتی ہے مولانا کی کھری کھری باتیں اور صاف گوئی نے بیان کے تعریفی پہلو کو بھی حق و صداقت کے جامے میں لپیٹ لیا ہے اس لحاظ سے مولانا نے محترم کا خط نہری تعریف پر محمول نہ کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے باوجود ہم نے اس کو شائع کرنا گوارا نہیں کیا تھا یہ خط آں محترم نے ہماری دس سالا کارگذاری کے بعد لکھا تھا مگر اب جبکہ حالات سے مجبور ہو کر حقیقتوں کا پردہ چاک ہی کرنا پڑ رہا ہے تو ہم نے مناسب یہی خیال کیا کہ ؎

بہتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

کے زرین مقولہ پر عمل کرتے ہوئے آپکے دلبر یعنی "ہندستانی ادب" کا رازِ حقیقت حال کا بہتر و سچا خاکا مولانا اقتدر موہانی کے الفاظ میں چلی کا نوٹ پیش کیے دیتے ہیں اس مختصر تعریف سے واضح ہو جائے گا کہ ہم نے "ہندستانی ادب" کی بھلائی بہتری کا خاطر کیا کچھ نہیں کیا۔

ہندستانی ادب کی دس سالا خدمات

ایسے مستقل مزاج۔ قول کے پورے۔ انتہا پسند۔ اور عزم راسخ رکھنے والے پر جتنا بھی رشک کیجئے بجا ہے جو باوجود انقلابی بیان کے کبھی کبھی اور کسی وقت اپنی بات سے نہ ہٹے اور کسی عالم میں اپنے اصول نہ بھو کے۔ یہ مصداق آں کہ ؎ ترے رندان در دآشام کو ساقی خدا رکھے ۔ یہی کچھ کر گذرتے ہیں یہی کچھ کر نکلتے ہیں۔

رسالہ "ہندستانی ادب" ماہوار حیدرآباد سے جن مقاصد و راہ اس کو لے کر نکلا ان کو از اول دم تا ایں دم ایک مثالی پرقایم رکھا اور برابر پیہم انہماک سے اپنے مقاصد کو تکمیل تک پہنچانا رہا اس کے مقاصد کی شروع شروع میں ہنسی اڑائی گئی رسالہ خطہ پر مضحکا ہوا جو قوتی کنایت پر استہزا کیا گیا یہ سب کچھ ایک طرف مگر جس کے لیے اور ارادوں کے مستقل راہوں پر گامزن ہو اس کے لائق اور ہونہار کارپردازوں نے اپنے کام کو بلا کسی رکاوٹ کے جاری ساری رکھا نتیجہ یہ کہ رسالہ دس سالہ کی مستقل خدمات ادبی اس کے اپنے مقاصد و خیال کا ایک واضح نگرش قرار دیا ہوا اور پھر کسی نے نہ ہنسی اڑائی نہ مذاق کیا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستقل کام کرنے والے بلا کسی کی پروا کیے ہوئے اپنے اغراض کو سطح پر لا کر کتنی ہندستانی ادب کا نمونا بن گیا۔

اکتوبر کے نمبر میں جن خدمات کی تشریح ایڈیٹوریل میں کی گئی ہے وہ بہت کم ہے جن شروع سے اس کو دیکھتا چلا آیا ہوں اس نے وہ سب کچھ تو نہیں لکھا گیا مگر اس سے زاید بھی بہت کچھ کم علمی ادبی خدمات انجام دی ہیں جن کا گوشوارہ رپورٹ میں نہیں ہے مگر پڑھنے اور دیکھنے والے بھولے نہ ہوں گے کہ گذشتہ سالوں کے متعدد نمبروں میں کس طرح ادارۂ انجمن ترقی اردو" کی قلعی کھول کر بابائے اردو کی اندرونی کارروائیوں کو ملک میں لایا گیا جس سے بڑی حد تک معلومات حاصل ہوئے اور پر ہنر کیا جا سکا و نیز اسی طرح کے سیکڑوں ٹھوس اور پر از معلومات مقالے اس دس سالا مدت اشاعت میں لکھے گئے ہیں شایع ہوئے کہ اگر سب کو جمع کر کے علحدہ کتابی صورت میں ترتیب دیا جائے تو مستقبل میں بڑے کام کی چیز ثابت ہو سکتی ہے۔ ضخیم ضخیم خاص نمبروں کے علاوہ بھی معمولی نمبروں کی ضخامت کافی اچھی رہی ہر پرچا ہر ماہ برابر نکلتا رہا بصورت یہی دلکشی اور کارآمد شایع ہوتی رہیں جو بعد کو قایم نہ رہ سکیں مگر جس حد تک شایع ہوئیں لیا کارآمد ثابت ہوئیں کاغذ اور لکھائی چھپائی بھی اچھی رہی۔ جو کچھ بھی لکھا گیا بے لوث اور صاف صاف لکھا گیا کسی کی اور رعایت اور خوشامد نہ کی گئی اس سے زیادہ ایک خالص اور ٹھوس ادبی خدمات کرنے والے رسالے کو اسلے اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ فرقہ وار اختلافات دوسری چیز ہیں مثل کسی نے رسم الخط سے اتفاق نہ کیا بعض نے "ہندستانی ادب" کو غزل کا دشمن سمجھا بعض نے مذہبی مضامین نہ شایع کیے جانے پر اظہار بیزاری فرمایا مگر یہ اپنے اپنے اصول کی باتیں ہیں۔ اس میں بحث ہی بیکار رہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اپنے مقررا اصول کے ماتحت پرچا کیسا ثابت ہوا۔ اس محل پر "ہندستانی ادب" شاید اپنی نظیر خود ہی کہا جا سکے تو بے جا نہ ہوگا اس نے وہ سب کچھ کیا جو کہ کر شایع ہوا تھا۔ اس لیے اس کی غیر معمولی کامیابی پر ہم اس کے لائق ایڈیٹر دوسرے کارپردازان ادبی و مضامین لکھنے والوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ وہ بہر صورت فایز المرام رہے دعا ہے کہ خدا کرے ہمیشہ کامیابی کی منزلوں تک پہنچتا رہے

اقتدر موہانی
ادارا اجام جہاں نما لکھنؤ

(نویں قسط)

ڈاکٹر میر سیادت علیخان

حجاج بن یوسف

دسواں باب
بغاوت ابن اشعث

اس اہم تاریخی مقالے کی آٹھویں قسط جلد (۱۳) شمارہ (۱۱-۱۲) مہر آبان ۱۳۶۱ف اگست ستمبر ۱۹۵۲ء کے ملے جلے نمبر میں دی گئی تھی اسی سلسلے کی کڑی یعنی نویں قسط آپ کی خدمت میں پیش ہے اور تقاضا ہے ہونے تک ہر مہینا پابندی کے ساتھ ایک ایک قسط پیش کی جاے گی۔ ایڈیٹر

عبدالرحمن جس ملک کے حصے کو فتح کرتا گیا اس پر پورا پورا قبضا بھی کرتا گیا۔ اور اس طرح سے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگیا اس کے بعد اس کی رہے ہوئی کہ ایک سال ٹہر کر اس ملک سے واقف ہونے کے بعد آگے بڑھے۔ حجاج نے اس رائے کو پسند کیا اور جواب میں لکھا کہ "تمہارا خط آیا۔ تمہاری رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سستی کو پسند کرتے ہو۔ حالانکہ یہ چیز سیاسیانا شان کے خلاف ہے تم نے یہ بتایا کہ اس معرکے میں تمہارے کتنے آدمی کام آے۔ مگر اس کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے جاو۔ اور رستے میں ہر ملک کو فتح و تاراج کرتا آگے چل کر حجاج نے لکھا کہ یہ یاد رہے کہ جب تک تم کسی مفتوح ملک پر اپنا قبضا نہ جما لو وہیں جمے رہنا۔ اس معرکے میں سپاہیوں کو بے کار بٹھانے رکھنے کی بجاے ان سے زراعت کا کام لینا۔" آخر میں حجاج نے کھلے طور پر عبدالرحمن کو یہ لکھ بھیجا کہ "چونکہ تم میرے ان احکام کی پوری پوری پابندی کرنے کے اہل نہیں ہو۔ اس لیے میں اسحاق ابن اشعث کو میر لشکر بنا کر بھیج رہا ہوں۔"

عبدالرحمن کو اپنی معزولی پر بہت غصا آیا۔ کہا کہ مجھ سے اسحاق کی سرداری کا بوجھ اٹھایا نہ جاے گا۔ فوج کو جمع کر کے یوں مخاطب کیا کہ "اے لوگو! میں تمہارا مخلص ہوں۔ تمہاری بہتری چاہتا ہوں اور تمہارے ہر نفع کا خیال رکھتا ہوں۔ اس جنگ کے متعلق جو میری رائے تھی وہ اصل میں تمہیں میں سے چند عقلمندوں اور لڑائی کا تجربا رکھنے والوں کے مشورے کی بنا پر تھی۔ یعنی یہ کہ اس وقت جنگ میں جلدی نہ کی جاے۔ تمہارے امیر حجاج کو میں نے وہی لکھ بھیجا۔ جواب میں خط آتا ہے جس میں مجھے مرتکب جرم بتایا گیا ہے اور دشمن کے ملک میں بڑھنے کا حکم دیا ہے اور یہ ایسے ملک میں جن میں کل کی بات ہے کہ تمہارے بھائی ہلاک ہوے۔ دوستو! میں بھی تمہیں میں سے ایک ہوں۔ اور سچ پوچھو تو تم سے کیا چھپانا۔ اگر تم سب مل کر اس حکم کی تعمیل کرنا چاہو تو میں بھی کروں گا۔ اور اگر تم انکار کرو گے میں بھی انکار کروں گا۔ بولو کیا رائے ہے تم سب کی اس بارے میں؟"

یہ سنتے ہی ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں "نہیں، نہیں ہم دشمن خدا کے حکم کی تعمیل ہرگز نہیں کریں گے اور کسی صورت اس کو بجا نہیں لائیں گے۔" اس کے بعد مطرف بن عامر بن واثلہ نے اٹھ کر تقریر کی کہ "حجاج تمہارا دشمن ہے یہ حکم اس لیے ہے کہ اگر تم کامیاب اور فتحمند ہوے تو اس کے دبدبے میں اضافا ہوگا اور اگر تم ہلاک ہو گئے تو اس کو خوشی ہوگی۔ اس دشمن خدا حجاج سے بیعت توڑ دو اور عبدالرحمن کی بیعت کرو۔ گواہ رہو کہ میں پہلا شخص ہوں۔ جو حجاج کی بیعت توڑتا ہوں۔" اس پر ہر طرف

سے آوازیں آنے لگیں ہم نے بھی بیعت توڑ دی۔" ایک اور شخص بھی لیمتیمی نے کہا اگر تم حجاج کی بیعت قایم رکھو گے تو پھر وطن کا منھ نہ دیکھنے پاؤ گے وہ تم کو مثل فرعون کے ہمیشہ ان ہی ممالک میں متعین رکھے گا اس لیے عبدالرحمن کی بیعت کرو اور وطن چلو" لوگوں نے دوڑ دوڑ کر عبدالرحمن کی بیعت کی گویا کہ حجاج سے بیعت توڑ دی گئی۔ مگر عبدالملک کا کوئی بھی ذکر نہ آیا۔

عبدالرحمن نے بست ارسنج ویغرا پنے عامل مقرر کیے اصیل سے صلح کی کہ کامیابی کی صورت میں اس کو خراج معاف کر دیا جائے گا یا دوسری صورت میں پناہ دینی ہوگی۔ رستے میں حجاج نے عبدالرحمن کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ باغی جب فارس پہنچے تو عام طور پر بلا استثنائے چند کے عبدالملک کی بیعت کو بھول گئے اور عبدالرحمن سے دوبارہ بیعت کی گئی۔ بیعت کتاب سنت پر عمل اور ائمہ ضلالہ کی خلع بیعت اور ان سے جہاد پر لی جاتی تھی۔ خراسان سے مہلب نے عبدالرحمن کو خط لکھا "للہ امت جدت محمد صلعم میں فساد نہ ڈال اور مسلمانوں کا خون نہ بہا۔ اگر تجھے لوگوں کا خوف ہوتا تو خدا سے بھی ڈرتا۔" مہلب نے حجاج کو بھی خط لکھا کہ "اہل اعراق آپ کی طرف آرہے ہیں اس وقت ان کی حالت مثل سیلاب کے ہے جو بلند قامت سے بہتا آئے جسے کوئی شے نہیں روک سکتی جب تک وہ اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ عراقیوں کو ابتدا میں جوش اور اپنی آل اولاد سے ملنے کی سخت رغبت ہوتی ہے جب تک وہ اپنے گھر والوں سے مل لیں اور لڑکوں کو چوم نہ لیں کوئی چیز ان کو روک نہیں سکتی۔ اس کے بعد ان سے لڑنے خدا آپ کی مدد کرے گا۔ انشاء اللہ" حجاج نے نہ مانا کہا میں باغی کے لیے بصرہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں" اور لڑائی کی تیاری کی شام سے بذریعہ برید مدد آتی رہی اور دم دم کی خبر عبدالملک کو پہنچتی تھی۔

پہلی جنگ بمقام تستر ہوئی۔ عبدالرحمن والوں نے وجیل کو بڑے جوش و خروش سے بھیجا۔ اور حجاج کی بھیجی ہوئی دو ہزار فوج کو شکست دی۔ حجاج زاویہ پر ہٹ گیا اور بصرہ خالی کر گیا۔ مہلب کے خط کو سنگوا کر پڑھا اس کے صاحب حرب ہونے کی داد دی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ بموجب ایک دوسری روایت کے حجاج استیفاء (امورز) پر ٹھہرا۔ عبدالرحمن بڑے کرتستر پر آیا۔ دونوں کے درمیان نہر تھی۔ حجاج نے دو ہزار فوج بھیجی جس کو پوری شکست ہوئی۔ حجاج کے پاس اس وقت پندرا کروڑ درہم تھے۔ ان کو اپنے ساتھیوں پر تقسیم کر دیا۔

شکست کھا کر حجاج بصرہ کی طرف گیا۔ عبداللہ بن عامر سمع اس کے صاحب الشرطہ نے پل توڑ دینا چاہا تاکہ حجاج نہ آسکے حکیم بن ابوب نے اس کو ایک لاکھ درہم رشوت دی اور باز رکھا۔ حجاج بصرہ میں داخل ہو کر اس سے وہ ایک لاکھ درہم چھین لیے اس کے بعد بصرا غالی کر دیا اور زاویہ پر تقسیم ہوا۔

تستر پر فتح کے بعد عبدالرحمن نے خطبا دیا جس میں لاف زنی بھی تھی "حجاج کی کچھ بساط ہی نہیں۔ ہم تو عبدالملک سے لڑنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد عبدالرحمن بصرہ میں داخل ہوا۔ جہاں کل اہل بصرہ نے قاریوں اور بوڑھوں نے جن میں ایک صحابی بھی تھے بھی عبدالملک کی خلع بیعت اور حجاج سے لڑنے کی بیعت کی۔

زاویہ پر آخر ذی الحجہ ۸۱ھ اور محرم ۸۲ھ میں جنگ ہوتی رہی۔ اک دن سخت لڑائی ہوئی۔ عراقیوں نے شامیوں کو شکست دی حتاکہ حجاج کے قریب پہنچ گئے۔ شامیوں کے میمنہ اور میسرہ دونوں ٹوٹ گئے اور صفیں تتر بتر ہو گئیں قریش اور منہی تقیف عام طور پر شکست کھا گئے۔ حجاج نے جب یہ دیکھا تو رہنی سواری پر جم کر بیٹھا اور تلوار کو بائیں پر کھینچا اور مصعب بن زبیر کی سنت کو یاد کرنے لگا۔ ساتھیوں نے سمجھ لیا کہ مرنے پر تلا ہے۔ ان میں سے ایک غدار نے مصعب کے ساتھی غداروں کی نسبت بھی یاد کی لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں سفیان بن ابرد السکلبی نے سمیت کو سنبھال کر جو حملا کیا تو فتح ہوئی حجاج کو یقین نہ آیا۔ لیکن یقین نہ آنے پر سجدے میں گر پڑا متقین

کو بھیجا۔ ان میں سے عبداللہ ابن عامر بن سمیع کا سر جب حجاج کے سامنے لایا گیا تو درد بھرا جملا بولا "جب سے یہ رحم سے جدا ہوا میں نے اس کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ اب اس کا سر میرے پاس لایا گیا"۔ عبداللہ حجاج کا صاحب الشرطہ تھا۔

عبدالرحمٰن نے شکست کھا کر کوفہ کا رخ کیا۔ بصری فوج بھی اس کے ساتھ گئی۔ یقیناً بصریوں نے عبدالرحمٰن ابن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب ہاشمی قریشی کی بیعت کی اور پانچ دن حجاج سے سخت لڑائی جاری رکھی اور اس کے بعد عبدالرحمٰن ابن اشعث سے بصریوں کی اک جماعت سے کوفہ میں جا ملا۔ ادھر حجاج باقی محرم اور صفر بصرہ میں قیام کیا پھر بصرہ پر ایوب بن حکم کو مقرر کیا۔ اور بڑکر دیر قرہ پر میدان واری کے ارادے سے اترا۔ عبدالرحمٰن جب کوفہ پہنچا تو کوفیوں نے بڑھ کر استقبال کیا۔ کوفہ پر حجاج کا عامل عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عامر الحضری تھا۔ قصر امارت میں کوفیوں نے اس کا محاصرہ کیا اور آخر میں کوفہ سے چلا جانے کی شرط پر اس کو اجازت دی۔ اب عبدالرحمٰن ابن اشعث حجاج سے مقابلے کے لیے نکلا اور دیر جماجم پر مقیم ہوا۔

اس کے بعد کوفی و بعضے بصری سرحدی اور مسلم فوجیں اور بصرہ اور کوفہ کے قاریں تھے۔ طبری کہتے ہیں کہ اس اجتماع کی وجہ حجاج سے کراہت اور "بغض" تھا۔ لڑنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بیان کی جاتی ہے جن کے ساتھ اتنے ہی موالی بھی تھے دونوں لشکروں نے اپنے گرد خندقیں کھودی تھیں روزانہ سخت لڑائیاں ہوتی تھیں۔

روساے قریش نے اب عبدالملک کو رائے دی کہ اگر اہل عراق صرف حجاج کی معزولی چاہتے ہیں تو حجاج کو معزول کر کے جنگ کو ختم کرنا بہتر ہوگا۔ عبدالملک نے اپنے فرزند عبداللہ اور محمد بن مروان والی جزیرہ کو بھیجا اور یہ شرطیں پیش کیں۔

عراقیوں کو شمالی شامیوں کے وظیفے سے عطا دیا جائے گا ابن اشعث عراق کے جس ملک کا چاہے جب تک حیات تک عامل رہے گا۔ یہ شرطیں اگر قبول کرلی جائیں گی تو حجاج معزول ہوگا اور محمد بن مروان والی عراق بنے گا۔

یہ صورت نہ ماننے کے حکم تھا کہ عبداللہ اور محمد بن مروان حجاج کے مطیع رہیں۔ حجاج کو اس پر بہت پریشانی ہوئی۔ عبدالملک کو لکھا یہ تدبیر سود مند نہ ہوگی۔ عراقیوں نے حضرت عثمان بن عفان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کو بھول نہ جائے۔ ان سے سعید بن عاص کی معزولی چاہی۔ لیکن ابھی پورا سال نہ گذرا تھا کہ عثمان کو شہید کر دیا گیا گویا لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔

عبدالملک نے جنگ سے بچنے ہی کو مناسب سمجھا۔ اور اوپر کی شرطیں پیش ہوئیں۔ عراقیوں نے کہا اک رات سوچنے کے اور واپس ہو کر سب کے سب ابن اشعث کے پاس جمع ہوئے اس کی رائے تھی کہ ان شرائط کو قبول کر لینا چاہیے۔ لیکن عراقیوں نے اک زبان ہو کر کہا کہ وہ اب مغلوب ہوا چاہتے ہیں ہم آرام و آسایش سے ہیں ان کے پاس رسد تک کی کمی ہے یہ خدا ہم نہ قبول کریں گے۔ اس پر عبدالملک کی خلع بیعت کی گئی۔ اور فارس سے زیاد اتفاق کے ساتھ کی گئی۔ یہ خبر سن کر عبداللہ اور محمد بن مروان نے حجاج سے کہا کہ ہمیں حکم تمہاری اطاعت کا ہے۔ لڑائی کا انتظام کیجیے۔ حجاج نے ادب سے اس کو قبول کر لیا۔

جماجم میں جب عراقیوں نے عبدالرحمٰن کی اطاعت کا نعرہ جوش سے دم بھرا تو اس کو غرور زیادہ ہو گیا۔ کہا بنو مروان عبدالملک کے نسب میں عیب لگاتے ہیں۔ وہ حذ بھی تو بیدین گرہین صفوریہ سے۔ اگر قریش میں کوئی صحی نسب ہے تو میں ابن اشعث ابن قیس ہوں۔

اہل شام تنگ حال اور عراقی خوش حال تھے۔ اب عبدالرحمٰن نے قاریوں کے لشکر کو جو اپنی بہادری اور تقوا کے لیے مشہور تھا جبلہ بن زحر کے تحت آراستہ کیا۔ ادھر حجاج نے بھی جراح بن عبداللہ کے تحت ان کے مقابلے کے لیے منتخب لوگ بھیجے۔ قاریوں میں بڑے مشہور اور معزز علما فقہا اور

صحابہ تھے۔ مثلاً عامر الشعبی، سعید بن جبیر، ابوالبختری الطائی اور عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ ان کی تقریریں قابل غور ہیں۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے جو مشہور رفیق تھے فرمایا کہ "میں نے ۷۰ سے زیادہ صحابہ کو دیکھا ہے جن میں حضرت علی نے شام کی جنگوں میں فرمایا تھا کہ جو شخص زیادتی ہوتے دیکھے اور دل سے اور زبان سے برا سمجھے اور کہے تو وہ ماجور ہے لیکن جو حق کے پیتے تلوار اٹھائے وہی ہدایت پر ہے۔ یہ ان حرام کو حلال کرنے نئی باتیں پیدا کرنے والے بدعتوں سے جو حق ہے دور ہیں اور زیادتی کرتے ہیں۔ اس کو بڑا سمجھتے ہیں لڑو۔" ابوالبختری نے ان سے کہا۔ "اپنے دین دنیا کے لیے ان سے لڑو بخدا وہ اگر غالب آئے تو تمہارے دین میں فساد ڈالیں گے۔ اور دنیا میں تم پر غالب رہیں گے اور تمہیں محروم رکھیں گے۔" شعبی نے فرمایا "ہم تو ان سے لڑو اور کمی نہ کرو بخدا روئے زمین پر کوئی قوم ان سے زیادہ ظالم اور ظالمانہ احکام دینے والی نہیں دیکھی۔ اس کو ہلاک ہونا ہی چاہیے۔" سعید بن جبیر نے فرمایا "ان سے لڑو۔ اور کمی نہ کرو اور تمہارے دل میں اپنے متعلق نیان کاری یا غلطی کا خیال نہ آئے۔ ان سے ظالمانہ احکام جبر فی الدین۔ ضعیفوں کو ذلیل کرنے اور زنا کو ترک کرنے کی وجہ لڑو۔"

غرض یہ کہ قاریوں کا لشکر بڑے جوش سے بڑا لیکن الحجاج کے لشکر نے بھی جواب چھا دیا۔ قاریوں کے سردار جبلہ کو چند شامیوں نے علیحدہ پا کر قتل کر دیا۔ اس کے قتل سے مقدس قاری بالکل پریشان ہو گئے۔

حجاج نے اہل شام کو فتح کی بشارت دی اور کہا "کوئی فساد نہیں بچتا جب تک کہ ان کے نیک و بد کرتوت والے اشخاص ہلاک نہیں ہو جاتے۔" اسی اثنا میں ایک عراقی بہادر نے جس کو عراقیوں کے ساتھ مرنا شامیوں کے ساتھ جینے سے زیادہ پسند تھا "مملاکہ کے چند عورتوں کو قید کر کے لے گیا۔ لیکن تھوڑی دور لے جا کر چھوڑ دیا۔ حجاج نے یہ سن کر کہا "ان کے لیے اچھا ہوا۔ انہوں نے اپنی عورتوں کی حفاظت کر لی۔ بخدا اگر وہ ان کو واپس نہ کرتے تو میں بھی ان کی عورتوں کو قید کرتا کل جب کہ میں غالب آتا۔"

اس کے بعد دو بدو کی لڑائیوں میں عراقی بہادروں نے کمال دکھایا اور کئی شامی ہلاک ہوئے۔

آخر کار حجاج تدبیر سے کام لیا۔ امر بن قرہ التمیمی عبدالرحمٰن کے پیسر کو بلایا۔ اور جب سفیان بن امرو نے اس پر حملہ کیا تو وہ بے لڑا بھاگا۔ اس سے ابتری پھیلی اور آخر میں عقوبی کوشش کے بعد ابن اشعث کو بھی بھاگنا پڑا۔ حجاج نے تعاقب کرایا اور منادی کرادی کہ جو واپس ہو اس کو امن ہے۔ طبری لکھتے ہیں کہ حجاج کوفہ میں داخل ہوا اور بیعت لینی شروع کی۔ بیعت کے وقت پوچھنا کہ کیا تو نے کفر نہیں کیا اگر مخاطب کفر کا اقرار کرتا تو اس سے درگذر کرتا ورنہ قتل کر دیتا۔ ابن قتیبہ اس کی توضیح کرتے ہیں کہ اس سے مقصد یہ تھا کہ خوارج کا استیصال ہو۔

واضح رہے کہ یہ بیعت عام طور پر کل عراقیوں سے کی گئی۔ یعنی ان لوگوں سے بھی جو فتنہ میں شریک نہیں تھے کیونکہ کسی شخص کے ایک شخص کے قتل سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی شخص نے کہا ہے جس فتنہ سے الگ رہا۔ آپ کے غلبے کے بعد لوگوں کے ساتھ بیعت کرنے آیا ہوں۔ حجاج نے وہی کفر کے اقرار کا سوال کیا۔ اس شخص نے بڑی سختی سے انکار کر دیا۔ قتل کی دھمکی پر بھی نہ مانا حجاج نے اسے قتل کرا دیا۔ ایک اور شخص کے قتل کا طبری ذکر کیا ہے اور وہ حضرت عثمان کے قاتلوں میں سے تھا۔

ابن اشعث نے کوفہ سے شکست کھا کر بصرہ کا رخ کیا۔ عبدالعدا بن عبدالرحمٰن قریشی جوان پندرہ اقریشیوں میں سے تھا جو اس فتنہ میں ابن اشعث کے ساتھ شریک تھے حکم بن ایوب کو جو حجاج کی طرف سے والی بصرہ تھا شکست دیا تھا۔ ابن اشعث نے تیاری کی اور مسکن پر حجاج سے پندرہ روز تک سخت لڑائی لڑی جس صبح حجاج کی فتح ہوئی وہ ساری رات حجاج نے تیاری میں گذاردی اور لشکر میں پھر کر دل بڑھاتا رہا کہ تم ہی فرماں بردار خدا تعالیٰ سے راضی ہے۔ تمہارے دشمن خدا کے دشمن ہیں تم نے جب کبھی صبر کیا اللہ تعالیٰ نے ان پر فتح دی۔ مجھے شک نہیں کہ

فتح قریب ہے۔ صبح میں سخت معرکے کا رن پڑا۔ آخر کار فتح حجاج کی ہوئی۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ فقیہ اور المختری الطائی شہید ہو گئے۔ فرار ہونے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ بسطام بن مصقلہ الشیبانی نے چار ہزار ساتھیوں کے ساتھ میدان تو چھوڑ دیا اور اس لڑے کہ حجاج نے کہا ان کو گھیر لو اور یزیدون سے خبر لو چنانچہ یہ بہادر سیکے سب باستثنا معدودے چند شہید ہو گئے۔ یکرین ابی ربیعہ کو اور اک بہادر عراقی کو جو قید کیے گئے تھے حجاج نے قتل کر دیا۔

عمارہ بن تمیم اللخمی کے ذریعے حجاج نے ابن اشعث کا تعاقب کیا جو قید بست اور زرنج پہنچا تو اس کے عاملوں نے غداری کا جو سبق خود اس سے سیکھا تھا اسی کے خلاف استعمال کیا۔ زرنج کے عامل نے خفیہ دیکھ اس کو قید کر دیا۔ لیکن نرسل نے اس کو چھڑوا دیا۔ سات ہزار مصوریں کے جمع ہو جانے سے ابن اشعث پھر ایک دفعہ قسمت آزمائی کرنے اپنی رائے کے خلاف خراسان آیا۔ یہاں بعض لوگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس پر ابن اشعث رتبل کے پاس واپس ہو گیا۔ مابقی لشکر نے عبدالرحمٰن الہاشمی سے بعت کی۔ یزید بن مہلب نے اس کو شکست دی۔ قیدیوں میں عبدالرحمٰن بن طلحہ اور محمد بن سعد بن ابی وقاص جیسے لوگ بھی تھے ان دونوں کو یزید نے چھوڑ دیا اور باقی قیدیوں کو حجاج کے پاس بھجوا دیا۔ حجاج نے عمر بن موسیٰ ابن اشعث کے صاحب الشرطہ کو اور نیز مقاتل بن تعیم کو قتل کر دیا لیکن عمرو بن ابی قرہ الکندی کو جو شریف اور قدیم گھرانے کا تھا چھوڑ دیا۔

دیر حجاج کے بعد حجاج نے منادی کرا دی تھی کہ ابن اشعث کے ساتھیوں میں سے جو بھی ہمارے پاس واپس آئے یا جو ابن قتیبہ سے جا ملے اس کو امان ہے۔ شعبی نے رے میں جا کر امان حاصل کی تھی۔ ایک دن حجاج نے اس کے متعلق دریافت کیا اور خبر پا کر بلوایا شعبی کے دوستوں نے رائے دی کہ جہاں تک ہو سکے عذر کرو۔ شعبی جب حجاج کے سامنے آئے۔ کہتے ہیں کہ فوراً ان کی رائے بدل گئی۔ سلام کیا۔ اور کہا۔

"اے امیر لوگوں نے مجھے رائے دی ہے کہ میں تجھ سے جہاں تک ممکن ہو عذر کروں۔ ایسے عذر جو خدائے تعالیٰ اور میرا ضمیر جانتا ہے کہ سچ نہیں ہیں اور خدا مجھے یہاں سوائے سچ کے کچھ نہ کہنا چاہیے۔ خدا ہم نے آپ کے خلاف اپنی پوری کوشش صرف کر دی لیکن ناکام رہے۔ ہم نیکی پر نہ تھے اور بدی کا وجہ قوی بھی نہیں تھے۔ آپ کو خدا نے کامیابی دی اگر جرم پائی کرو گے تو ہمارے گناہوں کی وجہ سے اگر معاف کرو گے تو یہ آپ کا حلم ہے اور آپ کو ہمارے ساتھ محبت سے پیش آنا چاہیے۔" حجاج نے کہا "خدا اے شعبی تمہاری گفتگو مجھے ان لوگوں سے زیادہ پسند آئی جو میرے سامنے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہیں ۔۔۔ نہیں کیا۔ میں فتنہ میں شریک تھا۔ حالانکہ ان کی تلواروں سے ہمارا خون ٹپکتا ہے اے شعبی ہم نے تمہیں امن دی ہے اب جاؤ۔" شعبی فرماتے ہیں کہ میں واپس ہوا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ حجاج نے مجھے پکارا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر میں نے اس کا یہ قول یاد کیا کہ "ہم نے تمہیں امان دی ہے۔"

"۔۔۔ اور مجھے اطمینان حاصل ہوا" حجاج نے پوچھا "ہمارے لوگوں کو آپ نے کس حال میں پایا؟" شعبی فرماتے ہیں کہ حجاج میری عزت کرتا تھا میں نے کہا "خدا آپ کے بعد ٹھنڈک دیا نیند دے سوئے سفر و قیام دونوں حالتوں کو دشوار پایا اور خوف مدام رہا۔" حجاج نے جانے کی اجازت دی اور میں بھی واپس ہوا۔

ابن اشعث کے ساتھیوں کے متعلق جن کو مسکن پر شکست ہوئی تھی ایک اور روایت بیان کی جاتی ہے۔ عمر بن ابی الصلت رے پر غالب آ گیا تھا۔ حجاج نے فتنہ کو رے پر بھیجا تھا جن مفسدین نے یزید سے لڑائی کی۔ نیز دوسرے مفسدین نے عمر بن ابی الصلت سے کہا ہم تمہارے ساتھ مل کر تمیم سے لڑنے تیار ہیں۔ عمر نے اپنے باپ سے مشورہ کیا۔ ابی الصلت نے کہا اگر وہ لوگ سچے آج اپنا سر دار بتاتے ہیں تو مجھے اس کی بھی پروا نہیں کہ کل تو قتل ہو جائے۔ غرض عمر بن ابی الصلت نے ان لوگوں کے ساتھ فتنہ سے جنگ کی۔ شکست کھائی اور وہ سب عبدالرحمٰن ابن اشعث کے

پاس بھاگ گئے اس کے خراسان پہنچنے سے پہلے پہلے رتبیل کے پاس واپس ہونے کے بعد باقی نے یزید بن مہلب سے جنگ کی جو بیان ہو چکی۔ کہتے ہیں کہ یزید بن مہلب نے صرف طلوع کے فرزند کو حجاج کے پاس نہ بھیجا باقی قیدیوں کو بھیج دیا۔ اس کی وجہ طلوع کا مہلب پر ایک احسان تھا یعنی ایک یا دو لاکھ کا قرض ادا کرنا۔ یزید نے کہا حجاج سے تو تم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بھائی حبیب نے کہا معزول ہونے تک رہا ہو جائے لیکن ابن طلوع کو اس کے پاس نہ بھیجے۔

جب حجاج کے سامنے محمد بن سعد بن ابی وقاص یعنی فاتح ایران کے بیٹے پیش ہوئے تو حجاج نے کہا "اے غرور و کبر مجسم تو نے یزید بن معاویہ کی بیعت سے انکار کیا۔ حسین و ابن عمر سے مشابہت کی پھر عراق ابن ابی الصلت کا موذن بنا" اور حجاج نے بات کی لکڑی سے ان کے سر پر مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ خون نکل آیا۔ اب محمد نے کہا "اے شخص علیا پایا ہے تو بزرگی اخلاق دکھلا"۔ حجاج نے ہاتھ روک لیا۔ محمد نے کہا میرے متعلق امیر المومنین سے خط لکھ کر پوچھ لے اس پر حجاج برابر دیر تک سوچتا رہا جس کے بعد کہا قتل کر دو۔

اس قیامت خیز بغاوت کے واقعات بیان ہو چکے اب مورخ کا فرض ہے کہ اس کے اسباب پر غور کرے۔ ہم نے واقعات کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے تاکہ جو نتائج ہم مستنبط کریں وہ مدلل ہوں۔ ہماری قطعی رائے ہے کہ اس بغاوت کا ٹرا سبب حجاج کی ظالمانہ حکمرانی یا نشہ دولت نہ تھا بلکہ عراقیوں کی بے چین اور ضد طبیعت ان کی تعزیر کی خواہش۔ اطاعت سے وحشت غیر مانوس حالات میں دوڑ تک گھستے جانے سے نفرت ہمیشہ یا مدتوں تک کام قیام کرنا۔ اور وطن سے دوری ہونے کا خوف تھا۔ اور وطن واپس آنے کی خواہش تھی۔ فتح سے سر پھر گیا تھا۔ حجاج کے تقسیم کیے ہوئے مال غنیمت سے نشا پڑ گیا تھا اور اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ آٹھ سال سے حجاج کی زبردست حکمرانی کی وجہ سے جو امن و امان نصیب تھا۔ اس کو عراقی بدامنی کے مصائب میں فراموش کر گئے تھے۔

اس بدامنی میں عبدالرحمن بن محمد بن اشعث کی خدا پسند طالب جاہ طبیعت کو بھی دخل تھا۔ تھوڑی سی مغرورفکر کے بعد یہ ظاہر ہو جائے گا کہ حجاج کی یہ خواہش بجا تھی کہ بغیر سستی کے رتبیل کے ممالک میں ہشیاری سے پیش قدمی کی جائے۔ حجاج نے بڑا بھاری لشکر تیار کر رکھا تھا۔ سپاہی منتخب اور بہادر تھے۔ ساز و سامان بھی خاص تھا۔ روپیہ بے دریغ صرف کیا گیا تھا۔ چنانچہ جس وقت عبدالرحمن نے اپنی اس انوکھی رائے کی وجہ سے کہ ایک سال تک توقف کیا جائے اور پیش قدمی موقوف کر دی جائے تو اس وقت فوج کی یہ رائے نہ تھی کہ آگے بڑھا نہ جائے۔ بات اصل یہ ہے کہ جیسا کہ طبری نے ایک دوسرے موقع پر اس کے متعلق لکھا ہے۔ ابن اشعث سے زیادہ سست اور کاہل کوئی نہ تھا۔ دیر کرنے میں حکمت تھی۔ آرام تھا اور جنگ کے مصائب سے نجات ملتی تھی اس کی خدا رائی کے بارے میں خدا اس کے چچا نے ایک بار کہا تھا کہ "مجھکو ڈر ہے کہ کہیں بغاوت نہ کر جائے"۔

عبدالرحمن کی اس غیر معمولی کاہلی کا سبب تھا کہ وہ کبھی بھی فرات کے اس پار جانے نہیں پایا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہر والی سے اپنا احترام منوانا چاہتا تھا۔ وہ فطرتاً کم ظرف بھی واقع ہوا تھا چنانچہ اس کی کم ظرفی کا ثبوت اس ایک واقعے سے ملتا ہے کہ جنگ تستر کے بعد اس نے کہا تھا کہ حجاج کی تو پرچ ایاط ہی نہیں۔ ہم عبدالملک سے لڑنا چاہتے ہیں اور جب یہ حجاج میں عراقیوں نے عبدالملک کی پیش کی ہوئی شرطوں کو نامنظور کیا تو اس نے مضرورانا انداز میں کہا تھا کہ نہ تو خلیفہ اور نہ ہی مروان کا نسب بھی ہے وہ تو گبر کی اولاد ہے۔ قریش میں صرف بنی امیہ ہی ایک بھی انسب ہوں۔ اس کے اپنی حیثیت کو بھول جانے اور اپنی حقیقت کو فراموش کر جانے کی شمائل مسعودی نے بھی دی ہیں کہ وہ اپنے کو "قحطانی موعود" کہتا تھا اور یہ کہ "ناصر المومنین" کا لقب اختیار کر لیا تھا۔

امام ابن قتیبہ نے وہ خط نقل کیا ہے جو اس نے حجاج کو صلح بیعت کے وقت مشہور کاتب منشی ابن الفریہ کے ہاتھ سے یہ کہہ کر لکھوایا تھا کہ اچھے سے اچھا لکھ۔ حجاج سے اچھا لکھ۔ خط کیا ہے ابن اشعث کے مغرور اور ناز کا بے رنگ مجسمہ۔ حجاج نے

اس کو پڑھ کر اذان دلوائی اور نماز کے لیے لوگوں کو جمع کیا۔ پھر خطبا دیا اور کہا۔

نقاتلهم ولا نشتم علوا
وشر عداوة المرء السباب

ہم لڑتے ہیں مگر دشمن کو گالیاں نہیں دیتے
کسی مرد کی بدترین دشمنی گالیاں دینا ہے

غرض اس بغاوت اور مہیب بغاوت کے دو سبب عراقیوں کی تلون مزاجی اور عبدالرحمٰن کی حق پسندی اور طلب جاہ تھی۔ تیسرا سبب وہی "اصولی" اختلاف تھا۔ جو حضرت معاویہ کے وقت سے پیدا ہو گیا تھا یعنی جمہوریت اور شاہی کے حامیوں کا اختلاف بقول احمد زیلان کے ابن اشعث کے ساتھ بہت سے صحابیوں کے بیٹے بڑے بڑے تابعی علما اور فقہا تھے مثل سعید بن جبیر شعبی۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ جو علمائے تابعین میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے اور صحابیہ میں سے ابوالطفیل عامر بن واثلہ تھے۔ ان بزرگوں کی یعنی عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ الجبری السطائی۔ شعبی اور سعید بن جبیر کی دیر جاجم پر تقریریں ہم نے تفصیل سے نقل کر دی ہیں۔ ہم نے ان کو کئی دفعہ پڑھا بھی ہے۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ سارا رونا قیام شاہی کی بابت تھا۔ چاروں تقریروں میں جو امر مشترک ہے وہ "جور فی الحکم" کی شکایت ہے۔ پھر حرام کو حلال کرنے مثل معاویہ کے استلحاق زیاد) بدعتیں نکالنے مثل خلافت کا موروثی کرنا ہر فصا ہے۔ نیز "یزید" کی بھی شکایت ہے۔ (مثل حرم شریف کا محاصرہ کرنا اور ظلم و زیادتی کا بھی تذکرہ ہے اور اس کا اشارہ ہیں بڑی حد تک یقین ہے کہ حجاج کے ان احکام کے متعلق ہے جو خراج کے کم ہو جانے کی وجہ سے اس کو دینے پڑے تھے اب آپ اس کو ذرا تفصیل سے سن لیجیے۔

مضامین

اور نظمیں وغیرہ بہت صاف اور خوش خط لکھا کیجیے۔

حقایق و معارف

کائنات حسن کے جلووں کی منزل چاہیے
کم سے کم اتنی تو دل میں وسعت دل چاہیے
ذوق نظارا بقدر حسن کامل چاہیے
تیرے جلووں کو مری آنکھیں مرا دل چاہیے
خنجر و شمشیر سے ہوں گے بھلا وہ کیا شہید
قتل کو جن کے نگاہ ناز قاتل چاہیے
جس میں مرگ و زیست کے آتے ہیں یکساں مزے
تا قیامت ایسی بار یب لذت دل چاہیے
کہہ رہا ہے سارا عالم دیکھ کر ان کو جواں
آسماں پر اور اب اک ماہ کامل چاہیے
آ چلی ہے زلزلے میں سرزمین کوئے دوست
کچھ ترقی اور ابھی بیتابی دل چاہیے
وسعت جلوا بحر وسعت دل ہوا گر
چشم نظارا بقدر ذوق کامل چاہیے
بعد مردن کو چہ جاناں میں ہو تربت اگر
اس سے زاید اور کیا جینے کا حاصل چاہیے

شوق نظارا ہی نظارے کا اقصر ہوا
دل کی تسکیں کے لیے بیتابی دل چاہیے

اقصر موہانی وارثی

لندن یونیورسٹی اور اس کی اہمیت

ج. ل

یہ ایک بڑی عجیب بات ہے کہ آکسفورڈ اور کیمرج کی یونیورسٹیاں قایم ہو چکنے کے بہت دیر بعد تک بھی پائے تخت لندن کی اپنی کوئی یونیورسٹی نہ بننے پائی تھی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تسلی بخش جواب آج تک بھی دل سکا صرف اتنا ہی پتا چلا ہے کہ لندن میں یونیورسٹی بنانے کی کوشش تو کئی دفعہ ہوئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

درمیانی دور میں لندن میں چند ایک تعلیمی ادارے موجود تھے ان کا آپس میں تھوڑا بہت تعلق ضرور تھا لیکن وہ متحد کبھی نہیں ہوئے پھر ۱۶ ویں صدی میں ایک منصوبا تیار کیا گیا جو کسی حد تک سرے چڑھ گیا۔ یہ منصوبا سر ٹامس گریشم کا تیار کیا ہوا تھا۔ اپنی موت پر انہوں نے رائل ایکسچینج اور اپنے مکان کا کرایا لندن کارپوریشن اور مرسر کمپنی کے نام لکھ دیا تھا اور انہیں ہدایت کر دی تھی کہ اس پیسے سے دینیات، علم نجوم۔ جیومیٹری موسیقی، قانون، طب و زن خطابت کے استاد مقرر کریں۔ اس طرح گریشم کالج عالم وجود میں آیا لیکن شومئی قسمت سے رائل ایکسچینج عظیم آتشزدگی کی نذر ہو گیا۔ اور کالج کی آمدنی کا بڑا ذریعہ جاتا رہا۔

اس کے بعد اصل کام ۱۸۲۶ء میں شروع ہوا۔ ۱۸۲۶ء میں شاعر ٹامس کیمبل نے ٹائمز میں ایک چٹھی شایع کرائی تھی جس میں اس نے لندن میں ایک بڑی یونیورسٹی کے قیام کی حمایت کی تھی۔ اس کی اپیل پر ایک لاکھ ۶۰ ہزار پونڈ اکٹھے ہوئے اور گوور اسٹریٹ میں ایک نئی عمارت بننا شروع ہو گئی اس عمارت کو اب یونیورسٹی کالج کہتے ہیں۔ چند سال بعد ایک دوسرا عظیم ادارہ کنگز کالج جس کو ۱۸۳۱ء میں ویلیم چہارم نے ایک چارٹر کے ذریعہ قایم کیا اور جس کی تجدید ایک سال بعد ملکہ وکٹوریا نے کر دی تھی۔ لندن یونیورسٹی قایم کر دی اور اسے ڈگریاں عطا کرنے کا اختیار دے دیا۔ یہ یونیورسٹی برطانیا کا پہلا درسی ادارہ تھا جس میں عورتوں کو بطور امیدوار ڈگری داخلے کی اجازت تھی۔ ۱۸۶۲ء کی بات ہے کہ عورتوں کے لیے ایک خاص امتحان رکھا گیا اور ۱۱ سال بعد مرد اور عورتیں ڈگریوں آنرز اور انعامات کے لیے شانا بشانا مقابلے میں بیٹھنے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اندنوں جیکے ہمارے خیال کے مطابق عورتوں کی سرگرمیاں گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ کئی ایک خواتین ملک زندگی میں بھی آ چکی تھیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آکسفورڈ اور کیمرج کے برعکس لندن یونیورسٹی مختلف تعلیمی اداروں کا فیڈریشن ہے ہر ادارہ آزاد انہ طور پر کام کر رہا ہے لیکن وہ یونیورسٹی کے تحت ہے۔ کل ادارے ۳۶ ہیں اور ان تمام کی سرگرمیاں اور نام بیان کرنا تو ناممکن ہے۔ ان میں اعلیٰ اسکول یا کالج بھی شامل ہیں۔

سینیٹ یونیورسٹی کی عالا گورننگ باڈی ہے جو چانسلر وائس چانسلر چیرمین آف کنووکیشن پرنسپل اور دوسرے ارکان پر مشتمل ہوتی ہے سینیٹ ہاؤس ایک قابل دید عمارت ہے۔

یونیورسٹی میں پورے وقت حاضر رہنے والے طلبا کی تعداد قدرتی طور پر کم و بیش ہوتی رہتی ہے لیکن سالانا اوسط ۱۸ ہزار سے اوپر ہی رہتا ہے اس میں سے ۳ تا ۳ ہزار طلبا کا من ویلتھ اور دوسرے ملکوں کے ہوتے ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جس کے طلبا لندن یونیورسٹی میں نہ آتے ہوں۔ آج کل سب سے زیادہ القدا د ہندستان پاکستان کا امریکا برما۔ آسٹریلیا۔ کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے طلبا کی رہتی ہے تمام درسی مضامین کی تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ انگلستان کا معیار اونچا ہے لیکن غیر ملکوں کے طلبا اکثر یونیورسٹی سائنس سوسائٹیز طب اور انجینئرنگ کے دلدادا ہوتے ہیں۔ غیر ملکوں سے آنے والے طلبا کی اوسط عمر ۲۰ یا ۲۱ سال کے قریب ہوتی ہے اور یہ ضروری ہے کہ وہ میٹرک کا امتحان پاس کر چکے ہوں۔ کورس تقریبا تین

ہوتا ہے لیکن بعض مضامین سے زیادہ دیر لگتی ہے خصوصاً طب
کورس چھ سال کا ہے۔

یونیورسٹی کے کسی اسکول میں داخلے کے لیے درخواست عموماً
متعلقہ ملک کے دفتر خارجہ اور وزیر تعلیم یا آبادیاتی دفتر
معرفت بھیجی جاتی ہے کہیں کہیں دفعہ اس قاعدے پر عمل نہیں
جاتا جس سے کئی مسایل پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض اوقات
یک طالب علم محض اپنی مرضی سے ہی لندن آپہنچتا ہے اسے کسی
یر کا پتا نہیں ہوتا۔ اور اس کے پاس پیسے بھی نہیں ہوتے۔ سچ تو
ہے کہ سمندر پار کے کسی طالب علم کو بھی یونیورسٹی میں اپنی نشست
محفوظ کرائے بغیر اور ڈگری کورس کے اخراجات کا بندوبست
یے بغیر نہیں آنا چاہیے۔ بعض طلبا صرف اتنی رقم ساتھ لاتے ہیں جتنی
ن کے قیام کے لیے کافی ہوتی ہے لیکن اگر وہ فیل ہو جائیں یا
ہیں دیر ہو جائے تو بہت مشکل پیدا ہوتی ہے۔

ان تمام مشکلات کے باوجود لندن یونیورسٹی کی بالیسی نرم
ہے۔ غیر ملکوں کے اکثر طلبا ایک دوسرے ملک میں رہنے اور کام کرنے
مسایل کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ دار السلام کے ایک سکھ
الب علم نے ۲۰ سال بطور کلرک کام کرنے کے بعد وکالت کا
متحان پیش کیا تھا۔ طالب علم کی تنہائی کا مسلا اکثر برطانوی
حل کر دیتے ہیں اگر طالب علم نے رہایش کا انتظام نہیں کیا
تو وہ اسے کہیں نہ کہیں رہایش ولوا دیتے ہیں۔ اس کا تعارف
ا دیتے ہیں۔ اور اسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

غزل

معجز (لکھنوی)

کھوں میں اشک چاک گریباں نہ کیجیے
چھا ہی ہے درد کا درماں نہ کیجیے
یوانا جان کر نہ ستانا کہیں مجھے
ح قفس میں رہ کے گذرنا ہے زندگی
یا کر رہے ہیں دیکھیے ملتے ہیں کون کون
س ہو چکی بہار نشیمن بنا لیجے
ظر ہیں ملاپ کیوں یہ تجھ کا اختلاف
ب جانتے ہوئے بھی یہ تجھ خیالی خام

ظاہر ہو راز دل کا وہ ساماں نہ کیجیے
میرے کرم کو ناز یہ احسان نہ کیجیے
بہتر یہی ہے چاک گریباں نہ کیجیے
ھوکے سے بھی خیال گلستاں نہ کیجیے
سنیے او ناز زلف پریشاں نہ کیجیے
کنج قفس میں فکر بہار الساں نہ کیجیے
میرے کرم کو ناز پشیماں نہ کیجیے
دل میں خیال دوست کو مہماں نہ کیجیے

حیدرآباد کوآپریٹیو انشورنس سوسائٹی لمٹڈ

بشیر باغ روڈ۔ حیدرآباد دکن

قایم شدہ ۱۹۳۵ء

۱۶ سالہ ترقی

اعداد بتاریخ یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء

کاروبار چالو
زاید از ۳½ کروڑ روپیہ

لایف فنڈ
زاید از ۷۵ لاکھ روپیہ

ادائیات
زاید از ۱۲ لاکھ روپیہ

چار مرتبہ
بونس کا اعلان کیا گیا

ہر قسم کے بیمہ کے لیے ہم سے مشورہ کیجیے

آذر - دے ۱۳۶۱ ف | ہندستانی ادب | اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء

امریکا کے تفریحی مقامات

ایس

(تفریح انسانی زندگی کے لیے ایک نہایت لازمی چیز ہے نہ صرف صحت اور تندرستی کے لیے یہ مفید ہے بلکہ ملک کی روایات معاشرت، اور سماجی زندگی پر بھی اس کا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ امریکا ہندستان کے لحاظ سے بھی بڑا وسیع ہے قدرتی طور پر وہاں بھی ہندستان کی طرح بیسیوں تفریحی مقامات ہیں جنہیں امریکا کی مرکزی اور ریاستوں کی سرکاریں عوام کے لیے آرام دہ اور دل کش اور خوب صورت بناتی ہیں۔ تفریح اور سیاحت کے لیے یہ سب سہولتیں ہی جاتی ہیں۔ وہاں یہ بھی ایک صنعت اور تجارت کا درجہ رکھتی ہے ہندستان آزاد ہو چکا ہے یہ بھی اپنے تفریحی مقامات کو عوام کی کشش کا باعث بنا سکتا ہے۔ اب امریکا کے تفریحی مقامات کا کچھ حال ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔)

امریکا کی مرکزی سرکار نے امریکی لوگوں کی تفریح اور سیاحت کے لیے ایک بہت بڑا خطہ مخصوص کر رکھا ہے جو ایک طرف امریکا کے شمال مشرقی گوشے شانت ساگر کے گرم جزیروں اور دوسری طرف امریکا کے مشرقی سمندری ساحل سے الاسکا کی برفانی چوٹیوں تک پھیلا ہوا ہے اس سارے علاقے میں مناظر کی گوناگوں کیفیت اور تاریخی رقبوں کے علاوہ بہت سی تاریخ اور عجیب و غریب چیزیں پائی جاتی ہیں۔

گرینڈ کینیان جو صخرہ ہی سرزمین کے بہت سے ولولہ انگیز مقامات کا پس منظر بنا ہے جہاں کے ۲۰ تفریحی پارکوں میں سے صرف ایک ہے اور چھٹیاں منانے کے لیے سب سے وسیع جگہ ہے جھیلوں۔ پہاڑوں اور حیرت انگیز اور مختلف قسم کی چیزوں سے بھرا ہوا ہے اور دنیا بھر میں سب سے بھاری تفریح گاہ ہے۔

امریکا میں نیشنل پارکوں (یا نات و غیرا) قومی یادگاروں تاریخی یادوں۔ فوجی پارکوں وغیرہ کا ایک وسیع سلسلہ پایا جاتا ہے جس کی نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔

پارکوں کا یہ سلسلہ آج سے (۷۰) برس پہلے شروع ہوا تھا جبکہ یلوسٹون نیشنل پارک قائم کیا گیا اس علاقے کی ملکیت اور منافع کے حقوق امریکیوں کے ایک گروہ نے اپنی رضامندی سے ترک کر دیے اور اس وسیع علاقے کو امریکیوں کی تفریح کے لیے مخصوص کیا گیا جس کی منظوری امریکی کانگریس نے ۱۸۷۲ء میں دی۔ ترک حقوق اور اس علاقے کو نیشنل پارک بنائے جانے کی یہ دلیرانہ تجویز ایک قانون داں کوریلس ہوجنز نے پیش کی تھی۔ اس خیال کو دوسرے لوگوں نے بھی پسند کیا۔ اور آخر سے عوام کے فائدے کے لیے عام تفریحی پارک کے لیے مخصوص کیا گیا۔

۱۹۵۰ء میں ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ امریکنوں نے ان تفریحی پارکوں کی سیاحت کی۔

امریکی نیشنل پارک سروس کے اولین ڈائریکٹر اسٹیفن ٹی ماتھر تھے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اس تحریک کی سرپرستی کی۔ اسے منظم کیا اور ۱۴ برس تک اسے ایک خاص صورت دینے ان کی غرض اور غایت پوری کرنے اور ایک پالیسی مرتب کرنے کے لیے کام کرتا رہا۔ مسٹر ماتھر کیلی فورنیا کے رہنے والے تھے اور امریکی سرکار کی ملازمت میں ۱۹۱۵ء میں شامل ہوئے آپ جنگلات کے بڑے ماہر تھے نیشنل پارکوں کے سلسلے میں جب ڈیپارٹمنٹ آف انٹیریر کی خط و کتابت ہوئی تو انہیں بڑا غصہ آیا۔ اور امریکا کے معاملات داخلہ کے وزیر کو آپ نے شکایتی مراسلہ لکھا۔ اس نے جواب میں لکھا ایسی ہی بات ہے تو خود واشنگٹن آکر خدا ان پارکوں کا انتظام سنبھالو چنانچہ مسٹر ماتھر کی بھاری قوت عمل اور پارکوں کے لیے ایک طرح کے جنونی جذبے نے ان سے بے نظیر کام کرایا۔

انہوں نے امریکی کانگریس کو ان کے یہ کھلے دل سے قدرتی منظر کرنے کی ترغیب دی پریسیڈنٹ روزویلٹ کے زمانے امریکی عوام پر ان پارکوں کی اہمیت ضرورت واضح کی ۱۹۱۶ء میں نیشنل پارک سروس قایم ہوگئی۔

امریکا کے کسی بھی مقام سے یہ تفریحی پارک دو دن کی مسافت سے زیادہ دور نہیں۔ پارک میں سیاحوں کا جو مقدم سپرنٹنڈنٹ والے پارک ریینجر کرتے ہیں ہر پارک کے ساتھ ایک سپرنٹنڈنٹ بھی ہوتا ہے ریینجر پارکوں کو آگ وغیرہ سے محفوظ رکھنے اور سیاحوں کو سہولتیں دینے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ سڑکوں اور رستوں وغیرہ میں بھی سفر کے دوران میں سیاحوں کی حفاظت ان ریینجروں کا کام ہوتا ہے۔

جب سیاح ان پارکوں میں سے گذرتے ہیں تو دل لبھانے والے اور حیرت انگیز مہوش کر دینے والے نظاروں سے وہ ششدر و حیران رہ جاتے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ خوب صورت مقامات کی طرف رجوع میں لگ جاتے ہیں اس مقصد کے لیے ترجمان مقرر کیے گئے ہیں جو سیاحوں کی خدمت مفت بجا لاتے ہیں۔ وہ تقریریں کرتے ہیں درختوں اور پودوں حیوانوں اور زمین کے متعلق معلومات بتاتے ہیں۔ پارکوں میں ایک عجایب گھر بھی ہوتا ہے۔

پارکوں میں رہنے اور ٹھہرنے کے لیے کھلی جگہ اور مکان اور میدان ہوتے ہیں جن میں خیمے لگا کر لوگ مفت بھی رہ سکتے ہیں اور ہوٹلوں میں بھی ٹھہر سکتے ہیں کیفیٹریا اور اسٹور وغیرہ قایم ہیں پٹرول وغیرہ بھی مل سکتا ہے اور مفت سواری کا انتظام بھی ہے

ان پارکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں جنگلی جانوروں کو زندہ اصورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شکار کھیلنا منع ہے۔ بے شک کیمرے سے آپ انہیں "شوٹ" کر سکتے ہیں یعنی تصویریں اتار سکتے ہیں تاہم مچھلیوں کے شکار کی اجازت ہے لیکن وہ ایک مقرر التعداد تک اور مچھلیوں کی پیداوار اور ان کے کم و بیش ہونے کے لحاظ سے۔

ان تفریحی پارکوں میں لوگ پہاڑوں کی سیر ہائی کنگ تیرنے گھڑ سواری کشتی رانی۔ مچھلیاں پکڑنے وغیرہ وغیرہ کے کھیلوں اور تفریحی اشغال میں حصہ لے سکتے ہیں۔

ان تفریحی مقامات پر جانے والے لوگوں میں نہایت قلیل تعداد ایسی ہوگی جنہوں نے جلد یا دیر میں امریکا کے مشہور نیچرلسٹ جان بیور کی یہ تحریر درست نہ پائی ہو کہ:—

"ہزاروں تھکے ماندے حد سے زیادہ متمدن اور پریشان خاطر لوگوں کو جنگلوں اور پہاڑوں کی سیر و تفریح سے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنے گھر ہی پہنچ رہے ہیں"

غزل

لے لیا ہاں سے لیا دل اب مرا دل ہو گیا
تم کو اتنا سوچ سے کہہ دینا بھی مشکل ہو گیا

آئینے میں عکس جب مدمقابل ہو گیا
ایک قاتل ہو گیا اور ایک بسمل ہو گیا

عشق کی بنیاد اسی پر منحصر کر دی گئی
منجمد ہو کر جو قطرہ خون کا دل ہو گیا

عشق کی ہو ہو مرا امیدوں کے قربان جایئے
منزل الفت میں میں گم کردہ منزل ہو گیا

ایک درد عشق ہی تھا زندگی کا شغلا
تھم کے وہ بھی باعث بربادی دل ہو گیا

اک نظر ملتے ہی دل میں درد سا پیدا ہوا
رفتہ رفتہ بڑھ کے پھر وہ عشق کامل ہو گیا

(لکھنوی) مہر

اپنی اپنی فکر میں کھوئے ہوئے ہیں سب کے سب
آج کچھ برہم نظام حسن محفل ہو گیا

پھر گلا کیا اس کو ظلمت کا خیال زلف میں
ہو کے جو آزاد دیا بند سلاسل ہو گیا

بزم انجم اور نظام کہکشاں کیا چیز ہے
مہر جب ان پر فدا خدا ماہ کامل ہو گیا

کالا گلاب

شہباز پرویز

تخفیف شدہ ملازمین کی فہرست میرے سامنے تھی اور ایک بک کا ریکارڈ دیکھتے ہوئے برطرفی کی دستخط کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر بریں حسن علی خاں ولد عابد علی خاں کے نام پر رک گئیں حسن علی خاں کے نام سے میری زندگی کا ایک اہم باب وابستہ ہے جو رنگین بھی ہے اور پر درد بھی۔ کل حسن علی خاں کی ملازمت میرے حکم سے ختم ہو جائے گی۔ کل سے وہ اس کی بیوی زبیدا اور اس کے چار بچے فاقوں مریں گے میں جانتا تھا کہ حسن علی خاں فضول خرچ اور نام و نمود کا بندا ہے اور یہ کہ اس کی جگر کی آمدنی بھی بند ہو چکی ہے اس حیاں کے ساتھ ہی کہ کل زبیدا تنگ دست ہو جائے گی۔ وہ ایک ایک پیسے کو ترسے گی۔ خدا معلوم معاشی پریشانی اسے اپنے مقام سے کتنا نیچا اتار دے میرے دل میں ہمدردی کروٹیں لینے لگی۔ زبیدا کی طرف سے میرے دل میں جتنا بھی میل تھا آنسوؤں سے دھل گیا۔ اب میرے سامنے ایک حسین شریر آٹھ سالا معصوم بچی تھی جو میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ جو میرے ہار سہتی تھی جو میرے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھیتوں میں نکل جاتی تھی اور ہمارے سفید کپڑوں کی سفیدی اور استری انہی کھیتوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ ہم ایک ساتھ پٹتے تھے ایک ساتھ روتے تھے اور پھر گلے میں ہاتھ ڈالے سو جاتے تھے۔ پھر ایک وقفہ آیا۔ طویل وقفہ۔ بے کراں خاموشی۔ انقلاب نے ہمیں جدا کر دیا۔ کیسے مجھے پتہ بھی نہیں۔ لیکن وہی زبیدا۔ میرے سامنے دوبارہ منظر آ گیا۔ آنسوؤں کی روانی میں مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں تعلیم کے لیے حیدرآباد آ رہا تھا۔

ارشتے داروں کی مثال اس لکڑی کی طرح ہے جو چلتے تو اپنے فریب کے لوگوں کو لپیٹ میں لے لیتی ہے اور جو کھٹتی ہے تو اس کے دھویں سے دور والوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ تم جا رہے ہو وہاں تمہارے ایک چچا بھی ہیں لیکن بیٹا ارشتے داروں سے دور ہی رہنا بہتر ہے اللہ حافظ" والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور میں انہیں کے الفاظ ذہن میں لیے حیدرآباد پہنچ گیا۔ مجھے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ مل گیا اور ہوسٹل کی بھی رہائش کا انتظام بھی۔

اڈیکیٹ کی معطر بیز فضا میں اور ہوسٹل کا جانفزا ماحول ۔۔۔ چچا جان سے ملنا تو ایک طرف والد صاحب ہی کو پابندی سے خط لکھنے کا خیال نہ رہتا۔ دن بڑے مزے سے گذر رہے تھے نہ فکر فردا نہ پریشانی امروز۔ ایک شام ہوسٹل کے سامنے ٹہل رہا تھا کہ ایک نیلی رنگ کی ایک بیوک آ کر رکی اور اندر سے ایک باوضع اور وجیہہ شخص نکلا اور میری طرف آنے لگا میں خاموش کھڑا دیکھتا رہا انہوں نے خود آداب کیا اور میں نے بھی شرمندا ہو کر جھک کر تسلیمات بجا لایا وہ میرے قریب آئے اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ہنستے ہوئے کہا۔

"خوب تنے بڑے ہو گئے ہو کہ چچا کو بھی نہیں پہچان سکتے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی اور یہاں آنے کے بعد میرے پاس کیوں نہیں آئے۔ کس نے منع کیا تمہیں ہمارے پاس آنے سے ۔ وہ کہے جا رہے تھے اور میں خاموش کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ "خاموش کیوں کھڑے ہو۔ چلو میرے ساتھ۔ انہوں نے مجھے موٹر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا اور میں وارڈن کی اجازت لے کر ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ اور موٹر اسٹارٹ ہو گئی ہم ایک شاندار پھاٹک میں داخل ہوئے۔ سامنے ایک وسیع چمن تھا جس میں رنگ برنگ پھولوں کے گچھے اٹھتے ہوئے فوارے ۔۔۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی الف لیلوی فضا میں پہنچ گیا ہوں۔ وہ مجھے اندر لے گئے۔ ایک وسیع

ہال میں ایک بڑی بی ہنستی ہوئی بیٹھی تھیں۔ بڑے سفید گاؤ تکیے سے سہارا لیے ۔ وہ ضرور ایک گاؤ تکیہ معلوم ہو رہی تھیں۔ بازو ہی ایک بڑا چاندی کا پاندان اور اگالدان بھی تھا۔ ہال میں بڑے بڑے فانوس اور کانچ کے جھاڑ لگے ہوئے تھے نیچے نرم قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی قدیم ایرانی یا مغل دربار میں باریاب ہوں۔

میں سمجھ گیا کہ یہی ہماری چچی صاحبہ ہیں جھک کر آداب بجا لایا۔ چچی نے ہاتھ بڑھا کر قریب کر لیا دعائیں دیں۔ اور خیریت پوچھی تھوڑی دیر بعد کہا "جاؤ نہا دھو کر آرام کر لو۔ اور میں نے کہا آپ نہیں چلیں گی؟

"میں چلنے پھرنے سے مجبور ہوں بیٹا تم جاؤ"

کیا آپ کے پیر میں درد ہے۔ میں نے ان کے اون کے گالے جیسے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے فیلیفس کی شکایت ہے۔ تم جاؤ"۔ اور جاتے جاتے میں نے سوچا کہ یہاں بیٹھا رہنے سے بہتر ہے کہ نہا لوں۔ معلوم ہوا کہ جدی امیر بیگمات کی اکثریت اس مرض میں مبتلا ہے۔ یہ مرض بیٹھے بیٹھے بغیر ہاتھ پیر ہلائے مفت خوری کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

مجھے مکان کے پائیں باغ میں اس طرح پہنچایا گیا کہ ایک ملازم ہاتھ باندھے آگے آگے اس طرح چل رہا تھا کہ مجھے اس کی پیٹھ آدمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ڈر ہو رہا تھا کہ کہیں کم بخت ٹھوکر کھا کر گر نہ جائے میں دل ہی دل میں ہنستا ہوا اپنے آپ کو مغل شہنشاہ جہانگیر یا آصفی بادشاہ عثمان علی خان کہتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ سامنے لان پر ایک میز بچھی ہوئی تھی جس پر چائے کا سامان اور کچھ ناشتہ چنا ہوا رکھا ہوا تھا اور ایک صاحبہ میری طرف پیٹھ کئے ہوئی کھڑی مالی سے کچھ فرما رہی تھیں اور مالی ہاتھ باندھے سر جھکائے کچھ کہہ رہا تھا۔ جی نہیں عرض کر رہا تھا۔

سفید ململ کا کرتا۔ سبز شاہ موکا تنگ چوڑی دار پائجامہ اور چنٹ کا کھڑا سبز دوپٹا۔ لانبی چوٹی کمر سے ہوتی ہوئی ان کی تنگ پنڈلیوں سے لپٹی جا رہی تھی۔ میں ابھی دیکھتا کھڑا تھا کہ بچہ جان اندر آ گئے اور وہ بھی پلٹ گئیں۔

ارے تم نے زبیدا کو پہچانا نہیں" چچی جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور تم نے بھی انہیں نہیں پہچانا" وہ زبیدا سے کہنے لگے۔ زبیدا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور ہلکی سی شرم کھیلنے لگی اور سرخی اس کے چہرے پر یوں کھیلنے لگی جیسے افق پر شام کی ڈھلتی ہوئی شفق۔

ناشتے کے دوران میں معلوم ہوا کہ زبیدا زنانا کالج میں اس سال انٹر آرٹس میں داخلہ لیا ہے۔

رات گئے انہیں کی موٹر میں واپس ہوا اور دیر تک زبیدا کا بچپن آنکھوں میں پھرتا رہا۔ پھر اس کی جوانی میری آنکھوں میں تیرتی رہی۔

ایک دن کالج سے تھکا ہوا بورڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ میرے نام ٹیلیفون آیا ہے۔ رسیور اٹھانے کے بعد معلوم ہوا کہ زبیدا بول رہی ہے "آپ پھر تشریف کیوں نہیں لائے۔ آج آپ کے چاچے پراٹھے انتظار رہے گا" نہا دھو کر کپڑے بدل رہا تھا کہ وہی نیلی بیوک آ گئی اور ڈرائیور کی زبانی معلوم ہوا کہ زبیدا نے مجھے لینے کے لیے بھیجی ہے میں جلد ہی اس میں سوار ہوا اور گھر پہنچ گیا۔ مکان کے سامنے احاطے میں ایک لان پر میز سجی ہوئی تھی اور زبیدا بھی بڑے ٹھاٹ میں تھی۔ سرتاپا بیلی۔ وہ زیادہ گوری نہ تھی۔ اس لیے نیلا لباس اس پر زیادہ اچھا نہیں رہا تھا۔ تاہم اس کی ملاحت۔ دکن کی اس ملاحت کا چرچا تو سارے عالم ہی میں ہے۔ میز پر خوب صورت گلاب کا گلدستہ رکھا ہوا تھا اور زبیدا کے بالوں میں بھی سفید اور سرخ گلاب لگے ہوئے تھے۔

"آپ کو گلاب بہت پسند ہیں" میں نے اس کی بڑائی ہوئی پلیٹ سے ایک پسٹری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بہت پسند۔ آپ نے ہمارے گلاب کے تختے نہیں دیکھے"۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ بہت دیر تک مجھے گلاب کے پودے بتاتی رہی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایک کی تاریخ پیدائش وفات شخصی عمر موجودہ شجرہ نصب وغیرہ

"آپ کے ہاں کالے گلاب کا پودا نہیں" میں نے اسے گلاب توڑنے میں مدد دیتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں ایک تھا وہ مرجھا گیا" زبیدہ اشرمندا ہوئی جا رہی تھی۔

"ہمارے پاس ہے۔ میں لا دوں گا"

"شکریہ" اس کی جھکی ہوئی پلکیں اٹھیں۔ اور جھک گئیں اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

دوسرے دن میں نے "وی۔ سی۔ لاج" کے مالی کو دو ایک روپے انعام دے کر کالے گلاب کا پودا حاصل کر لیا اور اس کی اطلاع ٹیلیفون سے زبیدہ کو دی۔ اس نے جواب میں کہا "جلد ہے آئیے موٹر بھیجدوں" میں نے کہا اس کی ضرورت نہیں اور سیکل پر میں زبیدہ کے گھر چلا گیا۔ وہ کالے گلاب کا پودا دیکھ کر بیحد خوش ہوئی۔ نہ جانے کیوں۔ پودا بیٹھے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ گئے اور آنکھیں مچ پر کچ دیر کے لیے بھیگ گئیں۔

"آئیے اسے وہاں رکھیں گے" اس نے چمن کے ایک خوبصورت کونے کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا اور ہم دونوں چمن کے وسیع لان پر سے گذرنے لگے۔ جس کے اطراف چنار کے درخت تھے۔ ہارسنگار اور ترنواری کی بیلیں تھی لاجونتی کے پودے تھے بیلے کے پھول کھلے تھے۔ اور فوارا چ گنگنا رہا تھا میں نے بیل کو جھٹکے دیے اور پھول اس پر سے نیچے ہو گئے۔ چمن کی فضا میں ایک نصرتی قہقہا گونجا اور وہ لجاتی ہوئی آگے بڑی اور حوض کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ میں دوسرے کونے پر بیٹھ گیا اور اس پر پانی اچھالنے لگے۔ اس کے سارے کپڑے بھیگنے لگے۔

"دیکھیے ایسا مت کیجیے"۔ ہمارے کپڑے بھیگ گئے۔ بھیگے ہوئے کپڑے اس کے جسم سے چپٹ گئے اور وہ بری طرح شرمانے لگی۔

"اچھا آیئے۔ پودے کو وہاں رکھیں" میں نے کہا۔ اور وہ میرے ساتھ چمن میں کام کرنے لگی۔

"دیکھتے ہی سے یہ پودا کتنا خوب صورت معلوم ہو رہا ہے" اس نے ذرا ہٹ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے یہ اس پھول کتنا خوب صورت معلوم ہو رہا ہے" میں نے اس کے بالوں میں ایک پھول لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ زیادہ موزوں تو یہاں معلوم ہو رہا ہے۔ اس نے پھول کو میرے کالر میں لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر ہنستے سے بوسا دیدیا۔ اور اس کے گالوں پر کئی گلاب کھل گئے۔

ایک دن شام کے وقت اچانک اس کے گھر گیا۔ چچا جان کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اور چچی جان بغرض تفریح یا دوسرے الفاظ میں موٹاپے کو گھٹانے کے لیے حسین ساگر کے کنارے گئی ہوئی تھیں۔ میں کمرے میں بیٹھ گیا۔ زبیدہ اتیز تیز میرے کمرے میں آئی۔ سرخ غرارا سرخ قمیص اور سرخ اوڑنی میں تو بس وہ ایک لال پری معلوم ہو رہی تھی۔

"بہت مصروف ہیں آپ" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں! کالج کی چند لڑکیاں آئی ہوئی ہیں اگر آپ کو یہاں دیکھ لیں گی تو بس تمام کالج میں میرا ناطقہا ہی بند ہو جائے گا" اس نے کہا۔

"تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے شرارت سے پیر پھیلا دیے اور پیر کے انگھوٹھے سے اس کے لہریں لیتے ہوئے غرارے کو پکڑ لیا۔ بھیجی آتی دور سے تھکے ہوئے آئے ہیں کچھ دیر ستا لینے کے بعد ہی جائیں گے۔ تم غور کرو۔ کہاں اڈیکیٹ اور کہاں یہ گنوار اہل۔ سوچو تو کتنے تضاد فراز ہیں رشتے ہیں" وہ گومگو حالت میں کھڑے مجھے دیکھتی رہی۔ کتنی عقیدت تھی ان آنکھوں میں۔ خلوص تشکر، محبت، ہمدردی اور شرارت کے جذبات جب آنکھوں سے جھانکنے لگتے ہیں تو کتنی خوبصورت نظر آتی ہیں آنکھیں

"ارے چلو چلو۔ دیر ہو رہی ہے" بیگم صاحبا کا اصرار اب بھی باقی ہے" کوئی لڑکی قریب آ رہی تھی اور زبیدہ پریشان ہو کر تیزی سے مڑی لیکن غرارا میرے پیروں میں الجھا ہوا تھا

وہ گرتے گرتے بچ رہی۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھال لیا۔

"اوہوں! چھوٹے سے بھی! کوئی دیکھ لیگا" وہ غرارا سنبھالی ہوئی آگے بڑی اور دروازے کے پاس رکتے ہوئے کہنے لگی۔

"معاف کیجیے، اب میں اجازت چاہتی ہوں۔"

"اور ہم جو اتنی دور سے تھکے ماندے آئے ہیں!" میں نے طنز کیا

"مجبوری ہے۔ امید کہ آپ کچھ خیال نہ کریں گے ——"

"نہیں تو آرام فرمائیں۔"

"اکیلے ہی کیسے کٹے گی!"

"گذارہ بھی کیجیے" کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔

مجھکو سخت غصہ آگیا کہ اس نے ذرا بھی پرا لحاظ نہ کیا کہ میں ڈکیٹ سے بچا رات تک سیکل چلاتا ہوا اس کے لیے کالا گلاب لے آیا اور وہ مجھکو کیا چھوڑ کر فوجی ہو گئی۔ میں بھی اسی وقت واپس چلا گیا۔

چھ بجے رونگ ٹیلیفون آیا میں نے چپراسی سے کہا "کہدو کہ کمرا بند ہے" پھر دو تین وقت ٹیلیفون آیا۔ میں نے گفتگو نہیں کی۔ ایک رات سینما دیکھ کر لوٹ رہا تھا کہ کمرے کے سامنے وہی نیلی بوسکی کھڑی نظر آئی۔ سوچا لوٹے پیر لوٹ جاوں لیکن پھر خیال آیا کہ کافی دیر ہو چکی ہے مزید دیر ہو جائے تو پھر کھانا پانی بند ہو جائے گا۔ تیز تیز کمرے کی طرف گیا۔ جیسے موٹر کو دیکھا ہی نہیں اور کمرا کھول کر بجلی جلائی۔ تھوڑی دیر بعد نسیما خود اندر چلی آئی۔

"بلا اجازت اندر آنے کی معافی چاہتی ہوں" اس کا لہجا اداس اداس سا تھا۔

"فرمایئے پاشا کدھر تشریف لائی ہیں آپ؟" میں نے بھی طنز کا بھرپور وار کیا۔

"آج ہمارے گھر میں دعوت ہے۔ تین دن سے ابا اور امی کو آپ کا انتظار ہے۔ کل خدا بابا نے ٹیلیفون کیا تھا لیکن آپ سے گفتگو نہ ہو سکی۔ اب ابا ہی کے کہنے پر آپ کو لینے آئی ہوں۔" اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے آواز گلوگیر تھی۔ مزید کچھ کہتا تو شاید وہ بری طرح رو پڑتی۔ بورڈنگ کا مقام رات کا وقت پھر نسوانی آواز اور خدیدا دل پسیج رہا تھا۔ اسے موٹر میں بٹھا کر وارڈن کو اپنے باہر جانے کی اطلاع دی اور روانہ چلا گیا۔

وہ موٹر تیز چلا رہی تھی جیسے جذبات کے حدود کو نا پار کرنا چاہتی تھی مکان پہنچکر وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی خاموش، خاموش۔ پھر دعوت شروع ہوئی۔ میز پر کئی مہمان سے متعارف ہوا۔ اور یہیں میرا تعارف حسن علی خان سے ہوا وہ آپ سے ملیے۔ نواب حسن علی خاں، نواب عابد علیخاں کے فرزند ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں محبوب گرمیں ان کی وسیع جاگیر تھی اور منصب دار بھی ہیں۔

اور میں نے نواب حسن علی خاں سے ہاتھ ملاتے ہوئے خیال کیا کہ یہاں کا ہر بچا پیدائشی نواب ہے لیکن ساتھ ہی مجھے کچھ شک سا ہوا۔ مگر پھر مختلف اقسام کے کھانوں اور میٹھوں میں کھو گیا۔

دعوت ختم ہونے کے بعد سب مہمان رخصت ہونے لگے۔ اور میں بھی اجازت لے کر نیچے اتر رہا تھا کہ سامنے ہار سنگھار سن کی بیل کے نیچے نوجوان خاتون کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں انجان سا موٹر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے بیل کو جھٹکا دیا اور ہار سنگھار کی نوخیز کلیاں مجھ پر نچھاور ہو گئیں۔ وہ تیز تیز میری طرف آنے لگی۔ میں موٹر میں بیٹھ چکا تھا۔

"دیکھیے! آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہو تو کہہ دیجیے شاید میں دور کر سکوں" اس کا گلا اب بھی رندھا ہوا تھا۔

"جیسے آپ جانتی ہی نہیں۔ برسوں مجھے ٹھہرا کر کہاں گئیں تھیں؟"

"تمہارے کالج میں تار دیا ہے اور تم حسن علی خاں کے ساتھ کیسوں نکلتی ہو" میں نے پوچھا۔

"اس کمیٹی میں پردے کی خاص پابندی نہیں کی جاتی۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کے گھر چلے جاتے ہیں اور پردے میں دھرا کیا ہے کبھی گھر میں ملاقات ہوتی ہے اور کبھی ROCKCASTLE HOTEL میں" اس کے کہنے میں لاپرواہی اور لاابالی پن تھا۔ جیسے سے حسن علی خاں سے بے پردگی کو کوئی اہمیت ہی نہیں تھی لیکن میرے دل میں کوئی انجان سا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ سی

کے متعلق سوچتا ہوا اسی ہیوک میں ہوسٹل واپس چلا آیا۔

ایک دن میں وہاں گیا۔ چچا جان سے ملاقات ہوئی انہوں نے رحیانہ بنک کے روپے وغیرہ کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ سب ختم ہو چکے ہیں اور میں جانتا تھا کہ ہماری جاگیر اور رحیانہ کے کثیر حصے پر صرف چچا جان کا ناجائز قبضہ ہے۔

"بی۔ اے کے بعد تم کیا کرو گے" چچا جان نے دریافت کیا

"ارادہ ہے کہ ایل۔ ایل۔ بی میں اخلاقوں" میں خالی ذہن تھا چچا جان نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سیول سروس کی تیاری کیوں نہیں کرتے"

"کوشش کروں گا" میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا۔

یہاں کی سیول سروس میں میرے لیے کوئی موقع نہ تھا۔ آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان میرے لیے کافی مشکل تھا۔ علاوہ ازیں زبیدا میری رگ رگ میں سما گئی تھی۔

امتحانات ختم ہوتے ہی میں وطن واپس چلا گیا میں نے ابا سے کہلوایا کہ ایم میں پڑھنا نہیں چاہتا۔ اور ساتھ ہی زبیدہ کے متعلق بھی اشارہ کر دیا نہ جانے ابا اور چچا جان میں کیا مراسلت ہوئی۔ جواب نفی میں ملا مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں کمرے میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ خدایا میرے کمرے میں داخل ہوئے اور گلوگیر آواز میں کہنے لگے۔

"بیٹے! میں نے تم سے کہا تھا کہ رشتہ داروں کی حالت اس جلتی ہوئی لکڑی کی سی ہے جو قریب کے لوگوں کو بھسم کر ڈالتی ہے اور دور والوں کا دم اس کے دھوئیں سے گھٹنے لگتا ہے۔ پھر تم وہاں کیوں گئے تھے تم نے تو امتحان امتیاز سے کامیاب کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن حالات سے تو پتا چلتا ہے کہ تم یہ وعدہ بھی پورا نہیں کر سکتے میں ابا سے لپٹ گیا اور وہ مجھے دلاسا دینے لگے۔

فتیجا نکلنے پر میں پھر حیدرآباد واپس ہوا۔ اس سال میرا فنل ہو چکا تھا چچا جان کے پاس بھی گیا لیکن ملاقات میں نہ گرمی تھی اور نہ بات چیت میں وہ خلوص انہیں کی زبانی معلوم ہوا کہ زبیدا کی نسبت حسن علی خاں سے طے پا گئی ہے وہ بڑا جاگیردار ہے۔ ممتحل تو اب اور حالانکہ اس کا فرزند ہے اور تین سو روپے ماہوار پر ملازم بھی ہے میں زبیدا کے کمرے میں دبے پیر گیا۔ زبیدا نرم صوفے پر نیم دراز اس قیمتی چڑاوی انگوٹھی کے نگ کو نیم وا نظروں سے دیکھ رہی تھی جو شادی کی منگنی کے دن چڑھا دی گئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔

"آیئے ہاشم بھائی" تشریف لائیے وہ جلدی جلدی انگوٹھی موڑنے لگی۔

ہاشم بھائی۔ میں نے دل میں کہا۔ یہ ہرجائی لڑکیوں کا سب سے آسان حربہ ہے! جہاں کسی بدقسمت پر سے دل اترا اور نظروں میں کوئی اور چاہنے والا سمایا فوراً پہلے منظور نظر کو "بھائی" کہہ دیا جیسے دونوں کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون دوڑ رہا ہو۔

"مبارک زبیدا" میں اطمینان سے اندر چلا گیا۔ اور اس کے بازو ہی بیٹھتے ہوئے اس کی انگوٹھی والی انگلی مضبوطی سے پکڑ لی نگ پر اچ۔ اے۔ کے کی خوب صورت مہر بنی ہوئی تھی وہ ایسے مجھے دیکھنے لگی جیسے میری اس حرکت کا اسے احساس ہی نہ تھا۔

"مبارک" میں نے دوبارہ کہا۔ کہیں شادی میں ہمیں بھول تو نہ جاؤ گی"

"ہٹیئے بھی۔ کون بھولے گا آپ کو۔ ضرور آیئے" مصنوعی شرم اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

اور جب میں نیچے اتر رہا تھا تو حسن علی خاں ایک جھنڈ کے نیچے کھڑا سیاہ گلاب کے پودے پر جھکا پھول توڑ رہا تھا پھول لگانے کے بہانے حسن علی خاں زبیدا کے ریشمی بالوں سے کھیلنے لگا۔ میں سوچتا ہوا خاموش چلا آیا۔

اس کے بعد کئی سال تک میں حیدرآباد نہ جا سکا۔ بی۔ اے کیا پھر ایس۔ ایس میں شرکت کے بعد کامیاب ہو کر فنانس میں ملازم ہوا۔ اس دوران میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ زبیدا کی شادی ہو چکی ہے اور وہ بہت خوش ہے۔ بچے بھی کئی پیدا ہوئے لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ کنوارا ہی رہا۔ اور کنوارا ہی رہنے کا ارادہ حیدرآباد پبلک سروس کمیشن ہوا اور کمیشن کے بعد چند

ہیے داروں کو روانا کیا گیا جن میں میں ایک تھا۔ ڈیجنٹ افسر کی حیثیت سے میں حیدرآباد آیا جس کا کام بھی زیادہ اور ناکارا ملازمین کو نکالنا تھا۔ حیدرآباد آتے ہوئے کچھ خفگی ہوئی لیکن زیادہ تر یہ خوشی تھی کہ حیدرآباد میری محبت کا گہوارا ہے اور میری محبت کا مدفن بھی یہاں کے حسن نے میری نگاہوں کو خیرہ کیا۔ یہاں کی عطر بیز فضاؤں نے مجھے فرحت بخشی۔ یہاں کی تہذیب اور کلچر نے مجھے متاثر کیا۔ یہاں کی محبتوں نے میرے کردار کو جلا دی۔ یہاں کی جاں معاشرے نے میری دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارا۔

مادر جاں معاشرے میں تجھے سلام کرتا ہوں۔ تیری سکون پرور آغوش میں حسرت کی چند گھڑیاں مجھے ملی ہیں۔ میں نے یہاں بہت کچھ پایا اور کھویا بھی۔

حیدرآباد آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حسن علی خاں اور زبیدا اور اس کے چار بچے بڑی مشکل سے گذارا کر رہے ہیں۔ منصب بڑا سے نام ہے اور گذر بسر کا سارا دارومدار ان تین چار سو روپوں پر ہے جو ملازمت سے مل جاتے ہیں جس پر میں اپنا آخری حکم لکھ رہا تھا۔ میں زبیدا کی کچھ مالی مدد کرنا چاہتا تھا ــــ مجھے اب بھی زبیدا کا خیال تھا لیکن معلوم تھا کہ زبیدا کی خودداری اسے کبھی گوارا نہیں کرے گی بلکہ شاید اپنے لیے باعث رسوائی سمجھے۔ رسی جل جاتی ہے لیکن اپنے بل نہیں کھوتی۔ یہی حالت یہاں کے لوگوں کی تھی۔ سب کچھ کھو چکے تھے لیکن وہی ٹھاٹ باٹ تھے۔

میں نے شکل پھر شروع سے پڑھا۔ شکل کے معائنے سے صاف ظاہر تھا کہ دفتر میں اس کا وجود عدم وجود دونوں برابر ہیں اور ایسے اشخاص کا وجود خزانے پر بوجھ ہے اور جتنی جلدی ہو سکے اس بوجھ کو ہٹا دینا چاہیے۔

زبیدا بچ سے دور رہے وہ کسی کی بیوی بچوں کی ماں بن چکی ہے لیکن میری نگاہوں کے سامنے وہی معصوم چھوٹی سی زبیدا ہے جو میرے مار کھاتی تھی تو مجھ سے روٹھ جاتی تھی لیکن پھر من جاتی تھی وہی زبیدا جس کے ساتھ میں نے چند رومان پرور اور یادگار لمحے گذارے ہیں لیکن اب وہ بھیگی ہوئی لکڑی کی طرح میرا گلا گھونٹ رہی ہے۔ میری سانس رک رہی ہے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ کیا زبیدا یہ میرا آخری وار سہہ سکے گی۔ کیا وہ روٹھ کر پھر من سکے گی۔ کیا وہ اس ضرب کی وجہ جان کر قلم سے اسے پہنچنے والا ہے برداشت کر لے گی۔

ــــ نہیں وہ ــــ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

غزل

شکیل (امیٹھوی)

سرِ میخانا جب ساقی کا فیض عام ہوتا ہے
ہمارے کانپتے ہاتھوں میں خالی جام ہوتا ہے

جوانی کے سہارے آ گئے ہم ایسی منزل پر
جہاں خود دل اسیرِ عشرتِ ناکام ہوتا ہے

جدائی کا تصور، خوفِ تنہائی معاذ اللہ
سحر کے وقت بھی دل کو خیالِ شام ہوتا ہے

رگیں کھنچتی ہیں، دم گھٹتا ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے
مرا آغاز اب شرمندۂ انجام ہوتا ہے

قدم جو ڈگمگا دے رہروانِ کیف و مستی کے
وہی اک گھونٹ ساقی حاصلِ صد جام ہوتا ہے

نہ اتنا گا اے دل کہ آنسو ہی نکل آئیں
عروسِ صبح کے چہرے پہ رنگِ شام ہوتا ہے

غریبی بھوک کی شدت سے جب کروٹ بدلتی ہے
کوئی اس وقت بھی مست مئے گلفام ہوتا ہے

نہ گھبرا ظلمتِ آشوبِ دنیا کی فضاؤں سے
اندھیرا ہی اجالے کا لیے پیغام ہوتا ہے

نظر آتی ہیں جب کالی گھٹائیں تتھن گلشن میں
نہ جانے کیوں مرے لب پر تمہارا نام ہوتا ہے

ہنسی میں بھی نکل آتے ہیں آنسو اس کے اے شکیل
جو انساں آشنائے لذتِ ناکام ہوتا ہے

وفا بہبد

ارشد افضلی

ابھی صبح کے پانچ ہی بجے تھے اور حسب معمول انور کو دو گھنٹے اور بستر ہی پر آنکھیں بند کیے لیٹے رہنا تھا کہ اس کا دوست لطیف گھبرایا ہوا داخل ہوا اور اسے جھنجھوڑ کر بٹھا دیا۔ انور کی بلند سے بوجھل پلکیں بکھرے ہوئے خشک بال اور تمتمایا ہوا چہرہ اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ اسے بے وقت چھیڑا گیا ہے جو اسے بے حد ناگوار گذرا ہے لیکن خلاف معمول لطیف کے بکھرے ہوئے اور سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر یک لخت اس کی ساری غنودگی دور ہو گئی اور وہ لطیف کے اس غیر متوقع اور اتنا سویرے آنے پر چونک اٹھا اور اس سے کچھ پوچھنے والا ہی تھا کہ لطیف نے ضد ہی بڑی خموشی لیکن متوحش لہجے میں جس نے خوف ہمدردی اور خلوص کے جذبات نمایاں تھے کہنا شروع کیا۔

"انور آخر وہ وقت آ ہی گیا جس کے خطرات سے میں تمہیں ہمیشہ آگاہ کرتا رہا۔ تم ہمیشہ میری باتوں کا مذاق اڑاتے رہے اور مجھے ڈرپوک رجعت پسند ابن الوقت اور نہ جانے کن کن الفاظ سے نوازتے رہے حالانکہ میں تمہیں ہمیشہ محبت اور نیک نیتی سے صحیح مشورے دیتا رہا۔"

آخر کچھ بولو گے بھی یا یوں ہی لکچر دیتے رہو گے۔ لطیف آخر بات کیا ہے خدا کے لیے جلد سے پہیلیاں بوجھو۔

صاف بات یہ ہے انور کہ تم آج گرفتار کر لیے جانے والے ہو۔ تمہارے دوسرے ساتھی پولیس کی حراست میں لے لیے گئے ہیں اور تمہارے خلاف بھی وارنٹ نکل چکا ہے۔ یہ ساری باتیں رات کے بارہ بجے خفیہ طور سے معلوم ہوئیں۔ اور میں اس وقت اس سے تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔"

انور کو یہ سب کچھ سن کر بہت زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ اور اس کے جسم کے کسی حصے سے بھی گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں نہیں ہوئے۔ وہ بڑی سنجیدگی اور گہرے سکوت سے لطیف کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک مدھم سی بجلی کوندی لیکن پھر وہ فوراً ہی ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ تیزی سے اپنے دل کا جائزہ لینے لگا کہ وہ کہاں تک اس کے اصول اور نظریوں سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ اس کے ذہن کے پردے پر ان گنت سوالات ابھرنے لگے اور شعور میں متضاد خیالات کا ٹکراؤ ہونے لگا۔ اس نے اپنے ضمیر کی آواز میں اور بھی کئی آوازیں کی لے محسوس کی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بڑی نفرت سے اس پر طنز کر رہا ہو "تم جیل جاؤ گے بہت برا ہوگا۔ تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ تمہارا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ تمہارا کیریر بگڑ جائے گا اور پھر تمہارے بوڑھے والدین کا کیا ہوگا۔ جو تمہارے ہی سہارے زندہ ہیں۔ تمہارے چھوٹے بھائی بہن کے مستقبل کا کیا حشر ہوگا جنہوں نے تمہاری ذات سے ساری امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں اور جنہیں ہر قدم پر تمہاری رہبری کی ضرورت ہوگی۔ تمہاری نوجوان بیوی کیا کہے گی جس سے تم نے چند مہینے پہلے شادی کی ہے۔ اور جس کے رومانی خوابوں کی تعبیر صرف تم ہو۔ بولو یہ آخر تم نے اپنے خاندان کی تباہی کی ذمہ داری کیسے قبول کی۔ یہ کونسی دوراندیشی ہے کہ اپنے گھر میں آگ لگا کر دوسروں کے گھروں میں روشنی پہنچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اپنے خاندان کی لاش پر دوسروں کے لیے حسین اور عالی شان عمارت کی بنیاد رکھ رہے ہو۔"

میرا سر ظلم ہے اپنے ساتھ ناانصافی اور زیادتی ہے۔ اس رستے پر مت جاؤ ورنہ ناسٹ جاؤ گے اور زندگی بھر پچھتاتے رہو گے۔"

خیالات کا ایک بگولا اس کے ذہن میں چکر کاٹنے لگا اسے سخت الجھن محسوس ہونے لگی۔ عالم اضطراب میں اس نے ٹہلنا شروع کیا۔

دور کھڑکی سے دیکھنے پر ایک شخص سائیکل پر خاکی وردی میں ملبوس اس کے کمرے کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ یہ کچھ چوکنا سا ہونے لگا لیکن اس سے پہلے کہ یہ کچھ فیصلا کرے وہ آدمی اس کے دروازے تک آگیا۔ اور اسے پہچان لینے پر اس کا شک دور ہوا کہ وہ اس علاقے کا پوسٹ مین ہے اور صبح کی ڈاک تقسیم کرنے نکلا ہے۔

پوسٹ مین کو دور ہی سے دیکھ کر ہیتا اس کی پریشانی بڑھ جاتی تھی وہ مقدور بھر اس سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا اور جب اس کے کمرے کے سامنے سے وہ خط دیئے بغیر گذر جاتا تو وہ ایک اطمینان کا سانس لیتا جیسے کوئی مصیبت اس پر نازل ہوتے ہوتے ٹل گئی ہو۔ اپنے گھر والوں کے خط دیکھ کر وہ ہیتا کانپ جاتا تھا۔ پڑھنے سے پہلے وہ ڈرتے ہوئے اسے سرسری نظر سے دیکھتا جس لفافے کے اندر کوئی تباہ کن گیس نہ کہ جو لفافہ کھولتے ہی اس پر ابل پڑے گا۔ اور اس کے دل و دماغ بیکار کر دے گا۔ اصل میں اس کے گھر کے خطوں کی اکثریت ایسی ہی ہوتی تھی جن میں مالی مشکلات کا ذکر ہوتا۔ کسی کی علالت کی خبر ہوتی۔ قرض دینے والوں کا ذکر ہوتا اور پھر آخر میں اس سے مزید روپے بھیجنے کا اصرار ہوتا۔

اس وقت کی ڈاک سے اسے ایک ساتھ دو خط ملے تھے پہلا خط جو اس نے کھولا وہ اس کے باپ کا تھا بعد القاب و پیار کے لکھا تھا "بیٹا! ادھر دو ہفتے سے میں سخت بیمار ہوں۔ بخار کے ساتھ سر میں چکر اور دل میں دھڑکن کی شکایت ہے۔ دو قدم بھی پیدل نہیں چل سکتا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لینے کا مشورہ دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دودھ اور پھل کھانے کو بھی کہا ہے۔ بیٹا ہم لوگ بہت پریشان ہیں اب ہم سے ملازمت بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن سوچتا ہوں آخر گھر کے اخراجات اور علالت کے روپے کہاں سے آئیں گے۔ بیٹا! کیا اس مہینے کچھ اور روپیوں کا سامان ہو سکتا ہے؟ تمہاری اماں اور تمہاری بہن دیکھنے کو بہت بے چین ہیں۔ میری نگاہیں بھی تمہارے لیے نظر بہ راہ ہیں۔"

دوسرا خط اس کی بیوی کا تھا جو اس نے اپنے میکے سے لکھا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ذہن میں الفاظ کو تول لینا چاہا۔ لیکن ہر پہلے پر اس کی نگاہ رکتی گئی اور ذہن میں اضطراب بڑھتا گیا۔ خط کا مضمون کچھ اسی طرح کا تھا۔

"میں آج کل سخت پریشان ہوں۔ ڈاکٹر نے انجکشن اور مقوی غذائیں استعمال کرنے کی رائے دی ہے اس کا خیال ہے کہ میرے جسم میں خون کی کمی ہو گئی ہے میں اماں سے روپیہ نہیں لے سکتی۔ آپ مہربانی کر کے دو سو روپے مجھے جلد روانا کر دیں۔"

خط ختم کرنے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ الفاظ سے اپنی نگاہیں سمٹا نہ سکا۔ اور غیر شعوری طور پر وہ اسے بار بار پڑھتا رہا۔ اس کی پیشانی کی سلوٹیں گہری اور نمایاں ہوتی گئیں اور کچھ دیر کے پہلے متبسم ہونٹ سکڑتے ہوئے بالکل مدھم ہو گئے۔

اس نے دل ہی دل میں اب تک بچی ہوئی رقم کا حساب لگانا شروع کیا۔ دو۔ روپے پانچ آنے اس کی جیب میں تھے اور کیس میں غالباً پندرہ روپے ہوں گے۔ وہ اس سے فاضل کچھ اور نہ سوچ سکا یقور نے اس کے باپ کی شبیہ اس کے سامنے کھڑی کر دی۔ ۵۰ برس کا دبلا پتلا بھرپور جسم، عزم پیار، محبت، ہمدردی اور شفقت سے چمکتی ہوئی روشن آنکھیں، چہرے کی گولائی کو ڈھانپتی ہوئی سفید پر نور اور حسن داڑھی ہونٹوں پر پھیلا ہوا پر خلوص اور شفیق تبسم جس کبھی کبھی ہلکے کرب اور ذہنی بے چینیوں کا عکس جھلکتا اور کبھی پختہ عزائم اور آہنی استقلال کا پرتو چمکتا۔ وہ عالم تصور میں اس ضعیف اور ناتواں انسان کو دیکھ رہا تھا۔ جو بیک وقت اس کا باپ تھا۔ اس کی ماں کا سہاگ اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کا سہارا اس کے گھر کا نگہبان اس کے خاندان کا مورث اعلیٰ اور اس کے لیے سب کچھ تھا جس کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا اور جس کے دم سے اس کے بچپن سے جوانی تک کے ہزاروں واقعات وابستہ تھے جو اس وقت بستر علالت پر ہلکے مرض میں مبتلا تھا جو ہزاروں تمناؤں، دلوں اور امنگوں کے ساتھ زندگی کے تمام رستوں پر ہر قدم پر اس کی رکھوالی کرتا اسے خطرات سے بچاتا آگے بڑھاتا رہا تھا جو اپنی ہر نماز کے

بعد صبح پر وقار کے ساتھ بلا ناغا اس کی ترقی حیات اور اقبال کی بلندی کی دعائیں مانگتا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ انجکشن اور مقوی غذاؤں کی نایابی کی وجہ سے وہ نایاب یاد گار اور خاندان کی رونق ہمیشہ کے لیے اس سے چھین لی نہ جائے۔ پھر وہ کس منہ سے ماں کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روک سکیگا" ماں" بالعمد کو بھی منظور تھا شاید۔ جبھی تو علاج میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اور روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔

اس کے تصور میں کئی اور تصویریں گڈمڈ ہونے لگیں پہلی تصویر کا خاکا مدھم ہوتے ہوتے غایب ہونے لگا۔ اور اس کی جگہ پر نیا نقش ابھرنے لگا۔ دلکش، پر فریب اور جاذب نظر نقش حسین پر رونق اور متناسب خدوخال میں رنگ و روغن بھرنے لگے۔

فرزانا اس کی شریک حیات، اس کی امیدوں کا گہوارا اور اس کی زندگی کا سرمایا زبان حال سے شکایتی لہجے میں کہہ رہی تھی" پیارے! میں سخت بیمار ہوں!" انجکشن، دوسو روپلے یہ دو ٹکڑے اس کے ذہن میں بار بار جگہ گھٹا گئے، وہ سوچنے لگا اگر فرزانا کو واقعی کچھ ہوگیا تو وہ کیا کرے گا۔

اسے بچانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ فرزانا جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اور جو اس کی ساری امنگوں کا سرچشمہ تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی غفلت سے ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے اور پھر زندگی بھر یہ کلیجا مسوستا رہ جائے۔

فرزانا کا تصور اسے خیالات کے دھارے میں بہانے لگا۔ شادی کے وقت سے لے کر اس وقت تک سارے واقعات ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں کے سامنے امڈتے ہوئے آنے لگے

دو سال قبل کالج کے نو مین ہال میں جب اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی، سلوار، اچہیرا اور سیتر رنگ کے سوٹر میں ملبوس ڈریسنگ سوسائٹی میں اس کے مخالف کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے کالج کے بزم ادب کے مشاعرے میں جب وہ اپنی نظم پڑھ کر اسٹیج سے اتر رہا تھا تو اسے اپنی طرف پرتحسین نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے آدرش کو بھول نہیں سکتا اپنے آئندہ فیصلے پر اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے اس کی ساری ہوئے اور پھر ان گنت موقعوں پر کالج میں ہوسٹل میں پارک میں اور تفریح گاہوں میں اور پھر حال ہی میں حجلۂ عروسی میں سرخ اور سیتر چھاپے ہوئے لباس میں مسی، مہندی، اٹلن عطر صندل اور سہاگ کے عطر کی ملی جلی مدہوش کن خشبو میں ڈوبے ہوئے پراشتیاق اور پر ارمان دلوں کے ساتھ اور سب سے آخر میں افسکبار آنکھوں اور تمتمائے ہوئے چہرے سے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے جب وہ یہاں کے لیے روانا ہو رہا تھا یہ سارے مناظر شروع سے آخر تک تفصیلی طور سے اس کی نگاہوں میں رقص کرنے لگے۔ اور اس کے دل میں کمزوری کا احساس پھیلنے لگا۔ اور اس کے دل کا چور انگڑائی لینے لگا اس نے سوچنا شروع کیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور اب کون سا قدم اٹھانا چاہیے کیا واقعی وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ غداری کر رہا ہے لیکن خود ہی ایک دوسرے خیال نے اس کے ذہن میں جنم لے کر اس کے پہلے خیالات کو دبوچ لیا اور وہ ٹھنڈے دل سے تمام حالات کا تجزیہ کرنے لگا کہ اگر ایسے ہی شبہات اس کے تمام ساتھیوں کے ذہنوں میں ابھرنے لگے تو پھر اپنے مشن کی تکمیل کن لوگوں کے ہاتھوں ہو سکے گی کیا وہ اپنے خاندان یا چند شخصیتوں کی انفرادی طور سے وقتی امداد کرنے کے لیے اپنے آدرش اپنے پرخلوص اصول اور اپنے ملک کے عوام کی اکثریت سے غداری گوارا کر سکتا ہے۔ یہاں تک سوچنے کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے یکبارگی اس کی روح جاگ اٹھی ہو اور تاریکی میں بھٹکتے ہوئے روشنی تک آ لگا ہو۔ اسے اپنے سارے شبہات خدبخد دور ہوتے نظر آنے لگے اور اس کے دل میں یقین کی ایک مستحکم لہر دوڑنے لگی اس نے اپنے عقاید میں پھر سے ایک نئی توانائی محسوس کی۔

اس نے دل ہی دل میں ایک بھرپور عزم کے ساتھ فیصلا کر لیا کہ وہ اپنے باپ اور اپنے خاندان کی تباہی اور اپنی فرزانا سے غفلت کے طعنے زندگی بھر برداشت کر سکتا ہے لیکن ضمیر فروشی نہیں کر سکتا۔ اپنی روح کو زخمی نہیں کر سکتا وہ جو بھی دل میں کمزوری محسوس کر رہا تھا وہ ایک بھیانک خواب کی طرح ہٹ چکا تھا۔ اور وہ بیحد و حساب پرسکون ہو گیا۔ اور تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے ارادوں پر ثابت قدم رہے گا اس نے اپنے آئندہ کے پروگرام کا از سر نو جائزہ لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن پر چھائی ہوئی اداسی کی گھٹا چھٹ گئی۔ اور اس کے ذہن کی ساری الجھنیں دور ہو گئیں

کہے صنم بھی ہری ہری

قمرالدین قمر

(ہندستانی سماج کی گندگیاں ماضی اور حال کی روشنی میں)

کلکتا ہندستان کا بڑا شہر ہے۔

وہ ناگنوں کی طرح بل کھاتی۔ ملل کے آنچل کو لہراتی کشاں کشاں بڑھی جارہی تھی۔ رات تھی بلیک آوٹ کی تاریکی تھی لمبے لمبے رینگتے ہوئے گہرے سائے تھے۔ ٹرامیں بند ہوچکی تھیں ایک موٹر ہارن بجاتی ہوئی شائیں سے گذر گئی۔

وہ تیز تیز ڈگیں بھرتی گئی۔ ہوا کے نم آلود جھونکے دن بھر کے جھلسے ہوئے جسم کو فرحت بخش تھپکی دیتے ہوئے پرواز کر جاتے۔

اس کی غلافی آنکھوں کی چمک ماند تھی۔ رخسار مرجھائے ہوئے اور ہونٹوں پر پھیکی پھیکی سی ایک مردا مسکراہٹ رینگ رہی تھی اور مخصوص چال ـــــ ناگنوں کی طرح بل کھاتی جیسے تھک گئے تھے۔ لامتناہی سفر۔۔۔۔ منزل کی جستجو میں چلتے ہوئے بڑے بڑے آبلے پھوٹ پڑے تھے اور ہوا سیٹی بجاتی رہی گنگناتی رہی۔

اوپر آسمان کی بلندیوں پر ٹمٹماتی ہوئی روشنی بکھرتا ہوا بمبار جہاز اڑ رہا تھا۔ اس کی آواز کانوں سے ٹکراتی ہوئی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیتی لوگ آنکھیں ملتے ہوئے جاگ پڑتے اٹھ بیٹھتے اور چل پڑتے۔ پھیپھڑے اور نظریں اوپر اٹھ جاتیں۔ روشنیاں گل کر دی جاتیں۔ کھڑکیاں اور دروازے بھیڑ دیے جاتے۔

"یہ دھواں کیوں اٹھ رہا ہے۔" کوئی چیخا۔

"بیٹے چلے جاوگے ـــــ ارے میاں جی شمعیں بجھا دو۔"

"کیوں نیند خراب کرتے ہو جی۔ اس طرح کب تک زندہ رہیں گے ہم۔"

"سور ہو آنکھیں بند کر لو۔ موت ٹل جائے گی زندگی سے ٹوٹ کر نہیں رہ سکتی سمجھتے؟"

"برٹش کا جہاز ہے۔"

"جاپانی ہے میاں۔"

"نہیں جی۔ چینی۔ روسی امریکی ہوگا سالا کوئی بھی۔" گھڑ گھڑاہٹ کی آواز شور مچاتی رہی لوگ جاگتے رہے سوتے رہے جاگتے رہے چھپتے رہے زندگی خاشی ہوچکی تھی ہر طرف گہری خاشی چھائی ہوئی تھی

اس نے حقارت آمیز نظروں سے جہاز کی طرف دیکھا جو آسمان کی وسعتوں پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔

"فٹ پاتھ پر ہو جاؤ۔ اے مڈر عورت اے۔ آر۔ پی کا ایک آدمی چلایا۔ مگر وہ آواز سے بے خبر اپنے خیالوں میں مدغم بڑھتی رہی اور نگاہیں کسی کی متلاشی۔۔۔۔ گھوں۔ گھوں گھوں۔۔۔ جہاز غراتا رہا۔

شام سے اب تک اسے کوئی گاہک نہ ملا تھا۔ اس کے قدم تھکے تھکے تھے چہرے پر جھوک اور ایک بڑے مرض کی جھلکیاں اندھیرے اور اجالے کے سنگم پر عجیب ہیبت اختیار کیے ہوئے تھیں جس کے سبب چہرے کی خوب صورتی ساری رعنائی ختم ہوچکی تھی اور یہ کتنی عجیب بات تھی۔ اس نے چورنگی نیو مارکیٹ اور گرانڈ ہوٹل کے کئی پھیرے کیے لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا سارے امریکوں انگریزوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ کوئی بھی ایک نگاہ غلط انداز سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہ جھلا اٹھی اور مدتوں کے بعد بمبار کی گھڑ گھڑاہٹ مختلف شور شرابے خوفناک بھونچالی کی صدا معلوم ہو رہے تھے اور اندھیرے میں گہرے سائے مختلف زاویے بنائے رینگ رہے تھے۔

مسلسل کئی سال سے اس ماحول کی بے ہنگم فضاؤں میں اسے دلکشی جھانکتی ہوئی نظر آتی۔ جہاز کی گھڑ گھڑاہٹ جیسے جلترنگ کی دلنواز صدا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم کے کنول کھل جاتے۔

"سو سویٹ ہارٹ، ڈارلنگ، تم کتنا سندر لگتا جانی!"

"سو سوڈ ڈارلنگ۔ تمہارے جیب کی جھنکار سریلی ہے۔

سورج کے بچے۔" اگر ہی تاریکی میں دونوں کی ہنسی چھم چھم باج اٹھتی

"کم آن۔ کم آن۔ ڈارلنگ تم کدھر رہنے مانگتا۔ ہم تم کو ـــــ مانگتا۔ ہم یہ لوکٹ پسند کرے مانگتا۔" ٹامی اس سے چمٹ جاتا "او۔ یس۔ مامی ڈیر۔ الو کے چھٹے۔"

انگریزوں کے پسینے سے چوکلیٹ اور کنڈلس کی خوشبو آتی ہے ان کے موٹے جبڑوں سے نکلے ہوئے زرد زرد دانت اور ان کی سبز آنکھیں وہ رات کے صرف پانچ روپے دیتے مگر چتھندر کی طرح لال لال امر کی جوہت چالاک نہیں بہت شریر نہیں بہت عجیب سے جوڈھنگ کی گدگدیاں بھی دینا نہیں جانتے جو اچھے الفاظ میں مذاق نہیں کرتے چھوہڑا اور کمزور۔ مگر انگریزوں کی گرفت میں اسے ایسا لگتا جیسے ابھی ابھی وہ دب کر پچک کر مر جائے گی۔ اس کی سانسیں اکھڑ تیں۔ رگیں تنتیں۔ وہ جھنجلا اٹھتی اور کبھی کبھی تو تکلیف سے رو بھی دیتی مگر امر کی گدھے انگلیاں تیراتے لپلپاتے نرساتے اور جن کے پسینوں سے ڈالر کی پیاری پیاری مہکیں کتنی صبر آزما ہوتی ہوئی نتھنوں میں سرایت کر جاتیں۔ دس۔ پندرہ۔ بیس اور سو روپے۔

"ہاؤڈو ڈو ڈارلنگ۔"

"جانی سگریٹ پینے مانگتا۔ تم ہندوستانی بڑا جامر والا سکتا جیسا انگ بانگ بازار کا رش لگتا۔" وہ چٹخارے کے ساتھ ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور اس کی ہتھیلی میں نوٹوں کا پلندا دبا دیتا وہ بلوز میں کھونس لیتی۔ اور وہ رستے میں ٹرام میں پارک میں کتنے بھدے پن کتنے ہی دنیا نوسی طور پر اس کے گاہک چوسا کرتے

اس کی ساری سرخیاں آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتیں اب سیٹے زرد رو خار جس پر مکھیاں بھی برسانا گوارا نہیں کرتیں اس کی آنکھوں سے چند قطرے آنسوؤں کے ڈھلک پڑے۔ جہاز بدستور گھڑگھڑا رہا تھا۔ سیٹیاں بجتی رہیں۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی بڑھتی رہی۔

اس کے قدم دھیرے دھیرے اٹھ رہے تھے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے اسے آج پندرہ دن ہو چکے تھے جیکر کا ٹھنے مگر ایک گاہک بھی نہیں مل سکا تھا۔ پندرہ دن پندرہ برس کی طرح طویل عرصا اختیار کرتا گیا وہ ہر ممکن قرض لے کر بوڈی حیت کرنے کی جڑی بوٹیاں پھانکتی بلانا غا اسنو پاوڈر چہرے پر لیپتی ہوتی۔ لیکن۔۔۔۔۔ دفعتہً اندھیرے کے سینے پر لائیٹ کی پتلی سی لکیر چھری کی طرح چمکی اور ہندستان کے نقشے کو دو ٹکڑے کرتی ہوئی بحر کاہل میں ڈوب گئی دو راہی کہتے ہوئے گذر گئے۔

"آزادی ملنے والی ہے۔ سنا تم نے" دوسرے کی مسکراہٹ میں طنز تھا۔

"ہنھ۔ میرا نام عبداللہ ہے اور تمہارا رام نامہ پری چہرا نسیم کی باتیں کریا ـــــ"

"گھمیر تاریکی میں روشنی کا ایک ٹکڑا ابھرا اور پھیلتا گیا اس کی روشنی وسیع ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے قافلے کی پاسبانی کرنے لگی اور چالیس کروڑ انسانوں کا قافلہ رواں دواں بڑھنے لگا۔ اور جب قافلے کا پہلا قدم منزل کی طرف اٹھا تو دھماکے کی دہشت ناک آواز یکایک فضا میں تحلیل ہوئی اور قافلے میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ ایک ہنگاما تھا ـــــ ایک اویلا کہ دیکھتے دیکھتے قافلہ دو گروہ میں بٹ گیا پہلے گروہ کا نشان چرخا تھا اور دوسرے کا چاند ـــــ اور بیچ میں ایک ندی بہہ رہی تھی۔ جس کی لال لال موجیں مختلف ندیوں دریاؤں سے بہتی ہوئی بحر کاہل کی طرف بڑھی جا رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی انگریز سولجر کی آواز ٹکرائی۔

"ریشمان جانی واٹ ڈکس"

"ڈونٹ بی سلی"

"او مائی گاڈ ـــــ تم کتنا اچھا۔ کتنا پیارا ہے"

"یو۔ آر۔ فول"

آہا۔ ہا۔ ہا۔ تم ہندوستانی مائیں۔ انڈین نائی۔ وہ منی پرس سے روپے نکال کر گننے لگا۔ ریشمان نے ایک نگاہ اس کی طرف دیکھا۔ دوسری نگاہ روپے پر پڑی۔ اور وہ مسکرادی

"بولے؟"

"ڈارلنگ۔ کیا چاہئے مانگتا۔ مٹا ٹو جوس، یا یرانڈی"۔

انگریز آنکھ مارتے وہ بھی مارتی۔ میز پر بوتلیں بجتی گلاس لچکتے ٹکراتے اور صبح کی لمبی پیٹھنے سے پہلے وہ بہت سے چوکلیٹ کے ڈبے، سگریٹ، لوکٹ اور روپوں کو پٹور کر لے آتی۔

—— یہ آغاز تھا۔

اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

اور رامی کی بھول بھلیوں میں وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس گھپ اندھیارے میں جہاں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو مگنو کی چمک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر مزید روشنی کی خواہش بے معنی تھی

پس وہ اتنا جانتی تھی دنیا نام ہے اس کوکھ کا جس میں مختلف قسم کی اولاد جنم لیتی بڑھتی اور پھیلتی ہے ان ہی اولادوں میں کسی کے پاس رہنے کو بہتر مکان تو پہننے کو نفیس کپڑے اور کھانے کو روغنی غذائیں ملتی ہیں۔ اور کسی کے پاس کھدر تک بھی میسر نہیں کیونکہ ان کی پیشانی پر جلی حرفوں میں "غریبی" تحریر ہوتی ہے اور جس کے معنی ان کی جگہ اس سوسائٹی میں کہیں نہیں اس غریبی کے ڈبے میں پرورش پانے والی عورتیں جن کے رخساروں کے سیب سرخ ہوتے اور ہونٹوں پر تبسم کے کنول کھلتے مگر کیا وہ یہ نہیں چاہیں گی کہ ان کا اپنا ایک گھر ہو۔ اپنی خوشی ہو۔ اپنی الگ تھلگ چھوٹی سی ہنستی کھیلتی دنیا ہو۔ لیکن نہیں یہ محض خیالوں کے خوب صورت مناظر تھے جو خیالوں کی وادیوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔

وہ پاس ہی ایک کھمبے کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر رخسار پر بہہ گئے۔

رات ڈھل رہی تھی۔ گھڑ گھڑاہٹ کی آواز اور سپاہی کے بوٹوں کی کھٹ پٹ کھڑ پٹ کی بے ہنگم ہوا فضا کو جھنجھوڑتی خلا میں تحلیل ہو جاتی۔

اس نے دانستہ ٹھوکر نہیں کھائی تھی بلکہ سماج کے بے رحم ہاتھوں نے ایک ایسے گڑھے میں ڈھکیل دیا تھا جہاں سے فرار مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا اور جہاں اس جیسی ہزاروں عورتیں اور بھی تھیں۔

اس کے سامنے سے بوڑھے باپ کی ضعیف آواز ٹکرائی۔

"ریشماں" میں تجھ تیرے ساتھ ظلم کیا میری بچی مجھے معاف کر دے۔ اور اس کے سوا کوئی چارا بھی تو نہ تھا میری بچی۔ کیونکہ میرے ناتواں کاندھے اب تیرا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ اور تیرے چھوٹے چھوٹے بھائیوں کی بھوکی نگاہوں کی التجا دیکھنے کی تجھ میں تاب نہیں میری بچی"۔

آواز اس کے حلق میں گھٹنے لگی۔ اس کی نگاہیں آسمان کی وسعت پر ٹکی کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں لیکن بوڑھے خدا نے اس کی ہوائی پر بالکل رحم نہ کھایا۔ پھر۔۔۔۔ پھر وہ کچھ سمجھ نہ سکی اسے اتنا ہی علم تھا وہ لوگوں کی ہوس کا شکار ہونے کے لیے لائی گئی ہے اور ہو رہی ہے۔

ہر روز نئے نئے گاہک آتے ہر روز وہ جھجکتی اور مجبوراً اپنا جسم ان کے سپرد کر دیتی ہر روز کوئی نہ کوئی اسے تسلیاں دیتا پیار پیار کی باتیں کرتا۔ اور یہی کہتا "میں تمہیں بہت جلد اپنے گھر لے جاؤں گا" "ریشماں" ہم دونوں شادی کر لیں گے" ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہوگا میں مزدوری کروں گا اور تم اپنے ہاتھوں سے روٹی پکایا کرو گی۔ کتنی اچھی زندگی ہماری ہو گی ریشماں۔ پھر میرا بچا ہوگا وہ روپا کہے گا۔ تم دودھ پلایا کرو گی وہ مجھے ابو اور تمہیں اماں کہے گا۔ وہ کبھی سے بیوی اور عورت سے ماں بن جاتی۔ خیالی بچے کو بہروں چمٹائے اس کے منہ میں اپنا پستان ٹھونستا کرتی۔ کپڑے دھوتی برتن مانجتی اور پھر۔۔۔۔ پھر وہ بری طرح چونک پڑتی زور زور سے ہنسنے لگتی۔ قہقہے بلند کرتی۔ اس کی کیفیت جنون کی سرحد چھا جاتی۔

اندھیرے میں اس کا متحرک سایا اس کے ساتھ تھا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے —— چہرے کی رنگت سیاہی مائل ہوتی گئی۔ پیپ خون اور رطین کی تکلیف نے چہرے پر کئی چہریاں چھوڑ دی تھیں۔ اس کا حسن اس کی جوانی۔ جوانی کی دلفریب ادائیں اس کے منہ سے ایک دبی دبی سی چیخ ابھری اور گھٹ کر رہ گئی۔

اور لاکھوں فٹ کی بلندیوں پر ہوا ہڑاہڑا رہا تھا گھڑ گھڑ —— سپاہی کے مضبوط بوٹوں کی آواز لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ اٹن شن کے انداز میں زمین کے سینے پر پڑ

رہی تھی ایک۔ دو۔ لفٹ دا رائٹ۔۔۔۔ لفٹ رائٹ۔ گھوں گھوں۔ گھوں گھرگھوں۔ جہاز قلابازی کھاتا ہوا گذر گیا۔ کھمبے والی بتی دھیمی لو سے جل رہی تھی۔ اس کا آنچل نم ہو گیا اس کی آنکھیں مجسم سوال بنی پوچھ رہی تھیں کیا ہندستان میں پینچ این جین کا علاج نہیں۔ یہ ہندستانی اپنی ماؤں سے ہم بستر کیوں ہوتے ہیں۔ کیا ہندستان میں ماں اور بیٹوں میں کوئی تفریق نہیں۔

وہ زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسی کی آواز فضا کو جھنجھوڑتی ہوئی دور تک پھیل گئی۔ جہاز کے گھڑگھڑانے کی صدا ماند پڑتی گئی۔ سپاہی سکے بوٹوں کی چاپ بیگانی بیگانی سی ہو گئی۔ فضا چونک گئی۔ سپاہی آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

"کون تو"

کوئی آواز نہیں۔

"اتنی رات گئے چل تھانے سالی چالان کروا دوں گا۔ حرامی لونڈوں کو خراب کرتی ہے۔" سپاہی موچھوں کو اینٹھنے لگا رال تھتھپانے لگا۔

ریشاں بولی۔ "سپاہی جی"

سپاہی گرجا "کیا ہے؟" اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں سپاہی کے چہرے پر چرگسیں جس سے نفرت کی جھلکیاں جھلملا رہی تھیں۔ اور سپاہی کی آنکھوں میں شہوانیت کے انگارے تاپ رہے تھے۔ سپاہی نے ریشاں کی مٹھی داب لی۔ ہی۔ ہی ہی۔ سپاہی ہنسا۔ میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا۔ دال میں کچھ کالا ہے ہی ہی کا۔۔۔۔ چل سالی۔"

دو سوکھ سائے بڑنے لگے۔

اور نیرے روز منگل سنگھ اپنی ڈیوٹی پر نہیں آیا دوسرا سپاہی کہہ رہا تھا۔

"سالی کس کس کو پیسے خون اور جلن دیتی پھرے گی۔ منگل سنگھ کے بھی چھوت کی بیماری ہو گئی ہے یار۔ نہ معلوم ہم ہندستانی کب باز آئیں گے۔ ان بدتمیزیوں سے ورنہ ہماری آنے والی نسلیں اسی طرح تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گی۔

موجودہ زمانے کی فوج

موجودہ فوج کو جیسے پچھلی بڑی لڑائی میں ایک مضبوط فوج بنایا گیا محض لڑائی کا کمال ہی نہیں سکھایا جاتا بلکہ اسے صحت اور صفائی کے اصول بھی بتائے جاتے ہیں کوئی بھی نیا افسر اپنے کمانڈنگ افسر سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی فوج کے بارو کے لیے حفاظتی سرگرمیوں کے اصول کو نہیں مانتا لیکن ایسے بہت سے افسر ہیں جنہیں کونین پر وشواس نہیں اور جو گرم ملکوں میں ہوتے ہیں تو کونین سے خاص طور پر پرہیز کرتے ہیں۔ افسر ہی نہیں بلکہ دوسرے رینک بھی کونین کے استعمال پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ایک چھوٹا سا مچھر اتنے بڑے سپاہی کا کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن اصل میں وہ غلطی پر ہوتے ہیں۔ انہیں علم نہیں ہوتا کہ مچھر ملیریا جیسی خوفناک ہماری کی جڑ ہے اور ایک دفعہ اگر کسی کو ملیریا بخار آ جائے تو نہ جانے اس پر کیا مصیبت آ بنتی ہے چنانچہ سائیں لیگ آف نیشنز کی ملیریا کمیٹی نے ملیریا کی بیماری کی اچھی طرح پڑتال کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں اپنی رپورٹ شائع کی جس میں بتایا کہ ملیریا کے موسم میں روزانہ ۱۵ گرین کونین کھانے سے ملیریا پاس تک نہیں پھٹکتا۔ اور اگر کسی کو ملیریا بخار آتا ہو تو پانچ سات روز تک ۱۵ سے لے کر ۳۰ گرین کونین کا روزانہ استعمال کرنے سے یہ بخار دور ہو جاتا ہے اس رپورٹ کے صفحہ ۱۵ اور ۱۲ پر اس بیماری کے علاج کی تفصیل درج ہے اور آج بھی اس علاج کی سفارش کی جاتی ہے۔

Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN.)
14 JAN 1953

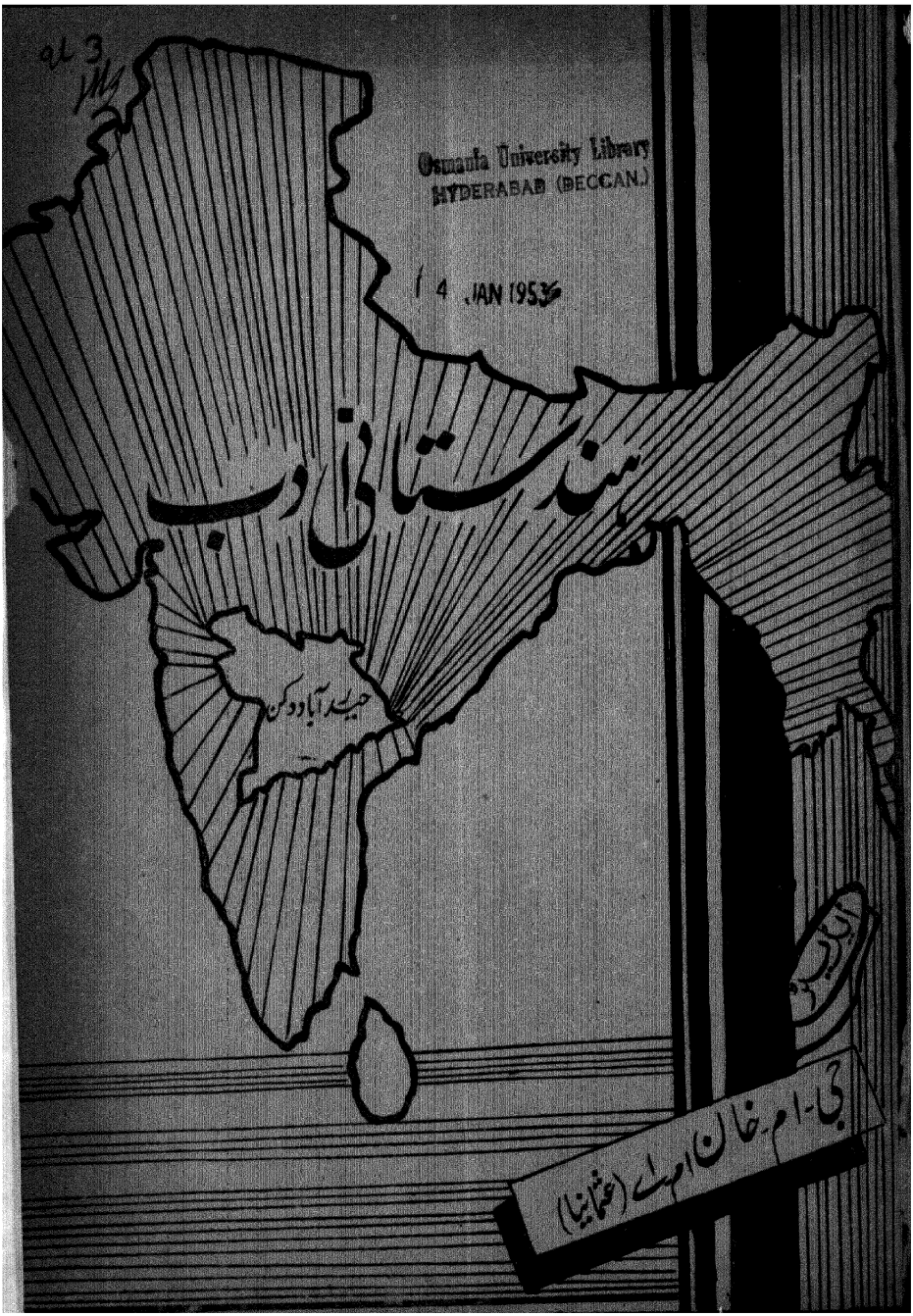

ہندستانی ادب

بی۔ ام۔ خان ایم اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

رجسٹرڈ نمبر (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹ اے اعظم پورا شرقی۔ پی۔ او۔ چوبلی۔ حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ ام، خان۔ ام اے (عثمانیا)

چندہ سالانا چھ روپے — جلد (۱۳) — نمبر (۴۳) — قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

بہمن۔ اسفندار ۱۳۶۲ف — دسمبر ۱۹۵۲ء جنوری ۱۹۵۳ء

"دوستوں کے خیالات"	افقر موہانی	۲	غزل
حقایق و معارف	افقر موہانی	۳	ہم فضا میں ایک دو چاند نہیں
دیگن آباد	ادیب سہیل	۴	غزل
غزل	انجم اعظمی	۵	سیاہ وحشوں سے پرے
تذبذب	مرزا اشتاق علی بیگ	۶	غزل
کیڑا	نقش (کراچی)	۷	سلاخوں کے پیچھے سے
دو بچے	نقش (کراچی)	۷	اقبال — ایک مطالعہ
تسلی	افتخار احمد	۸	غزل
حجاج بن یوسف	ڈاکٹر پیر سیادت علی خان	۹	طوفان
روشنی۔ تاریکی	جاوید (نہال)	۱۳	غزل
شیدا (میٹھوی)	غزل	۱۶	
قادر حمدی	ہم نشیں سن مرے	۱۸	
وشوناتھ دتہ	غزل	۲۱	
ایاز قصبی		۲۲	
طبیب شاہ وانی		۲۳	
شمیم مظفرپوری		۲۴	
عبدالحسیب ام۔ اے		۲۶	
واصف (بنارسی)		۲۷	
قمرالدین قمر		۲۸	
آنم فردوسی		۳۲	

جلد ۱۔ شمارہ ۱ سنہ ۱۳۶۲ھ — ہندستانی ادب — دسمبر ۱۹۵۲ء / جنوری ۱۹۵۳ء

دوسروں کے خیالات

یہ سال ہیں یہ ہوتا ہے کہ "میرے خیالات" کا ایک مستقل عنوان یہ ہوتا۔ اس برس کا اداریہ لکھا جا چکا تھا کہ ایسے میں مولانا افغر سوہانی کا خط ملا جس میں ایسی بھی سوجھ تھی۔ رسالے میں اور تو کہیں گنجایش نہ تھی سوا ہے اداریے کے ٹھکانے کے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اپیل پر جو باتیں لکھی ہیں جو ایک دو اداریے میں لکھی جانی چاہئیں تھیں۔ اس لحاظ سے بھی اپیل کا بھی مقام ہی معنی ہو سکتا تھا اس سارے کے جاری ہونے سے لیکر آج تک مولانا کا "ہندستانی ادب" سے جو تعلق خاطر رہا ہے اس کی یہ اپیل آئینہ دار ہے چونکہ یہ باتیں مولانا کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہیں اور بقول قائل ؎ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے ہم نے سوچا کہ عمل ہے۔ اثر کر جائے۔ اس لیے مولانا کے دل سے نکلی ہوئی باتیں ہم لیڈروں کی توں دیدیں اگرچہ ان میں بعض باتیں ہمارے خلاف بھی پڑتی ہیں لیکن تیرا سال سے ایسی باتیں سنتے سنتے ہم عادی ہو گئے ہیں ہم ان اختلافی مسایل کا ضرور جواب دیتے لیکن اس وقت پر جواب کی گنجایش ہی نہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

سنتے ہیں یورپ و امریکا کے ایسے تعلیم یافتا ممالک میں جہاں ۱۹ ویں صدی تک پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں وہاں فی ہزار آبادی پر ایک جریدہ شایع ہونے کا اوسط موصوف سے چلا آتا ہے اس لحاظ سے ہمارے ملک کا اوسط تو ہزار گنا زاید ہونا ہے جہاں تعلیم ابھی ۵ فی صدی سے آگے نہیں ہے مگر اے بسا کہ ملک کے طول و عرض میں جو چند خدمات ادب کے علم بردار ٹھوس اور کارآمد جاید ہیں بھی تو وہ "شب دیگر نمی ماند" کے عالم میں سفک ہے ہیں اور کوئی پرسان ان کا نہیں ہے۔ ان کو حکومت کی زبانی تسلیاں ہی حاصل ہیں نہ ملک کی طرف سے تقویت پہنچائی جاتی ہے زمانے کے انقلابوں نے مذاق کو بھی بدل دیا ہے۔ اردو زبان کا اگر دیس نکالا کیا بھی گیا تھا تو غریب ہندستانی ہی شاید اس کی خطا تھی آہ اس کو بھی تو بولتے اور اپناتے ہیں۔ اسی ملکی اور قومی زبان کا ترجمان و علم بردار ماہنامہ "ہندستانی ادب" بھی ہے جس نے اپنی ٹھوس اور پایدار خدمات کے پورے بارہ سال کی طویل مدت ختم کر لی ہے اور تیرویں اشاعتی سال میں قدم رکھا ہے مگر اس قدر ضخیم و کیفیہ ہو کر اس کی زندگی پر موت کے دھوکا کا تو لیے ایسا کیا ہے اور کیا کسی ماہنامہ میں بھی یہ سوال اٹھ سکتا ہے اور وہ بھی جو ہمارے ہیں جیسی ہیئت نہ ہندستانی ایسی ملکی و قومی زبان کو بھی ٹھکرا کر اس کے بجائے دیو ناگری ہندستانی کو زبردستی ٹھونسنا چاہتا ہے اس سے فریاد کرنا بھی اپنا سر پھوڑنا ہے مگر کیا کیا جائے جب "غنچہ ناشگفتہ سوزد" کا عالم ہو۔ یہ "ہندستانی ادب" کی اپیل نہ اثر کیا میں ہو سکتی ہے نہ انگلینڈ میں ہاں تو ہندستان ہی میں قایم ہونے والے ہندستانی ہی حوام اس کے لوٹنے والے ہیں پھر کیا تعجب ہے اگر ہم سایا ہونے کے باوجود اس کو نہ پہچانتے ہوں کیونکہ اردو زبان اور اردو کا دلدادا ہونا ہوا ہے پھر آخر شوب ہندستانی ہندستانی ادب کی مانوس رہے اس کی زبان بھی ہے جگر ہندی ہو جاتی ہے یہ بات ہم بھی مانتے ہیں۔ اس کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم ہندستانی ادب کی اپیل کو ہر ہندستانی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کی ضرورت اور اہمیت

حقایق و معارف

افقر
موہانی وارثی

محبت میں خرد کی رہبری دیکھی نہیں جاتی
یہ کوتاہی نگاہ شوق کی دیکھی نہیں جاتی
بس اب جھوٹی نشاط زندگی دیکھی نہیں جاتی
ہر اک تصویر کی جلوا گری دیکھی نہیں جاتی
گرے آخر کرے بیہوش ہو کر پائے ساقی پر
بہا اچھی طرح گلشن میں آئی بھی نہیں لیکن
الٰہی کون سی منزل پہ دنیا رک گئی آ کر
مری ہستی کا پردا بھی مری نظروں سے اٹھ جائے
دل مضطر مرا پروردہ آغوش طوفاں ہے
اسے پیتے ہیں آنکھیں بند کر کے بادا کش زاہد
یہ تم اپنے زدل انسانہ موت اپنی نہ ہم اپنے
نشیمن برق نے پھونکا مزاج بے گلستاں میں
نظر نے جب سے دیکھا ہے سماں گور غریباں کا
نگاہ شوق کیا دیکھے گی جلوا حسن کامل کا
نگاہ یاس لیکن نے یہ کیسا کر دیا جادو
بہا تھا جس جگہ خون وفا تیرے شہیدوں کا

یہ توہین مذاق عاشقی دیکھی نہیں جاتی
وہ جلوا گر ہیں اور جلوا گری دیکھی نہیں جاتی
یہ تعمیر حیات عارضی دیکھی نہیں جاتی
وہ صورت دیکھ کر پھر دوسری دیکھی نہیں جاتی
ازل کے سیکنوں کی بیخودی دیکھی نہیں جاتی
اسیروں سے نظر صیاد کی دیکھی نہیں جاتی
کہ اب وہ شاہراہ زندگی دیکھی نہیں جاتی
کہ وقت دید جاناں بے خودی دیکھی نہیں جاتی
یہ کشتی موج ساحل پر کبھی دیکھی نہیں جاتی
نگاہوں سے یہ شیشے کی پری دیکھی نہیں جاتی
زمانے سے ہماری بیکسی دیکھی نہیں جاتی
چمن بھر میں کہیں بھی تازگی دیکھی نہیں جاتی
جہان رنگ و بو کی دل کشی دیکھی نہیں جاتی
کہ جب دنیا تجلی طور کی دیکھی نہیں جاتی
کہ خنجر قاتل کی اب افسردگی دیکھی نہیں جاتی
زمیں اتنی فلک سے آج بھی دیکھی نہیں جاتی

نظر جتنی تھی صرف دید جاناں ہو گئی افقر
کوئی شئے اب جہان حسن کی دیکھی نہیں جاتی

ویگن آباد

ادیب سہیل

(۱)

حضرت فلاں سے کہتے ہیں ویگن آباد
"دوڑتی پھرتی حویلی" کا نمونا ہے یہ
"چلتی پھرتی ہوئی کالونی" بسانے کے لیے
جوٹ کے ریشمیں اجسام کے بدلے میں اسے
وال اسٹریٹ نے بھیجا ہے بطور تحفہ
کیا کہا آپ نے ارشاد — غلط کہتا ہوں
"دوڑتی پھرتی حویلی تو نہیں — ویگن ہے"
آپ سے جو بھی کہیں میری نظر میں ہے مگر
ریگنا پھرتا سرکتا ہوا "دولت خانا"

آپ کو آیا پسند میرا یہ دولت خانا"
سالہا سال کے خوابوں کی سنہری تعبیر
جہد و ایثار مسلسل کا حسیں ترحاصل
راہ گم کردہ مسافر کی طرح لائینوں کے
آہنی جال کے ماحول میں استادہ ہے
یہ بیک وقت ڈنر ہال بھی خلوت بھی ہے
اور طرب گاہ بھی ہے خانہ راحت بھی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ اس در میں راحت بھی ہے
رخ سے گر لو پھیے تو "در" میں راحت کے سوا
اک نئے دور کے آغاز کی سرحد بھی ہے

موسم گرما میں سورج کے طلوع ہوتے ہی
دھوپ کا جلتا ہوا جال سا تن جاتا ہے
ناچنے تیرنے لگتی ہیں شعاعیں ہر سمت
اپنے آغوش میں نالش کی پھواریں دبکائے
سامنے ٹوٹا ہوا ڈبا جو استادہ ہے
۸۶ء جلی خط میں لکھا ہے جس پر
جس کے آغوش میں پھیلے ہیں منوں مٹی کے ڈھیر
آپ سے آپ آگ آئی ہوئی ہریالی ہے
لپلپاتی لمبی ہری گھاس کہ رہے پودے ہیں
اور ہرے پودے کی نازک سی حسیں پھنگی پر
سرپھرا تتلیاں ہیں مچلتے ہیں کئی لئے پھول
کئی سو نغمہ بند لیلی سی، نوبیلی کلیاں

جوں ہی دن چڑھ تلہے پڑ جاتا ہے حدت کا جھکاؤ
چلچلاتی ہوئی کرنوں کی لپکتی باہیں
سامنے ڈبے کے منظر سے چمٹ جاتی ہیں
عارض گل کی نمی کھچی کلی کا جوبن
ہری ٹہنی میں لچکتی ہوئی نغمی کونپل
پیکر سبز کی لچکیلی، حسیں رعنائی
آتشیں لہروں کی آغوش میں کھو جاتی ہے
ان ہی لمحات میں خوابوں کی حسیں تعبیریں
یعنی ویگن یہ نئے طرز کے دولت خانے
یک بیک آتشیں آغوش میں ڈھل جاتے ہیں
آہنی چھت در و دیوار سلگ اٹھتے ہیں
حدتیں ناچتی، لہراتی ہیں بل کھاتی ہیں
اڑنے لگتی ہیں ہر اک سمت گھنیری آنکھیں
فکر کا بھی — تصور کی سنہری تتلی
عندلیبان محبت کی سہانی تخئیل
ذہن کو دور ہی سے تکتی ہے اڑ جاتی ہے
اپنے سینے میں جگائے ہوئے یہ خوف و ہراس
جل نہ جائے کہیں خستہ تنگ پروں کی پرواز

اپنا یہ حال کہ ماں باپ بہن بچوں سمیت
دھوپ کے تیروں کی بوچھار سے بچنے کے لیے
ڈر سے صیاد کے بھاگے ہوئے پنچھی کی طرح
پہیوں کی جھاڑی میں ہر روز دبک جاتے ہیں
صرف ہم ہی نہیں ہر روز ہزاروں انساں
چاروں پہیوں کے نشیمن میں سمٹ آتے ہیں
ان کے ماحول سے ہر روز یہ اٹھتی ہے صدا
"زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"

(۲)

اور برسات میں طوفان کے مسلسل یلغار
بادو باراں کے گرجتے ہوئے پاگل جھونکے
میرے "دولت کدہ" کی پھونس کی چھت کو اکثر
دست وحشی سے فلاخن کی کھلا دیتے ہیں
آہنی چھت کے نہ ہونے کی وجہ سے جس کو
آہنی ڈبے کی دیواروں پہ منڈھ رکھا تھا
زور طوفان کا اولوں کی تڑا تڑ بارش
کیسے برتنوں سے لیمپ سے ٹکراتی ہے
تلملاتی ہوئی یہ لیمپ بجھ جاتی ہے
طاقچیں کھولے ہوئے یاں اسٹنڈ آتی ہیں
یوں ٹناٹن کی صدا گونج کے لہراتی ہے
سامنے جنگلے کی پر نور فضا میں جیسے
کوئی نوشت پیانو کے حسیں پردے پر
موج میں آ کے یونہی انگلیاں کھیلتا ہو

اور اونوں کے گھنے حملوں سے بچنے کے لیے
پھیلتی بڑھتی سسکتی ہوئی تاریکی میں
دق زدہ بیوی بہن ــــ بچوں سمیت
تخت یا کھاٹ کے سائے میں سرک جاتے ہیں
زور طوفان کا بجلی کی کڑک تھمتے ہی
میرے ہی جیسے کئی اور پڑوسی میرے
بال بچوں کو لیے خانہ بدوشوں کی طرح
ناچتے گاتے ہوئے جنگلوں کی برساتی میں
شب گذاری کے لیے بھاگ کے آجاتے ہیں
دیکھ کر زیست کا یہ بھیانک بے رنگ تضاد
قہقہے گونج، لہو رنگ کھنکھنے ہو جام
کیف میں نشہ کے ڈوبے ہوئے نورین روپام
یک بیک ذہن کی کھوئی ہوئی پہنائی میں
سوئچ کا جلتا ہوا موڑا بھر آتا ہے
اک طرف جنگلوں میں ہے روئیدنیوں کی فراط
گھر کے ہر فرد کے سونے کو الگ کمرا ہے
بجلی پنکھا ہے سہری ہے نئے صوفے ہیں
اور صوفے پہ چڑھائے ہوئے زرین غلاف
رقص ہے رنگ ہے تزئین ہے آرایش ہے
عیش ہے عیش کے اسباب میں خشحالی ہے
اک طرف تیرگی کے جال میں پتر مردا سے
دیگن آباد کے پہیوں کی حسیں حلوت ہے
آہنی فرش کی شبرنگ سی قالینیں ہیں
اس کی آبادی کے آسودا طبیعت افراد
شوق سے ڈالے ہوئے جسم پہ عریانی کو
غم و آلام کی خش رنگ حسیں جھاڑی میں
در یا بھوک کے رومان بنا کرتے ہیں

(۳)

اور دسمبر کی گھنی چبھتی ہوئی سردی میں
میرا دولت کدہ ہر رات برائے تزئین
اوڑھ لیتا ہے بصد شوق ردائے برقاب
جسم پر اپنے بجا لیتا ہے صدہا آلات
برف کی گود کے پروردہ ہوا کے جھونکے
اور جھونکوں کی اچھالی ہوئی لوک شمشیر
برف پروش ہواؤں کی یہ سیل پرور
جھول سے گر کسی انسان کے بدن سے چھو جائے
تار احساس اذیت سے تڑپ اٹھتا ہے
تھمنے لگتی ہے رگ و پے میں لہو کی گردش
جلد میں رینگنے لگتی ہیں نکیلی لہریں
کبھی ان لہروں کے برفیلے نکیلے اثرات
فوری تدبیر عمل کرنے سے مر جاتے ہیں
اور کبھی برف زدہ لہروں کی تیزی تندی
جسم کو موت کے تاریک عمیق خانے میں
لوری دے کر ابدی نیند سلا دیتی ہے
آج دو سال سے ہر روز "نئی بستی میں"
کوئی بیوی کو کوئی شوہر تو کسی کا بچا
جھول انسان کے الفت کی لجیلی کلیاں
آرزوؤں کی ہمکتی ہوئی نازک کونپل
برف کی پھیلی ہوئی جھیل میں کھو جاتی ہے

اب یہ آلام ہیں برداشت سے باہر اپنی
اب ان آلام کے کانٹوں کو ہے گل کی حاجت
اب ان آلام کو راحت میں بدل دینا ہے
اب ان آلام کے مرجھائے ہوئے عارض پہ
غازۂ تازۂ شفق عام ہی مل دینا ہے

دیکھیے دیکھیے جنگلوں سے وہ نئے ابلے
شب کی تاریکی میں تحلیل ہوئے بادو رنگ
رقص کرتی ہوئی چھاگل کی صدا میں ٹڈیں
مرد کے جسم سے چپکی ہوئی عورت ناچی
دیکھیے ابھرا فضاؤں میں گراہوں کا ہجوم
دیکھیے ڈیلے سے مدقوق کے کھانسی لپکی
دیکھیے سامنے دیگن میں الاؤ جلکے
جسم کو سرد ہواؤں سے بچانے کے لیے
سرخ شعلوں نے تئے دنگ سے انگڑائی لی
کون جانے کہ یہی شعلے لپکتے۔ بڑھتے
جھلملاتے ہوئے جنگلے کی فضا بھر جائیں
کون جانے کہ یہ چنگاری کی لے پاک اڑان
رقص کرتی ہوئی چھاگل کی صدا کو چھو لے

غزل

پچھلے پہر جو جلوہ فگن دامن چل گیا
ہر بزم میں شراب کا اک دور چل گیا
کتنا غرور علم و ہنر پر تھا وہ عشق
غلطت کا آفتاب بھی پستی میں ڈھل گیا
کھلنے نہ پائے ہونٹ کہ شعلے صراط کے
کیا بات تھی کہ دامن یزداں بھی جل گیا
مجکو تو چھیڑ چھاڑ کی عادت نہ تھی مگر
کیا مل گیا تجھے کہ میرا جی بہل گیا
دامن کی تتلیوں ہی کا رونا نہ رویئے
اپنوں کا اعتبار بھی اپنوں پہ کھل گیا
اک حشر لاجواب کی تصویر کیا کریں
آہن بھی کانفری سے کسی کی پگھل گیا
ہنگام انقلاب کی مدہوشیاں نہ پوچھ
سرمستی ازل کا مقدر بدل گیا
کس کس کی وفائیں تھوکریں کھا کے بعد آج
ایسا ہوا کہ سارا زمانا سنبھل گیا

انجم عظیمی

تذبذب

میں کیسے مان لوں آخر کہ دیش ہے آزاد

وہی بساط سیاست پہ کھیل ہیں اب بھی
عوام دکھ میں کسی کے ملفیل ہیں اب بھی
زبان کٹتی ہے حق بات اب بھی کہنے پر
وطن میں عہد فرنگی کے جیل ہیں اب بھی

میں کیسے مان لوں آخر کہ دیش ہے آزاد

صغیر بچے ادھر دودھ کو بلکتے ہیں
سرور و کیف میں ساغر ادھر کھنکتے ہیں
ادھر جوانیاں بکتی ہیں اشک گرتے ہیں
سیاہ رات میں تارے ادھر نکلتے ہیں

میں کیسے مان لوں آخر کہ دیش ہے آزاد

وہی بساط بچھی ہے وہی حکومت ہے
ہیں مہرے بدلے ہوئے پر وہی سیاست ہے
خموش ظلم کو سہنا تو ہے وفاداری
زباں پہ شکوہ اگر آجائے تو بغاوت ہے

میں کیسے مان لوں آخر کہ دیش ہے آزاد

یہاں عوام کے جذبات پل نہیں سکتے
زباں پہ زیست کے نوحے مچل نہیں سکتے
یہ آج اس طرح پابندیوں میں جکڑا ہے
کہ اپنے گھر کی سیادت بدل نہیں سکتے

میں کیسے مان لوں آخر کہ دیش ہے آزاد

ابھی تو جوش میں آئے نہیں غریب عوام
ابھی تو صبر کے چھلکے نہیں ہیں کوئی جام
ابھی تو پھرتے ہیں زردار ہر طرف آزاد
ابھی تو بدلا نہیں ہے فریب کا نظام

میں کیسے مان لوں آخر کہ دیش ہے آزاد

مرزا مشتاق علی بیگ

کیڑا

نوٹ:- یہ شہادات فطرت کے تحت میں ایسی تمثیل اور چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھ رہا ہوں جس سے کوئی بچے کا کیا تعلق کا غور سے مطالعہ کرنے اور آگے چل کر وہ مخلوق خدا کی رہنمائی کر سکیں۔ نیز خود مستفید ہو سکیں۔ یہ اوسی سلسلے کی ایک کڑی ہے

محمد یامین نقش

ذرا پیر اپنا بچا ہی کے رکھنا
کہیں دب نہ جائے یہ تنہا سا کیڑا!

محمد

کچلنے لگی تھی جسے تیری غفلت
کیا ہے خدا ہی نے اس کو بھی خلقت

خدا جس نے دونوں جہاں کو سنوارا
تجھے زندگانی کا خلقت یہ بخشا

اسی کی عنایت کا ہے یہ کرشما
کہ ہے زندگانی کا یہ راگ گاتا

یہ سورج، یہ چاند اور بنتے ستارے
یہ سب اپنی خلقت کی خاطر بنائے

زمیں پر جو سبزے کی چادر بچھی ہے
درختوں کی پھولوں سے جھولی بھری ہے

زمین اور فلک کو جو ہے یوں سنوارا
اسے اس میں کیڑے کا بھی تو ہے حصا

تو لینے دے لطف اس کو بھی زندگی کا
کہ مخلوق یہ بھی ہے آخر اسی کا

اگر دے نہیں سکتا تو زندگانی
تو پھر یوں مٹانے میں ہے کیوں یہ جلدی

دو بچے

رہتے تھے میرے نظر میں دو بچے
ان کی حالت جو ہے وہ کیا کہیے

نام دونوں کا ہے عزیزیاں
ایک بد ہے تو ایک اچھے میاں

آنکھ اہنی ہوئی اہنسی پیاری
صاف ستھرا لباس بات بھی اچھی

دل یہ ہر ایک کا لبھاتا ہے
اور اوروں کو بھی ہنساتا ہے

بات موہ دھو کے جب وہ آتا ہے
جھک کے سیکو سلام کرتا ہے

پھول کھلتا ہے یا وہ ہنستا ہے
پانی ہنستا ہے یا وہ چلتا ہے

شکریہ بات بات پر کہنا
مہربانی کا لب پہ ورد سدا

وہ نہ وقت پر کام اس کا ہوتا ہے
وقت پر کام اس کا ہوتا ہے

رات دن وہ دعائیں لیتا ہے
کیا کہوں کیسا اچھا بیٹا ہے

دوسرے ہیں جواب عزیزیاں
کیے دیتا ہوں ان کا حال بیاں

یہ لڑکا بہت برا افسوس
پھرتا ہے بس خفا خفا افسوس

بات کرتا ہے یا کہ کاٹتا ہے
جس کو بھی دیکھتا ہے ڈانٹتا ہے

موہ نہیں دھوتا کپڑے ہیں گندے
اس کو دیکھا نہیں کبھی ہنستے

یامین

جس طرف سے بھی یہ گذرتا ہے
اک قیامت ہی برپا کرتا ہے

لوگ سارے اس کے بھاگتے ہیں
لعنتیں ہی بس اس پہ ڈالتے ہیں

کیا کسی سے بھلا دعائیں لے
جب بڑوں کو سلام تک نہ کرے

میرے ارجن کو ورغلاتا ہے
کام اس کو برے سکھاتا ہے

ڈر ہی ہم کو تو اس سے آتا ہے
جس کو دیکھو اسے ستاتا ہے

پیارے ارجن ذرا بتا دو تو
دوستی اس سے کیوں ہے لو تو

ہم نہیں جانتے جسے اچھا
آپ اور اس سے دوستی یہ کیا

ہم اگر آپ کی جگہ ہوتے
دوستی کا نہ اس کی دم بھرتے

ایسے ساتھی کو کیا کرے کوئی
جو کہ تکلیف دے بجائے خوشی

آپ کی اماں جان کہتی ہے
گھر کو دوزخ ہی کا نمونا بنائے

نقش

آپ کی زندگی خراب کرے
دوسروں کے لیے عذاب کرے

آپ ہی کے وہ دل میں رہتا ہے
بن بلایا یہ مہمان کیسا ہے

دل سے اس کو نکال دیں فوراً
خالی اس سے مکاں کریں فوراً

اس سے کہدیں کہ ہو گئے رخصت
رونی صورت سے ہے ہمیں نفرت

رات نیلگوں آنکھوں کے لرزتے آنسو
کیا کسی حسرت سوزاں کا سہارا بھی رہیں
ظلمت یاس کے غمناک سیہ خانوں میں
کیا کسی تیرہ مقدر کا اجالا بھی ہیں

تسلی

افتخار احمد

تو میں بنتی بھی بگڑتی بھی سنورتی بھی رہیں
قافلے آئے گئے اور گذرتے ہی رہے
پر میرے عہد گذشتہ کے وہ خورشید و قمر
ایک تھے بس جو ابھرتے ہی ابھرتے ہی رہے
میرا مینار، میرا تاج، میرا لال قلعہ
جس کی ضوباریوں سے آج بھی خیرہ ہے جہاں
میری تاریخ کے اوراق کے یہ زندہ حروف
میری شاندار روایات کے نقش تاباں
میرے افلاک نخیل کے یہ تابندہ گہر
آج تک جو میرے احساس میں لہراتے تھے
عظمت رفتہ ماضی کے وہ تارے لیکن
وقت کی گرد کے سیلاب تلے ڈوب گئے

میری آنکھوں میں نہ حسرت ہے نہ آنسو نہ چمک
ایک امید مگر آج بھی لہراتی ہے
ہلکے ہلکے دل مایوس کی دھندلاہٹ میں
میرے سوئے ہوئے جذبات کو چھو جاتی ہے
میرا مینار، میرا تاج میرا لال قلعہ
اپنے ماضی کی روایات میں کھو جاتا ہوں
ذہن میں پنکھنے لگتے ہیں بھیانک سپنے
سوچتے سوچتے پاگل سا میں ہو جاتا ہوں
یہ مگر آج اسی سوچ سے پھر کیا حاصل۔؟
اپنی قسمت میں جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا
جھلملاتے ہوئے اشکوں سے شفق بھیگ چکی
آسماں شومئی تقدیر پہ خوں رو ہی چکا

(دسویں قسط)

حجاج بن یوسف

دسواں باب

بغاوت ابن اشعث

(مسل)

ڈاکٹر
میر سیادت علیخان

حجاج کے عاملوں نے اس کو لکھا کہ ذمیوں کے مسلمان ہوکر شہروں کو چلے جانے اور رہ پڑنے سے خراج کم ہوگیا ہے حجاج نے احکام جاری کیے کہ گاؤں والے گاؤں کو واپس جائیں یہ لوگ رونے پیٹنے لگے اور آنحضرت صلعم کی دہائی دی۔ بصرہ کے قاری لوگ چھپ کر ان کے پاس جاتے اور ان کی حالت دیکھ کر روتے تھے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ ابن اشعث کی بغاوت اس کے بعد ہی سے ہوئی۔ اور بصرہ کے قاریوں نے حجاج سے لڑنے میں مبالغہ کیا۔ اور بڑا جوش دکھایا۔

اس ایک واقعے سے بھی پتا چل سکتا ہے کہ حجاج کی دشمنی ان تقوا مقدس نفوس کی حجاج سے سخت دشمنی کے کیا وجوہ تھے حجاج کے احکام سیاسی اور معاشی ضرورتوں پر مبنی ہوتے تھے۔ مقدس دینی حضرات اس کو سمجھتے نہیں تھے! اوپر کے احکام سے یہ نتیجا نکالنا کہ ذمیوں پر جو خراج لگایا گیا زیادتی تھی۔ کیونکہ گاؤں کو واپس جانے کا حکم دینا ایک بات ہے اور خراج لگانا دوسری بات۔ ممکن ہے محض آبادی کی خاطر حکم دیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی کہ شرفا اور زمینداروں کے شہروں میں رہنے سے زراعت برہم گی۔ اور ہر ملک میں خراب ہوتی ہے جیسا کہ آج کل مذہب ہمارے ہی ملک میں ہو رہا ہے۔ فرض کیجیے اگر واقعی ہی ہو کہ حجاج نے ذمیوں کو نہ صرف گاؤں کو واپس جانے کا حکم دیا بلکہ ان پر خراج بھی لگا دیا تب بھی حجاج سے کوئی خلاف اسلام کام ہی ہوا اور نہ کوئی بدعت۔ "کتاب الخراج" میں لکھا ہے کہ گو مسلمانوں کا خراج دنیا میں ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن جب کسی مسلم کو نو مسلم سے وراثتً زمین پہنچتی تھی تو وہ اس کے قبضے میں رہ سکتی تھی۔ بشرطیکہ وہ خراج ادا کرے۔ شقیق ابن سرین نے اپنے باپ سے ایک زمین ورثے میں پائی اور وہ اس کا خراج ادا کرتے تھے۔ حضرت عمر اور حضرت علی کسی شخص کے مسلمان ہونے پر اس کی زمین اس کے قبضے میں چھوڑتے تھے بشرطیکہ وہ خراج ادا کرے۔

اگر ہم ان واقعات سے یہ نتیجا نکالیں کہ "عراق کے قاریین کرام گو مقدس تھے لیکن سیاسیات سے محض نابلد تھے تو بے جا نہ ہوگا ان کے نزدیک آزادی کے یہ معنی تھے کہ کسی کو ہاتھ تک نہ لگایا جائے" حجاج نے سیاسی اور معاشی ضرورتوں کے مدنظر اگر گاؤں والوں کو وہاں سے واپس چلا جانے کا حکم دیا تو یہ کونسی "جباری" یا ظلم و زیادتی تھی۔ اس پر مقدس لوگوں نے کیوں "فتنہ" بپا کیا اور کیوں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا۔

غرض ابن اشعث کی خوفناک بغاوت عراقیوں کی نمک حرامی مزاجی عبدالرحمٰن ابن اشعث کی خدا پسندی اور طلب جاہ اور نیز ہمارے پکے عقیدے والے متقی حضرات کی نیک نیتی پر مبنی تھی۔ ان کی "شاہی پسند" اشخاص و احکام سے نفرت اور قیام جمہوریت کی کوشش کی وجہ یہی تھی۔

اب اس سخت آزمایش کے زمانے میں حجاج کے طرز عمل پر غور کرنا باقی رہ گیا ہے۔ پہلے اس کے مصایب سن لیجیے طبری جیسی مستند تاریخ میں یہ مصایب یوں بیان کیے گئے ہیں یوم زاویہ کے بعد گیارہ ہزار سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ یعنی ان کو دھوکے سے امانی کی منادی کرائی کہ فلاں فلاں اشخاص کو اس نہیں ہے لوگوں نے سمجھا

باقی اشخاص کو امن ہے وہ آگئے حجاج نے ہتیار چھین کر گیارہ ہزار کو قتل کر ڈالا۔ فیروزین حصین سولی پر سخت وحشیانہ تفتیش کی۔ حجاج کے مقتولین کی کل تعداد ایک لاکھ بائیس ہزار تک پہنچتی ہے۔ چند اشخاص مثلاً ایک حنفی بوڑھے کو کفر کا اقبال نہ کرنے اور محمد بن سعد بن ابی وقاص کو قتل کرنے پر ہار گلا لا یقین جانیے کہ ہم نے تاریخوں کے بہت سے صفحے الٹے۔ لیکن ان مصایب کے سوا اور کوئی عیب حجاج کے طرز عمل میں بیان کیا ہوا نظر نہ آیا پہلے زاویہ کے مقام پر جو گیارہ ہزار اشخاص قتل کیے اور نیز کل ایک لاکھ بیس بائیس ہزار اشخاص کو قتل کرنے کے "واقعہ" ہی کو لیجیے۔ زاویہ کے قتل کے متعلق ہم نے اساتذہ کی زبانی سنا ہے کہ محض غلط ہے۔ ہماری رائے میں قیاسات سب اس کے مخالف ابھی پہلے تو یہ دیکھیے کہ اس وقت حجاج کی مخالفت کا جوش مزاجوں میں ایسا تھا کہ حجاج کی امان قبول کرنے سے وہ یقیناً انکار کرتے تھے۔ نیز زاویہ کی جنگ کے بعد جب عبدالرحمن ابن اشعث کوفہ چلا گیا تو اہل بصرہ نے عبدالرحمن ہاشمی کے تحت پانچ دن سخت لڑائی کی اور اس کے بعد نکل کر ابن اشعث سے کوفہ میں جا ملے۔ پس قیاس غالب یہ ہے کہ اس وقت کے حالات اور مزاجوں کے جوش پر نظر کرتے کسی نے حجاج کی امان کو اگر اس نے اس کا اعلان کیا ہو تو قبول نہ کیا ہوگا۔ نیز ملاحظہ فرمایئے کہ اگر چند ہی اشخاص نے حجاج کی امان قبول کی ہو تو بھی ایسی صورت میں حجاج جیسا مدبر قتل عام کا حکم نہیں دے سکتا تھا اس لیے کہ ایسے وقت ایک بھی شخص کو قتل کرنا گویا باقی مزاجوں کو نئی مرگ لڑنے پر آمادا کرنا تھا حجاج نے اگر امان دی ہو تو پچھلی سے امان دی ہوگی اور یاد رہے کہ واقعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ حجاج خون کا پیاسا تھا قتل عام یا بڑی تعداد میں دشمنوں کو قتل کرنے سے مقصد محض رعب بٹھانا ہوتا ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کہ بغاوت نہ ہوئی ہو بلکہ باغیانہ خیالات پیدا ہو گئے ہوں۔ مثال کے طور پر پنجاب کے جلیانوالا باغ میں مجمع پر آتش باری کر کے جنرل ڈائر نے سارے پنجاب میں کم سے کم انگریز مدبروں کی رائے میں رعب بٹھایا تھا اس وقت پورا عراق مشتعل ہو چکا تھا۔ حجاج کا ایسا فعل باغیوں کے لزم میں پختگی پیدا کرتا تھا اور حجاج ایسا نادان نہ تھا کہ وہ اپنی مخالفت اس طرح کرنے معنی افعال سے بڑھاتا۔

اب ایک لاکھ بیس یا بائیس ہزار کے قصے پر بھی غور فرما لیجیے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی بھی تاریخ اس تذکرے سے خالی نہیں لیکن اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ یہ محض کذب افترا اور حجاج پر بہتان ہے ابن اثیر نے نہایت متانت سے لکھا ہے کہ حجاج کو خدا قبال تھا۔ اور اس نے اپنے موخہ سے اقرار کیا کہ صرف یزید کو شرابی اور کافر کہنے پر اس نے ایک لاکھ اشخاص کو قتل کیا تھا۔ اس پر علامہ موصوف تنقید فرماتے ہیں ــــ "اس نے خدا ایک وقت اعتراف کیا کہ اس نے صرف اک گناہ پر ایک لاکھ اشخاص قتل کیے"۔ ہماری رائے میں تو علامہ موصوف کا یہ بیان محض مضحکہ خیز ہے نہ معلوم انہوں نے کیوں اور کس بنا پر لکھ مارا۔ کیا حجاج کو اپنے اس قول سے زیادہ اور کوئی چیز صدمہ پہنچا سکتی تھی اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ موصوف نے حجاج کے کردار کے پہچاننے میں بڑی ہی بھول کی۔ غالباً ان کے نزدیک ایک لاکھ کی تعداد محض ایک مذاقیانہ عدد ہے۔ غالباً علامہ نے صفحوں کو بے کار سیاہ کر لکھ دیا۔ انہوں نے حجاج کے وقت کے بہادروں اور ہتیار بند لڑنے والوں کو چیونٹیوں سے زیادہ بے زبان سمجھا۔ غرض یہ کہ علامہ نے اس وقت کے حالات کو سمجھنے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ علامہ کے اس غلو آمیز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نہایت ہی غیر ذمے دارانہ انداز میں اوپر کی تحریر بطور مضحکہ لکھ دی ہے۔

ہم صاف کہتے ہیں کہ جس کسی نے یا اوپر کے ایک لاکھ بیس یا پچیس ہزار مقتولوں کے قصے کو لکھ مارا ہے اس نے فطرت انسانی کے سمجھنے میں بڑی بھول کی ہے ایسے واقعات لکھنے یا نقل کرتے وقت میعار عقل پر ان کو نہیں پرکھا۔ حجاج کے واقعات کو سمجھنے اور خود حجاج کی خصلت پر نظر ڈالنے کی کسی نے بھی زحمت گوارا نہیں کی۔

غرض یہ کہ یہ قصہ حجاج کے واقعات اور حجاج کی خصلت پر نظر ڈالنے سے سراسر غلط ثابت ہوا۔

اس سے ہمیں انکار نہیں کہ اس بغاوت کے فرو کرنے میں حجاج نے چند اشخاص کو ضرور قتل کیا اور قتل کرنا چاہیے بھی تھا۔ اس لیے کہ یہ بغاوت مسلسل دو سال تک جاری رہی اس عرصے میں اندازاً کچھ کم کشت و خون نہ ہوا ہوگا اس کے فرو کرنے کے لیے قتل کرنا ضروری تھا۔ لیکن مثل ہمیشہ کے حجاج کا طرز عمل "انسانیت" اور "تدبر" پر مبنی تھا۔ دیر جماجم کے بعد جب کہ ابن اشعث کو کافی شکست ہوگئی اور بغاوت کی آگ دھیمی پڑ گئی اور دلوں مزاج عراقی بغاوت سے تھک گئے تھے تو حجاج کے امان کا اعلان کرایا یعنی جو بھی واپس آجائے اس کو امن ہے۔ جوزجان میں قتیبہ بن مسلم کے پاس جائے اس کو بھی امن ہے چنانچہ اس اعلان امن کے نقض کا کہیں تذکرہ نہیں بلکہ اس سے مستفید ہونے کا ذکر ہے۔ تواریخ میں تفصیل سے جن اشخاص کے قتل کا ذکر ہے وہ معدودے چند ہیں جنہوں نے اس اعلان امن سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور بغاوت پر جمے رہے مثلاً وہ لوگ جو یزید سے خراسان میں لڑے اور جن کو قید کر کے یزید نے حجاج کے پاس بھجوا دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ واجب القتل باغی تھے انہیں بغاوت پر اصرار رہا انہوں نے اعلان امن سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ اپنے بوڑھے خسٹی یا محمد بن سعد بن ابی وقاص جیسے اشخاص کو قتل کرنا بہ قول ابن قتیبہ خوارج کا استیصال مقصود تھا ظاہر مسلمان کو یہ امر برا معلوم ہوگا کہ خوارج جیسے خدا پرست قتل کیے جائیں لیکن افسوس خوارج کو نیک تھے لیکن وہ خدا ہی زندہ رہنا چاہتے تھے اور نہ دوسروں کو زندہ رہنے دیتے تھے شبیب جس کے زہد و تقوا کی شہرت اس کی بہادری کے چرچوں سے کچھ کم نہ تھی عورتوں اور بچوں تک کو قتل کر دیتا تھا۔ دوسروں کا حال تو نہ پوچھیے۔

اس میں شک نہیں کہ ابن اشعث کی بغاوت کے بعد حجاج کو سیاست برتنی پڑی لیکن یاد رہے کہ یہ حسب ضرورت تھی تمام اقتباسات کا اقتضا یہی ہے کہ حجاج نے ضرورت سے زیادہ قتل

وخون نہیں کیا۔ اس کے ثبوت میں ہم مزید ذیل کا بیان پیش کرتے ہیں دیر جماجم کے بعد حجاج کے طرز عمل کی عبدالملک کو

لی تو لکھا:۔

"بعد حمد و ثنا! امیرالمومنین کو خبر پہنچی ہے کہ تم نے خو بہانے اور مال دینے میں اسراف سے کام لیا۔ یہ وہ خصلتیں امیرالمومنین کو کسی شخص میں بھی پسند نہیں۔ امیرالمومنین حکم د ہیں کہ قتل خطا کے عوض دیتم اور قتل عمد کے لیے قصاص ہو اور اموال کو ان کی جگہ واپس کر دیا جائے۔ پھر مناسب عمل کر جائے۔ امیرالمومنین ابن خدا ہیں اور ان کے نزدیک حق کو روکنا اور بے جا دینا دونوں باطل ہیں اگر مال دینے سے لوگ کو ملانا تیرا مقصد تھا تو وہ لوگ تجھے بچا سکیں گے۔ اور اگر اپنے لیے ان کو دیا تو تو اس سے مستغنی نہ ہوا۔ عنقریب امیرالمو کے پاس سے تیرے لیے وہ کام آئیں گے۔ ایک نرم۔ ایک سخت سوائے اطاعت کے کوئی چیز ان سے تجھے مایوس نہ کرے گی اور نافرمانی کے کوئی چیز ان سے تجھے نہ گرا دے گی۔ امیرالمومنین ہر امر کی امید رکھے۔ الا غلطی میں ساتھ دینے کے۔ اور جب کسی قو پر تو غالب آئے تو اس کو ہرگز قید کی حالت میں قتل نہ کرنا چاہ آخر میں بطور نصیحت چند شعر بھی لکھے تھے۔

حجاج نے اس کا جواب یوں دیا تھا۔

"امیرالمومنین کا مکتوب آیا۔ جس میں خون و مال میں اسراف کا ذکر ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے نافرمانوں کو کماحق سزا نہیں دی ہے۔ اور فرماں برداروں کو ان کا پورا حق نہیں دیا ہے۔ اگر میرا ان باغیوں کا قتل کرنا اسراف ہے اور وفادار کو مال دینا تبذیر تو امیرالمومنین گذشتہ کو معاف فرمائیں اور آ کے لیے کوئی حد مقرر فرمائیں جس سے میں آگے نہ بڑھوں گا۔ انشاء تعالیٰ بجز حجاج پر کوئی دیت یا قصاص واجب نہیں۔ میں نے کسی کو غلطی سے قتل ہی نہیں کیا کہ دیت و فدیہ دوں۔ زمین سے کسی کو کچھ دیا نہ کسی کو قتل کیا۔ مگر اس کے باوجود میں آپ کے دو موجودا امور کا منتظر ہوں۔ نرم کے لیے میں نے سامان تیار

کر رکھا ہے۔ اور سخت امر کے لیے بھی۔ یعنی پہلے کے لیے جلاد اور دوسرے کے لیے صبر۔"

"جس روز میں آپ کی رضا نہ چاہوں وہ روز میرا بڑا منحوس ہوگا۔ خلیفا کے بعد کسی شخص کے لیے کوئی شخص ان امور کی بابت جو وہ کرتا ہے سہر نہیں ہے۔ جو صلح کرتے ہیں میں بھی ان سے صلح کرتا ہوں، یہ صورت دیگر لڑتا ہوں۔ حجاج جس روز آپ کے نزدیک غلطی پر ٹھہرے اس کے خواہ بھی کھڑے ہو جائیں گے۔"

"اگر میں مخلصوں کو ان کی خلوص کی وجہ قریب نہ کروں اور جو شخص میرے درپے گزند ہیں ان کو دور نہ کروں تو اس سے غیر زمانے میں کون میرے وجود کا ضمنی ہوگا۔ اور کون حج سے ڈرے گا۔ مجھے اپنی رضامندی کی حد سے واقف کرانے میں کبھی بھی اس سے متجاوز نہ ہوں گا۔ اگر تا مجھے اور امور کے انصرام کیلیے چھوڑ دیجے کیونکہ میں شفیق و رفیق ہوں اور تجربوں نے مجھے حکمت سکھائی ہے۔"

عبدالملک نے یہ خط پڑھا اور کہا: "ابو محمد (حجاج) میری صولت سے ڈر گیا۔ اب میں کوئی امر ایسا نہ کروں گا جس کو وہ ناپسند کرے"

ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجاج پر خون بہانے اور مال دینے میں اسراف کا الزام لگایا گیا ہے۔ حجاج خلیفا کے پاس ادب سے یہ تو نہیں کہہ سکا کہ ان الفاظ کا استعمال غلط ہے مطابق واقعات نہیں۔ اس لیے اس نے پہلے اس کو مان لیا۔ لیکن بعد میں حیلہ شرطیہ میں لاکر عملاً صاف انکار کر دیا۔ خدا کی قسم کھائی کہ میں نے کسی کو بھی خطا سے بھی قتل نہیں کیا۔ جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر ضرورت دیکھ کر کیا اور ایک شخص کو بھی بے جا مالی نہ دیا۔ میرے اس طرز عمل سے آپ ناراض ہوں تو اپنی رضا سے مطلع کیجیے اس سے تجاوز نہ کروں گا۔ اگر آپ یہ نہ بتائیں تو پھر مجھے انتظام کرنے دیجیے کہ میں شفیق و رفیق اور پرانا تجربہ کار ہوں۔ قارئین کرام یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ دو تا خط ملتے۔ عبدالملک خلوص کے متعلق خبردار اور واقف رہنے اور جلد سے جلد اس کا محاسبا کرنے پر تلا ہوا تھا خلیفا نے بہ حیثیت خلیفہ کے حجاج سے اس کے طرز عمل کی وضاحت چاہی تھی۔ حجاج نے اس کی حمایت کی اور الزامات کو بے بنیاد ٹھہرایا۔ عبدالملک کو اطمینان ہوا اور وہ خاموش ہو گیا

حجاج کی اس انابت میں طرز عمل کے محاسن گو بہت طویل ہیں لیکن چند لفظوں میں ان کا خلاصا جو اوپر کے واقعات پر مبنی ہے یہ ہوگا کہ مستعدی، ہشیاری، عفو۔ فیاضی خلیفا کی حیثیت سے ان کی قابلیت کا اعتراف، بہادری، تدبیر، رعایا سے محبت، علما کی تعظیم اور ان کی غلطیوں سے درگذر کرنا، نصیحت پذیری۔ مستعدی کی اک دو مثالیں سازو سامان کے تیار کرنے اور این اشعث کو مناسب حکم و احکام بھجوانے رہنے اور نیز جنگ سکن سے پہلے ساری رات جاگنے؛ اور اہل شام کے دل بڑھاتے رہنے سے ظاہر ہے۔ فیاضی، جنگ تستر کے بعد پندرہ کروڑ درہم ساتھیوں میں تقسیم کر دینے اور عفو۔ مالک بن مسمع سے درگذر کرنے سے واضح ہے یعنی اس نے ارادا کیا تھا کہ حجاج کو بصرہ نہ آنے دے اور پل گرا دے۔ حکم بن ایوب نے لاکھ روپے دے کر باز رکھا تھا حجاج نے بصرہ آکر صرف یہ کیا کہ لاکھ روپے واپس لے لیے اس سے زیادہ معترض نہ ہوا۔ اور جب جنگ زاویہ میں اس کا سر سامنے آیا تو ایک دردبھرا جملا یولا خلیفا کی جانب سے اس کی قابلیت کا علمی اعتراف اپنے لائق بھائی محمد بن مروان والی جزیرہ کو اور اپنے بہادر بیٹے عبداللہ کو اس کے ماتحت کر دینے سے ہوتا ہے۔ بہادری یوں تو جنگوں میں شریک ہونے سے ہی ثابت ہے۔ لیکن جب یوم زاویہ میں فریش اور تعیف کو عام طور پر شکست ہوگئی تو حجاج نے مصعب کو یاد کیا اور مرنے مارنے پر تیار رہا۔ فرار ہونے کو فراموش کر دیا تھا۔ تدبر کی مثالیں شروع سے لے کر آخر تک ملتی ہیں۔ مثلاً لیجے کہ تستر کی شکست کے بعد کثیر رقم تقسیم کرنا ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ سیاسیات میں زر کا اثر بہت ہوتا ہے ابتدا سے ہے اور ہمیشا رہے گا۔ وہ سیاس ہی نہیں جو اس کی قوت کو پہچانے اور اس سے مناسب کام نہ لے۔ امام شعبی سے درگذر کرنا اور ادب سے پیش آنا علما کی تعظیم اور ان سے عفو کی ایک اچھی مثال ہے۔ یہ کوئی واحد مثال نہیں تھی بلکہ ایسی سیکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں۔

روشنی تاریکی

—— جاوید منہال

اس نے جھلا کر کتاب میز پر پٹخ دی۔ اسے اپنے محبوب فن کار کی کہانیوں میں بھی مزا نہیں مل رہا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں خیالات کی ان گنت لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اور وہ پریشان بھی ہو رہی تھی۔ خیالات کی لہریں اسے ماضی حال اور مستقبل کی طرف بہائے لیے جا رہی تھیں۔

اور وہ سوچنے لگی کہ جب وہ کنواری تھی جب وہ کسی کی بیوی نہیں بنی تھی تو اس وقت اس کے دل میں دلہن بننے کی انجانی سی خواہش پلتی رہتی تھی وہ ہر رات عجیب و غریب رنگ برنگ کے سپنے دیکھا کرتی تھی لیکن اس کے سپنے سورج کی تیز کرنوں کے ساتھ ٹوٹ جاتے تھے۔

وہ بچپن ہی سے شوخ و شنگ واقع ہوئی تھی وہ دن بھر ہنستی کھیلتی۔ اچھلتی رہتی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا اور اس کی ہم جولی سہیلیوں نے تو اسے "بھانڈنی" کا خطاب دیدیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی عزیز سہیلیوں سے کئی کئی دنوں تک روٹھی رہتی تھی۔

اور دن گزرتے رہے اور وہ جوان ہوتی گئی اور اس جوانی کے ساتھ اس کی شوخیاں بھی جوان ہوتی گئیں اور پھر اسے چند دنوں کے بعد اپنی جوانی کا احساس ہوا تھا یہ احساس اس کے دل میں عجیب و غریب طریقے سے اٹھا تھا اور اس دن زوروں سے بارش ہو رہی تھی۔ رم جھم مینہ سارا دن برستا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کیف ہوا اور سرور آگیں بارش نے عجیب رومانی فضا پیدا کر دی تھی اور اس نے بے اختیار اپنی آپا کو چھیڑتے ہوئے کہا تھا

"چلو آپا نہالیں۔ بارش کے پانی میں بڑا مزا آئے گا"

لیکن اس کی آپا خفا ہو گئی تھی وہ اپنی آپا سے ہمیشہ جلتی رہتی تھی۔ اس کی آپا نے کبھی بھی اس کی بات نہیں سنی تھی اور جب وہ اسے کچھ کہتی۔ اس کی آپا ڈانٹ کر چپ کر دیتی اس کی آپا عجیب سی لڑکی تھی ہمیشہ سنجیدہ اور اداس رہتی تھی وہ آج تک آپا کی سنجیدگی کی وجہ نہیں جان سکی تھی۔ اس نے کئی بار اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھنی تھی لیکن ہر بار نمکین آنکھیں اور وہ سہم کر خاموش ہو جایا کرتی تھی اس کی زندگی آپا کی سنجیدگی اور اداسی میں کٹ رہی تھی۔

اور پھر اچانک یہ فضا بدل گئی۔ مسموم فضا فضیلتوں اور امرت سے لبریز ہو گئی۔ اداس فضا میں چہک اور امنگیں آگئی تھیں۔ اس کی آپا کی سنجیدگی اچانک ختم ہو گئی۔ اور اسے آپا کی اچانک تبدیلی سے حیرت ہوئی تھی

"جمال اور اس کی آپا" اس نے سوچا کاش آپا کی شادی جمال سے ہو جائے۔ جمال اچانک اس کے ہاں آیا۔ اور اس کی آپا جمال کی مسکراہٹوں میں گم ہو گئی۔ اس کی آپا کی اداسیاں جمال کے قہقہوں اور مذاقوں میں ڈوب گئیں۔ اور اس کی آپا کے الجھے بکھرے بال سنور گئے آنکھوں میں جوانیاں رقصاں ہو گئیں۔ کئی بار اس نے چاہا کہ آپا کی اس فوری تبدیلی سے مذاق کرے۔ آپا کے چٹکی لے لیکن اس کی سرخ نمکیلی آنکھیں ——— اور ڈر کے وہ چپ سادھ لیتی۔

اور پھر چند دنوں کے بعد جمال چلا گیا۔ جاتے وقت جمال نے اسے پیار سے کہا تھا "شمو مجھے یاد کرو گی"

"وہ بھائی جان آپ بھی کوئی بھلانے کی چیز ہیں" وہ حبیب معمول شوخی کے ساتھ بولی ہے اور جمال بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ جمال چلا گیا۔ فضا ویسے ہی گمبھیر اور اداس ہو گئی۔ اس کی آپا ویسے ہی اداس رہنے لگی۔ پھر چند دنوں کے بعد اس کی آپا دلہن بن کر جمال کے ساتھ چلی گئی۔ اس کے قرب سے بہت دور۔ اس وقت اس کے دل میں ایک خلش ایک چبھن اور کسک اٹھتی تھی۔ اس کی آپا اس سے بہت دور چلی گئی تھی لیکن وہ خوش تھی کہ اس کی آپا کی خوشی مل گئی تھی۔ اس کی آپا کو اس کا جمال مل گیا تھا محبت جیت

گئی تھی اور اسی خوشی میں اس نے آپا کی جدائی کے غم کو بھلا دیا تھا۔

آپا کے چلے جانے کے بعد اس کی اداسی اس کے لیے کوفت بن گئی تھی اور وہ اسی کوفت کو مٹانے کے لیے کتابوں اور افسانوں میں اپنے دن بتانے لگی ان ہی رسالوں سے اس کی نئی زندگی شروع ہوئی تھی۔ اس کے دل میں محبت کا احساس جاگا تھا۔ اور وہ زندگی میں پہلی بار تڑپ اٹھی تھی اس نے بے قراری کے عالم میں نرگس کو پکارا تھا۔ اس سے اوٹ پٹانگ باتیں پوچھتی تھی۔

"نرگس تم نے کسی سے پیار کیا ہے"

"جی نہیں سرکار"

"کسی مرد کے بارے میں کچھ سوچا ہے"

"جی نہیں سرکار"

کسی کی آنکھوں میں ڈوب کر۔۔۔۔ "جی نہیں سرکار"

"تو گنوار ہے"

"جی۔۔۔" اور نرگس کچھ اور کہے بغیر بھاگ گئی تھی۔"

اور وہ بے چین ہو کر بالکنی میں چلی آئی تھی۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ بالکنی میں کھڑی وہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری سرخ مسکراہٹیں دیکھنے لگی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی تمنائیں سرخ مسکراہٹوں کے روپ میں آسمان کی نیلی چھاتی پر منتشر ہو کے رہ گئی تھیں بالکل اسی طرح جس طرح مرنے ہوئے انسان کے اجزا منتشر ہو جاتے ہیں۔ وہ بے چین ہو کر اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔ ریڈیو بج رہا تھا اور اس کے کانوں میں "برسات میں ہم سے ملو تم سجن" تم سے ملیں ہم" گونجنے لگا۔ چند منٹ تک وہ اس دوہرے گیت میں کھو گئی رہی۔

اور وہ سوچنے لگی۔ اس کا بن تو اس سے بہت دور چلا گیا ہے اس سے کئی سو میل دور۔ اف شادی کے صرف چار دن بعد ملازمت کا بہانا کر کے اس سے کئی سو میل دور چلا گیا تھا۔ اور جیسے وہ گیا تھا وہ اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ اس کے تصور میں اس کا شوہر چھایا ہوا تھا۔ اس کی پیاری پیاری باتیں اور اس کی جلتی ہوئی خوب صورت آنکھیں اور اس کی آنکھوں کے تصور ہی سے اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے دل میں اچانک جذبات کے شعلے لپک اٹھے جیسے اس کی پژمردہ زندگی میں جوانی کا طوفان گنگنانے لگا ہو جیسے اس کے پاؤں خدبخود تھرکنے لگے ہوں۔۔۔!

پھر اسے اپنی بدقسمتی پر رونا آ جاتا۔ چار دنوں میں وہ اپنے شوہر کا پیار بھی حاصل نہ کر سکی۔ ایک دن بھی اسے خوش نہ رکھ سکی تھی۔ ایک دن بھی اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں اس کی آرزوؤں کے چراغ نہ جلا سکی تھی۔ ایک دن بھی اس کے زرد رخساروں پر جوانی خنکی اور امنگ نے مل کے قرمزی رنگ نہیں ابھارا تھا۔ اور وہ آج تک اپنے شوہر کی اداسی کی وجہ نہ جان سکی تھی۔

اور اس چار دن میں اسے وہ دن بھی یاد آ گیا جب اس نے بڑے چاؤ سے اپنے شوہر کے گلے میں باہیں حمایل کر دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کو وفور جذبات میں چومتے ہوئے کہا تھا "جان تم آپ اتنے اداس کیوں رہتے ہیں"

اور جواب میں اس کا شوہر چپ چاپ رہا تھا۔

اس نے پھر پوچھا تھا "میں آپ کو پسند نہیں آئی کیا"

اور جیسے سابق اس کی زندگی کا ساتھی گم سم رہا تھا اس طرح اس نے اس کو بہلانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ کتنے پیار کے میٹھے بول بولے محبت کے گیت گائے تھے لیکن وہ بے حس چٹان کی طرح خاموش رہا تھا۔ اور اسے غصہ آ گیا تھا وہ اس سے دور ہٹ گئی تھی اور اس کا شوہر غزل لکھنے میں ڈوبا رہا تھا۔ اور پھر اسی شام کو کتنی آرزو اور تمنا لے کر وہ اس کے پاس آئی تھی "چلیے کیرم کھیلیں جانی۔ جانی جان بھی کھیلیں گے"

"میں کیرم کھیلنا نہیں جانتا" اور اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے شوہر نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ جیسے وہ مر گئی ہو۔

ان چار دنوں میں اس نے شوہر کی محبت کو جیتنے کے لیے کتنی کوششیں کیں۔ لاک جیتنے کے لیکن وہ ہر بار ناکام رہی تھی۔ اس نے صرف اس کے لیے فلمی گیت گائے۔ خوب صورت کپڑے پہنے لیکن یہ فلمی گیت بھی اس کے شوہر کو پگھلا نہ سکے اور یہ حس

چٹان کی طرح چاروں طرف سے اس کے پاس رہا۔ اور وہ اس چٹان کو جس طرح چاہے لڑکھڑا تی رہی۔۔۔۔ اسے اپنی قسمت اور اپنے ماں باپ پر غصہ آرہا تھا۔ انہوں نے اس کو ایسے شخص کے گلے باندھ دیا تھا جو خیال پرست تھا۔ جو عمل سے کوسوں دور تھا جو حسن کی خیالی تخلیق کرتا تھا۔ جو محبت کی پوجا کرتا تھا۔ لیکن وہ جوان تھی۔ اسے اپنی جوانی کا پورا احساس تھا اور یہ ہی احساس اسے نوچنے ڈالنے بیقرار رہا تھا اسے گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اسے انسان چاہیے تھا۔ اسے بے حس چٹان نہیں۔۔۔۔ بے حس چٹان کے تصور ہی سے اس کے دل و دماغ پر ہتوڑے چلنے لگتے تھے اور اس کا سر پھٹنے لگتا تھا۔

اور اس شام کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس شام کو اس کا ساتھی چھوڑ کر کئی سو میل دور جا رہا تھا۔ اسے وہ خبر بھی نہ دے سکا تھا اور اس شام اس کے ساتھی نے اسے پیار بھری نظروں سے گھورا تھا۔ اس شام اس نے اس کے خوبصورت بالوں میں انگلیاں کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"شمو مجھے افسوس ہے میں تمہیں خوش نہ کر سکا۔ میں مجبور ہوں"

اور وہ چلا گیا۔۔۔۔ کئی ماہ بیت گئے لیکن اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ صرف اتنا جان سکی کہ اس کا محبوب ندا ہے کبھی اچھا رہتا ہے کبھی بیمار۔۔۔۔!

اسے اپنی چھٹی تقدیر پر غصہ آرہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زہر کھا کے خودکشی کر لے یا اپنے آپ کو ہلاک کر دے یا پھر کسی گدھ جوان کے ساتھ بھاگ جائے۔ اس نے اس کے پاس کوئی خط لکھے۔ اس نے ہر خط میں ملنے کی آرزو ظاہر کی۔ لیکن اس کا ساتھی حسب سابق خاموش ہو رہا۔ اور پھر ایک دن اس کے چھوٹے بھائی نے اس کے دل میں شوہر کی طرف سے نفرت کی پیپ بھر دی۔ اس نے اس کے معاشقے کی عجیب و غریب کہانیاں سنائیں اور جس کو سن کر اس کا نسوانی وقار گھایل ہو گیا تھا۔ وہ غصے میں جھلا اٹھی تھی۔ اس دن پہلی بار اس کے دل میں مرد کے خلاف شدید نفرت ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے اپنی ہتک کا خیال ہوا تھا۔۔۔۔

اور اس دن وہ میز سے۔۔۔۔ رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگی تھی اس میں ننگی اور کھلی عورتوں اور مردوں کی تصویریں تھیں اور اس دن ننگی دیکھ کر اس کے جذبات ابل پڑے تھے اسے بے کیف چوانی کا احساس ہوا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں احساس اور جذبات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ابلنا لگ رہا تھا کہ وہ اس جذبات کے طوفان میں اپنی تقدیس کو بہا بیٹھے گی۔

اور جب نازو اس کے پاس آیا تھا تو کتنے پیار سے اس نے اس کو اپنے پاس بٹھایا تھا۔ نازو اس کا ملازم تھا اس کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر ساری ننگی تصویریں نازو کو دکھا دی تھیں۔ اور نازو شرم سے آنکھیں جھکا کے تصویروں کو دیکھتا رہا تھا۔ اور اس وقت اس کا جی چاہا کہ نازو سے لپٹ جائے۔ اسے اتنے زور سے بھینچے کہ اس کی ہڈیاں چٹخ اٹھیں۔ اس کی نس نس میں درد پیدا ہو جائے۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھنے لگے اور وہ نازو کے قریب ہوتی گئی۔ قریب اور قریب۔ اور جوں ہی اس نے اس کے ہونٹوں کو چومنا چاہا ویسے ہی اس کی ماں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا تھا اور نازو گھبرایا ہوا بھاگ گیا تھا اس دن اسے اپنی ماں پر بھی بے حد غصہ آیا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ اپنی ماں کا بھی گلا گھونٹ دے اور اسی دن وہ تمام رات جاگتی رہی تھی اور اس کے تصور میں اس کا بے حس شوہر ناچتا رہا تھا۔

وہ کئی ماہ تک اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہیں آیا اسے شاید اس سے نفرت تھی۔ نفرت کے خیال ہی سے اس کا دل اچھل اٹھا۔۔۔۔ اور آج وہ ریڈیو بند کر کے پھر وہی ننگی تصویریں دیکھنے لگی۔ اس کے دل میں امنگوں خواہشوں اور جذبات کی لہریں تلملا اٹھیں۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا آج وہ ان طوفانی لہروں کے ساتھ بہہ جائے گی اس کی تقدیس بہہ جائے گی آج اس کا انتظار ہمیشہ کے لیے مر جائے گا۔

اور اچانک نازو آگیا۔ نازو نے آتے ہی کہا "بی بی جی دودھ پی لیجیے"

اور نازو کے ہاتھ سے اس کے سامنے رکھ کر جانے والا ہی تھا کہ اس نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے ننگی۔ ادھ ننگی تصویریں دکھانے لگی۔۔۔۔

نازو نے تصویروں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں میچ لیں۔

اس نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ نازو آنکھیں کھول دیکھ یہ کتنی اچھی اور خوبصورت ہیں۔

اور اس وقت اس کے دل میں جذبات اور خواہشات کا سمندر ابل رہا تھا۔ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر نازو کی ران میں بھرپور چٹکی لی۔ اور نازو تلملا اٹھا۔ اس نے دودھ کا گلاس نازو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔

نازو نے یہ تو لے

"نہیں بی بی جی" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔۔۔

"پی لے بھی میرے اچھے نازو"

اور نازو نے گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔ پھر اس نے کہا۔ نازو آج سردی بہت زیادہ ہے تو میرے ساتھ ہی سو رہنا"

نازو اب تک نگی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اس نے نازو کو اٹھا کر بستر پر سلا دیا۔ اور خدا خشی میں گنگنانے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ نازو کے ملایم پتلے ہونٹوں کو چوس چوس کر لہو کہان کر دے پھر اس نے سوئچ آف کر دیا۔ روشنی مر گئی۔ تاریکی لپک پڑی۔ تقدیس کا دم گھٹنے لگا۔ گناہ جاگنے لگے اور وہ گھپ اندھیرے میں گناہ کی جانب بڑھنے لگی۔ بڑھتی گئی۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے گناہ کی طرف جاتے ہوئے رستے میں ایک دیوار کھڑی ہو گئی اس کی آنکھوں میں اس کا شوہر رقص کرنے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں اس سے کہہ رہی ہوں "تمہیں تم امانت ہو تم اس امانت کو محفوظ رکھو ورنہ زندگی بھر روتی رہو گی۔ زندگی بھر پچھتاتی رہو گی"

اور وہ بے چین ہو گئی۔ اس نے بتی جلا دی۔ روشنی جاگ گئی تاریکی مر گئی۔ تقدیس مسکرا اٹھی اور گناہ کی سیاہ پرچھائیاں روشنی میں ہمیشہ کے لیے کھو گئیں۔۔۔

اور اس کی آنکھوں میں اس کا شوہر گھومتا رہا اور وہ نازو کو بھول گئی۔

غزل

خاموش یوں ہی رہنے دے اے دیدۂ تر اور
مجبور مجھے ذکر تمنا پہ نہ کر اور

ہر چند ملا ساغر و پیمانا نگر اور
اے ساقیٔ میخانا کرم کی ہو نظر اور

اے کاش کہ بڑھ جائے مرا سوز جگر اور
اے خاک کے ہونے میں ہے تھوڑی سی کسر اور

میخانے میں کیا بارش الطاف و کرم ہے
ہر وقت کہا کرتی ہے ساقی کی نظر "اور"

زاہد تری باتوں سے بہلتی ہے طبیعت
ہاں پھر سے سنا دے کوئی جنت کی خبر اور

پیغام زبانی نے بڑھا دی مری الجھن
قاصد کی خبر اور ہے نامے کی خبر اور

جلوا ابھی پردا ہو تو پردا ابھی جلوا
کچھ عشق کا دے ساتھ اگر ذوق نظر اور

راتیں تو گذر جاتی ہیں امید پہ لیکن
بڑھ جاتی ہے الجھن مری کچھ وقت سحر اور

پرواز کی یہ سیلی سی وہ قوت نہیں ان میں
نکلے ہیں قفس میں مرے صیاد یہ پر اور

شیدا مرے اشکوں کی انہیں قدر ہو کیونکر
مفلس کی نظر اور ہے لوٹا نگر کی نظر اور

شیدا (املیٹھوی)

ہم فضا میں ایک اور چاند بنائیں

قادر جدی بی۔ اے

(میجر الگزینڈر بی۔ اے۔ ساورسکی کے انگریزی مضمون کا ترجمہ)

ہوابازی کے ایک مشہور و معروف ماہر نے۔ جو خوب سمجھتا ہے کہ آج کے تصورات ہی کل کے حقائق ہیں۔۔۔ راکٹ، انہوں کے کام کا عاریہ طالعا کیا ہے اور کہتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جبکے بین سیاراتی پروازیں ایسی ہی عام اور غیر حیرت انگیز ہو جائیں گی۔ جیسی کہ سفر کی دوسری قسمیں۔

یہ باتیں قیاس سے دور نہیں کہ اس مضمون کے پڑھنے والے اپنی زندگی ہی میں انسان کے بنائے ہوئے نئے "چاند" کو دیکھ سکیں گے جو زمین پر سے بلند ہوں گے اور آسمان پر گردش کرنے لگیں گے۔

خیال ہے کہ اس قسم کا کوئی پہلا چاند ممالک متحدہ کے کسی مقام سے اڑایا جائے گا۔ جہاں اس دلکش میدان میں کافی ریسرچ کیا جا رہا ہے۔ یہ چاند فضا میں مقام مقصود پر پہنچنے کے بعد ایک مستقل مدار پر ہمارے کرے کے اطراف گھومنے لگے گا۔ بالکل ایسے ہی جیسا کہ موجودا چاند گھومتا ہے۔ اس طرح ہمارے پاس زمین کا سب سے پہلا مصنوعی شہابیا ہوگا یا جیسا کہ ہیئت داں اور دوسرے سائنس داں اسے موسوم کرتے ہیں ایک مداری راکٹ آج کے تصورات ایک اور دفعا کل کے حقائق بن چکے ہوں گے۔۔۔۔ حقائق! جو اپنی نسل کے لیے اتنے ہی قابل لحاظ ہوں گے جتنے کہ موجودا نسل کے لیے آج کے معجزات

انسان کے بنائے ہوئے سب سے پہلے شہابیے پر اور بعد کے چند دوسرے شہابیوں پر کوئی انسانی وجود نہیں ہوگا۔ یہ تمام اقسام کے سیاراجی اور برقیاتی خبر رسانی کے خدکار انتظامات سے آراستا، سنسان فضائی تجربا خانے ہوں گے جن کو بہ ایں ہمہ فاصلہ پیمائی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مستحکم راکٹ

لیکن ہم یقین کر سکتے ہیں کہ اس نوبت پر پہنچ جد و جہد ختم نہیں ہو جائے گی۔ ایک مستحکم راکٹ لازماً اوپر بھیجا جائے گا جو اپنے معین مدار پر گھومنے کے لیے اور اوپر ٹھہر جائے گا زمین اور مستحکم شہابیے کے درمیان راکٹی آوک یا دل کا انتظام رہے گا۔ جو اتنا ہی قابل بھروسا ہوگا جتنا کہ ایک انجن۔

ابتدائی غیر مستحکم شہابیا دوسروں کے بمطابہیئت دانوں ماہر بن طبیعیات اور اشتاع کے طالب علموں کے لیے قابل قدر ہوگا یہ شہابیے جن سیاروں کو دیکھیں" ہماری دوربینوں کو جدا گیا کی مانند) انہیں زمین پر موجود پردوں پر ٹیلی وائز کر دیں گے۔

وہ ٹیلی ویژن اور ہالے عالقد دوالے با ترسیلی اسٹیشنوں کا فریضا بھی انجام دے سکیں گے۔ ایک خاص بلندی پر مداری حرکت کرتے ہوئے شہابے پر روشن کیے ہوئے پروگرام ہفتوار کی شکل میں پھوٹائے جا سکیں گے جو تقریباً نصف زمین پر حاوی ہو سکیں گے۔ ہمارے سیارے کے اطراف باہم مساوی فاصلے پر رکھے ہوئے ایسے تین شہابیے ہمارے پورے کرے کو پروگرام دے کر سکیں گے

نیا مصرف

بے شک مصنوعی چاند جیسے جیسے آسمان پر واقع ہوتے جائیں۔ ٹیلی ویژن عرسیل کے ضمن میں دریافتیں ایسے فلکی بازترسیلی مقامات کو غیر ضروری بنا چکی ہوں گی اسی علامت کے اعتبار سے یہ نئی دریافتیں موجودا فاسی آر ایلو سے کہیں بڑھکر شہابیوں کے نئے نئے استعمال کی پیش بینی کر سکتی ہیں

اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں شہابیے غیر مستحکم ہوں گے لیکن رفتار رفتا یہ مستحکم کیے جا سکتے ہیں۔ فلو قت قابل دلکشیا یہ کیمیائی ابندھن اس مقصد کا اطمینان دلاتے ہیں۔ ہمیں ضرورت

وقت کی کثیر مالی ذمہ داریوں کی اور پہلے سے معلومات تکنیکوں کو سدار نے کے لیے وسیع اطلاقات کی۔

آدمی کے بنائے ہوئے چاندوں کے چھوڑے جانے سے ہماری ساری کی ساری فضا کو زیر نگیں کر لینے کے دیرینا خواب ایک نئے موقف میں آجائیں گے۔ فضائی جہاز اصول اب بھی تیار کیے جاسکتے ہیں۔ گم شدہ اڑان بس ایک نیا سبک اور ناقابل تصور حد تک طاقت ور انجن ہے..... اور وہ یقینی موجود ہے قوت دھکیل کے لوازمے یعنی ٹوٹے ہوئے جوہر ہیں۔

جس دم یہ دستیاب ہو جائے چاند کی سمت جوہری طاقت والی اڑانیں اور دوسرے سیاروں کی طرف غایت درجے طول طویل اڑانیں آسان ہو جائیں گی۔ فضائی اجنبیوں سے سفر تصادفی انسانیت کا دیرینا خواب حقیقت بن جائے گا۔ اس کے وقوع میں آنے کا تیر بنا اس وقت سے پہلے ہی سے جس کا کہ اندازا لگنا خیز سے واقف شخص ہی کر سکتا ہے۔

الگزینڈر اور اس کے رفقا نے تینتیس برس پہلے ایک راکٹ تیار کیا اور اسے ایک میل کے عمودی افقی فاصلے تک چھوڑا یہ تجربہ بارہ کالے وائٹنگ ٹن کے میزائلوں میں ممالک محدہ کے فوجی عہدے داروں کی موجودگی میں کر دکھایا گیا۔

وائیٹ اسانڈز نیو میکسیکو کے آزمائشی میدان کے راکٹ رکارڈ نے اس کارنامے کو حقیر و ناچیز کر دکھاتے ہیں۔ یہاں والے جرمنی سے چھینے ہوئے ایک وی ٹو راکٹ کو ایک سو چوراسی میل اوپر تک بھیج چکے ہیں اور تو اور اس منزل کو بھی پیچھے برس عبور کر لیا جا چکا ہے جبکہ ایک وائیکنگ ٹائپ راکٹ ایک سو پینتیس میل اوپر تک گیا۔

یہ رہی انکرے راکٹ کی روئیداد۔ ایک دور رکنی یا دو منزلا راکٹ گنجائش کو نہایت وسیع کر دیتا ہے۔ وائیٹ اسانڈز والوں نے ایک جرمن وی ٹو کو دوسرے راکٹ کے نچلے حصے یا پہلے درجے کے طور پر استعمال کیا اور ایک امریکی ساخت (اصطلاحی نام ڈبلیو اے۔ سی کارپورل۔) کو بالائی حصے یا دوسرے درجے کے طور پر۔ یہ دوہرا راکٹ چھوڑا گیا تب نچلے وی۔ ٹو حصے نے اپنی انتہائی اونچائی نہ سہی اپنی انتہائی رفتار تو حاصل کر لی۔ راسی حصے۔ ڈبلیو اے سی کارپورل کو داغا گیا اور وہ زمین سے دو سو پچاس میل کی اونچائی پر پہنچ گیا۔ ایک مہماوقتی راکٹ فائم ہو گیا۔

دو سو پچاس میل کی اونچائی پر راکٹ کمرہ ہوا کی کے زمینی غلاف کو چھوڑ چکا تھا۔ یہ وہاں پہنچ گیا جسے سائنس داں "خلائی فضا" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس اونچائی پر دی ہوئی فضا کی اکائی میں کہتر سالمات ہوا ہوتے ہیں۔ بمقابل اس بہترین خلا کے جس کو ہم زمین پر پیدا کر سکتے ہیں۔

جاں فزا حقیقت

اس میدان میں آیندہ ترقی کی راہ میں سب سے جانفزا حقیقت یہ ہے کہ ایک دو منزلا راکٹ خالی فضا میں پہنچ گیا۔ سائنسداں ایک تین منزلا راکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ جو اور بہت زیادہ دوری تک جا سکے۔ اور آخر کار لاتناہی سفر کر سکنے کے قابل ایک کثیر منزلا راکٹ تیار کیا جائے گا۔ سطح زمین سے پرے کوئی ہوا یا حادثہ زمین کی مزاحمت نہیں کہ جس کو مغلوب کیا جائے۔ اس لیے بڑے فاصلے غیر معمولی رفتار سے بہت ہی خفیف۔ طاقت کی مدد سے طے کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ایک شہابیے سے شروع ہونے والی بین سیاراتی اڑان موجودا کیمیائی ایندھنوں کی مدد سے ممکن ہو جاتی ہے۔

مصنوعی شہابیے کی تخلیق ایک ایسے کثیر منزلا راکٹ کی تیاری سے مکمل ہو جائے گی۔ جس کی راسی اکائی ایک سو چھبیس میل اونچائی پر پہنچ چکنے کے بعد خد بخد رخ بدل دے گی۔ اس میں (پہلے ہی سے قابل حصول) ایک میکانیت رہے گی جو ایک مخصوص اونچائی پر راکٹ میں ایک طرف کو جھکاؤ پیدا کر دے گی۔ وہ اوپر کی سمت حرکت کرنا روک دے گا اور افقی سمت میں سطح زمین کے متوازی حرکت کرنا شروع کر دے گا۔

کسی مزاحمت سے دوچار نہ ہونے کی وجہ اس کو کسی ایندھن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بلکہ حالت سکون کے زیر اثر وہ زمین کے اطراف مدار پر گھومنے لگے گا جیسا کہ ہمارا چاند گھومتا ہے۔ یہ حقیقت میں ہمارا شمسی کا ایک مصنوعی جز ہو گا۔

۔۔۔ایک آدمی کا بنایا ہوا چاند۔

شہابیے کا مدار

آخر کتنی اونچائی پر شہابیوں میں گیر ڈالا جائے گا تاکہ وہ اپنے مقررہ مدار پر قایم ہو جائیں۔ یہ سخت ہے۔ ان مصرفوں پر جن کے لیے شہابیے استعمال کیے جائیں۔ شہابیا زمین سے جس قدر قریب ہوا اسی قدر نیزا سے ہمارے کرے کے اطراف گھومنا چاہیے تاکہ مدار پر اپنے مقام کو برقرار رکھ سکے۔ سطح سمندر سے چار ہزار میل اوپر اسے اتنی کافی تیزی سے حرکت کرنا ہوگا کہ چار گھنٹوں کے اندر زمین کا چکر پورا کر سکے۔

شہابیے کو فضا میں کوئی بہت زیادہ دوری پر رہنے کی ضرورت نہیں بلکہ کرہ ہوائی کے زمینی غلاف کے ٹھیک باہر (یعنی تین سو یا ساڑھے تین سو میل) تاکہ ایک عالی شان فلکی تجربہ خانہ مہیا کیا جا سکے۔۔۔۔۔ فلکی تجربہ خانہ ایک مشاہدہ مقام جہاں سے مشاہدین تاروں کا مطالعہ کر سکیں اور سلسلہ حالات کو سارے کرہ ہوائی میں جاری رکھیں۔ موسم کا نہایت وسیع اندازہ آسان اور صحی نہ ہوگا۔ کا سمک شعاعوں کا مطالعہ کیا جا سکے گا۔ ہوا اور پانی میں موجود ہوائی جہاز اور بحری جہاز راکٹ رانی میں راکٹ رانوں کی رہنمائی کے لیے شہابیے کی سمت ریڈار شعاعیں بھیج سکیں گی۔

سطح سمندر سے کسی شہابیے کا دل چسپ ترین فاصلہ یا تیس تا تین سو میل ہوگا۔ اس فاصلے کے مدار والا راکٹی جہاز ایک دن میں ایک نہ زمین کے اطراف گردش کرے گا۔ اس کے رستے کو آنکھ اتنوا کے متوازی رکھا جائے تو یہ آسمان پر ساکن دکھائی دے گا ایسا ایک بکھڑا ہوا اسٹیشن ملکی و غیر ملکی بازرسیل کے مقاصد کو پورا کرے گا بارے وجود امیدھنوں کی مدد سے۔ یعنی جو ہری قوت دھکیل کی دریافت سے پہلے ناممکن تھا۔ ہم ایک بڑا راکٹ اوپر بھیج دیں جو ایک تجربہ خانے کی حیثیت سے کام دے۔ اس لیے سائنس داں اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ تجربہ خانے کی قسطیں اوپر بھیج سکیں جو فضا میں اکٹھے ہو جائیں۔

آوک جاوک کا انتظام

ایک کے بعد ایک راکٹ نکلیں گے اپنا ایندھن خالی کر دیں گے اور زمین کو واپس آ جائیں گے۔ واپسی کے سفر میں پھر کرہ ہوائی میں داخل ہوتے وقت پیشتر راکٹ رفتار کو کم کرنے کی خاطر معکوس دھکیل والے جیلوں کا استعمال کریں گے ورنہ ہوا کی رگڑ راکٹ کو جلا دینے کے لیے کافی حرارت پیدا کرے گی ان کو بعد میں رفتار کے آسان کنٹرول اور اصلی پھر پھراڈے پر بہ حفاظت اترنے کے لیے پنکھ بھی مہیا کیے جائیں گے۔

شہابیے کی یک جائی داب کپڑوں میں ملبوس اشخاص کے ذریعے عمل میں لائی جائے گی۔ زمین سے اتنے کافی قریب ہونے کے باوجود کہ اس سمت میں کشش کیے جا سکیں۔ شہابیے پر کی ہر چیز اور ہر شخص قوت جاذبا زمین کے بغیر تابع معلوم ہوگی۔ لوگ ایسا محسوس کریں گے گویا وہ "بے وزن" ہیں انگلی کا محض ایک دھکا انہیں لامتناہی میں اڑا لے جانے کے لیے کافی ہوگا۔ ایسی صورت میں سا ز و سامان اور لوگوں کو دونوں کو شہابیے سے بندھنا پڑے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر فرد کو "باو کے زیر اثر ہوا" کے زیر اثر دھکے دلے ایک ایک ساتھی جیٹ کے ساتھ تیار رہنا پڑے گا۔ اس طرح مثال کے طور پر اگر وہ اڑنا شروع کر دے تو اصلی مقام پر اپنے آپ کو لوٹا سکے گا۔

اس نقص پر صرفا اسی طرح قابو پایا جا سکتا ہے کہ ایک قسم کی تالیفی قوت جاذبا زمین مہیا کی جائے۔ جو شہابیے کو محوری حرکت عطا کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طور پر کہ وہ اپنے محور پر اس وقت جب کہ اپنے مدار پر حرکت کرتا ہے۔

ایک یونی فارمٹ چکر کی مانند

ایک حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہابیے کو ایک بہت بڑے چکر کی شکل میں ایک جایا جائے جو اپنے ہی کے اطراف گردش کرے۔ یہ گردش شہابیے میں ایک مرکز گریز قوت پیدا کر دے گی اور اپنی باری پر دباؤ کے زیر اثر یہ کے اندرون میں قوت جاذبا زمین کا معادل پیدا کر دے گی جہاں اہالیان راکٹ رہ کر کام کر سکیں گے۔ تجربہ خانے اور اس کے ساز و سامان کے میلے کے لیے درکار قوت قیاس سورج کی شعاعوں سے حاصل کی جائے گی۔

غیر اصولی اعتراضات

انسان کے بنائے ہوئے شاہ پاروں کا تصور بدقسمتی سے اس کی خوف ناک حربی اصطلاحوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو پہلے سہل شہابے کو چھوڑیں گے اور اس پر اپنا اختیار چلا سکیں گے دنیا پر حکمرانی کر سکیں گے یعنی اس طرح کہ وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ دیکھیں۔ سنیں اور معلوم کریں کہ نیچے کیا کچھ ہو رہا ہے اور یہ کہ وہ اپنے اڈے کو بموں اور چھینک مار ہتیاروں کے لیے ایک کامل متحرک بچاؤ کے طور پر استعمال کریں گے۔

لیکن اس نوعیت کے خیالات کو میں شمار میں نہیں لاتا۔ غیر اصولی حربی اعتراضات ہمیشہ جدید سائنسی ارتقا پر کیے ہی جاتے ہیں۔ تمام جنگ بازوں کے سلاح خانوں میں وہ عمل محض جزوی ہتیاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ اگر ایک شہابے کو اس کے مدار پر چلا سکتے ہیں تو آپ اس قابل بھی ہو جائیں گے کہ زمین پر سے اس کو ہٹا دیں اور پاش پاش کر دیں تب آپ لوگوں تباہ سف کے لیے ایک مقابلا ہو گا۔ عجب نہیں کہ ہتیار بنانے کا اختراع اس وقت تک کے لیے جنگ کو روک دے جب کہ نوع آدم کو رضا کارانہ طور پر جنگ سے دست بردار ہو جانے کے لیے فہم و ادراک حاصل ہو جائے۔

منتقبل کا فضائی جہاز

الگزینڈر کا کہنا ہے کہ اس کو یقین ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے چاند مستقبل کا یقین ہی چاہیے بالغ کیمیائی ایندھنوں کا نتیجہ ہی سہی فنی مسایل زمانہ حال کی انجینیرنگ کے دایرہ عمل میں حل کیے جانے کے لیے خوب ہیں۔ لیکن جوں ہی جوہری توانائی پلٹاؤ و انجنوں میں استعمال کے لیے تیار ہو جائے۔ بحری و جہتیں بے اندازہ فراخ ہو جائیں گی تب پہلا جوہری فضائی جہاز ہمارے بس میں ہو گا۔ حقیقت میں سیارہ انجنی سے تعلق رکھنے والے ہم لوگوں میں سے اکثر لوگ تعمیر شدہ فضائی جہاز کے منونے کا ایک بہت ہی اچھا تصور رکھتے ہیں۔

ہوائی حمل و نقل کے حق میں جوہری قوت دھکیل اس قدر انقلابی ہو گی کہ یہ ہمارے تصور کو زیر و زبر کر دیتی ہے ہوائی جہاز کے بازوؤں اور امدادی میدانوں کی مزید ضرورت نہیں پڑے گی کسی بھی جسامت کے ہوائی جہاز بڑے بڑے ایرلائینروں سے لے کر انفرادی ران اباؤٹس تک ۔ ایک حقیقت ہوں گے۔

فضائی سفر کے لیے بھی بالکل یہی صورت ۔ ۔ ۔ تقریباً جہازوں سے لے کر سیاروں تک قریب قریب غیر مختتم قابل دغلیا قوت دھکیل کی بدولت مستقل رفتار سے پرواز کرنے کے اپنے دیرینہ تصور۔ اتنے سہل فی گھنٹا ۔ کو ہم ہتیا کے لیے چھوڑ دیں گے ہم ترقی پذیر رفتار کی ایک مستقل شرح (اسراع) سے پرواز کریں گے یا ثقل پذیر رفتار کی ایک مستقل شرح (ابطاع) سے۔

ہمیں زمین سے بیرونی فضا کو اس طور پر پرواز کرنا ہمیں پڑے گا کہ ایک آپ ہمیں داغ دے۔ ہمارا فضائی جہاز معتدل رفتار سے اوپر کو اٹھنا شروع کرے گا۔ (تاکہ رگڑ کی وجہ پیدا کی ہوئی زاید حرارت سے بچا جا سکے۔) جب تک کہ یہ کرہ ہوائی سے ادھر نہ ہو جائے اور یہ اپنی رفتار کو آہستہ آہستہ اس طور پر بڑھائے گا کہ مسافرین اپنے آپ کو اسراع یا رفتار کے تغیر سے موافق کر لیں۔ ہلکے اطمینان پہلے پہلے مسلسل ترقی پذیر رفتار کے ساتھ دکھائی دے گی۔ اور اس کے بعد منزل مقصود تک تقریباً آدھا سفر ۔ ۔ ۔ ایک مسلسل تنزل پذیر رفتار کے ساتھ (ابطاع)

چاند تک سفر

کسی خلائی جسم کا اولین انسانی حملہ یا شاید چاند ہی کا ہو گا۔ دو لاکھ چالیس ہزار میل کا دور کرنے کے لیے ہمیں بہت زیادہ رفتاریں پیدا کرنا ہوں گی لیکن چال (رفتار) اور رد ہے کہ انسانی جسم کے حق میں کوئی خطرا نہیں ہے۔ جو چیز اثر انداز ہوتی ہے وہ ہے اسراع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ شرح جس سے رفتار بڑھتی ہے اور ابطاع۔ میں اس پر اس وجہ سے زور دینا چاہتا ہوں کہ فضائی جہاز والے میرے تصور کا یہ ایک لازمی جزو ہے۔

چنانچہ وہ رفتار نہیں بلکہ اس کے بڑھنے اور گھٹنے کی شرح ہے جو ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ہم ان شرحوں کو بہت تیزی کے ساتھ نہیں تبدیل کریں گے۔ مادہ ہتیس فیٹ فی سکنڈ کی شرح سے زمین پر گرتا ہے اس لحاظ سے اضافہ رفتار کی شرح کے تناسب قوت کو "اکائی قوت جاذبہ زمین" یا ۱ ج کہا جاتا ہے۔

جب ہم کرہ ہوائی کو چھوڑ دیتے ہیں تو قوت جاذبہ زمین گھٹ جاتی ہے۔ اس لیے اس خسارے کی تلافی ہم اپنی رفتار اضافے سے کریں گے یہ مسلسل اسراع ہمیں مصنوعی جاذبہ زمین کا احساس عطا کرے گا خلائی فضا میں ہم کو رفتار میں بتیس فیٹ فی سکنڈ کی ترجے سے مسلسل اضافا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ معمولی جاذبہ زمین یا آرج کی کشش کو برقرار رکھا جا سکے۔

تقریباً تین گھنٹے مثال کے طور پر چاند تک کے سفر میں ہمارا جہاز اس وقت تک اسراع کرتا رہے گا جب تک کہ وہ سفر کی قریب قریب نصف مسافت کی منزل کو نہ پالے اور اس نوبت پر اس کی رفتار ایک لاکھ چالیس ہزار میل فی گھنٹہ تک پہنچ چکی ہوگی تب یہ رفتار کو کم کرنا شروع کرے گا یا بتیس فیٹ فی سکنڈ کی مستقل شرح سے پھر ابطاع کرنے لگے گا۔ ان بنیادوں پر کل سیر کے لیے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے درکار ہوں گے۔

جولس ورن اور فضائی سفر کے دوسرے ماہرین نے قوت جاذبہ زمین کی کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ اور بے حسی کو بیان کیا ہے۔ فضائی جہاز جس کے امریکن ہونے کا مصنف کو یقین ہے ان باتوں کو صحیح ثابت نہیں کرے گا۔ رفتار میں مسلسل اضافا اور کمی ایک ایسی معقول تلافی قوت جاذبہ زمین مہیا کرے گی کہ مسافرین کو مسافرین ایسے ہی پرسکوں رہیں گے گویا وہ گھر میں آرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

نازک لمحا فضائی سفر میں نازک لمحا وہ گھڑی ہوگا یعنی اسراع سے ابطاع میں تبدیلی۔

اس نوبت پر جہاز اس نزکیب کو کام میں لائے گا جس کو فن ہوابازی میں ہم موٹر یا نصف گھماؤ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مسافرین اس پر مشکل ہی سے دھیان دے سکیں گے مگر کارانتظامات کے کنٹرول میں ہونے سے جہاز کچھ ایسی رفتار سے اور کچھ ایسے نصف قطر پر مڑے گا رس کی جٹ ناک کچھ ایسا ٹھیک طور پر کام کرے گی کہ دیکھتے کا دیکھتے چاند چاند جو "اوپر" واقع تھا۔ آن کی آن میں نیچے آجائے گا۔

وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ اس مہم کا زمانا ابھی دور ہے سخت مغالطے میں ہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف اس مہم کی تجربی وسعتیں ہمارے کل ماضی کی کسی بھی تجربی وسعت سے حیرت انگیز بتمول انسان کے بنائے ہوئے نئے چاند۔ نئی نسل کے حضور میں دامن پھیلائے کھڑی ہیں۔

غزل

ہمارے عشق و محبت کے راز۔ راز رہے
وہ بے نیاز بھی رہ کر نہ بے نیاز رہے
نظام کہنہ سے الجھا ہوں عزم تو لے کر
مرے وطن کے جوانوں تمہیں پہ ناز رہے
سنبل سنبل کے یہاں رکھ قدم دل ناداں
یہ بزم غیر ہے اتنا تو امتیاز رہے
شکست دل سے یہ عقدا بھی کھل گیا آخر
وہ نغمہ نغمہ نہیں جو رہین ساز رہے
ابل پڑے مرے دل سے وہ مضطرب نغمے
جو آج تک مری فکر و نظر کا راز رہے
غم جہاں کی نہ کچھ فکر کر دل ناداں
دعائیں مانگ کہ در میکدے کا باز رہے

متاع درد کہاں جو غم حیات نہ ہو
غم حیات سے لازم ہے سازباز رہے

وشوا ناتھ درد

سیاہ دھبوں سے پرے

ایاز عصمی

اچھی کی یہ کچھ عجیب سی عادت تھی کہ صبح سویرے جوں ہی نکلے کی مسجد سے کھلا کھلا اپنی بھرائی ہوئی آواز میں اذاں پکارتا وہ لپک کر بستر سے اٹھتی اور سرہانے کی کھڑکی کھول دیتی۔ جیسے موذن نے اذاں کے دوران میں کھڑکی کھولنے کے متعلق بھی کوئی ہدایت دی ہو۔

کھڑکی کھلتی اور دھندلا دھندلا سا اجالا کمرے میں گھس آتا۔ دھیرے دھیرے یہ اجالا زمین پر گرے ہوئے تیل کی طرح پھیلتے پھیلتے پورے کمرے پر تقابض ہو جاتا۔ دور۔ سیمل کے اونچے درختوں کی پھننگیوں کی اوٹ سے سورج کا مسکراتا ہوا مکھڑا ابھرتا اور کرنیں کھڑکی کی پرمنڈے ہوئے لوہے کے گھنے تاروں کے بیچ سے گذرتی ہوئی کمرے کی مٹیالی اور ملگجی دیوار پر ایک سنہرا جال تان دیتیں۔

کرنوں کے بنتے ہوئے اس جال کو دیکھ کر میں سمجھ جاتا کہ دفتر جانے کا وقت قریب ہو گیا ہے یہ اچھی کی اس عادت کا ہی نتیجہ تھا کہ ہمارے گھر میں کوئی گھڑی نہ ہونے کے باوجود اس تاریک کوٹھری میں بھی یہ اندازا ہو جاتا کہ دفتر جانے کا وقت قریب ہو گیا ہے۔

اچھی کے سر میں سخت درد ہونے کی وجہ سے ایک دن وہ کھڑکی نہ کھولی اور میں دفتر دیر سے پہنچا تو مجھے اس خامش کھڑکی کی اہمیت کا اندازا ہوا اور اب میں ہی اکثر کہتا "کھڑکی کھولدو ——— "اچھی"

"کیوں کھولدوں" اچھی مجھے چھیڑتی "آج تو انوار رہے نا"

"اچھی ——— باہر سورج اپنی روشن مشعل لیے ہماری اس اندھیری کوٹھری سے سیاہی نوچ پھینکنے کو آگیا ہے" اور میں خود ہی اٹھ کر کھڑکی کھولدیتا "دیکھو اچھی دور سے سیمل کے سرسبز درختوں پر سرخ سرخ پھول کسی نویلی دلہن کی طرح گردن جھکائے کتنے حسین نظر آرہے ہیں۔ تمہیں یاد ہے اچھی وہ رات! جب تم بھی انہیں پھولوں کی طرح گوٹا کناری کے سرخ جوڑے پہنے اس اندھیری کوٹھری میں آئی تھیں۔

"ہاں!" اور اچھی کا چہرا ملول ہو جاتا۔

"کیا بات ہے اچھی! میں اسے اداس دیکھ کر بتیا دیتا

"کچھ نہیں ——— کچھ بھی تو نہیں"

"اچھی ———"

"سوچتی ہوں ہماری زندگی بھی اس تاریک کوٹھری سے کس قدر ملتی جلتی ہے۔ روز صبح کا سورج اسے اپنی روشنی سے منور کر دیتا ہے اور رات کی تاریکی اس اجالے کو اچک لیتی ہے۔ کیا ہماری زندگی میں کبھی ویسا اجالا آئے گا بھی ——— اجالا"

"ہاں اچھی ضرور آئے گا۔ دیکھو ہم لوگ آزادی کے لیے کتنی جد وجہد کر رہے ہیں۔ یقین رکھو جو چیزوں کا خون کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ آج نہیں تو کل ہم ضرور ضرور اپنی کوٹھری ہی نہیں سارے ملک میں مشعل جگمگا ہٹ لے آنے میں کامیاب ہوں گے ضرور ایسا ہی ہوگا اور ہمارے کمرے کی کارنس پر سے ایک گوریا اپنے پر پھڑپھڑاتی ہوئی باہر اڑ گئی۔ چند لمحوں تک کمرے کی خاموش فضا میں ایک سناٹا سا چھایا رہی۔ جیسے وہ دونوں ہی میرے اس دعوے پر موقہ دبا کر ہنس رہا ہو۔

"صحیح؟" اچھی کے ہونٹوں پر ایک تبسم دوڑ جاتا۔

"ہاں اچھی تم دیکھنا ہم بہت جلد آزاد ہو جائیں گے۔ ہمارے ملک میں ہوگی عہد ماضی کی تمام کلفتیں دور ہو جائیں گی۔ ہمارے حسین خوابوں کی تعبیر نظر آئے گی۔ ہر طرف عدل و مساوات اور امن و انصاف کی دلفریب تصویریں ابھر آئیں گی۔ ہمارے آنگن میں ایک نور ایک

اجالا چھا جائے گا۔ کتنے حسین ہوں گے وہ دن اور کتنی دل کش ہونگی وہ راتیں ——— اور سچ مچ جب وہ دن آئے جن کے حسین ہونے کی تو قع تھی تو وہ حسین نہ تھے اماوس کی رات کی طرح سیاہ تھے۔ آزادی کی دیوی آئی ایک شور اٹھا "اجالا آگیا" مگر نور کی یہ دیوی خونخوار بھیڑیے کی طرح انسانیت پر ٹوٹ پڑی اس طرح جھپٹی کہ اس کا چہرا لہو لہان ہوگیا ——— عوام نے گرہستیاں لٹا کر اپنے پیاروں کو کھو کر گھر بار چھوڑ کر قسم قسم کے دکھوں سے اس دیوی کا سواگت کیا ہمھوں کی مجسمہ نگاہیں "متوقع اجالے" کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کہتے ہیں وہ اجالا دیوی کے سر پر تھا اور دیوی کا سر ——— اونچا تھا ——— بہت اونچا ——— اتنا اونچا کہ اس اجالے سے صرف اونچے اونچے محلات ہی روشن ہوسکے وہ اجالا جس کے استقبال کے لیے سڑکیں خون سے دھوئی گئیں۔ نئی نئی سرحدیں بنائی گئیں۔ گھر پھونک تماشا رچایا گیا۔

اب تو اس زندگی سے نجات کی کیا بات ممکن معلوم ہوتا ہے چلیے ہم بھی یہاں سے بھاگ چلیں۔" اچھی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کوٹھری کے در و دیوار پر نظر ڈال کر کہا۔

"اچھی ——— میرے ہونٹ کانپ اٹھے اور آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

ہمارا چھوٹا سا قافلہ اس نئی لکیر کی طرف رینگنے لگا جس کے پار ہمیں امید تھی کہ اجالا ہوگا۔ ضرور ہوگا۔

راہ میں ہمارے قافلے پر ایک حملا ہوا۔ نہتے انسان مسلح انسانوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ بچے کچھے سامان لیے گردنیں کٹیں عورتیں چھین گئیں۔ انسانیت طرح طرح سے آبرو کی گئی۔ لوٹ اور غارت گری کے بادل ہٹ کے تو اچھی اس اندھیری دھرتی کو چھوڑ کر دور ——— بہت دور ——— موت کے اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں اس سرحد کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ جدھر اسے یقین تھا کہ اجالا ضرور چھایا ہوا ہوگا میرے ہاتھ دھیرے دھیرے اجالے کی طرف بڑھ رہے تھے مگر دل اندھیرے گھور اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں چمکیلے آنسو تیر رہے تھے مگر تیلیاں سکت جا رہی تھیں۔ اور آگے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

وقت کے پیدا کردہ اندھیرے میں بھٹکتا ہوا میں لکیر کے پار آگیا۔ آگے اور آگے ——— اور آگے ———

وہی دن تھے جو پہلے تھے وہی راتیں تھیں۔ سیاہ سیاہ جھونپڑے جو کل روتے تھے وہ آج بھی رو رہے تھے۔ عمارات جو کل مسکراتی تھیں البتہ ان میں سے قہقہے چھوٹ رہے تھے۔

یہاں آکر میں نے اپنی (۲۳) تنہائی اور زندگی کے خلا کو پر کرنے کے لیے ایک پنجابی لڑکی سے شادی کرلی۔ اور اب یہ میرا معمول تھا کہ روز صبح سویرے اٹھ کر اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیتا۔ کھڑکی کی موٹی موٹی سلاخوں کے بیچ سے سورج کی روشنی آکر دیوار پر جیل کے آہنی پھاٹک کا نقشہ بنا دیتی۔ میں اس وحشتناک تصویر سے گھبرا کر کھڑکی کی راہ سے دور دور تک دیکھتا مگر نہ منظر ہی وہ دلکشی ہوتی اور نہ وہ حسن۔ صرف کمرے کی دیوار پر کھڑکی کا سایا مسکراتا ہوا جان پڑتا۔ اور میں اداس ہو جاتا۔ اچھی کی یاد اس کی باتیں بے طرح یاد آنے لگتیں۔ مجھے اداس اور سوچ میں ڈوبا دیکھ کر میری بیوی مجھ سے پوچھتی "کیا سوچنے لگے ہیں؟"

میں دیوار پر سورج کی بنائی ہوئی تصویر کی طرف اشارا کر کے پوچھتا۔ "ان سیاہ سلاخوں کے سیاہ دھبوں کے پرے تم کچھ دیکھ رہی ہو؟"

ہاں! ——— اجالا"

اور ہم دونوں مسکرا دیتے۔

غزل

طبیب شادانی

مان بھی جا و اب منانے سے
بات کیا فائدہ بڑھانے سے

غم نوازی تو دیکھیے دل کی
مسکراتا ہے چوٹ کھانے سے

نیچی نظریں تو اک قیامت ہیں
جانے کیا ہوگا آنکھ اٹھانے سے

بزم عالم میں ہر سرور تو ہے
محفل دل میں ان کے آنے سے

ہے عجب شے متاع عشق طبیب
اور بڑھتی ہے یہ لٹانے سے

سلاخوں کے پیچھے سے

شمیم مظفر پوری

نینی سنٹرل جیل

الہ باد ۲۲ مارچ ۱۹۵۰ء

پیادی!

رات کے دس بج رہے ہیں بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہا ہے اور میرے سینے میں انگارے دہک رہے ہیں۔ کاش ہم ایک ساتھ ہوتے! زندگی کے بہترین لمحوں سے محظوظ ہونے کے لیے اس سے بہتر اور کون وقت ہو سکتا ہے! پیاری! میرے ہونٹوں کی پیاس چمک اٹھی ہے کیا یہ پیاس اب کبھی نہ بجھ سکے گی؟ نہیں! نہیں! شاید ہاں! امید کا دامن ابھی تک میرے ہاتھوں میں ہے اور اسی کے سہارے اس رومانی موسم کی سہمی آزمائی راتیں سکون کے ساتھ گذارنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ آج ہماری سرکار جو سامراجیت سرمایہ داری اور زمینداری کے سڑے گلے ستونوں پر قائم ہے ایک ایسے دور میں داخل ہو چکی ہے کہ اس نے دونوں کی یکجائی بھی مشکل کر دی ہے کون جانے اس کی فاشستی ظلم کی نرغہ میں کاہ پر عوامی تحریکوں کے لیے اب اپنی زندگی بھی قربانی دینے کی ضرورت پڑ جائے پھر بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ یہ نظر آنے والا نظام دم توڑ رہا ہے دنیا کے نصف حصے پر عوام کی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ یہاں بھی جنتا کا راج قائم ہو جائے۔ ہندستانی عوام کی طاقت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے امید ہے کہ حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے تم اخباروں کا مطالعہ ضرور کرتی ہوگی۔

بارش تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ بجلی کڑک رہی ہے اور من کی پیاس بڑھتی ہی جا رہی ہے ہم میں بارک میں رہتے ہیں کافی لمبی ہے اس میں دروازے کے برابر دو طرفا پندرہ پندرہ آہنی جنگلے لگے ہوئے ہیں۔ باہر سے ایک جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر بیرکی بارک کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

ہوا کے ساتھ ساتھ پھواریں بھی آ رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان آہنی سلاخوں کو توڑ کر اور ان اونچی دیواروں کو پھاند کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ پیاری اگر ایسا ہو سکتا تو کتنی اچھی بات ہوتی ہم لوگوں پر بڑی سخت نگرانی ہوتی ہے اتنی سخت بارش کے باوجود دو دو پہرے دار موجود ہیں اور گھوم گھوم کر دیکھ رہے ہیں کہ ہم لوگ کہیں بھاگنے کی تیاریاں تو نہیں کر رہے ہیں۔

ہمارا سامان جو کوتوالی میں زبردستی چھین لیا گیا تھا اس کے لیے ہم لوگوں نے پانچ دنوں تک بھوک ہڑتال چلائی تھی جو ہماری کامیابی پر ختم ہوئی۔ ہمارا تمام سامان جوں کا توں ہمیں مل گیا ہے۔

تمہارا خط مل گیا تھا تم لکھتی ہو کہ اس دفعہ تم میری جدائی بہت محسوس کر رہی ہو اور یہ کہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ پیاری جتنا ہم تم اس ڈھائی سو سالوں میں قریب ہوئے ہیں اتنا کبھی نہیں ہوئے تھے اس عرصے ہی میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانا ہے ایک دوسرے کو سمجھا اور پرکھا ہے لیک دوسرے کو دل و جان سے پیار کیا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ اب ہمارا پریم اٹوٹ ہو گیا ہے اور تمہاری قربانیوں نے یہ سمبندھ کو اور بھی گہرا اور مضبوط کر دیا ہے۔ تمہارے پہلے لفافے کے جواب میں ایک کارڈ بھیج چکا ہوں معلوم نہیں ملا یا نہیں۔ یہ خط تکرم سے بھیج رہا ہوں تاکہ یہ تم تک ضرور پہنچ جائے یہ تکرم اس جیل کی زندگی کا ایک اہم لفظ ہے۔ اسی کے سہارے تمام قیدی سالوں قید بھگتتے کھیلتے گذار دیتے ہیں۔ تکرم کی مدد سے یہاں ہر کام چٹکیوں میں ہو جاتا ہے۔ اسی تکرم کی بدولت ہر قیدی سرکار کی نام نہاد خاطر و تواضع کے خلاف برابر زور سے بھڑ مچاتا رہتا

ہے اور اس نکتہ کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں نوکر شاہی کے تمام پرزے دن رات متحرک رہتے ہیں جیل کے ملازمین خصوصیت کے ساتھ وارڈروں کی تنخواہ اتنی قلیل ہوتی ہے کہ اس کے بغیر ان کا گذر ناممکن ہے۔

منی کا کیا حال ہے؟ اس کی بیماری کا حال پڑھ کر کلیجا کٹ کر رہ گیا۔ جیسے بھی ہو لیکن اس کا علاج معقول ہونا چاہیے۔

وہ میری امانت ہے اس کی حفاظت ہر حال میں کرتی رہنا۔

تم مجھے ہر ہفتے خط لکھ دیا کرو۔ تم لوگوں کی صحت کے متعلق ہمیشہ تشویش رہتی ہے۔ نیم کی پتڑا ئی لکھائی کا کیا حال ہے؟ اس کو خوب جی لگا کر پڑھنے کی تاکید کر دو۔

بارش ایک چکی ہے۔ مچھر بے حد ستا رہے ہیں اچھا اب رخصت! میرا بہت بہت پیار کہنا۔

تمہارا پیارا
سمیع

ہفت روزہ فلمکار لاہور

کا

نئے فلمی چہرے

نمبر آج کل بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں فلم انڈسٹری میں داخل ہونا چاہتے ہیں مگر انہیں واقفیت اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ناکامیاں کے گرد چکر کاٹ کر ناکام واپس آجاتے ہیں اسی طرح بہت سی فلم کمپنیاں نئے چہرے پیش کرنا چاہتی ہیں مگر خواہش مند اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ چناؤ مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ چند مشہور پروڈیوسر ڈائرکٹر حضرات کے ایکا پر ادارہ فلمکار نئے چہروں کو فلمی دنیا کو متعارف کرانے کے لیے نئے فلمی چہرے نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں خلاصہ اس کام کرنے کے خواہش مند لڑکوں اور لڑکیوں کے مختصر حالات زندگی اور فوٹو شائع کیے جائیں گے۔

فلمکار کا چونکہ تقریباً ہر پروڈیوسر ڈائریکٹر مطالعہ کرتا ہے اس لیے اگر آپ فلم ایکٹر بننا چاہتے ہیں تو اپنی خوبصورت سی تصویر بمعہ نام ولدیت تعلیم، قد، رنگ، وزن وغیرہ کا مکمل کوائف بھیج دیں تاکہ نمبر میں شائع کی جا سکے۔ منیجر فلمکار

تاریخی دور سے پہلے کی تصویریں

بورنیو کے بورنیو میں ڈاروڈوں کا صوبہ ہے۔ ملک کے دکھنی حصہ میں جو کہ ایک پہاڑی خطہ ہے اور کئی ایک قلعوں سے گھرا ہوا ہے ماٹینگنگ کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ان میں سے ایک قلعہ چیٹو ڈی لسکار ہے جو ۱۰۰ کے لگ بھگ بنایا گیا تھا مگر اس میں کسی کو بدقسمتی نصیب ہوا تھا یہ قلعہ کوئی خاص تو اپنی اہمیت کو رکھتا نہیں تھا اور ۱۹۴۰ء میں اگر دو اسکول طلبا نے ایک سنسنی خیز انکشاف نہ کیا ہوتا تو شاید ہی کوئی شخص اس قلعہ کے نام تک سے واقف نہ ہوتا۔ ہوا یوں وہ دو طالب علم گھومتے گھامتے اس قلعہ کے کھنڈرات میں چلے گئے جہاں انہوں نے دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی دیکھیں لیڈناں جب اس کی چھان بین کی گئی تو ماہرین نے بتایا کہ یہ تصاویر ۔۔۔ پہاڑ پر بنی ان تصویروں میں زیادہ تر جانوروں کا تھا جن میں بونی بارہ سنگھے گھوڑے شامل ہیں بعض بعض مقامات پر انسان اور حیوان کی جنگ دکھائی گئی تھی۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں بھی انسان نے حیوانوں میں دلچسپی لی لیکن اس وقت بھی انسان کو خاص خاص قسم کے جانوروں ہی سے واقف تھا جہاں تک چھوٹے موٹے جانوروں یا کیڑوں مکوڑوں کا تعلق ہے ان لوگوں کو اس بارہ میں کوئی علم نہ تھا یہ تو بہت بعد کی یعنی تھوڑا عرصہ ہی کی بات ہے کہ جن کیڑوں مکوڑوں کو انسانی آنکھ مکتہ دیکھ سکتی تھی انسان نے ان میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ جب مائیکروسکوپ کی ایجاد کا استعمال ہونے لگا تو یہ کیڑے مکوڑے اور بھی زیادہ نمایاں صورت میں ہمارے سامنے آنے لگ گئے۔

ان میں سے ایک اہم ترین انکشاف یلاشیہ سر ہوائلڈ اس نے کیا تھا جنہوں نے ۱۹ ویں صدی کے آخر میں بتایا تھا کہ جو لوگ ملیریا کے خون کا مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کے اندر اس کے جراثیم ہوتے ہیں۔

ملیریا ایک ایسی لعنت ہے جو دنیا بھر کے گرم ممالک میں لاکھوں لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ کونین کا استعمال کیا جائے۔

شاہی ملیریا فیشنر نے ملیریا کے ماہرین کی جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے بھی ۱۹۳۰ء میں شائع کردہ اپنی رپورٹ میں اس بات کی سفارش کی تھی اور یہ سفارش دیا تھا کہ ملیریا کے موسم کے دوران میں اگر کونین کا استعمال کیا جائے تو ملیریا کے خطرہ کو بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ ان سفارشات پر عمل کر کے اس لعنت سے بہت حد تک چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے

بہمن ۔ اسفندار ۱۳۳۶ ف ہندستانی ادب دسمبر ۱۹۵۷ء جنوری ۱۹۵۸ء

اقبال — ایک مطالعہ

عبدالحبیب ایم۔ اے

اقبال فن کار ہے اقبال مفکر ہے، اقبال شاعر ہے وہ ایسا قلم کار ہے جو مخصوص زاویہ نگاہ کا مالک ہے وہ فکر و تخیل کی تمام ارتقائی منازل طے کر کے اپنے فن کی تخلیق و تشکیل کرتا ہے۔

اقبال کا نظریہ شعر و ادب اسی "چیزے دگر" کی تفسیر ہے۔

اقبال اس دور میں پیدا ہوا جب نہ صرف شعر و ادب بلکہ ساری ملت اسلامیہ ایک پر آشوب دور سے گذر رہی تھی۔ اس نے ماحول کا بغور مطالعہ کیا اور نہ اس نے صرف کچھ کتاب بلکہ اسے پرکھ نمایاں چیزیں بھی تھیں اس طرح اس نے اس لغاوت کو انقلاب کی صورت دینے کی جس کی داغ بیل آزاد، حالی اور شبلی نے ڈالی تھی فکر کی پختگی اور تخیل کے ارتقا نے اسے ایک مخصوص زاویہ نگاہ کا مالک بنا دیا جس کا اظہار اس نے اپنی مختلف نظموں میں کیا ہے۔ اقبال کے نظریہ شعر و ادب کو چند جہاں سے نکال کر رزم گاہ جہاں میں لایا۔ اس نے شعر و ادب کے کہنہ پیکر میں ایک نئی روح پھونکی جہاں شعر و ادب قوموں کے لیے تازیانہ بن جاتا ہے۔ اقبال اسی صحت مند اور زندہ ادب کا قایل ہے۔ ایسا ادب جس کا منبع ذوق و شوق ہو جس کی پرورش خون جگر سے ہوئی ہو۔ ایک "رواں دواں صفت بیل" ادب جو قافلہائے امم کو کہکشاں کہکشاں لے جاتا ہو جس میں ماضی کی تڑپ ہو حال کی گونج اور مستقبل کی پکار ہو۔ چنانچہ وہ اپنی نظم "امید" میں کہتا ہے ——

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر جذبۂ سرود

زندہ ادب کے لیے خدی کا تحفظ و بقا لازمی ہے۔ جب تک ادب خدی کا پابند نہ ہو ادب عالیہ نہیں بن سکتا اس کی حرارت لہو کو گرما نہیں سکتی۔ وہ ادب نشان راہ نہیں منار راہ بن سکتا ہے۔ چنانچہ دین و ہنر میں اقبال کہتا ہے ——

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اور شعر کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو یوں واضح کرتا ہے

شعلہ سے ٹوٹ کر کے مثل شرار آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

وہ مشرقی شاعری سے اس لیے نالاں ہے کہ —— "اس شعر سے ہوئی نہیں شمشیر خودی تیز" وہ شاعر کو اسی انداز سے مخاطب کرتا ہے ——

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طور نیا برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

مصوری میں بھی اقبال اسی تخیل کا ہمنوا نظر آتا ہے وہ مغرب کی تقلید سے بیزار ہے کیونکہ اس کی مصوری مادر صورت گری ہے۔ وہ مشرقی سوز و گداز اور ذوق و شوق کا حامل نہیں ہے۔ مغربی کی مصوری خدی سے بے نیاز ہے۔

اور ایسی ہی مصوری کے متعلق اقبال کا خیال ہے ——

گریز میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

چنانچہ وہ مصور کو پیغام دیتا ہے ——

معلوم ہیں اے مرد ہنر پیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پیدا بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

موسیقی اور رقص بھی اس سے علیحدہ نہیں ہے۔ رقص اور موسیقی شعر کے لیے جسم اور روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال اس نقطے کا قائل ہے جو پاکیزگی قلب کا نتیجہ ہو اور جس کی حرارت اور تب و تاب سے چہرا تابناک ہو جائے۔ ایسی موسیقی جو صحیفہ کی آلودگی کی پیداوار ہو زندگی کو ہلال کر دیتی ہے۔ ایک حیات آفریں موسیقی کے لیے خدی جز لاینفک ہے۔ خدی اس میں گرمی پہنچاتی ہے اتنا سوز بخشتی ہے کہ اس کے زیر و بم سے تلک کو حیات جاوداں ملتی ہے۔ تاروں کا وجود لگل جاتا ہے۔ انسان غیر خوف سے پاک ہو جاتا ہے اور غلامی کی زنجیروں کو ایک ہی جھٹکے میں توڑ ڈالتا ہے۔ ورنہ موسیقی روح کو "بیمار" بنا دیتی ہے روح افسردہ مضمحل اور بے جان ہو جاتی ہے ——

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نے چنگ و رباب

مغربی رقص جسم کا رقص ہے جسم کے پیچ و خم جس کا نظارا صرف جنسی تشنگی میں اضافہ کرتا ہے اس میں روحانی آسودگی کا سامان نہیں۔ رقص حقیقی روح کا رقص ہے جس میں شان بت شکنی ہے۔ ماسوا سے بے نیازی ہے خیر اعلیٰ سے قطع تعلق ہے

چھوڑ یورپ کے لیے رقص بدن کے پیچ و خم
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم الٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن
صلہ اس فقر کا درویشی و شاہنشاہی

فن تعمیر اور سنگ تراشی میں بھی اقبال کا نظریہ یہی ہے اس کے لیے بھی اس ذوق و شوق کی ضرورت ہے جس کی آفرینش خدی سے ہوئی ہو۔ وہ خدی جس کے زور سے فوارہ سنگ گلاخ زمین سے ابلتا ہے اور مرد مومن گردوں پر کمند ڈال دیتا ہے۔ تعمیر کو جلال و جمال، عظمت، سربلندی اور ثبات کا حامل ہونا چاہیے۔

ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر

اور اقبال سجہ قوت الاسلام کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ مسلمان بے جمیل ہوتو بے نگینی ہے۔ کہ غلامی سے ہو مثل زجاج اس کا وجود

ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکہ بود و نبود

اقبال اہرام مصر کی ابدیت اور عظمت کا قائل ہے وہ فن کا ایک زندہ اور لازوال شاہکار رہے۔

اہرام کی عظمت سے نگوں ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

غزل

کچھ اضطراب کا اپنے سبب بتا نہ سکا
ملا بھی اس سے مگر میں نظر ملا نہ سکا
مٹا کے خود کو بھی اپنا اسے بنا نہ سکا
اس کو پا کے میں یوں کھو گیا کہ پا نہ سکا
کچھ ایسے تھے اثر داستاں میں گم دونوں
کہ حرف رد بھی کوئی زباں پہ لا نہ سکا
نہ اس کو دیکھ سکا دیکھتا اگرچہ رہا
نظر کو جلوہ بیتاب پہ جما نہ سکا
شعاعیں حسن کی چہرے پہ بن گئیں چلمن
نظر اٹھائی مگر یہ حجاب اٹھا نہ سکا
گیا چمن کو میں پھیلائے حرص کا دامن
گلوں سے بھر نہ سکا خار سے بچا نہ سکا
مٹا مٹا سا نشاں آرزو کا باقی ہے
یہ جھلملاتی ہوئی شمع میں بجھا نہ سکا
تھی داستان محبت بلا کی رقت خیز
وہ شوخ سن نہ سکا اور میں سنا نہ سکا
ہے جد و جہد ہی دراصل زندگی واصفؔ
میں بچ کے موجوں سے ساحل کی سمت جا نہ سکا

واصفؔ بنارسی

قمرالدین قمر

طوفان

کردار:۔ (ریڈیائی فیچر)

(۱) چودھری (۲) آوارا (۳) ڈاکٹر

(۴) زہرا ——— (۵) رشید اعمر دس سال

(۶) لالا گھنشام داس ———

(طوفان کا شور۔ ہوا کے جھکڑ چلنے کی آواز۔ بوندوں کی ٹپاٹپ۔ کھانسی کی آواز۔ کھوں کھر کھوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔)

چودھری۔ (تھرتھراتی ہوئی آواز سے) "رفیق ——— رفی ——— تی"

آواز۔ کون ۔ ۔ ۔ ۔ کون ہو (قہقہا) کون پاگل چودھری

آ ا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔ تم سمجھتے ہو رفیق زندہ ہے۔ تمہارے خیال میں اس طوفانی رات میں چیخنے سے دیکھ لو تم پر رحم کھائیں گے اور تمہارا رفیق تمہیں مل جائے گا ——— لوٹ جاؤ چودھری لوٹ جاؤ۔ گھر میں دو جوان لڑکیاں بھی تو ہیں جاؤ ان کی حفاظت کرو جاؤ ———"

چودھری (بگڑ کر) خاموش۔ آوارا بدمعاش۔ تو میرے دروازے پر کھڑا کیا کر رہا ہے بدمعاش"

آوارا۔ تم مجھے آوارا کہہ کر اگر اپنی جھڑاس نکال سکتے ہو تو کہہ لو ہزار بار کہہ لو۔ میں برا نہیں مانوں گا چودھری مجھے تم سے ہمدردی ہے مگر تمہارے پاگل پن سے نہیں۔ آؤ میں تمہیں گھر میں پہنچا دوں"

وقفہ

(طوفان بدستور جاری ہے۔ بجلی کے کڑکنے کی آواز آتی ہے اور ہلکے ہلکے سروں میں کسی کے گنگنانے کی صدا۔)

زہرا۔ (گنگناتی ہے) اے غم دل کیا کروں۔ اے وحشت دل کیا کروں۔

رشید۔ باجی۔ باجی۔ دیکھو میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اس طوفان میں ابا کہاں چلا گئے باجی (بجلی کڑکتی ہے)

ہائے اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ رہی ہو سن رہی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ یہ گنگنانا بند کر دو باجی"

زہرا۔ جاؤ رشید۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ ابا خود سے چلے آئیں گے (پھر گنگنانے لگتی ہے) اے غم دل کیا کروں ۔ ۔ ۔

رشید۔ (آہ بھر کر) باجی تمہیں ابا کی ذرا بھی محبت نہیں"

زہرا۔ "ہنہ محبت ——— محبت اپنی جگہ ہے۔ رشید اگر اس کا کیا کریں کہ ان کے دماغ کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں"

(کھٹ کھٹ کھٹ ۔ ۔ لاٹھی ٹیکنے کی آواز کے ساتھ چودھری کی کھانسی سنائی دیتی ہے)

چودھری (کی فیڈڈ آواز) "بھاگ جاؤ۔ فوراً بھاگ جاؤ آوارا

چودھری (کی صاف آواز) "سنا تم نے۔ رفیق زندہ نہیں ہے رفیق مر گیا۔ کہاں ہو رشید ازہرا (چودھری کی سیٹی کی آواز)

رشید۔ ابا ۔ ۔ ۔ ۔ ابا ۔ ۔ ۔ ۔"

زہرا۔ اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں ——— چل

پھر کسی شہناز لالا رخ کے کاشانے میں ——— چل

یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

رشید "باجی"

زہرا۔ پھر وہ ٹوٹا اک ستارا پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

آوارا (قہقہا لگاتا ہے۔ دفعتہً بجلی بڑے زور کی کڑکتی ہے)۔
"زندگی نام ہے ہنس ہنس کے جیے جانے کا۔ ہنسو اور خوب ہنسو کہ قدرت کے اس بھیانک طوفان سے انسان ڈرتا نہیں کیونکہ قدرت رچا ہوا ایک سوانگ ہے جو اپنی طاقت اور قوت کا لوہا صرف کمزوروں سے منواتی ہے۔ بہادری کی یہ دلیل نہیں۔ کہاں ہیں بجلی کے کڑکتے ہوئے ٹکڑے اور بادوباراں کے مچلتے ہوئے اولے۔ ان سے کہدو انسان جب بغاوت پر اتر آتا ہے تو وہ معمولی دھمکیوں سے کبھی نہیں ڈرتا۔ کبھی نہیں۔ آہا ہا ہا۔۔۔۔۔ میں قدرت کا منکر نہیں باغی ہوں جسے برائی کے گڑھے میں ڈھکیل کر قہقہے لگاتا رہا ہے اور لوگ اس کے قہقہوں سے ڈر کر مجھے برا کہتے ہیں۔ مگر میں برائی نہیں برائیوں کی کوکھ میں پلی ہوئی بھلائی کی ایک کرن ہوں"

وقفا

خامش کیوں ہوگئیں خاتون گاؤ۔ (خود بھی گانے لگتا ہے)

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں
(بادل زور سے گرجتا ہے)

چودھری۔ (سنجیدگی سے) "ہنس رہے ہو یا دلو! ہاں۔ ہاں ہنسو ہنسو میری قسمت پر۔ مذاق اڑاؤ۔ میری حالت کا۔ خوشیاں مناؤ کہ رفیق مرگیا۔ چودھری پاگل ہوگیا۔۔۔ (زور زور سے ہنستا ہے اور ساتھ ہی رونے بھی لگتا ہے سسکیاں۔۔۔۔)

رشید ا۔ ایا۔۔۔ باجی۔۔۔۔۔ (بجلی کڑکنے کی آواز)

چودھری "رو نہیں بیٹا۔۔۔ یہ تقدیر کا ناٹک ہے جو دنیا کے اسٹیج پر کھیلا جارہا ہے۔ اور وہی کھیل زیادہ پسند کیے جاتے ہیں جن میں درد و کرب اور آنسوؤں کا طوفان ہو۔ میں نے چاہا تھا کہ۔۔۔۔۔ کھیل کے اس ڈرامے کو بدل دوں جن میں سسکتے ہوئے قہقہے اور پگھلتے ہوئے آنسوؤں لیکن میں کامیاب نہ ہوسکا اور تقدیر نے آگے تدبیر نے سارے ہتھیار ڈال دیے۔ رفیق مرا نہیں یہ میرا دل کہتا ہے لیکن اب وہ واپس کبھی نہیں لوٹے گا۔ کبھی نہیں۔۔۔ آٹھ سال کا ہی تو تھا جب وہ کھیلتے کھیلتے نہ جانے کدھر بھٹک گیا تھا۔ نہ ہی بتا کہ وہ اب کیا کھوج پائے گا۔ اپنا گھر۔ اوالد کڑاکے کی سردی۔ آٹھ سال کی جان۔ کپکپی پر چوٹ۔ چودا سال بیت گئے۔ چودا سال۔۔۔ (قہقہے لگاتا ہے) ہا ہا ہا یقین ہیں پاگل ہوگیا ہوں۔ پاگل پاگل

آوارا۔ چودھری تم پاگل بھی ہو اور اپاہج بھی۔ تمہاری ٹیچیں اب جنون کی حد تک پہنچ چکیں۔ تم ابھی تک اسی ایک ڈگر پر چل رہے ہو جہاں کتنوں نے ٹھوکریں کھائیں لیکن تم ٹھوکر کھا کر بھی سنبھل نہ سکے بلکہ زخموں سے چور کراہتے ہوئے یہ سمجھ رہے کہ یہ تقدیر کا کھیل ہے قسمت کا فیصلا ہے قدرت کو بھی منظور ہے لیکن یہ کیوں نہیں سمجھتے یہ فیصلا غلط ہے یہ کھیل بہت روز تک نہیں کھیلا جاسکتا۔ (وقفا) میری طرف کیا گھور رہے ہو۔ اس آسمان کی طرف گھورو۔ ان کالے کالے بادلوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو۔ شاید کچھ نظر آجائے میری طرف دیکھنے سے سوائے اس کے تمہیں کچھ نہیں مل سکتا کہ میرے بدن پر لوہے اور پھٹے ہوئے کپڑے ہیں۔

میرے بال الجھے میری زندگی کی عکاسی کر رہے ہیں میری باتیں بری اور تمہارے دل پر چوٹ سی بن کر چڑھ رہی ہیں۔ مگر ان باتوں پر تم نے غور بھی کیا (ہنستا ہے) کیوں کرنے لگے ..... میں آوارا جو ٹھہرا ... ایک اوباش میری باغی آوازیں تمہارے نزدیک محض بکواس ہے اور تم عقل کے پجاری اس بکواس پر کبھی دھیان نہیں دے سکتے۔ مگر میں پھر کہتا ہوں چودھری تم پاگل بھی ہو یا بچے"

چودھری۔ (گرج کر) خاموش۔ اب تک یہاں کھڑے ہو بدتمیز۔ ہتھکڑیوں سے قابو انہیں اٹھا سکتے۔ تم چودھری سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ جس کے غصے سے لوگ آج تک کانپتے ہیں۔ تم یہ سمجھتے ہو چودھری بوڑھا ہو گیا اور میں جوان ہوں۔ مگر ان بوڑھی ہڈیوں میں اب بھی قوت باقی ہے زخمی شیر بھی جان لیوا حملہ کر سکتا ہے سمجھے۔ تم میری عزت ..... میری ..... مے ..... ری (چودھری کی آواز کانپنے لگتی ہے)

لاٹھی اٹھا کر بھرپور مارنے کی آواز کے ساتھ آوارا کی چیخ اور آوارا کے فرش پر گرنے کی آواز ——

رشیدا۔ "ابا —— یہ کیا کیا؟"

چودھری۔ (قہقہہ لگاتا ہے)

رشیدا۔ "اب کیا ہوگا؟"

زہرا۔ اب کیا ہوگا۔ رسوائی ذلت"

چودھری۔ ہوگا کیا۔ چودھری خاموش رہنا نہیں جانتا۔ یہ اور بات ہے کہ بیٹے کے صدمے نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔ مگر میں اب بھی بول سکتا ہوں۔ اس حالت میں بھی۔ پولیس پولیس۔ دوڑو۔ پکڑو۔

رشیدا۔ "ابا —— ابا"

چودھری۔ "پکڑو —— پکڑو"

زہرا۔ "ابا —— ابا"

چودھری۔ "پولیس —— پولیس" (بہت سے آدمیوں کے چلانے شور مچانے کی آواز)

لالہ گنگشام داس۔ "کیا ہوا چودھری —— خون ..... بابا ہے"

چودھری۔ "ہا ہا ہا۔ خون۔ ہاں خون۔ لالا جی ڈر گئے اتنا بڑا پیٹ لے کر بھی ڈر گئے بڑے بزدل ہو لالا"

لالا (کپکپاتی ہوئی آواز سے) "خو ..... خ ..... د ..... ن"

چودھری۔ "ہاں ہاں! خون۔ اسے میں نے ہی مارا ہے مگر یہ مرا نہیں زخمی ہو گیا ہے۔ پہچانتے ہو اسے"

لالا۔ (ڈرتے۔ ڈرتے) "ہا —— آں"

چودھری۔ یہ آوارا ہے اس محلے کا بدمعاش۔ جب سے آیا ہے محلے میں ادھم مچا رکھی ہے۔ کہتا ہے میں آوارا نہیں سماج کا باغی ہوں۔ لیکن آج کی رات کتنی اندھیری اور کس قدر بھیانک ہے اور میرے پاس دو جوان لڑکیاں —— میں اکیلا ہی تو رہ گیا ہوں اتنے بڑے گھر میں۔ سب مجھے پاگل اور خبطی کہہ کر چھوڑ گئے مگر میں پاگل نہیں میری بوڑھی ان کی نگرانی کے لیے رات بھر جاگتی رہتی ہے اور یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ کوئی ہماری بچیوں کی طرف بری نظر ڈالے —— سمجھ گئے لالا۔ بس مجھ سے خون ہو گیا (سرگوشی سے) اب پولیس آتی ہی ہوگی۔ تمہیں یہی کہنا ہوگا جو میں نے کہا —— سمجھ گئے لالا ..... ورنا ..... ورنا —— اچھا تو سودا طے کر کتنے روپے ہوئے تمہارے کل میرے پاس"

لالا۔ مگر چودھری .....

چودھری۔ "ہاں۔ ہاں —— لالا"

لالا۔ "یہ خون ——"

چودھری۔ (بگڑ کر) میں پوچھتا ہوں کتنے روپے ہوئے تمہارے یاد رکھو گنگشام داس۔ میرے جیل جانے کے بعد تمہارے ایک پیسے بھی نہیں مل سکتے۔ (ہنستے ہوئے) اور تمہاری توند اس صدمے کی تاب نہ لا کر بلبل بچک جائیگی

اپنا نہیں تو اپنی توند کا تو خیال کرو لالا جی"

لالا۔ (لجاتے ہوئے لہجے میں) "چودھری تمہاری ہی کرپا سے اب تک جیتے رہے ہیں بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ گھنٹہ م کے ہوتے تم پر ذرا بھی آنچ آئے (نوٹ بک کی ورق گردانی کی ہلکی سی آواز)

دو ہزار چار سو اکاسی روپے تیرا آنے تین پائی سوا اصل و سود"

وقفا (ہتھوڑی پر چڑھنے کی آواز کے ساتھ کئی لوگوں کے بولنے کی آوازیں)

رشیدا (روتی ہے) ابا جان ـــــ ابا جان"

زہرا۔ چپ ہو جا رشیدا۔ چپ چپ (رشیدا اور زہرا کے بغلی کمرے میں جانے کی آواز ـــ اور ڈاکٹر کے آنے کی آہٹ)

چودھری۔ تم ـــ ڈا ـــ کٹر ۔۔۔ اتنی رات گئے اتنے طوفان میں

ـــــ ڈاکٹر"

ڈاکٹر۔ گھبرا گئے چودھری۔ ہاں میں ہوں اتنی رات گئے۔ اتنے طوفان میں۔ اور بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ بنا بدلا اب یہ بولی کرو۔ یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔ جیل سے کب آیا اور اب کیا چاہتا ہوں"

چودھری۔ (خشا مدانہ لہجے میں) "بیٹھو ڈاکٹر۔ بیٹھو۔ بہت پریشان نظر آرہے ہو۔ تھک گئے ہو گے"

ڈاکٹر۔ پریشان میں نہیں تم نظر آرہے ہو۔ تھک میں نہیں گیا تم تھک گئے ہو بوڑھے جو ہوئے"

چودھری۔ ڈاکٹر پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ گڑے مردے کھودنے سے اب کوئی فائدہ نہیں"

ڈاکٹر۔ ڈاکٹر کے سینے میں ایک مدت سے جو ایک آگ سلگ رہی ہے اسے بجھانے کا اس سے اچھا موقع نہیں آسکتا چودھری۔ تمہارے دل میں تم کا طوفان امنڈ رہا ہے دروازے پر خون سے لت پت ایک لاش پڑا ہوا ہے ـــ جانتے ہو ـــ وہ کون تھا"

چودھری۔ آورا ـــ محض آورا"

ڈاکٹر۔ آورا نہیں بلکہ یہ کہو میرا جگر پارہ

چودھری۔ (چیخ کر) رفیق ـــ خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ ڈاکٹر کہہ دو وہ سچ مچ آورا تھا۔ محض ایک آورا"

ڈاکٹر۔ آہا ہا ہا۔ کتنے معصوم بن رہے ہو چودھری۔ کتنی نرم ہو گئی ہیں گرجتی ہوئی آوازیں ۔۔۔ کہاں گئیں شان سے اکڑی ہوئی سوجھیں جنہیں ہر بات بات پر اینٹھا کرتے تھے تماشہ ابھی نہیں چودھری۔ یاد کرو وہ دن جب رات دن ایک کر کے تمہاری بیوی کا علاج کرنے کے صلے میں تم نے مجھے فلت اور روسوائی بخشی تھی۔ کیا تصور کیا تھا میں نے۔ صرف یہی نا کہ خاندانی معاملات کے الجھاؤ کی بنا پر ہمارے بزرگ ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ مگر میں تم سے ہنسا خندا پیشانی سے ملا کیا۔ تمہاری عزت کرتا رہا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ جب ایک خاندان مصیبتوں کے طوفان میں گھر کر برباد ہو جاتا ہے اور ان کی آنے والی نسلیں غربت کی کوک سے جنم لینے لگتی ہیں تو اپنا ہی خون سفید ہو جاتا ہے پلکے رقابت کی وہ چنگاری جو مدت ہوئی سنوں راکھ کے نیچے دب چکی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ سلگنے لگتی ہے اور جب سلگ کر آگ بن جاتی ہے تو یہی آگ اپنے گھر کو بھی جلا کر پھونک دیتی ہے۔ بولو گنگ کیوں ہو گئے۔ اپنی بیوی کے خون کے الزام میں مجھے جیل تک پہنچاتے ہوئے تول رہے تھے۔ اپنی سالقا خان بہادری کی ٹھولنی کھا رہے تھے اپنی رئیسانہ چال پر اترا رہے تھے اور اب بت بنے میرا منہ تک رہے ہو"

چودھری۔ "ڈاکٹر ۔۔۔" (چودھری کی چیخ میں ڈاکٹر کی آواز قدرے دب جاتی ہے)

ڈاکٹر۔ چودہ سال۔ چودہ طویل سال میں نے کاٹ دیے مگر اپنے دل پر جو گھاؤ تم نے اپنے ہاتھوں لگایا ہے وہ اب کبھی نہیں بھر سکے گا چودھری۔ آہا ہا ہا ۔۔۔۔ ہر چیز کا ردعمل ہوتا ہے۔ جواب دو چودھری"

چودھری۔ ڈاکٹر ـــ ڈاکٹر ۔۔۔ (ڈاکٹر کے قہقہے چودھری کی چیخ میں دب جاتے ہیں۔)

ڈاکٹر۔ چودھری تم شاید پوچھنا چاہتے ہو کہ مجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ یہ آوارا ہی رفیق ہے۔ تو سنو یہ بات مجھے جیل میں معلوم ہوئی جب تمہارا رفیق سماج کے باغیوں کے ساتھ جیل کی چار دیواری میں لایا گیا۔ لوگ اسے کتنے ہی نام سے پکارتے تھے۔ آوارا۔ بدچلن۔ باغی۔ بدمعاش۔ مگر وہ صرف انسان تھا لیکن سماج کی گدی پر بیٹھے قانونی عینک چڑھے شان والے سمجھتے ہیں برائی ہمیشہ گندی جگہ اگتی ہے مگر کبھی کبھی ان ہی گندگیوں میں ہیرے کے چمکتے ہوئے ٹکڑے بھی نظر آجاتے ہیں چودھری۔

"اب بھی تمہیں یقین نہ ہو تو جا کر دیکھ لو۔ اس کی کنپٹی پر وہ نشان اب تک موجود ہے جو بچپن میں تانگے کے نیچے آجانے سے اسے لگ گیا تھا۔"

چودھری۔ (بڑی زور سے چیختا ہے) "ڈاکٹر۔ رفیق۔ میرا رفیق۔ ر۔ ف۔ ق۔"

رشید۔ "ابا"

زہرا۔ "ابا جان"

ڈاکٹر (افسوسناک لہجے میں) "بچو! طوفان تھم گیا۔ جوالا مکھی بھڑک کر سرد ہو گئی۔"

(رشید اور زہرا کے رونے کی آواز) "ابا۔ ابا جان"

(بجلی زور سے کڑکتی ہے۔ سسکیوں کی آواز ہوا کے جھکڑ میں دھیرے دھیرے دب جاتی ہے۔)

غزل

اثم فروسی

ہم چلے ہیں دوسری دنیا بسانے کے لیے
ہے کوئی راضی ہمارے ساتھ جانے کے لیے

کیا کروں ناکام کوشش مسکرانے کے لیے
کس کا لے آؤں ہنسی ہونٹوں پہ آنے کے لیے

وائے قسمت تھے وہی تقدیر میں لکھے ہوئے
ہم نہ تھے آمادہ جو صدمے اٹھانے کے لیے

جان سے روٹھے ہوئے ہم زندگی ہم سے خفا
موت اب تو منتظر ہے کس بہانے کے لیے

داستاں در داستاں ہے زینت بزم سخن
دوست سننے کے لیے اور ہم سنانے کے لیے

فون نمبر (۵۳۲۲) ٹیلیگرام "HYCOIN"

آپ کے
زندگی کے بیمہ
کے لیے
دی حیدرآباد کوآپریٹیو انشورنس سوسائٹی لمیٹڈ
اور
موٹر اور آگ کے بیمہ
کے لیے
دی کوآپریٹیو جنرل انشورنس سوسائٹی لمیٹڈ
موجود ہے
ان دونوں خدمت گذار کوآپریٹیو انشورنس
سوسائٹیوں کو آپ اپنے ہی ادارے
تصور فرمائیں
معلومات ذیل کے پتے سے حاصل کی جاسکتی ہیں
بشیر باغ روڈ
حیدرآباد دکن

923
16 FEB 953

ہندستانی ادب

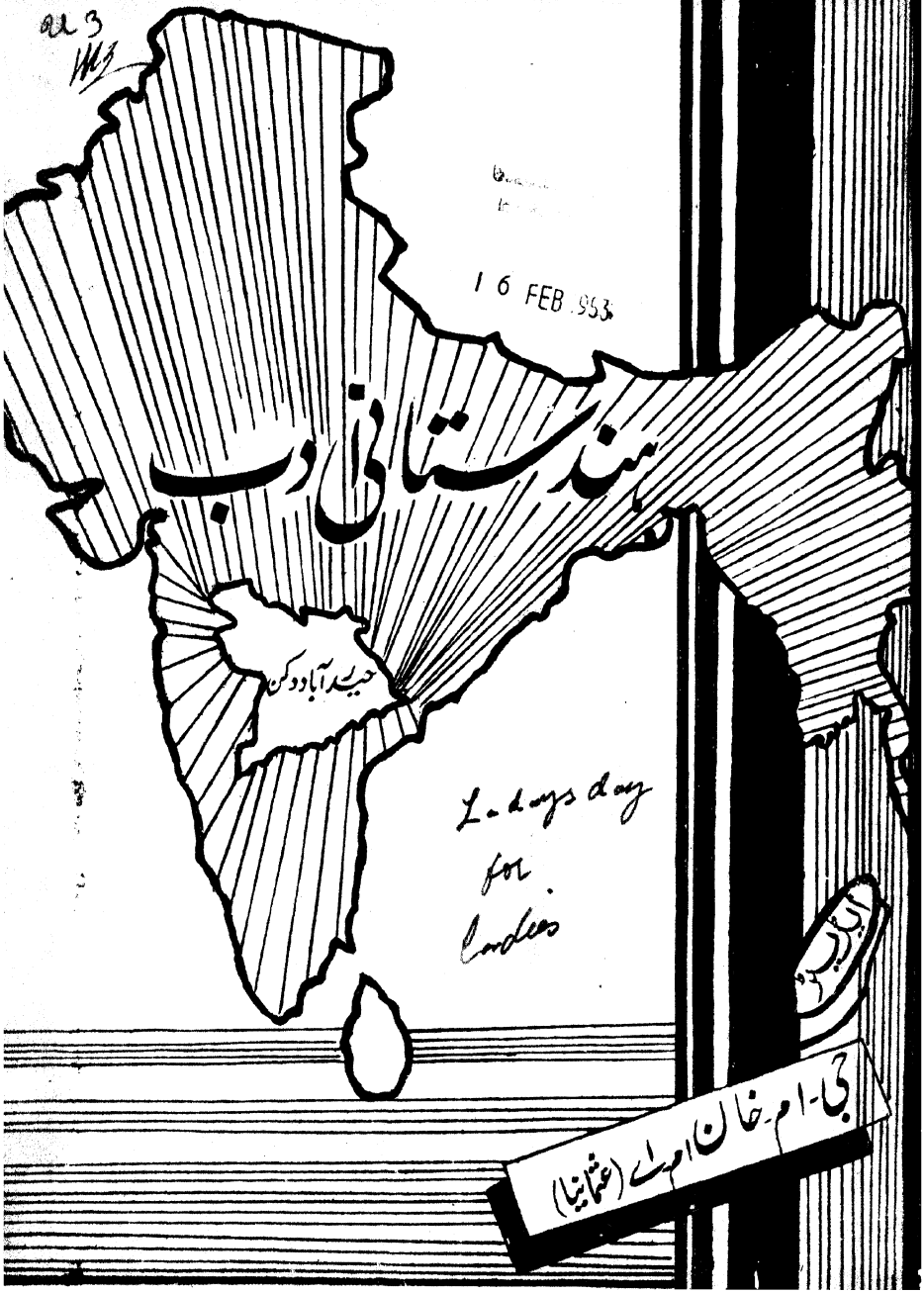

Lodge day
for
Ladies

جی۔ ام۔ خان ایم اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ

نمبر (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹ اے۔ اعظم پورا شرقی پی۔ او جوبلی۔ حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

فروری ۱۳۶۲ف

جلد ۱۳

نمبر ۵

قیمت ایک چوتھائی آنے

فروری ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
مشاعرا	ناظم مشاعرا	۳	
حجاج بن یوسف	ڈاکٹر پیر سیادت علی خان	۸	
غزل	حسن چشتی	۱۳	
تصویریں	ایاز عصمی	۱۴	
غزل	اشک (امرتسری)	۱۷	
امریکا کی مشہور ناول نگار مسز پرل ایس بک	یوسیس	۱۸	
موت	رفعت ہاشمی	۱۹	
کہانیوں کی وادی	غزل		قمرالدین قمر ۲۰
	غزل		انجم اعظمی ۲۲
	طامس گرے		ا۔ م ۲۳
	غزل		ناظر الحسینی ۲۴
	گریز		مسعود کلیم ۲۴
	ایک فسانا ایک حقیقت		اجمل رشید (عادل آبادی) ۲۵
	امریکا میں تعلیمی سرگرمیاں		یوسیس ۲۶
	لال قلعہ		ناظم (چکدیوی) ۲۲

ہمارے خیالات

آل انڈیا کانگریس اور ہندستانی

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس سال آل انڈیا کانگریس کا ۵۶ واں اجلاس حیدرآباد دکن میں ہوا۔ ۱۵ اور ۱۶ جنوری کو مجلس موضوعات کے اجلاس ہوئے اور ۱۷، ۱۸ کو کھلے اجلاس۔ ان اجلاسوں میں جہاں پورے ہندستان کی سیاسیات کو کھنگالا گیا۔ وہاں دیس بھاشا یا ملک کی ملی جلی زبان کا اہم مسئلہ بھی زیر بحث آئے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ ان اجلاسوں میں ہمارے شریک ہونے کا ایک بھاری مقصد ہندستانی کا مسئلہ بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ کانگریس کے یہ اجلاس خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان میں شرکت کے لیے ہندستان کے ہر گوشے کے نمائندے آئے تھے۔ ان میں آسامی بھی تھے اور بنگالی بھی، یوپی، پنجاب، راجستھان، گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک، تامل ناڈ اور آندھرا علاقوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس لیے نمائندوں کے سامنے مسئلہ طلب اور سب سے بھاری مسلا جھاشا کا تھا کہ نمائندے کس بان میں بولیں۔ اگر ہر نمائندہ اپنے اپنے علاقے کی جھاشا میں بولتا ہے تو سمجھنے والا کوئی بھی نہیں۔ چنانچہ تامل ناڈ کے نمائندے نے جیسے ہی تامل میں تقریر شروع کی تو بند کرو، بیٹھ جاؤ، ختم کرو کے نعرے شروع ہو گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ ڈیڑھ دو لاکھ کے مجمع میں مشکل ہی سے سو دو سو تامل لوگ ہوں گے۔ صرف ان معدودے چند کے لیے تامل میں تقریر کرنا باقی ڈیڑھ دو لاکھ دیسیوں کے قیمتی وقت کا خون کرنے کے برابر تھا۔ اس کے باوجود تامل ناڈ کے جوشیلے نمائندے نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ مگر یقین جانیے کہ اس تقریر کے دوران میں پورا اجلاس بھیلی یا زار بنا ہوا تھا اس لیے کہ جو سننے والے سمجھنے سے مجبور تھے تو سمجھنے کون اچانک آپس میں باتیں اور گپ شپ شروع ہو گئی اور جوں توں کر کے اس نمائندے نے بھی اپنی تقریر ختم کی۔

مجمع کی نوعیت اور رنگا رنگی کا لحاظ کرتے تقریریں صرف دو ہی جھاشاؤں میں ہو سکتی تھیں۔ ایک ہندستانی اور دوسری انگریزی۔ انگریزی کو ہم نے دوسرے نمبر پر اس لیے رکھا ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں انگریزی کے سننے اور سمجھنے والے بھی کم تھے ان کا شمار آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ لے دے کے صرف دیس کی ملی جلی جھاشا "ہندستانی" رہ گئی جسے حکمراں طاقت کا حامل ہر شخص سمجھ سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ اکثر تقریریں ہندستانی ہی میں ہوئیں۔ یہاں اس اعتراف کے لیے کہ یہاں پر "ہندستانی" کا شبد ہم نے اپنے طور پر استعمال کیا ہے اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ تمام تقریر کرنے والوں نے اس جھاشا کو ہندستانی نہیں بلکہ ہندی کا نام دیا لیکن آپ کے ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ اس نام کو تقریروں کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کریں اور اس وقت تبائیں کہ حقیقت اور صداقت کے آئینے میں دیس جھاشا کا اصلی نام "ہندستانی" ہو سکتا ہے یا ہندی۔ اچھا ہندستانی یا ہندی میں اج جھاشا کا سلاپیش تھا اسی وقت ہم نے انہیں صفحوں میں صاف صاف یہ لکھ دیا تھا کہ اج جھاشا وہی ہو سکتی ہے جو دیس جھاشا ہے دیس جھاشا نہ ہندی نہیں بلکہ ہندستانی ہے اس کے ثبوت میں ہم نے لسانی نقطۂ نظر سے پورے لٹریچر کے اعداد و شمار بھی پیش کیے تھے۔ اور اسی کو بنیاد قرار دیتے ہوئے ہندستانی پارلیمان سے اس بات کا زور و مطالبہ کیا تھا کہ "وہ ہندستانی" ہی کو راج جھاشا بھی مان لے مگر افسوس ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبران اور خود جواہر لال نہرو بھی جذبات میں بہہ گئے۔ اور ہندی کو سرکاری زبان یا جھاشا قرار دیا۔ اس قرارداد کے پاس ہونے کے بعد بھی ہم اپنے ارادے اور فیصلے میں اٹل رہے اور ہر وقت ہمارا یہی کہنا رہا کہ دیس جھاشا کا صحیح نام صرف "ہندستانی" ہو سکتا ہے ہم اپنے اس دعوے کی دلیل میں موقع موقع سے ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں، لیکن افسوس کہ ضدی اور جذباتی آدمیوں کے نزدیک بہتر سے بہتر دلیل کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور وہ مجذوب کی طرح اپنی ہی رٹ لگائے چلے جاتے ہیں۔

کانگریس کے ان اہم اجلاسوں میں جتنی بھی تقریریں "ہندستانی" زبان میں ہوئی ہیں ان پر ہم آنے والے نمبر میں تفصیلی روشنی ڈالیں گے اس سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ آیا اس جھاشا کا بھی نام "ہندستانی" ہو سکتا ہے یا ہندی ہے۔!

مشاعرہ ۱۹۵۲ء

انتخاب غزلیات اڑتالیسواں کل ہند سالانا وارثی مشاعرہ لکھنؤ

۱۹۵۲ء

مصرعہ طرح :- کسی کے آستاں پر ہے بہار آستاں کیسی

(داستاں، آسماں وغیرہ قوافی کیسی ردیف)

نوٹ :- واضح رہے کہ اس نصف صدی کی مدت مشاعرہ میں قوافی اور بحر ہمیشہ ایک ہی رہے صرف ردیف ہر سال بدلتی رہی چنانچہ اب تک اسی وضعداری پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ (ناظم مشاعرہ)

لکھنؤ کا یہ قدیم اور مخصوص مشاعرہ تقریباً نصف صدی سے اپنی روایتی خصوصیات کے ساتھ ایک حال پر برابر ہوتا چلا آرہا ہے۔ جو کہ آل انڈیا انجمن وارثی کے ماتحت اس کے تمام ارکین متعدی اور دلچسپی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد انجمن وارثی کی بھی تقسیم ہو گئی۔ پاکستان میں انجمن وارثی کی سب سے بڑی شاخ راولپنڈی میں ہے جس کا ناظم جناب شرفیض آبادی اور صدر حضرت سرور شاہ وارثی ہیں۔ مرکزی انجمن لکھنؤ کے زیر ہدایات وہاں بھی مشاعرہ اسی تاریخ اور اسی طرح ہوتا رہتا ہے نہ صرف راولپنڈی بلکہ پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی اسی طرح یہ مشاعرے ہوتے ہیں جس طرح ہندستان میں کئی کئی مقام پر ایک ہی تاریخ اور ایک ہی طرح پر سالانا وارثی مشاعرے ہوتے چلے آتے ہیں چنانچہ پچھلے سال بھی مجموعی طور پر پاکستان اور ہندستان میں جملہ ۹۶ مشاعرے ہوئے۔ لکھنؤ، لاہور، ڈھاکا، کراچی، راولپنڈی اور مدراس وغیرہ جیسے جس مقام پر جو مشاعرہ ہوتا ہے وہاں شاعروں اور رہبروں کی طباعت کا بھی انتظام ہوتا ہے اس قدیم مشاعرے میں ہر دور کے اساتذۂ سخن اپنے اپنے وقت میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً جناب داغ دہلوی حضیض جو نپوری حضرت سائل دہلوی جناب بیخود بدایونی حضرت جلیل، اصغر گونڈوی جنیظر شاہ وارثی بیدم شاہ وارثی فانی بدایونی بسمل الہ آبادی آرزو، صفی، عزیز لکھنوی بیخود موہانی ناطق، خواجہ ریاض وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح دور حاضر کے نامور شاعر سخن جناب اثر لکھنوی حضرت بیکل متین۔ وحشی رضا۔ کیفی جونپوری طبع آبادی بلا۔ درد۔ دل حسن صبا وغیرہ کو بھی اپنی شرکت سے مشاعرے کو کامیاب بناتے رہتے ہیں۔

آل انڈیا انجمن وارثی کو مولانا سید فقر محمد فانی نے اپنے مرشد طریقت حضرت حاجی وارث علیشاہ کی ۱۹۰۱ء میں قائم کیا تھا جس سال ان کا سنہ وصال ہوا تھا اب سے آج تک برابر انجمن کے مشاعرے نیز دیگر ادبی مظاہرے ہوتے چلے آتے ہیں اور یہ قصر فقہ ان کے پیر طریقت کا کرامت وجود انقلابات زمانہ انجمن کے قیام اور اس کے نظام میں کوئی بندش نہیں ہوئی۔ دور زمانہ بدلتے گئے مگر مدار ایک ہی حال پر رہا۔ سچ ہے ؎

چمنے کہ نافیامت گل و بہار دادند کہ مرتباش دوجہاں نثار دارد

ہمارے ملک میں فارسی زبان و ادب کو شاہ کیے جاتے ہیں اور ملک کی کسی حصے میں فارسی کا رواج نہیں ہاتا ہم اب پچاس سال پیشتر قیام انجمن کے وقت سے آج تک فارسی کو ملکی زبان ہی سمجھا جاتا تھا چنانچہ اسی بنا پر ہندستانی طرح کے مشاعرے کی طرح اسی کی ترجمانی کرتی ہوئی فارسی طرح بھی مشاعرے میں دی جاتی تھی اور فارسی گو شعرا جس پر طبع آزمائی فرماتے مشاعرے میں فارسی غزلیں آکا دوسرا دور بھی قائم رکھتے تھے جس کا سلسلا آج تک قائم ہے۔ فارسی میں گو اب سنی غزلیں نہیں ہوتی ہیں پھر بھی اس مٹی ہوئی حالت میں بھی ہندستان کے طول و عرض فارسی طرح میں بھی ہر سال ہوجاتی ہیں جن کو ہم بسا غنیمت اور انجمن کی انتہائی مسرت سمجھتے ہیں درج ذیل تحانی غزلیات نے لکھنؤ کے مرکزی وارثی مشاعرے کی ہیں۔ دوسرے مقامات کی غزلیات اپنے اپنے مقام پر شایع ہوتی ہیں۔ پہلی فہرست کے اشتہارات دعوت تحانی اور پوسٹروں میں بار بار درج کیے جاتے اور ہر سال اس دیرینہ مشاعرے کا طلب کیے جانے پر بھی ہر سال نصف سے زائد غزلوں کے پرچے بروقت طبع و نشر انجمن کو نہیں موصول ہوتے جس کی وجہ کمیابی کے تو بہت سے معقول اسباب فراہم ہوتی ہیں جو طبع کی جانچ میں چنانچہ اس سال بھی ۱۹۵۲ء سے زائد غزلیں شایع ہو رہی ہیں غزلیات کے بعد مشاعرہ طبع و نشر کے لیے نصف گھنٹہ کا وقفہ دیا جاتا ہے جس میں شعرا خوش ہو سکتے ہیں جن کو گانا ہے ہم بھجوا سکتے کیا عرض کر سکتے ہیں کچھ ہوتے جس کی پردہ داری ہے۔

راقم ناظم مشاعرہ۔

غزل افقر موہانی وارثی (بانی انجمن اور مشاعرہ وارثی)

قفس میں ہم سفیرو یاد سیر بوستاں کیسی
نہیں جب آشیاں تو گفتگوئے آشیاں کیسی

کہاں کی دوری منزل تلاش کارواں کیسی
ہوا پر لے اڑی ہے مجکو خاک آستاں کیسی

ترے جلووں سے خیرہ ہے نگاہ عارفاں کیسی
تجلی ہو رہی ہے دل میں آنکھوں سے نہاں کیسی

نہیں ہو تم تو ہر صورت میں اک جلوہ نہاں کیسا
تمہیں تم ہو اگر تو پھر یہ تخلیق جہاں کیسی

ابھی دو سرخیاں حشر و قیامت کی تو باقی ہیں
یہ دنیا ہے یہاں تکمیل شرح داستاں کیسی

جہاں ہم ہیں وہاں صبح وطن شام غریباں ہے
ملی ہے ہم کو یارب منزل عمر رواں کیسی

ہر اک جلوے میں اک صورت ہر اک صورت میں اک جلوا
محیط دو جہاں ہیں حسن کی رعنائیاں کیسی

کبھی دل چسپیاں دنیا کی جب دل کو لبھاتی ہیں
بھلا دیتی ہے سارے نقش یاد رفتگاں کیسی

جہاں نقش قدم دیکھا وہیں جھک گیا اپنا
نیاز عشق کے سجدوں میں قید آستاں کیسی

صبو حی کش تھے جتنے ہو رہے تھے نیند کے ماتے
مؤذن نے سمجھکر وقت پر دی ہے اذاں کیسی

کہیں مضمون میں اپنے بندشیں اپنی کہیں فقر
ہماری شاعری کی اڑ رہی ہیں دھجیاں کیسی

(۲) حکیم جامی جامعی الوارثی (جگدیشپوری)

خزاں کے دور میں نشو و نمائے گلستاں کیسی
فروغ آشیاں کیسا بہار آشیاں کیسی
چمن والے ذرا دیکھیں نگاہ غور سے آکر
نظر آتی ہے اب بدلی نگاہ باغباں کیسی
وہی کچھ جانتے ہیں جو ہیں اہل درد دنیا میں
ہے ساری داستانوں میں ہماری داستاں کیسی
فسانا دل کا ان سے کہدیا ہے میری آنکھوں نے
سر محفل بنی ہے بے زباں میری زباں کیسی
جسے ہو شوق نظارا وہ خود دیکھے وہاں جاکر
کسی کے آستاں پر ہے بہار آستاں کیسی
جو عاشق ہو وہی سمجھے جو دیوانا ہو وہی جانے
کہ ہوتی ہے محبت میں نیاز عاشقاں کیسی
محبت میں کسی کی مٹ گئے ہیں جو کہ اے جامی
فنا ہو کر ملی ان کو حیات جاوداں کیسی

(۳) سردار علی وارث خان ہمی وارثی (جگدیشپوری)

اگر ہے دور آزادی تو پھر پابندیاں کیسی
بیان درد دل سے روکی جاتی ہے زباں کیسی
یہ دوزخ کا بیاں کیسا یہ روداد جناں کیسی
تمہا سے ذکر کرکے ہوتے کسی کی داستاں کیسی
ہوا میں پھول اینچے سب پریشاں روئیں کس کس کو
ہوئی پامال دم بھر میں بہار گلستاں کیسی
دل ناداں تجھے اتنا نہ خدا کو منہ دکھانا ہے
حرم کو چھوڑ کر بت خانے سے دلچسپیاں کیسی
تصور میں تمہیں تم ہو دلوں کے درمیاں تم ہو
خدا جانے نظر سے پھر یہ پردہ داریاں کیسی
جہاں چھیڑا کسی نے تم آشیاں کا ذکر گلشن میں
بدل جاتی ہے فوراً ہی نگاہ باغباں کیسی
جبین شوق نے سجدے کیے ہیں جب سے اس در کے
بہاروں پر نظر آتی ہے شان آستاں کیسی
جدھر رخ ہو زمانے کا ادھر ہم بھی چلو راہی
زمانے کے حوادث سے یہ بے پروائیاں کیسی

(۱) نواب ابن گوہر (لکھنوی)

تو جب شرط ہے دیکھو ہے تاثیر بیاں کیسی
مزے لے لے کے کہتا ہوں میں اپنی داستاں کیسی
چمن کے رہنے والے اب قفس میں گھٹ کے مرتے ہیں
بہار بوستاں کیسی بہار آشیاں کیسی
دل سوزاں کے شعلے کیا بھڑک کر آگئے منہ تک
مری آہوں میں آتی ہیں نظر چنگاریاں کیسی
کھلی ہیں جب سے یہ آنکھیں قفس کی تیلیاں دیکھیں
میں کیا جانوں کہ ہوتی ہے بہار گلستاں کیسی
کسی کے عشق میں شاید گریباں کے کیے ٹکڑے
لیے پھرتے ہو ہاتھوں میں یہ گوہر دجیاں کیسی

(۴) یاور حسین یاور (لکھنوی)

یہ خفگی کیوں یہ چہرے پر شکن اے جان جاں کیسی
پھلی پھولی بہاروں میں بھلا فصل خزاں کیسی
نہیں ہے امتیاز دیر و کعبہ ذوق سجدہ کو
خلوص بندگی لازم ہے قید آستاں کیسی
نظر جس سمت جاتی ہے تڑپ اٹھتے ہیں دل والے
الٰہی چشم قاتل میں چھپی ہے یہ عجب یاں کیسی
زمانا پڑ کے رو دیتا ہے یاور خون کے آنسو
یہ تو نے اپنے درد دل کی لکھدی داستاں کیسی

(۵) محمد موسیٰ کلیم وارثی (جگدیشپوری)

تو مجھ میں ہے میں تجھ میں ہوں پھر شرح بیاں کیسی
تری جب داستاں میں ہوں تو میری داستاں کیسی
مزین ہے ترے دم سے بہار بوستاں کیسی
مہ و انجم میں ہے تیری تجلی ضوفشاں کیسی
متاع دین دنیا تجھکو اے زاہد مبارک ہو
غلامان محبت کو متاع دو جہاں کیسی
مسرت اور خوشی کی انتہا اس دم نہ کچھ پوچھو
لے جو مجھ سے ہے وہ حاصل ہوئی تسکین جاں کیسی
فلک پر مضطرانہ کر و فور شوق بے حد سے
تڑپ اٹھتی ہے ذوق دید میں برق تپاں کیسی
درد ولت پہ جاکر دیکھنے والے یہ کہتے ہیں
کہ ان کے آستاں پر ہے بہار آستاں کیسی
جہان عشق میں خاموش رہتے ہیں نظر والے
کلیم آشفتہ حالوں کو دہن کیسا زباں کیسی

(۶) منشی بھگوتی پرشاد شتاب (سوہانی)

بیان مدعا کیسا غم دل کی فغاں کیسی
ہم ایسے بے زبانوں کی جہاں میں داستاں کیسی
خدا کے واسطے رہنے دے اے ظالم گلستاں میں
یہ دو تنکوں کی خاطر برہمی اے باغباں کیسی
مدد کر اے خدا اب ناخدا نے ساتھ چھوڑا ہے
بھٹکتی پھر رہی ہے کشتی عمر رواں کیسی
نظارہ کرنے والے سبزگنبد کا یہ کہتے ہیں
کسی کے آستاں پر ہے بہار آستاں کیسی
ہمیں کیا فصل گل جیادا آئی ہے جو گلشن میں
قفس کے رہنے والوں کو بہار آشیاں کیسی

(۷) پنڈت داس مصطر سوہانی تلمیذ مولانا فقر سوہانی وارثی

تمہارا نام لینے لڑکھڑاتی ہے زباں کیسی
خدا ہی جانے اب ہوگی تمہاری انتہا کیسی
چمن میں فصل گل آتی رہی دور خزاں بنکر
اڑاتے ہم رہے گلشن میں خاک آشیاں کیسی
نہیں معلوم کیا کہا دیکھنا ہے بحر ہستی میں
جھکولے لے رہی ہے کشتی عمر رواں کیسی
مری حیران نظریں رات دن اکثر بھٹکتی ہیں
وہی صورت تمہاری ہے حجاب درمیاں کیسی
بہاریں ہو چکیں رخصت خزاں کا دور دورا ہے
مگر پھرتی ہے نظروں میں ہما گلستاں کیسی
وہی گھڑیاں لڑکپن کی جو ہنستے کھیلتے گذریں
جوانی میں نظر آتی ہیں وہ پرچھائیاں کیسی
پھرا ہے جستجو میں داس گرد کارواں بنکر
گرو وارث بتا دو اپنی منزل ہے کہاں کیسی

(۸) حامد علی نظمی (عیناوی)

اگر ملنا ہے تو شرط مکان و لامکاں کیسی
عبث جھگڑا جگہ کا ہے یہاں کیسی وہاں کیسی
ہمیں آستان یار سے مطلب ہے اے واعظ
ہمارے واسطے دوزخ ہے کیا سبز خزاں کیسی
جہاں تک میرے سجدوں کے نشاں معلوم ہوتے ہیں
زمیں تنگ بنی ہے اب جواب آسماں کیسی
ہمارے نام سے نام و نشان یار ملتا ہے
ہماری ہستی موہوم بے نام و نشاں کیسی
شریک بزم جتنے تھے وہ سب پی کر ہوئے رخصت
نظر کے واسطے ساقی یہ بے پروائیاں کیسی

(۹) ڈاکٹر رفیق حسین رفیق (اکسٹرا سرجن) ایم۔بی۔بی۔ایس (لکھنؤ)

الٰہی پھر گئی مجھ سے نگاہ باغباں کیسی
بہاروں پر نظر آنے لگی مجھکو خزاں کیسی
چمکتی ہیں سیاہ بادل میں پیہم بجلیاں کیسی
چمن کی خیر ہو یارب بہار آشیاں کیسی
وفا کی راہ میں اے دل ہیں یہ بیتابیاں کیسی
یہ کیسے نالہ و شیون یہ فریاد و فغاں کیسی
کسی کا خون ناحق آسماں پر رنگ لایا ہے
شفق میں ورنہ آتی ہیں نظر یہ سرخیاں کیسی
غضب ہے جب تری رحمت زیادہ ہے تو اے مالک
لگی ہے یہ ہی بخشش میں یہ شرط امتحاں کیسی
برابر بجلیوں کی جب کہ شاہ سازیاں دیکھوں
ہو تشکیل نشیمن کیا۔ بنائے آشیاں کیسی
جہاں رکھدوں جبین شوق بن جائے وہیں کعبہ
مرے سجدوں کی خاطر ہیں یہ قید آستاں کیسی
جو کل تک اے رفیق اردو میں ہم بات کرتے تھے
وہی اب پوچھتے ہیں بن کے یہ اردو زباں کیسی

(۱۰) مسعود وارثی

جو تم چاہو زمین و آسماں فردوس بنجائیں
چمن کیا ہے یہ گل کیا ہیں بہار یو تاں کیسی
زباں کھلتی نہیں اپنی حضور حسن میں لیکن
نگاہ حسرت آگیں کہہ رہی ہے داستاں کیسی
بس اتنا کہہ کہ دیدی جان بیمار محبت نے
ہماری داستان غم کی شرح و داستاں کیسی
نہیں مسعود فرصت سجدہ ریزی سے مجھے دم بھر
جبین عجز ہے وقف سجود آستاں کیسی

(۱۱) قاضی سید خورشید احمد قاضی ام۔ایس سی

زباں دل کی نہیں جب ہو تو پھر آہ و فغاں کیسی
رضا مند نظر ہے شکوا کیسا داستاں کیسی
نہ کہہ پائے جو حرف آرزو بھی وہ زباں کیسی
جسے سنکر نہ دنیا رو پڑے وہ داستاں کیسی
جنہیں پھولوں سے الفت ہے وہی کچھ جان سکتے ہیں
کہ ہوتی ہے گل نکہت کی سونکھی پتیاں کیسی
حقیقت ایک مشت خاک کی کچھ بھی نہ تھی لیکن
بلا دی اس نے بنیاد زمین و آسماں کیسی
مری ناکامیوں پر کوئی کیوں الزام رکھتا ہے
ترا ملنا نہ ملنا ہے تو سعی رائیگاں کیسی
اٹھائیں بار احساں باغباں کا کس لیے قاضی
دو عالم جب ہے گھر اپنا تو فکر آشیاں کیسی

(۱۲) رافت (بہرائچی)

چلی آتی ہیں وقت نزع پیہم ہچکیاں کیسی
سکس ہو رہی ہے عمر بھر کی داستاں کیسی
ابھی یوں ہی ارادا کچھ کیا تھا تو بانکے کا
فضائیں جھوم کر لینے لگیں انگڑائیاں کیسی
کسی سے بھی پڑھا جاتا نہیں اک حرف قسمت کا
نہ جانے لکھنے والے نے لکھی ہے داستاں کیسی
جہاں جس وقت چاہا اتنا کہہ کر کر لیا سجدہ
جو اہل عشق ہیں ان کے لیے پابندیاں کیسی

(۱۳) ناشاد (فتحپور آوی)

یہ میخانا نہیں مسجد سہی اے میکشو لیکن
جو پینا ہے نہیں پی لو یہاں کیسی وہاں کیسی

(۱۴) کنیز محمد شاعرہ صحرا نورد صحرانوی

ہوئی روداد ہستی خلق کی ورد زباں کیسی
سبق آموز عالم ہے ہماری داستاں کیسی
جدا ہے گل سے بلبل اور بلبل ہے جدا گل سے
چلی باغ جہاں میں دفعتاً بادِ خزاں کیسی
سراپا لیں ذرا حسن مذاق یار تو دیکھو
وہ کہتے ہیں بنائی ہے یہ حالت مہرباں کیسی
زمیں کو بار ہے اب تو حیات نوع انسانی
الٰہی تو نے نازل کی بلائے آسماں کیسی
جسے سن کر بھگو ہو شاعرہ شق سننے والے کا
ہماری داستاں ہے وہ کسی کی داستاں کیسی

(۱۵) مرزا مقرب حسین نایاب (لکھنوی)

گل و برگ و شجر میں ہے تری صنعت نہاں کیسی
بنا دی ہے ہر اک شئے بہر تفریح جہاں کیسی
سکوں سے چار دن کی زندگی کٹنے نہیں دیتا
مصیبت پر مصیبت ڈھا رہا ہے آسماں کیسی
نہ دیکھا اک جگہ تو نے اکٹھا چار تنکوں کو
کدورت ہے نشیمن سے تجھے برق تپاں کیسی
ہوئے آمادہ ترک چمن از راہ مجبوری
تھی برہم اہل گلشن سے نگاہ باغباں کیسی
شگفتہ ہی نہیں دل کی کلی نایاب جب اپنی
تو پھر سیر چمن کیسی - بہار بوستاں کیسی

(۱۶) شاہ درویش وارثی (لکھنوی)

شمیم گلستاں کیسی نسیم بوستاں کیسی
سبھی قربان تجھ پر اے بہار دو جہاں کیسی
ابھی میں آشیاں میں تھا ابھی کنج قفس میں ہوں
بدل جاتی ہے دم بھر میں نگاہ باغباں کیسی
خیال جرات عرض تمنا اور وہ دامن
ابھی سے تھرتھراتی ہیں یہ دیکھو انگلیاں کیسی
نہ سلجھیں زندگی بھر زندگی بھر ان کو تسلجھایا
خدا جانے محبت میں پڑی ہیں گتھیاں کیسی
کوئی بچھڑا ہے وحشی کارواں سے دشت غربت میں
پریشاں ہر طرف پھرتی ہے گرد کارواں کیسی

(۱۷) عشرت (فرخ آبادی)

وہ پردے اٹھ ہی جائیں گے وہ جلوے دیکھ ہی لیں گے
خلوص دل سلامت ہے تو سعی رائیگاں کیسی
زمانا کہہ رہا ہے اور تم محو تبسم ہو
یہ افسانا تمہارا ہے ہماری داستاں کیسی
کہاں ہے برق سوزاں اب قفس پر کیوں نہیں گرتی
رہی وقف ستم رانی برائے آشیاں کیسی
بہل جاتا ہے دل قیدی نشیمن بھول جاتا ہے
لگائی جا رہی ہیں اب قفس میں تیلیاں کیسی
نکالی جاتی ہے اردو زباں اب اجنبی کہہ کر
ہوئی ہے تنگ عشرت وسعت ہندوستاں کیسی

(۱۸) محمد عمر احسان (لکھنوی)

جھکی جاتی ہے سجدے میں جبین آسماں کیسی
کسی کے آستاں پر ہے بہار آستاں کیسی
خیال آیا شب معراج جرات کا جو حضرت کو
گنہگاروں کو دلوا دی جہنم سے اماں کیسی
سلام ان پر ہزاروں ہو پہنچے وہ جو دان پر ہزاروں
کہ جن کے نور سے پھیلی ضیائے دو جہاں کیسی
نہیں ممکن لکھے احسان کوئی نعت محمد کو
کہ جب قاصر فرشتوں کی یہاں پر ہے زباں کیسی

(۱۹) پیارے مرزا کشش (لکھنوی)

اجازت دو تو دیکھو چلتی ہے میری بات کیسی
سناتا ہوں تمہیں میں آج اپنی داستان کیسی
نگاہ مجکو گلشن سے نشیمن بھی جلا ڈالا
یکایک پھر گئی مجھ سے نگاہ باغبان کیسی
در و دیوار تھرانے لگے صیاد بھی رویا
اسیران قفس نے یہ سنا دی داستان کیسی
ہوا ہے آج قتل عام یہ معلوم ہوتا ہے
زمین کہے قاتل ہو رہی ہے خونچکاں کیسی
کسی کے عشق میں کیا ہو گیا ہے یہ بھی یو اٹا
گریباں کی اڑائی ہیں کشش نے دھجیاں کیسی

(۲۰) ادیب (اگا سنگھوی)

سلوک باغباں کیا جفا ہے آسماں کیسی
یہ اپنی بھول ہے نیرنگی رنگ جہاں کیسی
وہ چشمے جن سے تھی امید سیرابی گلستاں کو
انہیں چشموں سے پیدا ہو رہی ہیں بجلیاں کیسی
مرے سجدوں میں کچھ بوے وفا معلوم ہوتی ہے
جبین شوق سے لپٹی ہے خاک آستاں کیسی
مرا ذوق نظر ندرغم دنیا ہو اہمدم
جمال روے گل کیسا۔ بہار بوستاں کیسی
ادیب نے ندگانی کا کوئی پہلو نہیں روشن
تجلی زبان بلبل ہندوستاں کیسی

(۲۱) علی احمد خاں انجم (ملیح آبادی)

نئے ہندوستاں میں تلخی تیغ و سناں کیسی
یہ بزم ساغر و مینا میں آہ و فغاں کیسی
ابھی کھل بھی نہ پائے تھے کہ کھلانے لگے غنچے
میں حیراں ہوں بتا یہ فصل گل ہے باغباں کیسی
سر بازار لوٹا بھائیوں نے اپنی بہنوں کو
ہوا یہ مل گئی اے مادر ہندوستاں کیسی
ہمارے دم سے گل ہنستے ہیں کلیاں مسکراتی ہیں
ہمارے بعد کیا معلوم آئیں آندھیاں کیسی
جب اپنا دیس کپڑے اور کھانے کو ترستا ہو
تو انجم تنہ کیسا۔ ساز کیسا شوخیاں کیسی

(۲۲) مرزا محمد علی بیگ حیرت (ملیح آبادی)

گرائیں تاک کر اے آسماں یہ بجلیاں کیسی
اڑا دیں فصل گل یہ آشیاں کی دھجیاں کیسی
یہ ویرانی یہ عریانی یہ تفریحات کا عالم
وبائے مرگ یہ ہر سو اے ہندوستاں کیسی
نہ باد اہے نہ ساغر ہے صراحی ہے نہ پیمانا
تو پھر اے پیر میخانا بہار گلستاں کیسی

(۲۳) والی (لکھنوی)

نہیں آتا زباں پر کوئی حرف آرزو لیکن
کوئی جب مہرباں ہوتا ہے کھلتی ہے زباں کیسی
نظر کچھ اور کہتی ہے زباں کچھ اور کہتی ہے
حسینوں کی بھی ہوتی ہے ادائے دلستاں کیسی
کسی کی ہر ادا سے رنگ طفلی کا جھلکتا ہے
دکھائے ہیں جوانی میں بھی وہ اٹھکیلیاں کیسی

مضمون لکھنے والوں سے عرض ہے کہ جو بھی لکھیں مہربانی فرما کر صاف صاف خط میں لکھا کریں بعض وقت تو جلدی کے سبب پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض تو ایسے ناخواندہ خط ہوا کرتے ہیں کہ سر جوڑ کر بیٹھنے کے بعد بھی چند لفظوں کے معمے حل کر جانا ممکن ہو جاتا ہے۔ آپ خط ہی کیوں **اور شاعروں سے** مگر جو بھی لکھتے ہیں صاف اور صحیح طور پر لکھیے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ یہ کہ شاعر حضرات بھی اس طرف خاص طور پر توجہ فرمائیں گے

(گیارہویں قسط)

حجاج بن یوسف

ڈاکٹر میر سیادت علیخان

گیارواں باب

اصلاحات

بہ قول فان کریمر حجاج اپنے عہد کا سب سے بڑا مدبر تھا قیام امن و امان کے سوا جس کی تفصیل اب تک بیان ہوئی۔ اس کے عراق میں دو سرے کام کم اہم نہیں یہ کام حسب ذیل تھے۔

(۱) مالیات عراق کی درستی

(۲) خوبی انتظام

(۳) عراق میں عبد الملک کے تین اصلاحات کو کامیاب کرنا۔ یعنی

ا۔ عربی سکہ وضع کرنا۔

ب۔ غیر عربی عنصر کو دفاتر سے علیحدہ کرنا اور عربی کو سرکاری زبان ٹھہرانا۔

ج۔ جرثقیل برید کو ترقی دینا۔

مالیات میں اپنی بے مثال کتاب "الفاروق" میں علامہ شبلی نے عمر بن عبد العزیز کا حجاج کے متعلق یہ قول نقل فرمایا ہے کہ "حجاج پر خدا لعنت کرے۔ کم بخت کو دین کی لیاقت تھی اور نہ دنیا کی۔" عمر بن الخطاب نے عراق کی مال گذاری دس کروڑ اٹھائیس لاکھ درہم وصول کی۔ زیاد بن ولید نے دس کروڑ اور حجاج نے باوجود جبر و ظلم کے صرف دو کروڑ اٹھائیس لاکھ درہم وصول کیے۔ مسعودی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

اوپر کی رائے میں حضرت عمر و زیاد کے بعد سے عراق کی مال گذاری کا کم ہونا ظاہر کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ حجاج کا جبر و ظلم اور اصول سیاست سے ناواقفیت دراصل اس کا باعث تھا۔ عراق کی مال گذاری کا کم ہونا صحیح ہے لیکن کچھ اختلاف کے ساتھ حضرت عمر ابن عبد العزیز نے دو کروڑ ستاسی لاکھ مسعودی نے دو کروڑ پچیس لاکھ اور بلاذری نے چار کروڑ ظاہر کی ہے۔ ان جزوی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم بھی مال گذاری کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کمی کے اسباب و علل پر بھی غور کرنا ہوگا۔ حضرت عمر کے عہد سے لے کر حجاج کے عہد ولایت کی ابتدا تک یعنی (۱۸ھ تا ۷۳ھ) ۹۴ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس مدت میں حضرت عثمان کا بارہ سالا امن کا دور بھی شامل ہے حضرت عثمان کے عہد کے بعد سے ۳۷ھ تک بالعموم عراق میں کبھی بھی امن نہ رہا۔ خانہ جنگی کا وہ زور و شور رہا کہ الامان والحذر! خوارج یعنی۔ زبیری، فساویہ کے قیسی وغیرہ لڑپڑے جب یہ لوگ کشت و خون میں مشغول ہوں تو عراق کی مال گذاری متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ حضرت علی کے وقت میں خوارج کو لوٹ مار کے سوا خود آپ کے بعض عمال بھی لوٹ مار سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ مسعودی میں ایک واقعے کا ذکر ہے کہ حضرت علی نے سفیان بن عوف کو مالک بن کعب کی مدد کے لیے چھ ہزار فوج کے ساتھ انبار اور مداین کی طرف بھیجا۔ وہ ان مقامات سے سارا مال و خراج جمع کر کے لے گئے۔ حضرت علی خود ان کے تعاقب میں نکلے لیکن وہ لوگ حضرت کے ہاتھ نہ آئے اس کے بعد عہد فتنہ کے تیرا سال یعنی (۶۱ھ تا ۷۳ھ) پر بھی غور فرمائیے کہ اس عرصے میں عراق میں کتنا کشت و خون نہ ہوا۔ اور کتنے مدعیان حکومت نہ کھڑے ہوئے جو ں ہی موقع ملا ان لوگوں نے خراج لگایا۔ اور فوراً ہی وصول بھی کر لیا۔ اس پر عمل بھی کرنا خوارج کا تو معمول

ساہو گیا تھا یعنی ادھر خراج لگایا ادھر وصول کیا اور یہ لوگ قتل و غارت سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ صعب بن زبیر کے واقعات میں مذکور ہے کہ آپ سپاہیوں کو کبھی کبھی ماہ ان کے مقررہ عطیات اور وظائف نہیں دے سکتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خزانے میں رقم نہ ہونے کے سبب یہ مجبوری لاحق ہو جاتی تھی

مختصر یہ کہ ان واقعات کی بنا پر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر کے بعد سے مال گذاری کا گھٹنا شروع ہو گیا تھا جس سے حکومت کا مالیا بری طرح سے متاثر تھا۔

۷۳ھ کے بعد سے جو خونیں جنگیں ازارقہ اور خوارج سے پیش آئیں ان کا اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے۔ ان واقعات سے آپ نے بخوبی اندازا لگایا ہوگا کہ ان کا رد کنا حجاج کے بس کے باہر تھا۔ اس لیے کہ حجاج خود ان کا بانی نہیں تھا بلکہ دوسروں نے اس کو جنگوں پر مجبور کیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان جنگوں کا سلسلا حجاج سے پہلے ہی سے چلا آ رہا تھا۔ گویا خرابی شروع ہی سے موجود تھی اس لیے ان کی وجہ اگر مال گذاری کم ہو گئی تو حجاج اس کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مالگذاری میں کمی کا اگر ایک سبب ہولناک جنگیں تھیں تو دوسرا سبب بہت سے ذمیوں کا مسلمان ہو جانا تھا جس کی وجہ سے جزیہ وصول نہ ہو سکتا تھا نیز ایک تیسرا سبب بھی تھا یعنی یہ کہ گاؤں کی آبادی کا شہروں میں بڑی تعداد میں منتقل ہو جانا۔ حجاج نے مال گذاری بڑھانے کی بڑی ہی موثر تدبیریں اختیار کیں مثلاً مویشیوں کی تعداد بڑھانے کی ترغیب دی اور زراعت میں ترقی دینے کے نت نئے طریقے بتائے۔ دودھ دینے والے جانوروں خصوصاً گائے کے ذبیحہ کو اس نے بند کر دیا۔ اور نسل کشی کی خاطر ہندستان سے نر گائے کافی تعداد میں منگوائے تاکہ نسل اچھی ہو اور تعداد بھی بڑھے۔ بیس لاکھ درہم کاشتکاروں کو بطور تقاوی دیے۔ نیز دجلہ اور فرات کے درمیان کی جو نہر تباہ ہو چکی تھی اس کو پھر سے تیار کروایا۔ نیل اور ابی دو نہریں بنائی گئیں وہ ٹوٹ گئے جس سے بہت سی زمین زیر آب ہو گئی تھی نوشیروان کے وقت تک اس کی تعمیر نہیں ہوئی تھی نوشیروان نے بھی صرف ایک حصے کی تعمیر کی تھی۔

۸۸ھ یا ۸۹ھ میں پرویز کے وقت میں یہ بند متعدد مقامات پر ٹوٹ گیا تھا۔ حجاج نے ان کی تعمیر کے لیے خلیفا ولید سے تیس لاکھ درہم کی منظوری چاہی مگر ولید نے اس رقم کو بہت زیادہ سمجھا لیکن مسلمیہ نے اپنے بھائی کو اجازت دی کہ اپنے ذاتی صرفے سے اس کی تعمیر کرے۔ چنانچہ ہشام کے وقت اس کی تعمیر ہوئی۔ گاؤں کی آبادی جو شہروں کے آرام اور سیر و تماشے کی وجہ سے شہروں میں منتقل ہو رہی تھی حجاج نے سختی سے اس کو روکا اور جو لوگ آ گئے تھے انہیں اپنے اپنے گاؤں واپس چلانے کا حکم دیا۔ اس سلسلے میں یہ قصہ محض غلط ہے کہ حجاج نے بطور سزا ان کے ہاتھ دانے۔ حجاج جیسے مدبر سے ایسا مہمل اور غلط نا فعل ہرگز سرزد نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح ذمیوں سے مسلمان ہو جانے کے بعد جزیہ وصول کرنے کا قصا کسی عربی تاریخ میں تو کہیں نہیں ملا۔ حجاج کو اسلام کا درد تھا وہ اشاعت اسلام چاہتا تھا چنانچہ اس کے متعدد خطبوں سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے اور خود اس کے افعال سے یعنی قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم کو بھیجکر فتوحات حاصل کرنے سے بھی یہی نتیجا نکل سکتا ہے۔ غرض ہماری رائے میں حجاج اپنے ملک کی بہتری کے لیے بعض اوقات حد سے تجاوز تو کر سکتا تھا لیکن اس سے اسلامی قوانین کی خلاف ورزی اور ذمیوں کے مسلم ہو جانے پر ان سے جزیہ وصول کرنے کی توقع رکھنا نہایت ہی بے جا ہے۔ یہ روایت ہے کہ اس نے ذمیوں سے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی خراج زمین وصول کیا ہو۔ چنانچہ اس بارے میں ہم نے اس سے پہلے یحیٰی بن آدم کی کتاب الخراج سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر و حضرت علی نے بھی یہ عمل کیا تھا۔

حضرت عمر کے عہد کا لحاظ کرتے خراج کا کم ہونا قرین قیاس ہے چنانچہ اس کے اسباب بھی پہلے بیان کر دیے گئے۔

جنگ ستر کے بعد اس نے جی کھول کر رقمیں بطور انعام دیں اور یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ اس وقت خزانے میں پندرہ کروڑ درہم (یعنی تقریباً پچاس کروڑ روپے) موجود تھے۔ حجاج نے نہایت دریا دلی کے ساتھ اس رقم خطیر کو اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ ممکن ہے رقم کی مقدار ظاہر کرنے میں مبالغے سے کام لیا گیا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت خزانے میں رقم بہت زیادہ تھی۔ خیر و انعام کے بھی ہو یہ ایک کھلی حقیقت ہے ہے کہ عراق کا خزانہ کبھی بھی خالی نہ رہا۔ اور آمدنی اخراجات سے بڑی ہوتی تھی۔ خزانے کی فراوانی کا پتا ان لشکروں کی کثرت تعداد سے چلے گا جن کو حجاج نے تیار کیا تھا۔ ابن اشعث "جیشِ راطوارس" پر حملہ آور ہوا تو حجاج نے بیس لاکھ درہم (تقریباً ستر لاکھ روپے) صرف کیے تھے اور محمد بن قاسم کے لشکر پر ساڑھے لاکھ درہم (تقریباً دو کروڑ روپے) خرچ ہوئے تھے۔

قیام امن اور عراق کی مہمات کی درستی کے بعد حجاج کا تیسرا بڑا کارنامہ عراق کی فوجی حالت کو درست کرنا تھا۔ ہم نے اس خصوص میں تفصیل سے لکھا ہے کہ جس وقت حجاج والیِ عراق ہوا۔ اہل کوفہ اور بصرہ کس طرح جنگ سے جی چراتے تھے۔ یہ لوگ ڈسپلن کے دشمن تھے اور ازارقہ کی جنگ سے جی چرا کر ہتیار بیچ اپنے اپنے گھروں میں آ بیٹھتے تھے۔ اس بارے میں حجاج نے پہلی اصلاح جو کی وہ یہ تھی کہ فوجی نوکری پر عربوں کی جبری بھرتی شروع کر دی۔ اس لیے کوفہ اور بصرہ کی فوجوں کو خوارج کے مقابلے پر برابر بھیجتا رہا اور جب گھر میں امن قائم ہو گیا تو انہیں فوجوں کو بیرونی فتوحات پر بھیجا۔ ۸۳ھ میں حجاج اس قابل تھا کہ ابن اشعث کے ساتھ بصرہ سے بیس ہزار اور کوفہ سے بیس ہزار فوج بھیجے جب یہ لشکر ہار کر بھاگا تو قتیبہ بن مسلم کے پاس کوفہ اور بصرہ سے مختلف اوقات میں ہزاروں کی تعداد میں فوج بھیجی جاتی رہی۔ حجاج اس بات میں کامیاب ہو گیا کہ کوفہ اور بصرہ کو فوجی اڈے بنانے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ یعنی کوفہ اور بصرہ عظیم الشان فوجی چھاؤنیاں بن گئیں اور سارے مشرق کے لیے محفوظ فوج کا کام دینے لگیں۔

لیکن اوپر بیان کیے ہوئے حالات پر قناعت نہ کر کے حجاج نے فوجی انتظام کو مکمل کرنے کی غرض سے واسط چھاؤنی کی بنیاد ڈالی۔ واسط، بصرہ، کوفہ اور اہواز سے برابر فاصلے پر واقع تھا۔ اسی وجہ سے حجاج نے اس کا نام واسط رکھا۔ واسط کے بنانے سے فوجی چھاؤنیوں کا ایک مضبوط سلسلہ قایم ہو گیا۔ ان چھاؤنیوں کی اہمیت کیا تھی وہ خاں کریم کے ان لفظوں سے ظاہر ہو گی کہ "عربوں کا آدھی دنیا کو فتح کرنا اور عرصے تک اس کا مالک بنا رہنا اتفاق نہ سمجھنے کی وجہ سے تھا بلکہ ان کے جنگی کارناموں اور فوجی تنظیم کو اس میں بڑا دخل حاصل تھا۔ فوجی تنظیم میں اہم مقامات پر چھاؤنیاں بنانا ایک نہایت ہی دانشمندانہ کام تھا۔"

عبدالملک ساری سلطنت کو ایک سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی ایک سا انتظام قایم کرنے کے لیے ایک ہی قسم کے محکمے اور ادارے ضروری ہوتے ہیں۔ اس کے لیے عبدالملک نے ایک سکہ وضع کیا ایک ہی زبان کو کل سلطنت اسلام کے لیے دفتری زبان قرار دیا اور محکمہ برید کو ترقی دینے سے کل سلطنت کے واقعات سے باخبر رہا۔ اور جب ضرورت ہوئی دور دراز ممالک میں بھی مناسب انتظام کر سکا۔

حجاج نے ان امور میں عبدالملک کے ارادے کی پوری پوری تعمیل کی۔ عبدالملک کے احکام جاری کرنے کے بعد حجاج نے درہم وضع کیے اور ان پر "قل ھو اللہ احد" لکھوایا اور حکم دیا کہ ہمارے سوا کوئی شخص نہ بنائے۔ سمیر نامی یہودی نے خلاف ورزی کی تو اس کو قتل کرنے کی دھمکی دے کر قید کر لیا۔ سمیر نے کہا میرے درہم کا معیار تیرے درہم کے معیار سے اچھا ہے پھر کیوں مجھے قتل کرتا ہے۔ حجاج نے اس پر بھی اس کو نہ چھوڑا۔ اس واقعے سے ظاہر ہے کہ ضد حجاج ہشیار یہودی ساہوکار سے زیادہ ہشیار تھا اور اس نے وہی کیا جو آج کل کی ساری حکومتیں کرتی ہیں کہ سکہ سازی کو صرف حکومت کے لیے

تھا کر دیا اور اس طرح پر عبدالملک کے سکہ سازی سے متعلق احکام کی پوری پوری تعمیل کی۔ نیز اس کے صحیح منشا کو پورا کیا جس سے اس کی عالی دماغی اور دور اندیشی ظاہر ہوتی ہے اس کے علاوہ حجاج نے تجارت میں مزید سہولتیں پیدا کرنے کی خاطر اوزان اور پیمانجات مقرر کیے ان ہی تمام امور نیز مالیات کی درستی سے متعلق اس کے احکام کو پیش نظر رکھتے ہوئے پروفیسر والہوسن نے لکھا ہے "سکہ سازی اوزان و پیمانجات خراج اور زرعی ترقی کے متعلق اس کے احکام یادگار زمانہ ہیں"

اسی طرح عبدالملک کے دوسرے بڑے کاموں یعنی عربی کو سرکاری زبان قرار دینے اور عربی عنصر کو دفاتر میں داخل کرانے میں حجاج نے بڑی قابلیت سے عبدالملک کا ہاتھ بٹایا۔ اس وقت سوائے فوج کے مملکت کے باقی تمام عہدے ایرانیوں اور بیزنطیوں کے ہاتھ میں تھے۔ عبدالملک نے ان کی بجائے عربوں کو دفاتر میں رکھنا اگرچہ اس سلسلے میں اس کو پہلے پہل کامیابی نہ ہوئی اس لیے کہ عربوں کو دفتری کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن جیسا کہ علامہ بلاذری نے لکھا ہے حجاج کی کوششوں سے اتنا تو ضرور ہو گیا کہ خراج کے رجسٹر اور سرکاری دفاتر میں بجائے فارسی کے اب عربی رائج ہو گئی۔ عربی زبان کے اندراج سے حکمرانوں کی فارسی کی ناواقفیت سے جو غبن ہوا تھا اس کا انسداد ہوا۔ اور کل ملک میں ایک زبان ہونے سے جو ایک بنگی اور اتحاد پیدا ہوا وہ ہر مسلمان کی خوشی کا باعث بنا۔

حجاج نے عبدالملک کے محکمہ برید کے انتظام میں بھی مدد دی۔ کل مشرق میں حجاج نے برید کا انتظام اچھا رکھا چنانچہ آپ نے دیکھا کہ جب مطرف ابن مغیرہ باغی ہوا تو رے اور سجستان تک برید کے ذریعے حجاج نے فوج بھیجی۔

حاصل کلام یہ کہ جس طرح حجاج نے قیام امن میں اپنے لاثانی تدبر کا اظہار کیا تھا نظم مملکت میں اس سے کم نہ رہا اور جس طرح سکہ سازی اوزان و پیمانجات خراج اور زرعی ترقی اور سیاسیات کے متعلق اس کے کام بقول والہوسن یادگار زمانہ ہیں اسی طرح عربی زبان کے دفتری زبان قرار دینے اور فوجی تنظیم کو مکمل کرنے اور دوسرے مدبرانہ امور میں عبدالملک کا ہاتھ قابلیت سے بٹانے میں بھی حجاج کا تدبر ہمیشہ یاد گار رہے گا۔ ہاں حجاج نے "جریدہ عام" پر اپنا "دوام" ثبت کر رہا ہے کیونکہ اپنے ان بے نظیر خدمات سے "کل مشرق" کو اس نے منظم اور قوی کر دیا اور قتیبہ بن مسلم کے ذریعے تاریخ عالم میں بے مثال فتوحات حاصل کیں۔ اسلام کا جھنڈا کل وسط ایشیا میں لہرایا سمرقند و بخارا اور خوارزم کو اسلامی ممالک بنا دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں اسلام کے قدم جما دیے۔ اب ہم آنے والے حصوں میں اسی کا ذکر کریں گے۔

غزل

حسرت موہانی

میری بہاریں جو کھل کے مسکرا نہ سکے
وہ دل گرفتہ کسی طرح چین پا نہ سکے
جو آندھیوں کے مقابل قدم جما نہ سکے
وہ زندگی میں کوئی انقلاب لا نہ سکے
غم حیات کے صدمے تو سہہ گئے لیکن
خدا گواہ محبت کا غم اٹھا نہ سکے
نہ ہو سکا ہے نہ ہو گا وہ آشیاں لقمیر
جو برق و باد حوادث کی تاب لا نہ سکے
وہ آنکھ ہی نہیں جو غم سے آشکار نہ ہو
وہ دل ہی کیا جو ستم کے فریب کھا نہ سکے
چراغ کیا وہ جلائے بھلا زمانے کے
ہوا کی زد سے جو اپنا دیا بچا نہ سکے
مچل کے رہ گئے مشکوے لب و خاموش حسن
زباں تک آہ کوئی دل کی بات لا نہ سکے

تصویریں

ایاز عصمی

(۱)

وہ حوض پیتی چھوٹی چھوٹی کنکریاں پانی میں پھینک رہی تھی۔ زندگی کے سوجود ہیجان نے اسے کسی قدر ہیجان پسند بنا دیا تھا اور نہ جانے کیوں کنکریاں اور پانی کی خاموش سطح کے ٹکراؤ سے پیدا کی ہوئی ننھی منی لہریں اسے بڑی بھلی لگتیں۔ کنکریاں پانی کی خاموش اور پرسکون سطح پر ایک ہلکا سا ارتعاش چھوڑتی ہوئی پانی کا سینہ چیرتی ہوئی حوض کی تہہ میں جمی ہوئی پیلی کیچڑ میں دھنس کر گم ہو جاتیں تو اس کے دل کی حرکت کچھ تیز ہو جاتی۔ اور سطح پر بنی منی گول گول لہریں تھرکتی ہوئی کنارے کی طرف بڑھتیں اور کنارے کو چھو کر سطح کی وسعت میں چھپ جاتیں تو وہ کچھ غمگین سی ہو جاتی وہ بڑبڑا اٹھتی "میں بھی ایک لہر ہی تو ہوں۔ اور حرص و ہوس کے ہمت کنارے سے ٹکرا کر موت کی دسعت میں کھو جاؤں گی" کنارے اور لہروں کی آنکھ مچولی نے اسے موجود "وقت" سے بہت دور لے جا پھینکا ..... اس کی نظر کے سامنے اس کی گذشتہ زندگی کی وہ تصویر تھرتھراتی ہوئی آئی۔ جس میں خوشحالی، آسودگی اور سکون تھا۔ شوہر کا پیار، ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت تھی ..... اور اچانک سیلولائیڈ کے فیتوں کی طرح تخیلات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ پرسکون اور ٹھہری ہوئی زندگی میں گویا لکیریں پھینک کر ہیجان اٹھا دیا گیا ہو۔ اندھیرا۔ گھپ اندھیرا ..... شور و غل ہنگامے، دھماکے۔ شعلے، آہیں، چیخ و پکار ——— اور پھر آہستہ آہستہ شور و غل، ہنگامے۔ دھماکے آہیں سب بند ہو گئے۔ شعلے سرد پڑ گئے۔ تصویر پھر ابھری مگر مناظر بدلے ہوئے تھے۔ عمارتوں کے ملبوں اور جھونپڑیوں نے کھنڈروں اور راکھ کا روپ دھار لیا تھا۔ مسکراہٹیں اور قہقہے۔ آنسو اور گریہ میں بدل چکے تھے۔ خوشی کے شادیانے موت کے غمناک راگ میں تبدیل ہو چکے تھے۔ شیطنیت کی جوالا مکھی نے جو لاوا اگلا تھا اس نے ہری بھری کھیتوں ہی کو نہیں جلایا تھا بلکہ انسانیت تک کا سوتا جھلس کر رکھ دیا تھا اور انسان بھاگنے لگے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کی بربریت سے ڈر کر موت سے دور پناہ کی آغوش کی طرف اور بھاگتے ہوئے وقت کا ساتھ اسے بھی دینا پڑا۔ اسے بھی بھاگنا پڑا وہ بھی بھاگتے ہوئے وحشت زدہ لوگوں کے گروہ میں شامل تھی جان بچانے اور کرنے والے شوہر و والدین گرمہتی۔ مکان آبرو اور جان کے پیچھے جان گنوا بیٹھے تھے۔ انہیں ان ہی جیسے انسانوں نے موت کی میٹھی نیند سلا دیا تھا۔ چہروں، تعفن، تلواروں بندوقوں اور بموں کی لپوں سے وہ سو گئے اور جو سوئے نہیں انہیں بھاگنا پڑا ——— اور پھر تصویر کا یہ رخ دھندلا پڑ گیا اور ایک دوسری تصویر ہلتی کانپتی لرزتی اس کے سامنے آئی۔ ایک بھیانک اور گھناؤنی تصویر ..... .

(۲)

وہ اکیلی تھی ——— اپنے شوہر اور مشفق والدین کی لاشیں "وہیں" چھوڑ آئی تھی۔ اس نے سوچا "کاش وہ ان لاشوں کو لا سکتی تو اپنے رہنماؤں کو وہ لاشیں دکھا کر کہتی" یہ ہے تمہاری آزادی کا جنازہ ان شہیدان وطن کی لاشوں کو خود کہیں گم کر دو اور اپنے نوجوانوں کو تاکید کر دو کہ وہ ان کے متعلق کچھ نہ پوچھیں ورنہ آئندہ نوسل کبھی کوئی بھی انسان تمہارے ملک کی تواریخ کی ورق گردانی کرے گا۔ تو ان شہدا کا خون پکار پکار کر وہ تمہارے ان جسموں کو ڈھا دینے کا عزم کرے گا جو تمہارے بعد تمہارے مکار پیروکار شاہراہوں پر نصب کر دیں گے گران چند لاشوں کو چھپا دینے سے بھی کیا ہوگا۔ تمہارے سامنے تو لاکھوں چلتی پھرتی سانس لیتی لاشیں کھڑی چیخ رہی ہیں۔ جنہیں تم نے اپنی خود غرضی پر بھینٹ چڑھایا ہے ——— مگر تم نے تو اپنی اونچی حویلی

مڑیاں بند رکھی ہیں۔ اپنے کان اور اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں
ارے پڑے دروازوں پر سنگینوں کا پہرا ہے تاکہ تمہارے
توں میں سے کسی کی چیخیں روح تمہاری حویلیوں میں گھس
پڑے۔ تم نے لاشوں کی چیخ کو گولیوں کی آواز میں گم کرنے
ا شار چار کی ہے مگر تم نہیں جانتے یہ لاشیں گولیوں نے ہی
ا ری ہیں۔ گولیاں انہیں دبا نہ سکیں گی ——" اور تھرک
و یر نے اس کے سامنے کل کا ایک اور منظر رکھ دیا۔

کل جب وہ، اور اس کی طرح لاکھوں لٹے پٹے دکھی انسان
ا نگری میں آئے تھے تو انہیں کس طرح ہاتوں ہات لیا گیا تھا۔
یف۔ کیمپ ۔ اور فنڈ ۔ چند دن بیت گئے اور ایک
ے بھوک اور بے کاری اور دوسری طرف دکھاوے کی ہمدردیاں
پڑتی گئیں۔ خدمات۔ نیکی اور ہمدردی کی جگہ ناپاکی غرض
گنا ونے لے گی ——— اس دوپہر کی بات وہ، کیسے بھول
ی تھی۔ جب کیمپ کے ایک انٹیرنے اپنی ایک آنکھ داب کر
ے ایک غلیظ اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ ایک تلخ مسکراہٹ
کے ہونٹوں پر کوندی اور وہ، اس کی طرف بڑی بھیا ج
یچ کہا۔ اور وہ انٹیرنے اپنا سا موہنے لے کر دوسری طرف کھسک
ا لیس کا بچا، اس کی زبان سے نکلا اور اس نے سوچا۔
ری جگہ اگر اس کی بہن بھی ہوتی تو شاید یہ کتا صفت چھوکرا
ہی کرتا" اور اس نے جی ہی جی میں بڑبڑا کر اپنے دل کو
سایا کہ صدیوں کی غلامی نے اس ملک کے لوگوں کے اخلاق اور
نیت کو پستی کے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں پہنچکر اکثر قومیں
ٹ گئی ہیں۔

رفتار فتا اس نے محسوس کیا کہ اکثر لوگوں نے پناہ گزینوں
ے ہمدردی کا ڈھونگ صرف اسی لیے تو رچا یا ہے کہ وہ پریشان
ا ہیں ان کا مذاق اڑایا جا سکے ان کے پاس پیٹروں میں لپٹی
ئی عورتیں ہیں۔ فریبوں کی آڑ لے کر ان کے حصول سے اپنی اپنی
ین سے رنگین تر بنا سکیں اور وہ سوچنی گئی "ملک میں
ھی بلائیں آئیں، اور بخار جو ہار دلوں کا ہے غلامی کا ہے

"نتیجا تھیں"۔ اور اس کی نظروں کے سامنے قحط بنگال کا غم انگیز منظر دوڑ گیا کہ کس طرح انہوں نے ایک بڑی انسانی آبادی کے منہ سے نوالے چھین کر انہیں سونے میں ڈھال کر اپنی تجوریاں بھر لی تھیں۔ ان کے دامن نہ جانے کتنی ہی بھوکی جوانیوں نے خون عصمت سے داغدار ہوئے تھے۔ زمانے سے "یہ محلات "جھونپڑیوں" کو فریب دیتے آئے ہیں مگر ان مٹی کی بنی ہوئی جھونپڑیوں میں بسنے والے انسان بھی سچ مچ "مٹی کے مادھو" ہی تو تھے۔ بھولے۔ خرگوش جیسے بھولے۔ . . . . . "

ایک پناہ گزیں کا بچا بھوک سے تلملا کر چیخ اٹھا۔ اور اس کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔

مگر اس معصوم بچے کو دودھ کہاں سے آئے۔ بھوک نے ماں کی چھاتی سے دودھ کی بوند بوند نچوڑ لی تھی۔

کل تک اس کے والدین دوسروں کے بچوں کی آواز پر تڑپ اٹھتے تھے۔ مگر آج ان کا بچا "ان" کے خلاف احتجاج کر رہا تھا جو خدمت کی آڑ لے کر اپنا گھر بھر رہے تھے تو خاموش تھے۔ بلکل خاموش اور بے زبان بے زبانی شاید اس معصوم کے احتجاجی نعرے کی تائید کر رہے تھے۔

(۳)

——— اور پھر اپنے منتشر خیالات کے سلسلے کو جوڑنے کی کوشش نے اس کے سامنے اس کی ایک اور تصویر رکھ دی جو سیاہ تھی اتنی سیاہ کہ وہ اپنے آپ کو پہچان بھی نہ سکی۔

"آپ اکیلی اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتیں اس میں کیمپ کی بدنامی ہو سکتی ہے . . . . . .

. . . . آپ آفس میں تشریف لے چلیں" کیمپ کا انچارج اسے حکم دیتا ہوا دوسروں کی طرف بڑھا اور اس نے بلکے بستر سے وہ ساڑھی نکالی جو کچھ صاف تھی اور پرسوں ہی ایک خوش پوش عورت نے اس کے حال پر ترس کھا کر اسے دی تھی اور اسے سوچا" . . . . . تصویر کھینچ کر

کھلی چٹھی ہی تو تھی۔ اونچی اٹاری والی گرگابیوں اور استری شدہ ساڑی میں اس کی آنکھیں کو یا کہہ رہی تھیں "بھئی ہم تم پناہ گزیں کتنے گندے ہو۔ میلے کچیلے۔ مریل۔ مجھے دیکھو۔ مونہہ پر اسنو، پوڈر لگا ہے۔ ہونٹوں پر سرخی سجائے۔ اس سادہ مگر قیمتی ساڑی میں کتنی اچھی نظر آتی ہوں۔ میرا بچا دودھ کے لیے کبھی نہیں روتا ہم نے اس کے لیے کافی دودھ جمع کر رکھا ہے۔ ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت سارے روپے خرچ کر رہے ہیں تاکہ پڑھ لکھ کر وہ ایک دن حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں اور تمہارے نیچے۔ بھی! گھاؤ نے۔ پلیلے" اور اس نے ایک نفرت بھری نگاہ اس ساڑی پر ڈالی ــــ اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی سستا اور بھدی ساڑی ہی میں کیمپ کے آفس میں کھڑی تھی۔

"دیکھیے ہم قانون سے سخت مجبور ہیں ایک آدمی کو ایک کمرا الاٹ نہیں کیا جا سکتا۔" انچارج کہہ رہا تھا۔

"پھر میں کہاں جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔؟"

"میں جلد ہی آپ کے لیے ایک مکان کا بندوبست کر دوں گا اور اگر آپ برا نہ مانیں تو اس وقت میں اپنے مکان کا ایک کمرا آپ کے لیے خالی کر دوں گا۔ میرا مطلب ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی شکریہ!" اس نے انچارج کی بات کاٹ دی۔ اور اس کے چہرے پر غم اور غصے کے تاثرات جھلک اٹھے۔ مگر اپنی حالت پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی گردن جھکا لی "وقت" نے اس کے گرم جذبات کو گویا برف کی سل کے نیچے دبا دیا۔ اور وہ وہیں کھڑی کھڑی سوچتی رہی "حضرتِ انسان کے ناپاک مجسموں نے ہمدردی کا چولا کتنی خوب صورتی اور چالاکی سے اوڑھ رکھا ہے کہ گھور گھور کر دیکھنے کے بعد بھی اس لبادے کے پیچھے چھپے ہوئے پتلون کا پتا تک نہیں مل پاتا۔

"تو پھر کیا سوچا آپ نے؟" انچارج کی آواز سے وہ چونکی۔

"مردِ بدست زنده" جو آپ مناسب سمجھیں!" اور نہ جانے کیا کچھ سوچتی ہوئی سر جھکائے آفس سے باہر نکل گئی۔

(۴)

ــــ اور کیمپ چھوڑنے کے وقت اس نے ان برف کے تودوں پر ان چھ کے ٹکڑوں پر ایک رحم بھری نگاہ ڈالی جو کیمپ کے بڑے کمپونڈ میں پھیلے ہوئے تھے جو کبھی آدمی ہوں گے ــــ پر اب ریفیوجی تھے۔ پناہ گزیں۔ ! ــــ جو کہنے کو تو انسان تھے پر نہ جانے کیوں گندگی کے کیڑے کی طرح اپنی موجودہ ذلیل زندگی پر قانع تھے۔ کیا ان میں کوئی ماں کی جائی جوان آف آرک نہیں جو لوک شمشیر سے بھاگتے ہوئے وقت کا رخ بدل نہ دے۔ کیا ان جوانوں میں کوئی لینن نہیں جو مردہ جسموں میں جوان روح پھونک کر انہیں ان کی منزل کی طرف بڑھا دے ۔ ــــ پر کیمپ کی پوری آبادی پر موت کی سی خاموشی ایک گہرا سکوت چھایا رہا۔ گویا سب سو رہے ہوں ــــ اور وہ کیمپ کے وسیع احاطے پر الوداعی نظر ڈال کر انچارج کے ساتھ ہو لی۔ اس یمینے کی طرح جو اس بھیڑیے کے ساتھ ہو لے جس نے بھیڑ کی کھال اوڑھ رکھی ہو ــــ یہ جانتے ہوئے کہ یہ بھیڑیا نہیں بھیڑیا ہے۔

چلتی ہوئی گاڑی کے ہچکولوں پر وہ سوچنے لگی زندگی نام ہے وقت کی تیز رفتار گاڑی کے ہچکولوں کا ــــ پر کبھی کبھی یہ ہچکولے ایک جھٹکے سے انسان کو سونہہ کے بل بھی گرا دیتے ہیں۔ اور وہ خدا بھی تو سونہہ کے بل گر پڑی تھی۔ وقت کی تیز رفتار گاڑی نے اسے ۔ ۔ ۔ ۔ کہاں لا پہنچا دیا تھا!! اور یہاں اس کے خیال کی گاڑی رک گئی ــــ اور وہ ایک عالی شان عمارت میں تھی۔ آج کل سے بھی زیادہ اس شان و شوکت اسے اپنے سامنے بکھری نظر آئی۔ مگر وقت بدلا ہوا تھا۔ کل۔ کل تھا اور آج آج ــــ ماضی میں اسے اطمینان تھا۔ سکون تھا ہر چیز سے ایک رنگینی۔ محبت اور پاکیزگی ٹپکتی تھی۔ اور حال میں ہر چیز سے ایک غرض دکھاوا اور گندی ہوس کی بو نکلتی محسوس ہوئی کہ اس بڑھاپے سے اس کا دماغ پھٹنے لگا ــــ

—— اور مستقبل ؟ —— وہ کچھ سوچ نہ سکی ——

"یہ ہے آپ کا کمرا" انچارج نے مسکراتے ہوئے
ے اس کا کمرا دکھا دیا۔

—— اور اسی رات انچارج اس کے کمرے میں
—— اور کئی راتیں یہ "سیاہ" کھیل کھیلتے بیت گئیں
—— اور جب انچارج نے اس گناہ کے کھیل کے لیے ایک
سری بنا گزیں لڑکی کا انتخاب کر لیا تو اسے بھی اس کے
نقبل نے "بازار" میں ڈھکیل دیا۔ جہاں وہ "ایک کرے"
وض "چند سارلوں" کے بدلے بھوک کی جلن مٹانے کے
کتی نہیں۔ بلکہ گندم نما جو فروشوں کے ایمان خریدتی
ان کی شرافت کی "کا بوٹی" کر کے رکھ دیتی ہاں کی دولت
کھیلتی ہے ان کی عزت کا مذاق اڑاتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔

اور آج حوض پر بیٹھی ہوئی پانی میں کنکریاں پھینکتے
ے وہ محسوس کر رہی ہے گویا خاموش سطح پر تھرکتی ہوئی دائرہ
ا چھوٹی چھوٹی لہریں اس سے سرگوشی کے انداز میں کہہ
ہی ہوں "۔ زندگی میں ہیجان پیدا کرنے والے بھی ان
لریوں کی طرح موت، بے اعتمادی اور لعنت کی پیپلی
یں گم ہو جاتے ہیں"۔ اور اسے یہ حوض نصیحت آمیز
ہنیوں کی وہ کتاب معلوم ہوئی جس میں کہانی کے نیچے
فاقی سبق بھی لکھا ہو۔

دی فلم سانگ اینڈ اسٹوریز کارپوریشن لمیٹیڈ پونا ۱۴ کھیری

اگر آپ کو اپنے فلموں کے لیے (مطابق اسٹوری) گیت، غزلیات
کہانیوں کی ضرورت ہو تو ہماری خدمات سے فائدہ اٹھائیے
تفصیلات کے لیے آنے کے ٹکٹ بھیجیے
لیجر فلم سانگ اینڈ اسٹوریز کارپوریشن بشاق منزل لمیٹیڈ پونا ۱۴ کھیری
ماٹونی

غزلیں

اشک (امرتسری)

ازل سے اپنا یہ قصۂ غم ہزار عنوان بدل چکا ہے
میں کہہ رہا ہوں کہ حسن ہے یہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے

یہ شورِ غوغائے زندگی ہے کہ حشرِ فریاد کا پیام ہے
یقین قیامت پہ کیوں نہ ہو یہ اگر قیامت نہیں تو کیا ہے

یہ وقت بھی وقتِ امتحاں ہے یہ دور بھی دورِ آزمائش
وہی نگاہ و نماز خیر و شر ہے وہی بیاباں کربلا ہے

نہ کوئی ہمراز و ہم زباں ہے نہ کوئی ہمدم نہ ہمنوا ہے
یہ چار تنکے ہیں آشیاں کے اب اور گلشن میں کیا دھرا ہے

یہ دل ہے پروردۂ تلاطم یہ موج و طوفاں سے کھیلتا ہے
رہے گی ساحل سے دور کشتی اگر یہ کشتی کا ناخدا ہے

رہِ وفا میں ہے شرطِ ہمت ہزار پیچیدہ راستے ہیں
تلاش کر لیگی اسکو منزل جو فکرِ منزل میں کھو گیا ہے

ابھی مذبذب ہیں اہلِ دانش مگر یہ دانش کا فیصلہ ہے
تمام عالم وہ راز ہے جو نہ کھل سکے گا نہ کھل سکا ہے

نہ چرخ چکر میں ہے نہ سورج زمیں کے گرد گھومتا ہے
یہ کوئی معشوق ہے جو پردا اٹھا رہا ہے گرا رہا ہے

بہارِ گلشن لٹی ہوئی ہے چراغِ محفل بجھا ہوا ہے
قفس کی تاریکیوں میں اشک خراجِ تسغزل سرا ہے

امریکا کی مشہور ناول نگار مسز پرل ایس۔ بک

یو ایس

(اگرچہ امریکا کی مشہور عالم ناول نویس مسز پرل۔ ایس۔ بک کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ تاہم ان کی زندگی کے مخصوص حالات یقیناً دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ پچھلے دنوں ۲۶ جون کو پرل بک نے اپنی ساتویں سالگرہ منائی۔)

پرل ایس۔ بک نے ۱۹۳۱ء میں اپنا ناول "دی گڈ ارتھ" "THE GOOD EARTH" لکھ کر عالم گیر شہرت حاصل کی۔ ۲۶ جون ۱۹۳۶ء کو ساٹھ برس کی عمر کو پہنچیں۔

اگرچہ بک بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ لیکن "دی گڈ ارتھ" ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے جس میں چین کے ایک کسان وانگ لنگ اور اس کی وفادار بیوی او لان کی کہانی کھیتی باڑی سے ان کی اچھے اور قحط اور افلاس کی سختیاں برداشت کرتے اور تین بیٹوں کی کھیتی باڑی سے دلچسپی نہ رکھنے پر ان کی مایوسی کی داستان بیان کی گئی۔ اس کتاب میں ۱۹۲۰ء کے دنوں میں عام بیکاری اور معاشرتی نظام میں بھی کا عکس بھی پایا جاتا ہے اور چینی کسانوں کی عجیب و غریب اور خاص ڈھنگ کی زندگی کو جس افسانوی طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ شاید وہ بہترین اور تسلی بخش ہے۔

اس کی اشاعت کے ۱۲ مہینوں تک یہ سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب رہی۔ اس کے لیے انہیں پلٹزر انعام ۱۹۳۲ء میں ملا۔ اس کا ترجمہ ۲۰ زبانوں میں ہوا۔ اسے فلم کی صورت دے کر کھیلا گیا۔ اور اس کی فلم بنائی گئی ہے۔

مسز بک چین میں ہی پلی اور بڑی ہوئیں۔ انہوں نے چینی ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور چین کی زندگی اور کریکٹر کے متعلق ان کی معلومات انتہائی وسیع ہیں۔ ان ہی خوبیوں کے باعث انہوں نے چین کی قدیمی تہذیب اور تمدن کو دنیا کے دوسرے دیشوں میں قابل فہم بنایا۔

۱۹۳۸ء میں انہیں کو اپنی جملہ تصانیف کے لیے نوبل پرائز ملا۔ یہ امریکا کی پہلی خاتون تھیں جنہیں اتنے بڑے بڑے انعام سے سرفراز کیا گیا۔

مسز بک ملس بورو مغربی ورجینیا میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والدین مشنری تھے اور اپنے بچپن کا زمانہ آپ نے چین کے ایک دریائے ینگسی کے کنارے واقع ایک مقام چنگ کیانگ میں گذارا۔ ایک چینی نرس (آیا) نے اولی اول آپ میں دلی رجحانات پیدا کیے جو انہیں بدھوں اور تاؤسٹ معجزات وغیرہ کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔

۱۹۱۲ء میں ۱۷ برس کی عمر میں انہیں لنچبرگ ورجینیا کے انڈولف میکن ویمنز کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔

ان کی ماں انہیں پندرہ برس کی عمر تک پڑھاتی رہیں۔ مسز بک اپنی ماں کے متعلق بیان کرتی ہیں کہ وہ انہیں جو چیز سب سے زیادہ اچھی طرح سمجھاتی تھیں وہ الفاظ کی خوبیوں اور ان کے مطالب سے متعلق ہوتی تھیں۔

۱۹۱۴ء میں یہ نے گریجویٹ کی ڈگری لی۔ چین واپس آئیں اور تین سال کے بعد ایک نوجوان امریکی مشنری سے شادی کی جس کا نام جان ال بک تھا۔

شمالی چین میں قحط، ڈاکوؤں اور لٹیروں کا مقابلہ کرتے ہوئے مسز بک نے اپنے شوہر کے ساتھ پانچ برس کاٹے یہاں انہیں چین کے لوگوں سے زیادہ انس اور ان کے متعلق بھاری واقفیت حاصل ہوئی۔

اگلے دس برس مسز بک نے اپنے گھر بار کو چلانے اور دو لڑکیوں کی پرورش کرنے کے علاوہ اینکنگ اور

چنگ یانگ کی یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے بھی گذارے ان دس برسوں میں سے ایک برس آپ نے امریکا میں گذارا جس کے دوران میں نیویارک میں مسز بک نے بدیشی ملکوں میں چرچ مشنریوں کے طریق کار کے متعلق ایک تقریر اور مضمون کے ذریعے نکتہ چینی کی۔

جس پر بدیشی مشن کے بورڈ اور مسز بک کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ اور آخر مشنری کے کام سے استعفا دیدیا۔

۱۹۳۴ء میں مسز بک نیویارک واپس چلی گئیں اور کتابیں چھاپنے والی ایک کمپنی جان ڈے کمپنی کے عملے میں شامل ہوگئیں یہی ادارہ ان کی کتابیں چھاپتا تھا۔ اسی سال مسز بک نے طلاق حاصل کرلی اور اس کمپنی کے پریسیڈنٹ مسٹر رچرڈ جے والش سے شادی کرلی۔ اب یہ منسلونیا کے ایک فارم میں اپنی دو لڑکیوں چھ پوتوں اور ۸ چھینے کے بچوں کو لے کر خاموشی سے اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہیں۔

اس وقت تک بک نے کل ۱۵ ناول اور بچوں کے لیے ۲۳ کتابیں لکھی ہیں "دی گڈ ارتھ" کے علاوہ ان کے دوسرے مشہور ناول ڈریگن سیڈ۔ دی مدر۔ دی پیڑیاٹ۔ یوریٹریٹ آف اے میرج۔ پیویلین آف ویمن۔ کن فولک اور پوٹی ہیں۔

پرل بک "ایسٹ اینڈ ویسٹ ایسوسی ایشن" کی صدر ہیں۔ یہ ایک کلچرل تنظیم ہے جو امریکا اور ایشیا اور یورپ کے درمیان بہتر مفاہمت اور باہمی اتحاد پیدا کرنے کے لیے بک ہی نے قائم کی ہے امریکا کے کئی اداروں نے بک کی عزت افزائی کی ہے ایل یونیورسٹی نے ۱۹۳۲ء میں آپ کو ام۔ اے اعزازی ڈگری دی۔

۱۹۳۵ء میں افسانا نویسی کے لیے انہیں ہاویل کا تمغا عطا ہوا ۱۹۳۶ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرس کا ممبر بنایا گیا۔

کولمبیا یونیورسٹی میں اسکول آف جرنلزم میں ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے پرل بک نے کہا مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں کسی قدر انوکھی واقع ہوئی ہوں کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ میں ناول لکھے بغیر خوش نہیں رہ سکتی۔"

موت

(۱)

آئی بہار چاک گریباں کیے ہوئے
پھولوں کے اشک وقت کی آنکھوں سے بہ گئے

(۲)

کوہ و دمن پہ پھیل گیا شام کا دھواں
اور آسماں پہ چند ابابیل رہ گئے

(۳)

یہ خاک دیکھو اس میں دل بیقرار ہے
اس وقت دل فریب ستارو! میں تم نہیں
احسان ہیں بہت ستم روزگار کے
کس رہ گذر سنگلاخ پہ میرا قدم نہیں
تو ہے بلاکشان محبت سے بے خبر
فردوس مرتبے میں جہنم سے کم نہیں

(۴)

معمور کشمکش جہت ہے صدائے الم فضا
تقسیم کرچکا ہوں فروغ نظر کو میں
اس کارواں میں سوز نہ پایا سراغ کا
اب لامکاں کو ڈھونڈنے جاؤں کدھر کو میں
معصوم غم نصیب! گنہگار ——— مرحبا!
پہلو بدل رہی ہے مشیت کی دشمنی
تقدیر نارسا ہے جنوں کارسازسے
مرجھا چلی ہے میرے تبسم کی روشنی
میں آج سنگدل ہی نہیں سنگساں بھی ہوں

(۵)

میرے حضور موت پہ تاری ہے جانکنی
بس ایک خواب عظمت آدم کے واسطے
وہ فرصت نگاہ نہ پائی کہ سو سکوں
مرنے سے پہلے حسرت ناکام وقت دے
اتنا قلیل وقت کہ جی بھر کے سو سکوں

رفعت ہاشمی

کہانیوں کی وادی

قمرالدین قمر

مجھے کہانیوں کی تلاش تھی ——— !

میں کئی روز سے کہانی کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ ہر سو کہانی کی جستجو کی مگر مجھے کہیں بھی ایک کہانی نہیں ملی میں پریشان تھا کہ کیا کروں کیونکہ میرا کام کہانیاں جمع کرنا ہے اور جب تک کہانیاں جمع نہیں کر لیتا مجھے چین نہیں ملتا۔ بڑی مشکلوں کے بعد ایک کہانی ملی مگر اسے بھی پولیس والوں نے زبردستی جمع سے چھین لی۔ اب آپ حیران ہوں گے بھلا پولیس والوں کو کہانیوں سے کیا مطلب ——— ۔ تو جناب انہیں صرف کہانیوں ہی سے نہیں بلکہ کہانیاں جمع کرنے والوں سے بھی مطلب ہے اس لیے کہ آزادی بڑی نعمت ہے اور آزادی قایم رکھنے کا وچار وہ اور ان کے گروہ ہمارا جو زیادہ بہتر طریقے سے جانتے ہیں۔ پھر بھلا ہماری کیا مجال ——— تو ہاں میں نے بھی ایک کہانی پائی اور وہ بھی چھین گئی۔ وہ تو خیر ہوا۔ اس روز میں سوٹ میں ملبوس تھا اور نہ اگر کھدر کا کرتا یا کاڑے کے پیجامے میں ہوتا تو شاید کہانی کے ساتھ میں بھی . . . . . تو ہاں کہانیوں کی تلاش میں چکر لگاتا پھرا مگر کہانی ملنے سے رہی دھول بھانکتا فلمی گانے گنگناتا تا کافی دور نکل گیا کہ میرے سامنے سے بنسری کی سریلی آواز ٹکرائی۔ میرے قدم تیز تیز آواز کی سمت بڑھنے لگے۔ اور میں ندی کے بالکل قریب پہنچ گیا ندی کا پانی صاف شفاف اور برف کی طرح ٹھنڈا تھا کنارے رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی کشتیاں بندھی ہوئے ہچکولے کھا رہی تھیں میں جب کشتی کے پاس پہنچا جس میں سے بنسری کی لے مست ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی گونج رہی تھی تو مجھے ایک بوڑھے ماجھی نے آواز دی "آؤ بابو ——— کدھر جایئے گا" میں رکا۔ "چلو بابو سیر ہو جایئے گا" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا۔ کل چار آنے پڑے تھے "ندی کے اس پار کا کتنا لوگے؟" "جو دینا" بوڑھے ماجھی نے کہا "چار پیسے دوں گا" بوڑھے ماجھی کے ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی بکھر گئی۔ اس کی آنکھیں بڑی اداس تھیں تھوڑی دیر جواب کا منتظر رہا۔ پھر میں نے خود ہی کہا "اچھا دو پیسے اور لے لینا" جس پر جوان ماجھی ہنس پڑا۔ وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

بوڑھے ماجھی نے کہا "تمہیں معلوم نہیں بابو جی۔ دھان کی قیمت بڑھ چکی پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ میرے چار بچے ہیں جو ہر موسم میں ننگ دھڑنگ پھرا کرتے ہیں۔ میری بیوی کے بدن پر ناگر سیل کی ایک ہی ساڑی ہے جس کا رنگ کھلتی ہے جسے میں نے چھ روپے تیرہ آنے میں خریدا تھا آج دو سال ہوئے ان دو سالوں میں وہ اسی ایک ساڑی سے عزت ڈھانپ رہی ہے۔ گاؤں کی عورتیں سیدھی ہوتی ہیں نا وہ، ہماری جورو یاں جاتی ہیں ——— اور میری طرف دیکھو۔ میرے بدن کی طرف نہ دیکھو یہ تو ہمیشہ ننگا رہتا ہے۔ میرے پیٹ پر نہ جاؤ۔ اسے تو ہر موسم میں فاقہ کھانا نصیب ہوتا ہے بلکہ میری آنکھوں کی طرف دیکھو جس میں ابھی بھی چمک باقی ہے۔ طاقت ہی ہے . . . . . تم حیران ہو گئے کہ بھلا ہم نے اس کی حفاظت کیوں کر کی ——— بابو زندگی کو مارا نہیں جاتا . . . . . " اور نہ جانے وہ کیا کیا کہہ گیا۔ ندی کا پانی موجیں مار رہا تھا اور کشتیاں ڈگمگا رہی تھیں ——— جوان ماجھی کے ہات سے بنسری گر پڑی اور بوڑھا ماجھی چپو کو ہات سے پھینکیاں دینے لگا "اچھا تو چار آنے دیدوں گا۔ میری جیب میں چار آنے ہیں یہ تم لے لینا" اور جوان ماجھی نے ایک نظر بوڑھے ماجھی کی طرف دیکھا۔ بوڑھا ماجھی چپو گھماتے ہوئے بولا . . . "تو چلے آؤ" میں کشتی پر بیٹھ گیا۔ ہماری کشتی ہولے ہولے پانی کو چیرتی ہوئی بڑھنے لگی

پانی کا شور کافی تھا۔ بوڑھے مانجھی کا بازو مضبوطی سے چپو کو چلا رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ نمودار کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں تم کیا کرتے ہو بابو"

"میں ـــــ میں کہانیاں جمع کرتا ہوں"

"صرف کہانی" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ جوان مانجھی جواب بھی خاموش بت کی طرح مجھے دیدے لگائے گھور رہا تھا میرے بالکل قریب آکر بولا "تو تم صرف کہانی جمع کرتے ہو"

"اور تم بنسری اچھی بجا لیتے ہو بڑی درد بھری لے ہے مانجھی" میں نے گری ہوئی بنسری اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا ـــ کشتی چپ چپ ..... چپ پانی کو چیرتی ہوئی بڑھتی رہی۔ جوان مانجھی بنسری بجانے لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بنسری کی لے۔ اپنے اندر کوئی کہانی چھپائے ہوئے ہو۔ کیا میرا خیال ٹھیک ہے میرے اجنبی دوست" اجنبی دوست کی آنکھیں کالی کالی پلکوں کے پیچھے سے چمک اٹھیں۔ اس نے نگاہوں آسمان کی طرف دیکھا۔ ہواؤں میں دو لمبی دو چیلیں اڑی جا رہی تھیں تب بوڑھے مانجھی نے کہا "میری لڑکی کو بھی کہانی سننے کا شوق ہے بابو مگر میں کہانی نہیں جانتا۔ میں ایک کہانی جانتا ہوں صرف ـــ" اور فوراً وہ چپ ہو گیا۔ ہوا کے جھونکے ہولے ہولے چل رہے تھے۔ لہریں دھیرے دھیرے بل کھا رہی تھیں "ہاں کون سی کہانی مانجھی۔ کیا مجھے سناؤ گے نہیں تم"

ـــــ "کہانی کیا ہے بابو۔ بس ایک بھولی ہوئی یاد ہے۔ جب دل بھر آتا ہے تو اسے ہی کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتا ہوں ویسے تو کہانی وہانی بلکل نہیں آتی"

اور اس نے اپنی کہانی یوں شروع کی ـــ "میرا گاؤں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو یہاں سے دس میل پر واقع ہے جس کے جنوبی طرف پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ حد نظر تک پھیلا ہوا ہے اور جہاں دریائے گنگا کی چنگھاڑتی ہوئی لہریں ہر سال دو ایک کشتیوں کو اپنے وسیع دامن میں چھپا لیتی ہیں ـــ چنگھاڑتی ہوئی لہروں کی طرح اس گاؤں کا مکھیا بھی بڑا بے رحم ہے۔ اس کی عمر ساٹھ سال کی ہے اور اس کا نفسیاتی مطالعہ گہرا ہے اس کی نظریں کھٹور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دو جوان کنواریوں کو بیاہ دیا ہے اور میرا باپ بھی میری ہی طرح ہی گیر تھا۔

ہم لوگ دن بھر ناؤ چلاتے اور شام کے وقت کچھ پیسے لے کر گھر آتے ـــ ہم تین بھائی بہن تھے بہن بیچ سے بڑی تھی۔ میں منجھلا اور میرا بھائی بیچ سے چھوٹا ـــ میری ماں کھیت میں کام کرتی اور ہم دونوں بھائی مچھلیاں پکڑتے تھے جس کے سبب کچھ پیسے اور ہو جاتے مگر ایک دفعہ کا ذکر ہے بارش زوروں سے ہو رہی تھی ہم جال ندی میں ڈالے مچھلیوں کے پھنسنے کا انتظار کر رہے تھے اور جب ہم نے جال اٹھایا تو ہماری خوشیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کیونکہ آج سب روز سے زیادہ مچھلیاں پھنسی تھیں کہ یکایک شور اور واویلا سنائی دیا۔ شور مشرق کی طرف سے بلند ہوا تھا ہم دونوں بڑا کر مشرق کی طرف بھاگے جب نزدیک پہنچے تو دیکھا میرا باپ زمین پر گرا تھا اور اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ پچکاری مار رہا تھا۔ اردگرد بہت سے مزدور کسان کھڑے شور مچا رہے تھے میں باپ پر جھک گیا اور میرے آنسو بہ پڑے۔ بھائی نے اس کے زخم کو خشک کیا اور مزدوروں کی مدد سے اٹھا کر اپنے ڈریا نما مکان میں لے گئے۔ جب باپ کو ہوش آیا تو اس نے سب سے پہلے جس کا نام لے کر پکارا وہ میری بہن تھی۔ ہم دونوں نے بیک وقت ایک آواز ہو کر اپنی بہن کو پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا جس کی وجہ سے باپ کے رخمی ہونے کی کچھ کچھ وجہ معلوم ہو گئی ـــ کیونکہ میری بہن گاؤں بھر میں سب سے حسین اور خوبصورت تھی۔

"بابو گریبوں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے کیا کھیال ہے" اس نے ایک آہ بھری۔

"یہی اس کی بھول تھی کہ وہ خوبصورت کیوں پیدا ہوئی یا اگر ہوئی تو میرے بابو نے اس کا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔ لیکن اولاد کی محبت جیوانوں میں بھی ہوتی ہے بابو ـــ بہت دنوں سے مکھیا کی نظر میری بہن پر تھی۔ اس نے کئی بار میرے باپ کو لالچ

بھی دیا کہ وہ ساٹھ سالا بوڑھے کھورٹ کے ساتھ اپنی معصوم لڑکی کو بیاہ دے اور اس نیک کام کے عوض اس نے چار بیگھے زمین اور دو بیل دینے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن میرا باپ ظالم نہ تھا۔ غریب تھا سہی مگر اس کے دل میں محبت تھی اور رحم ـــــ باپ نے صاف انکار کر دیا۔ جس کے سبب کئی بلائیں نازل ہوئیں۔ زمین لگان میں ضبط کرا لیا گیا۔ ندی پر پہرا لگا دیا گیا۔ گاؤں والوں کو ہمارے خلاف بھڑکایا یا اکسایا گیا۔ پھر بھی ہم چھپ کر مچھلیاں پکڑا کرتے باپ ناؤ چلاتا اور مان بہن کے غم میں سورگ باسن ہو گئی ـــــ اس واقعے کو تیس سال بیت گئے۔

"یہ لڑکا میرے بھائی کا ہے" اس نے مانجھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے باپ کو پولیس کی گولی نے ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔ اور یہ اب جوان ہو چکا ہے یہ بڑا بدمعاش ہے بابو۔ اس کا باپ بھی بدمعاش تھا۔ یہ زمیندار کو گالی دیتا ہے۔ اس کا باپ بھی دیا کرتا تھا اور وہ کسانوں کے کارن لڑتے ہوئے مارا گیا کیونکہ انہیں پیٹ بھر کھانا نہیں مل رہا تھا۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا میسر نہ تھا اور ان کے ننھے منے بچے آئے دن سوڈی مرض کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کی کنواری بہنوں کی عزت لوٹی جا رہی تھی کیونکہ پیٹ دوزخ ہی تو ہے بابو اور اس دوزخ کے کارن سب کچھ ہوتا ہے نا۔"

بوڑھا مانجھی خاموش ہو گیا ـــــ موجیں تھرکتی ہوئی پیچھے ہٹ جا رہی تھیں۔ کنارا آ چکا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کل چار آنے نکل رہے تھے جو میں نے بوڑھے مانجھی کے ہاتھ میں رکھتے اور نیچے اتر گیا۔ بوڑھے نے میری طرف دیکھ کر پوچھا "اب کہاں جاؤ گے بابو؟"

"دور ـــــ کہانیوں کی وادی میں ..... کہانی کی تلاش ہے نا مجھے۔"

"وہ وادی ..... تمہارے دیش کے قریب ہی ہے جہاں کسانوں کے بچے بھوک سے سسک نہیں مچلاتے۔ وہاں ننگے بھوکے انسانوں کے جسم پر سرمایہ داری کے کوڑے کے نشان نہیں ہوتے مانجھی کی بیوی صرف ایک ساڑی پر عمر بھر عزت نہیں ڈھانپا کرتی بلکہ ان کے ہونٹوں پر نیا گیت مچلتا ہے ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک چھم چھم ناچ اٹھتی ہے ..... !"

..... اور میں چل پڑا۔ میرے پیچھے جوان مانجھی ہاتھ میں بنسری لیے ہرا رہا تھا وہ بنسری بجا رہا تھا۔ بنسری کی آواز دور بہت دور تک پھیلتی جا رہی تھی۔ ہم کہانی کی تلاش میں چل رہے تھے۔ کہانی مچ سے آگے تھی۔ بیچ میں اور میرے پیچھے جوان مانجھی بوڑھے مانجھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اور اس کی آنکھوں کی چمک بدلکل نئی تھی اور سورج غروب ہو چکا تھا

غزل

انجم اعظمی

پچھلے پہر، جو جلوہ فرد اچھل گیا
ہر بزم میں شراب کا اک دور چل گیا

کتنا غرور علم و ہنر پر تھا وائے عشق
عظمت کا آفتاب بھی پستی میں ڈھل گیا

کھلتے نہ پائے ہونٹ کہ شعلے بھڑک اٹھے
کیا بات تھی کہ ذہن یزداں بھی جل گیا

مجھ کو تو چھیڑ چھاڑ کی عادت نہ تھی مگر
کیا مل گیا مجھے کہ مرا جی بہل گیا

دامن کی آنسوؤں ہی کا رونا نہ رو سکے
اپنوں کا اعتبار بھی اپنوں پہ کھل گیا

اک حشر لا جواب کی تفسیر کیا کریں
آہن بھی کانفرنسوں سے کسی کی پگھل گیا

ہنگام انقلاب کی مدہوشیاں نہ پوچھ
سرمستی ازل کا مقدر بدل گیا

کس کی وفا میں ٹھوکریں کھانے کے بعد آج
اچھا ہوا کہ سارا زمانہ سنبھل گیا

طامس مور

(ایک مشہور انگریز شاعر)

ا-م

اپنی زندگی میں طامس مور (۱۷۷۹ء — ۱۸۵۲ء) یورپ کا ایک مشہور ترین ادیب تھا اس کی شاعری اور سب سے بڑھ کر اس کے گیتوں نے عوام کے دلوں پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ جہاں جاتا بہت بڑے آدمیوں کی طرح عزت پاتا جوں ہی وہ کسی تھیٹر میں داخل ہوتا حاضرین اس کی تعظیم میں کھڑے ہو جاتے اور تالیاں پیٹتے

اس کی اپنی نوجوانی ہی میں بام شہرت پر جا پہنچنے کی کہانی بڑی دلچسپ ہے وہ ایک معمولی گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا دادا آئرلینڈ میں چھوٹی سی دکان کرتا تھا لیکن اس کی والدہ ایک حوصلہ مند خاتون تھی۔ چنانچہ لڑکے کو ڈبلن کے ٹرینٹی کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں کی سیاسی گڑبڑ میں حصہ لینے کے باعث نوجوان کو لندن آ گیا اور قانون کا مطالعہ کرنے لگا یہاں اس کا تعارف ایک آئرش نواب لارڈ مونٹ ایجل سے ہوا جس پر اس نوجوان کی دلفریب شخصیت نے جادو سا کر دیا تھا۔

چنانچہ مور کو ہر قسم کی دعوتوں میں بلایا جانے لگا جہاں اس کا تعارف امرا سے کرایا جاتا یہ اس کی شخصیت کی جیت تھی اس کی آنکھوں سے ہمیشہ ظرافت ٹپکتی تھی۔ اس کی آواز میں رس بھرا تھا۔ شگفتہ ناچ میں اس کے مقابلے کا کوئی گویا نہ تھا۔ بڑے آدمیوں کی محفل میں وہ ہر شخص کو ہنسا دور لا دیتا تھا۔

پرنس ریجنٹ (جو بعد ازاں شاہ جارج چہارم بنا) اس کا گرویدہ تھا۔ چنانچہ پرنس کی سرپرستی نے بھی اسے فائدہ پہنچایا۔ ۲۲ سال کی عمر میں اس نے اپنے عشقیہ اشعار کتابی صورت میں شائع کرنے کی جسارت کی اب اس کا جیشر دوست لارڈ مونٹ ایجل کے دیہاتی مکان پر گئے لگا ایک آئرش پبلشر نے اس کے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ وہ اس کے تمام گیت موسیقی سمیت شائع کر سکے گا اور ہر ماہ بطور شاعرانہ بیان اس کی شہرت بڑھتے لگی ——

اگلے صفحوں میں اس نے ہر طبقے کے لوگوں کو اپنا دوست بنا لیا۔ مارکوئیس آف لینز ڈاؤن اور لارڈ جون رسل (جو بعد میں انگلستان کا وزیر اعظم بنا اور جس نے مور کی سوانح عمری بھی لکھی) اس کے گہرے دوستوں میں سے تھے ان کے علاوہ ایک تلخ گو نقاد فرانسس جیفری کی دوستی کا اسے بہت پاس تھا۔

اسکاٹ لینڈ کا ایک اور باشندہ جو مور کو اپنا زندگی بھر کا دوست کہا کرتا تھا سر والٹر اسکاٹ تھا۔ لارڈ بالٹرن کے دل میں مور کی از حد تعظیم تھی اور اس نے مور کو اپنی آپ بیتی بطور تحفہ پیش کی تھی۔

طامس مور نے بائرن کی سوانح عمری بھی لکھی جو میعادی تسلیم کی گئی ہے مور نے رسالوں کے لیے بہت کچھ لکھا اور وہ اچھا نقاد تھا ورڈزورتھ کے محاسن تسلیم کیے جانے سے بہت پہلے مور نے اس کی عظمت کی ببانگ بلند تائید کر دی تھی اس نے رچرڈ برنسلے شیریڈن اور لارڈ بائرن اور رچرڈ فٹز گیرلڈ کی زندگی کے حالات بھی لکھے اور شاعرانہ نثر میں ایک رومان بھرا ناول بھی شایع کیا۔

مور نے آئرلینڈ کی تاریخ اور طنز و ہجو سے پر کتابیں لکھیں۔ اس کی سیاسی ہجو اتنی شاطرانہ اور برمحل ہوا کرتی تھیں کہ ٹائمز نے اسے ان کے عوض ۳۰۰ پونڈ سالانہ پنشن ادا کی۔ اس کی لمبی نظموں میں سے سب سے مشہور "لالارخ" ہے جس میں مشرق کا رومان بیان کیا گیا ہے۔ ناشروں کی ایک انگریز فرم نے اس نظم کو دیکھے بغیر ۳۰۰ گنی (سکہ) کی عظیم رقم ادا کر کے "لالارخ" خرید لی۔ اس سے مور کی زبردست شہرت داغ ہو جاتی ہے۔

عوام میں مور کو مقبولیت اس لیے حاصل رہی کہ وہ

شاعر خش الحال تھا۔ معلوم ہوتا تھا قدیم لوک سنگیت اس کی رگ رگ میں بھرا پڑا ہے انگریزی کے الفاظ کو آرش موسیقی کے مطابق ڈھالنے میں اس نے واقعی انگریزی نظم میں نئی روانی پیدا کر دی۔ اس نے انگریزی شاعری کو ۱۸ ویں صدی کی قیود کی پابندیوں سے آزاد کرانے میں مدد دی۔

مور کی بیوی نے مالی تنگ دستی میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ چنانچہ مور نے اپنی ایک نظم میں بیوی کے ساتھ اپنی الفت کا اظہار کیا ہے زندگی کے آخری ایام میں اس کی ذہنی قوت سلب ہونا شروع ہو گئی تھی جس کے باعث اس کی خش الحالی ختم ہو چکی تھی۔ ایک سو سال ہوئے کہ وہ موت کی آغوش میں چلا گیا۔ مقامی روایت کے مطابق انگلستان کے مغرب میں اس کے چھوٹے سے گھر میں اب بھی اس کا بھوت کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے۔

اغز

فکر پابند محاکات نہیں ہو سکتی
شاعری صرف اشارات نہیں ہو سکتی
تو میری جان تنہائی سہی جان سکوں
تجھ سے تجدید ملاقات نہیں ہو سکتی
میں نے جذبات کو سینے میں چھپا رکھا ہے
چشم سے اشک کی برسات نہیں ہو سکتی
آج دنیا ہے زمانے کو عمل کا پیغام
یہ زباں وقف مدارات نہیں ہو سکتی
توڑ ڈالوں گا روایات کی زنجیروں کو
مجھ سے تقلید روایات نہیں ہو سکتی
صبح پر نور کی تنویر نے پالا ہے مجھے
میری دنیا میں کبھی رات نہیں ہو سکتی
نکتہ چیں بزم میں ہیں آج وہی تو ناظر
جن سے تخلیق خیالات نہیں ہو سکتی

ناظر الحسینی

گریز

آپ تو مجھ سے اسی چیز کی خواہاں ہیں نا!
آپ کے حسن و لطافت کے قصیدے لکھوں
ناز و انداز و نزاکت کے قصیدے لکھوں
آپ کے عشق کے منظوم فسانے لکھوں
آپ کے عشق سے معمور ترانے لکھوں
رات دن آپ کے صدقے کے نئے گاؤں
تیشۂ فرہاد سے بھی چار قدم بڑھ جاؤں
جاؤ بے جا ہیں ہر اک ناز گوارا کر لوں
زندگی آپ کے قدموں پہ نچھاور کر دوں
جیسے دنیا میں مجھے اور کوئی کام نہیں
جان من! عشق و محبت کا یہ ہنگام نہیں
اک خطرناک دوراہے پہ کھڑی ہے دنیا
پنجۂ نزع میں اس وقت پھنسی ہے دنیا
بارہا فلاس سے انسان دبا جاتا ہے
جبر اور ظلم کی چکی میں پسا جاتا ہے
امن کے پھول جھڑا کرتے ہیں جن کے لب سے
جنگ کے شعلے ہیں دامن میں چھپائے بیٹھے
ایٹمی اسلحوں پہ ناز جو فرماتے ہیں
امن کے غم میں وہ بے چارے مرے جاتے ہیں
لب پہ دیکھو تو ہیں تعمیر کے نغمے رقصاں
دل میں دنیا کو مٹانے کے مزایم پنہاں
دوست کی طرح گلے سے لگا لیتے ہیں
پشت میں موقع سے خنجر بھی چبھو دیتے ہیں
آدمیت کا گلا گھونٹ رہا ہے کوئی
دونوں ہاتھوں سے ہمیں لوٹ رہا ہے کوئی
ایسے ماحول میں شیدائی کی تانیں کیسی
عشق و الفت کی بھلا مجھ سے امیدیں کیسی
ذہن ویسا اس کو اک لمحہ بھی آرام نہیں
جان من! عشق و محبت کا یہ ہنگام نہیں

مسعود کلیم

ایک فسانا — ایک حقیقت

اجمل رشید (عادل آبادی)

(معذرت چاہتے ہوئے میں اس کہانی کو زہرا کے نام معنون کرتا ہوں۔ اجمل)

زہرا خون تھوکتی ہے اسے دق ہو گیا ہے دق! ایک ہیبت ناک مرض ہے جس کے سنیے سے ہی آدمی پر موت کا سا سکوت طاری ہونے لگتا ہے ایک نامعلوم ہول پیٹ میں ابھر ناشروع کر دیتا ہے زہرا اسی قسم کے دق میں مبتلا ہے وہ روز ہی خون تھوکتی ہے روز ہی کھانس کھانس کر بے دم ہو جاتی ہے روز ہی لال لال خون کے سیاہی مائل ٹکڑے اس کے سینے سے گرنے لگتے ہیں ـــــ سویرے بستر سے اٹھتے ہی جب وہ پہلی دفعہ کھانستی ہے تو خشک ٹھسکوں سے اس کی سانس رکنے لگتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ سینے میں جلن سی ہونے لگتی ہے۔ گلا اور حلق میں تیز خراش سی اٹھ اٹھ کر تیزاب کی سی جلن پیدا کر دیتی ہے۔ بار بار کے کھانسنے سے دو چار سیاہی مائل ٹکڑے اگل دیتی ہے۔ اسے کچھ سکون سا معلوم ہونے لگتا ہے اور وہ پھر دھڑام سے بستر پر ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑتی ہے۔

زہرا کو میں نے سب سے پہلے منچریال کے اسٹیشن پر دیکھا تھا جب وہ اپنے علاج کے لیے حیدرآباد جا رہی تھی ایک چاکلیٹی رنگ کا برقعہ اوڑھے نقاب میں سے بھانک بھانک کر باہر آنے جانے والے کو بغور دیکھ رہی تھی وہ اپنے بھائی کا انتظار کر رہی تھی جو اسے حیدرآباد پہنچانے کے لیے آ رہا تھا ـــــ ہیضہ پوش پر کچھ دیر کے لیے اس کی نظریں ٹھٹکتی اور پھر اپنے بھائی کو کھوجنے لگتیں ـــــ ایک چھوٹا لڑکا غالباً اس کے بھائی کا لڑکا تھا ایک چھوٹا سا صندوق اٹھائے کھڑا تھا اور اس کے بازو ہی زہرا یاس کا مجسمہ بنے آنے جانے والے کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا ابا نوکر محمود کہہ رہا تھا "بیگم صاحب اب آپ کے بھائی نہیں آئیں گے"

"مگر انہوں نے تو آنے کا وعدہ کیا تھا" زہرا پلاٹ فارم پر دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں بیگم صاحب! وہ نہیں آئیں گے" صندوق اتارتے ہوئے محمود نے کہا "نہ جانے کس قسم کی مصروفیت ہو گی انہیں"

زہرا کا چہرا اتر گیا۔ ایک اداسی سی سارے چہرے پر چھا گئی زہرا کی وہ حالت شاید میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر رو پڑی تھی بیچارگی کے دو جھلملاتے آنسو خشک پلکوں سے چھٹ کر پلکوں پر ٹھہر گئے تھے ـــــ اسے گنگا دھوکا دیا گیا تھا۔ آج تین دن سے ـــــ وہ مسلسل تین دن سے اسٹیشن پر آتی رہی اور پھر واپس گھر جاتی رہی۔ تین فرلانگ کا فاصلہ اس کے لیے ہمالا کی چڑھائی سے کم نہ تھا۔ وہ چار قدم چلتی اور پھر ایک تھکے ہوئے بیل کی طرح زور زور سے سانس لینے لگتی اور پھر چل پڑتی۔ جب قدم اٹھاتی تو پیر ڈگمگانے لگتے۔ ایک عجیب سی کپکپاہٹ سارے جسم پر دوڑ جاتی اور پھر محمود کا سہارا لے کر بیٹھ بیٹھ جاتی اور پھر چل پڑتی۔ اسے الٹی سانسیں سی آنے لگتی۔ سر چکرانے لگتا۔ آنکھوں میں اندھیری چھانے لگتی۔ مگر وہ تین فرلانگ کا فاصلہ کسی نہ کسی طرح طے کر ہی لیتی ـــــ روز ہی ایک آس لیے وہ اسٹیشن آتی اور پھر بھائی کا انتظار کر کے تین فرلانگ کا فاصلہ ہانپتے کانپتے ہمے نا پہنچنے لگتی۔ آج بھی وہ امید و بیم کے عالم میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔

"محمود سگنل گر گیا گر بھائی صاحب کا پتا نہیں ہے" زہرا کا نقاب اٹھ گیا۔ اور اس بے نور آنکھوں نے مدتوں تک اپنے بھائی کو دیکھا

"چلیے بیگم صاحب! گھر چلیے۔ گاڑی آنے والی ہے" محمود منہ بسورتے ہوئے بولا۔

"نہیں محمود" زہرا کچھ سوچتے ہوئے بولی "میں آج اکیلی حیدرآباد چلی جاؤں گی"

"اکیلی حیدرآباد جائیں گی آپ ـــــ ہ ہ!!" محمود کا تعجب سے منہ کھل گیا۔

"ہاں" زہرا نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا "میں آج

اکیلی ہی حیدرآباد جاؤں گی۔ ان کمینے بھائیوں کا انتظار کیے بغیر"

"مگر بیگم صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"مگر وگر کچھ نہیں" اس نے پرس سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا "جا۔ دوڑ کر حیدرآباد کا ٹکٹ لے آ"

اور پھر محمود دوڑ کر ایک ٹکٹ لے آیا۔ حیدرآباد کا ٹکٹ

"۔۔۔ یرآگڈا دتی کے ہسپتال کا ٹکٹ" جہاں وہ اپنا علاج کروانے کے لیے جا رہی تھی۔ اپنے کمینے بھائی کا انتظار کیے بغیر جو نہ جانے کن جواریوں کے ساتھ بیٹھا جوا کھیل رہا تھا۔۔۔ ایکا یک ٹرین گھنٹی بجی اور پھر ٹرین آ گئی زہرا کا بھائی ایک کتے کی طرح ہانپتا کانپتا ہوا پلاٹ فارم پر اپنی بہن کو کھو جنے میں مصروف ہو گیا۔

"محمود!۔ ارے او محمود۔۔۔!!" دو ایک دفعہ بھائی کے بلانے کی آواز آئی۔ جوے میں جیتی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں رہ رہ کر جیبوں میں سے مسکرا رہی تھیں۔ اور دھنی ہوئی آنکھیں بڑی ہی تمسخر کے ساتھ بہن کو دیکھنے میں مصروف تھیں۔ یکایک زنانا ڈبے کے پاس محمود رک گیا۔

"محمود زہرا کہاں ہے؟"

"جی جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" محمود مسافروں کی بھگدڑ سے گھبرا گیا تھا۔

"ابے بولتا کیوں نہیں زہرا کہاں ہے؟"

"وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈبے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زنانا ڈبے میں"

اور پھر اسے زنانا ڈبے میں زہرا مل گئی۔ بھائی نے چیخ کر کہا "میں آ رہا ہوں زہرا تمہارے ساتھ۔"

بہن کا چہرا بھائی کو دیکھ کر کھل اٹھا۔ ایک نمول مسکراہٹ بہن کے ہونٹوں پر آ گئی ابھی ابھی ہی بہن بھائی کو کمینا کہہ رہی تھی اور ابھی ابھی اس کے ہونٹوں پر بھائی کے لیے مسکراہٹ آ گئی۔ میں حیرت اور تعجب کے عالم میں کھڑا دیکھ رہا تھا زہرا نے اب اپنا برقعہ بالکل اتار دیا تھا۔ اس کا سوکھا سوکھا جسم بے نور آنکھیں دھنسے ہوئے گال روکھے خشک بال تنکے کی سی کلائیاں۔ ایک جیتا جاگتا مردہ اپنے جسم میں زندگی کی نشانیاں بھرنے کے لیے ہسپتال جا رہا تھا۔ ایک جھوٹی امید لیے اپنی ایک نئی زندگی کی تجدید کروانے جا رہا تھا۔ جہاں نہ جانے کتنی ہی زہراؤں نے سسک سسک کر گھٹی ہوئی آشاؤں کے ساتھ دم توڑ دیا ہو۔

میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ زہرا کسی وقت بڑی ہی حسین اور صحت مند تھی۔ آج کی طرح اس کے اجلے اجلے گال پچکے ہوئے نہ تھے کلیجے ان میں گلابیاں دوڑتی تھیں۔ لال لال گلابیاں ۔۔۔۔

جب زہرا اپنے وقت کی قلوپطرا بننے ٹھمک ٹھمک کر چلتی تو ثروت بیگم کے ہونٹوں پر اپنی بیٹی کے لیے مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ وہ اپنی زہرا پر قربان ہو ہو جاتی تھیں۔ ادھر زہرا اپنی مستانا چال سے آتی اور ثروت بیگم نے چٹ چٹ اپنی لاڈلی کی بلائیں لے ڈالیں ادھر زہرا نے کوئی ہلکا سا گیت گنگنایا اور ثروت بیگم کے پیٹ میں من من بھر کے لڈو پھوٹنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ستارہ رو کر انگڑائیاں لینے لگتی۔ سینے میں ایک محبت بھرا ابال سا پیدا ہو جاتا۔ اپنی بیٹی کے لیے ۔۔۔۔

زہرا اس وقت اپنی ماں کی لاڈلی بیٹی تھی اور باپ ۔۔۔۔ باپ صاحب کو اپنے رنگین شغلے سے فرصت ہی کہاں تھی جو بیٹی کی ناز برداری کرتے وہ فطرتاً ہی "رنگیلے شاہ" واقع ہوئے تھے۔ یا اس سے بھی دو چار قدم آگے۔ اگر رنگیلے شاہ اپنے وقت کا حکمران تھا تو قبلہ محترم بھی اپنے وقت کے اچھے خاصے ڈکٹیٹر تھے ان کے جسم میں بھی نوابوں کا شاہی خون تھا اور شاہی خون جیسے کے شغل اختیار کرتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں تھا۔ صرف ثروت بیگم ہی ایک ہستی تھیں جو نوابی خاندان سے تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی تعلق جوڑنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ رات کے دو بج رہے ہیں ثروت بیگم اپنے رنگیلے شاہ کے انتظار میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ نماز پڑھ رہی ہیں مگر سجدے رنگیلے شاہ کے نام پر ہو رہے ہیں۔

بہرحال ثروت بیگم بڑی ہی شوہر پرست بیوی واقع ہوئی تھیں انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ رنگیلے شاہ کا مشغلہ بیوی ہی سے رنگ رلیاں منانا رہا ہے۔ شاہی خون رامش و رنگ کے لیے مجبور کرتا تھا اور رنگیلے شاہ اپنی فطرت سے مجبور تھے ۔۔۔ دن میں تو عام طور پر شراب کے نشا میں دھت رہتے تھے دفتری کام گھر

ہی پر ہوتا تھا۔ وصول باقی جمع بندی حلقے کی پلوائیں وغیرہ وغیرہ غرض کہ اس دور کے حاکمان وقت میں سے کوئی بازپرس کرتا بھی تو ان کا بال بیکا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کسی کا ان کو چھیڑ دینا سوتے ہوئے سانپ کو چھیڑ دینے کے برابر تھا۔ اگر کوئی قسمت کا مارا چھیڑ بھی دیتا یا ان کی سرکاری ملازمت پر حرف آجاتا تو نواب جاگیردار یا جنگ بہادر کے رفقوں اور سفارشوں سے ان کی میز بھر جاتی پھر وہ کون مائی کا لال تھا جو ان سے جانے بوجھے بھی بگاڑ لیتا ——

وقت نے ایک زوردار سی مضراب لگائی —— تار جھنجھنا اٹھے —— ساز زندگی کی کریہ تاک چیخوں کے ارتعاش سے ثروت بیگم کا رواں رواں چیخ اٹھا۔ زہرا یتیم ہوگئی اب اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سی خامش لہریں سی اٹھنے لگی تھیں —— وہ اب زندگی کو سمجھ رہی —— اب اس میں وہ چنچل پن تو نہ تھا مگر پھر بھی ایک شرارت سی دل ہی دل میں کروٹیں لے لے کر رہ جاتی۔ اب اس ٹھٹھکتی چال میں ایک لنواتی وقار شرم و حیا کے پردوں سے رہ رہ کر آشکار ہونے لگا تھا۔ باپ کی موت نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ روز ہی گھنٹوں سوچتی رہتی اور ثروت بیگم چپکے ہی چپکے اپنی بیٹی کی سوچ پر حیران سی رہ جاتیں جب کبھی وہ پوچھ بھی لیتیں "بیٹی کیا سوچ رہی ہو تم۔"

"جی کچھ بھی تو نہیں امی" وہ چونک کر کہہ اٹھی ثروت بیگم کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ آواز بھرا جاتی۔ دل کی گہرائیوں سے ایک نعرہ نکلتا "بیٹی" اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو جاتیں۔

ثروت بیگم مجبور تھیں وہ کر ہی کیا سکتی تھیں۔ جب رنگیلے شاہ زندہ تھے گھر میں ہر طرف زندگی ہی زندگی نظر آتی تھی۔ مگر جب سے وہ اللہ میاں کے پیارے ہو گئے سارا گھر سونا سونا سا لگنے لگا تھا۔ اور پھر اس پر گھر کے بڑے بیٹے اور بہو کا راج —— ثروت بیگم یہ تاڑ جانے سے لگنے لگی تھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ زہرا کی قسمت کبھی نہ چمکے گی آخر وہ بھی اسی فکر میں گھل گھل کر اللہ میاں کے ہاں سدھار گئیں۔

زہرا پر یہ دوسرا تازیانا ایسا بڑا کہ وہ بدل کر رہ گئی —— اب وہ چپ اور رات کی تاریکی کے سنسان لمحے۔ وہ اب اداس اداس سی رہنے لگی۔ ہنستا یا تو گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی یا پھر کسی ایک کمرے میں اپنی اس دیکھنے والی زندگی کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتی —— وہ جینا چاہتی تھی مگر اس کا بڑا بھائی اسے مرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ بھابی کو ہنستا سہتا دیکھ کر چلی آرہی تھی کہ زہرا کے جذبات کو کیوں کر کچلا جا سکتا ہے —— زہرا جب کبھی اپنی بھابی کو دیکھتی تو ایک عجیب سی خواہش اس کے دل میں رہ رہ کر مچلنے لگتی —— کاش وہ بھی بھابی ہی کی طرح بنا دی جاتی —— بھابی کا مسکراتا ہوا چہرا اس کے لیے کسی خاص انجانی چوٹ سے کم نہ تھا۔ جس کی دکھن چپکے ہی چپکے سینے کے اندر سے اٹھتی اور پھر پھڑ پھڑاتے آنسوؤں کے ذریعے بہہ جاتی —— جب کبھی اس کے بھائی جان مسکراتے ہوئے آتے تو بھابی جان کا انگ انگ کھل اٹھتا جسم میں کلیاں سی چٹکنے لگتیں اور پھر مسکراتے ہوئے استقبال —— زہرا کے چہرے پر زردی سی چھا جاتی اور اپنا اداس چہرا لیے چپکے چپکے اپنے کمرے میں آنسو بہانا شروع کر دیتی۔

زہرا یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی قسمت کے ہزاروں ہی ٹکڑے کر دیے جائیں گے۔ اسے کسی طرح بھی جینے کا حق نہ دیا جائے گا۔ وہ اپنا الگ گھر نہ بسا سکے گی۔ ازدواجی زندگی کے خوشگوار لمحے اسے کبھی نہ مل سکیں گے۔ وہ یوں ہی روتی بسورتی رہے گی اور ان ہی تفکرات میں گھل گھل کر مر جائے گی جب کبھی بھائی کی اس ننھی سی بچی شہناز کو دیکھ پڑتی تو اس کے کلیجے میں ایک ہوک سی اٹھتی —— وہ تڑپ کر رہ جاتی اور پھر تخیلات کی چھوٹی دنیا میں کھو جاتی جہاں پہنچ کر وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتی۔

اب زہرا کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا ہے مگر بھائی جب ہے وزن دن بدن گھٹتا چلا جا رہا ہے مگر سب ہی چپ ہیں زہرا بخار میں تپ رہی ہے کھانستے کھانستے بے دم ہو رہی ہے مگر کسی کو اس کی پروا نہیں ہے —— آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ رہے ہیں مگر کوئی بھی زہرا کو نہیں پوچھتا۔ گال اپنی گلابیاں کھو رہے ہیں۔

حسن مر رہا ہے شاداب خاک میں مل جا رہی ہے جسم سوکھتا چلا جا رہا ہے اور وہ پھر خون تھوکنے لگی۔ لال لال جیتا جاگتا خون زندگی کی رعنائیاں، گلابیاں، شادابیاں، خواہشیں ارمان آرزو زہرا کی جسم جوانی خون کے متعدد کھڑوں میں بہہ رہی ہے مگر گھر کی سارنگ کا نیات ہی چپ ہے۔ اس کا دیبی ہوئی آنکھوں والا بھائی ایک اچٹتی ہوئی نظر زہرا پر ڈالتا ہے اور پھر سر جھکا کر چپ ہو جاتا ہے ــــ زہرا کے علاوہ اور پانچ جوان بہنوں کی پیاری سی جوانیاں جو نہ جانے کن کن تیروں کا نشانہ بنیں گی۔ اس کی گردن ندامت سے جھک جاتی ہے ــــ شاہی خون مجبور کرتا ہے کہ زہرا کی شادی کسی نواب سے کر دی جائے اور حالات مجبور کرتے ہیں کہ اس کی شادی کسی غریب سے کر دی جائے ــــ

اب وہ اس دوراہے پر کھڑا تھا جہاں اس کی نظریں حقیقت کو کھوجنے کے لیے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ سرمایہ داری غریبی کا منہ چڑا رہا تھا۔ بھائی نے قسمت کا پانسا پھینکا۔ بازی سرمایہ داری لے گئی۔

زہرا اب ہڈیوں کا ایک ڈھانچا تھی جس پر انسانی جلد منڈھ کر کسی نے زندگی کا برش پھیر دیا ہو۔ میلے برساتی ہوئی آنکھوں میں اب وہ رنداتا مسکینیاں مرگھٹ کی اڑتی ہوئی راکھ بن چکی تھیں۔ اب اس کی آنکھوں میں ایک خاموش سی حسرت ہمیشا کی اپنی بیچارگیوں کے ساتھ جھانکتی رہتی تھی۔ ایک عجیب سا اسرار رہ رہ کر اس کی آنکھوں سے برستا رہتا جس کو دیکھ کر ایک نامعلوم سا خوف معلوم ہونے لگتا ہے اس کے شاداب گالوں پر گلابیوں کا نشان تھا۔ ہونٹوں کا عنابی رنگ اڑ چکا تھا۔ لوجدار آواز میں اب وہ رس اور کھنک ختم ہو چکی تھی جس کی ہلکی سی ایک گنگناہٹ پر شردت بیگم زہرا کی چٹ چٹ بلائیں لے ڈالتی تھیں۔ بلکہ وہ اب کرخت کرلے ہنگم سروں کا ایک مجموعہ تھی جس کی ایک ہلکی سی کھانس پر زندگی کے راز ابل ابل کر منجمد خون کے ٹکڑوں میں گر رہے تھے

آج زہرا پر اگڑا جا رہی تھی۔ دق کے ہسپتال کو ــــ شاید اپنی موت کو ٹلانے اور زندگی کی شادابیوں کو پھر سے کھینچ لانے کے لیے جا رہی تھی گویا کہ ایک نئی زندگی پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اپنے دق زدہ ہاتھوں سے ان دنوں کو کھینچ لینے کی کوشش کر رہی تھی جن کو کوئی قوت بھی واپس نہیں لا سکتی ــــ وہ ہنس رہی تھی۔ سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نہ جانے دل کے کن پردوں کو ادھیڑتے ہوئے آ گئی تھی۔ اس کی اس کھوکھلی مسکراہٹ میں کئی ایک تلخ افسانے جھانکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے ــــ ایک طنزیہ ہنسی یکایک اس کے دق زدہ پھیپھڑوں سے عود کر آئی اور پھر ایک زوردار سا خشک ٹھسکا لگا سیاہی مایل خون کا ایک سرخ ٹھکڑا اگل کھاتے ہوئے پلاٹ فارم پر حلق سے نکل کر گر گیا۔ وہ ایک موٹی تو ند کے بیسخر خون کے ٹکڑے کو جوتوں سے مسل کر چلا گئے۔ اور بچے لال لال خون کے دھبے تو ند والے سیٹھوں کے پیروں سے چمٹے ہوئے دور تک نظر آئے۔ دھندلے دھندلے سے مبہم مبہم سے جا بار بار پھیل پھیل کر روندتے چلے جا رہے تھے ــــ زہرا اپنے آنسو پونچھنے لگی جو خشک ٹھسکے سے اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔ پھر بھی وہ نہ جانے کیوں مسکرا رہی تھی ــــ وہ مسکرا نہیں رہی تھی بلکہ ان مسرتوں اور لطافت آمیز زندگی کا مذاق اڑا رہی تھی جس کی یاد اب اس کے سینے میں ایک استخوان پارہ بن چکی تھی وہ اس متوسط طبقے کی ہنسی اڑا رہی تھی جس کو پیٹ بھر کھانا تک نہیں ملتا۔ مگر اپنی وضع داری کو نباہنے کے لیے اپنے آپ کو بیچ دینا پڑتا ہے۔ وہ اس بھابی کا مذاق اڑا رہی تھی جس کے جسم میں نوابی خون تھا جو شاید ابھی تک یہ ہی سمجھے ہوئے تھا کہ زہر کا پیالہ بھی کسی متوسط طبقے کے غریب سے نہیں۔ بلکہ نام نہاد نواب ہی سے ہو سکتا ہے وہ اس بھابی کا مذاق اڑا رہی تھی جو نہ جانے کب سے شاہی محلات کے چھوٹے دستر خانوں پر پل پل کر زہرا کو بھی اپنے نقش قدم پر چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

گاڑی آہستہ آہستہ پلاٹ فارم پر رینگنے لگی۔ اور زنانا کمپارٹمنٹ سے زہرا کے مسلسل کھانسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گاڑی نے سیٹی دی اور ایک جیتا جاگتا خون کا لوتھڑا پلاٹ فارم پر گر گیا۔ گاڑی کی

رفتار دھیمی پڑ رہی تھی اور خون کے جمنے جلد گئے لوتھڑے پلاٹ فارم پر گرتے جا رہے تھے ــــ گاڑی بڑھ رہی تھی۔ لوتھڑے گر رہے تھے۔ اور مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ ہر اخون نہیں تھوک رہی تھی بلکہ اس گھناؤنے سواد کو اگل رہی تھی جو نہ جانے کب سے یک بیک کر سیاہی مائل خون کا رنگ اختیار کر چکا تھا جس نے اس کی زندگی تلخ کر دی تھی اور جینے سے ہمیشا ہمیشا کے لیے بیزار کر دیا تھا۔

آج وہ انہی ناکام امیدوں کے ساتھ ایراگڈا جیسے ایاد جا رہی تھی اپنی پامالی تمناؤں حسرتوں اور بیچارگیوں اور ادھوروں کا ایک انبار لیے ایراگڈا کے جہنم میں جلنے کے لیے جا رہی تھی۔

زہرا! ــــ جاؤ ــــ! تم پر خدا کی رحمت ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا یہ مرض لاعلاج ہے۔ تم پھر زندگی کی جیتی جاگتی صورت نہ دیکھ سکو گی۔ تمہارے کچلے ہوئے جذبات میں پھر سے بہار نہ آ سکے گی، ــــ تمہاری شعلا بداماں جوانی ہمیشا ہمیشا کے لیے رخصت ہو گئی تمہاری زندگی کا یہ بیسواں سکراتی سال ہے مگر پھر بھی تم کنواری ہی اس زندگی کو چھوڑے جا رہی ہو ــــ زہرا جاؤ ــــ! جاؤ ــــ ضرور ایراگڈا جاؤ ــــ ممکن ہے تمہاری نہ بدلنے والی قسمت پھر سے بدل جائے اور تمہاری قوت ارادی پھر سے ایک نئی زندگی کی تخلیق کرے۔

ایکایک میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ بھتوے ہوئے خون کے ہر ٹکڑے میں مجھے زہرا کا معصوم چہرا نظر آ رہا تھا جو مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا "ابھی ناامید نہ ہو۔ میں ضرور اس زندگی کو پھر سے کھینچ لاؤں گی۔"

ہندستانی ادب

مسلسل تیرا سال سے علم و ادب اور دیس کی بھلی جھاشا یا زبان کی سیوا کیے چلا جا رہا ہے اس کو ٹکس کے بھاری رکھتے ہیں آپ کی سہائتا اور امداد کی ضرورت ہے ہم صرف یہی چاہتے ہیں کہ آپ یا دوسرے ذی علم اور ودیا رتھی اس کے خریدار بنائیں تاکہ ہم اپنی کوششوں کو اور بھی آگے بڑھا سکیں۔

ضروریات زندگی

(۱) مکان

(۲) غذا

(۳) پوشاک

(۴) تعلیم و تربیت

ہر انسان کو یہ پیدائشی حق ہے کہ ان جملہ ضروریات زندگی کو حاصل کرے اہل عیال کو آپ کی غیر موجودگی میں ان ضروریات زندگی کے میسر ہونے کا کیا انتظام فرمایا ہے اس کے لیے انجمن ہذا سے جملہ تفصیلات حاصل فرمایئے جس نے گذشتہ متعدد بیمہ داران کے متعدد بیمہ داران کو ان کی ضروریات زندگی کے تکمیل کے لیے فوری طور پر تقریباً کئی لاکھ روپیہ ادا کیا ہے

آج ہی انجمن کی کمپنی قبول فرمایئے

حیدرآباد کوآپریٹیو انشورنس سوسائٹی محدود بشیر باغ روڈ

حیدرآباد دکن

امریکا میں تعلیمی گرمیاں

یو سیس

نیچے کے مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ امریکا کے بالغوں میں صرف ۲ فی صد اشخاص ان پڑھ ہیں۔ ان میں سے بھی ۳ کروڑ تعلیم بالغان کے اسکولوں میں تربیت پا رہے ہیں۔

امریکا آج دنیا میں صنعتی اور علمی تربیت کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہے پچھلے برس ہندستان کے طلبا کی تعداد دوسرے بیرونی ملکوں کی نسبت سب سے زیادہ تھی۔ امریکا تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ہر برس تعلیمی ہفتہ مناتا ہے۔

امریکا میں والدین کو ہر برس خاص موقع دیا جاتا ہے تاکہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ ان کے بچوں کو کس طرح تعلیم دی جاتی ہے۔ امریکا میں تعلیمی ہفتے کی تقریب پر والدین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ جماعتوں کا معائنہ کریں اور اسکولوں کے مقاصد کارکردگیوں اور مسایل کا مشاہدہ کریں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح سارے کمیونٹی میں اسکولوں اور ان کے مقاصد میں دلچسپی پیدا ہو۔ ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور تعلیم کے لیے بہتر مواقع حاصل ہوں۔

۱۹۳۰ء سے یہ ہفتہ ہر برس منایا جاتا ہے تاکہ تعلیمی طریق کار کے مسایل اور ضروریات سے متعلق پبلک کی توجہ اس طرف لوٹے پچھلے برس تعلیمی ہفتے کے دوران میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ والدین نے امریکی اسکولوں کا معائنہ کیا۔ انہوں نے استادوں اور منتظموں سے باتیں کیں اسکولوں میں جماعتوں کی سرگرمیوں کا معائنہ کیا اور معلوم کیا کہ وہ اسکولوں میں مزید بہبودیں کس طرح پہنچانے اور ان کی ترقی کے اقدامات میں کس طرح امداد دے سکتے ہیں۔

اس ہفتے میں ریڈیو۔ ٹیلی ویژن۔ اخباروں رسالوں کے مضامین فلموں عام جلسوں وغیرہ کے ذریعے تعلیمی ضروریات اور اہمیت پر زور دیا جاتا ہے اخباروں کے ایڈیٹوریل کالموں اور ایڈیٹروں کے نام مراسلات میں مقامی تعلیمی ضروریات اور ترقی کے متعلق بحث مباحثہ ہوتا ہے۔ بہت سے گرجوں میں صبح یا شام کی سروس کے وقت روحانی ترقی کے لیے تعلیم کی ضرورت واضح کی جاتی ہے۔

پبلک جلسوں میں ان مردوں اور عورتوں کو خراج تحسین ادا کیا جاتا ہے جنہوں نے اسکولوں کو موجودہ معیار پر لانے کے لیے کام کیا ہے۔ ان جلسوں میں مقامی ریاستوں کی لیجسلیچروں یا امریکی کانگریس کے ممبروں اور تعلیم۔ کامرس اور لیبر کے افسروں اور ٹیچروں کو تقریریں کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔

مقامی اسکولوں کی بہتری اور ان میں اضافے کے لیے پلان بنائے جاتے ہیں اور ان کا پرچار کیا جاتا ہے۔

امریکا کے محکمۂ تعلیم نیشنل کانگریس اور پیرنٹس اینڈ ٹیچرس (والدین اور اساتذہ کی انجمن) نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن اور مرکزی گرجوں کی پراٹیوریٹ تنظیموں کی طرف سے تعلیمی ہفتہ منایا جاتا ہے۔ امریکا کے لوگ روایاتی طور پر تعلیم میں اعتقاد رکھتے ہیں۔

آج کل کی پیچیدہ زندگی میں تعلیم سے ہی بہتر مواقع مل سکتے ہیں اور جمہوریت کی زندگی کے تحفظ کے لیے بھی یہ بہترین ذریعہ ہے۔

امریکا کے لوگ اعلان آزادی کے مصنف یعنی تیسرے امریکی صدر مسٹر ٹامس جیفرسن کی طرح اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اگر کوئی قوم اس متمدن دور میں جاہل بھی رہے اور آزادی کی توقع بھی رکھے تو یہ ایک لایعنی بات ہے جو نہ کبھی ممکن تھی اور نہ ممکن ہوگی۔

اس لیے آج امریکا کی تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں کی تعداد تمام دوسرے پیشوں کی نسبت سے زیادہ ہے۔ نوآبادیاتی

زمانے سے ہی تعلیم کو فروغ دینا، امریکی ریاستوں کی مقامی ذمے داری رہی ہے۔ امریکی آئین میں تعلیم کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا دانستہ طور پر ایسا کیا گیا ہے کیونکہ تعلیم ریاستی حکومتوں کے ہاتھوں میں رکھی گئی ہے امریکا کی تمام ۴۸ ریاستوں میں تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ اور پبلک اسکولوں میں بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ اسکول مقامی ٹیکسوں، ریاستوں کی طرف سے مالی امداد اور بعض خاص صورتوں میں مرکزی حکومت کی طرف سے امداد پر چلائے جاتے ہیں۔

مرکزی تعلیمی پروگرام اکثر بالغوں کی تعلیم یا اہمیت خاص قسم کی ٹریننگ سے تعلق رکھتا ہے کسی پیشے کی تربیت کے سوا ۴۸ ریاستوں میں مرکزی حکومت ابتدائی اور سکنڈری تعلیم میں قریب قریب کوئی امداد نہیں دیتی۔

امریکی محکمہ تعلیم کا دفتر امریکا کی تعلیم کے ہر شعبے کے ساتھ کسی حد تک تعلق رکھتا ہے۔ یہ مرکزی ایجنسی تعلیم کو فروغ دینے کے متعلق بنیادی معلومات ریسرچ اور تحقیق اور مشورے دینے کا کام کرتی ہے۔

آج امریکا میں ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ بالغوں میں سے صرف ۲ فی صد لوگ ایسے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ۱۹۵۲/۵۳ء کے تعلیمی سال میں ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ بچوں اور بالغوں نے پبلک اور پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ حاصل کیا ہے امریکی تاریخ میں طلبا کی یہ سب سے بڑی تعداد ہے جو امریکا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ ایک لاکھ ۳۰ ہزار ابتدائی اور سکنڈری اسکول ہیں۔ استادوں کی تعداد ۱۲ لاکھ ہے ان کے علاوہ ۳ کروڑ اشخاص تعلیم بالغان کے مختلف دوروں میں تعلیم پا رہے ہیں۔

امریکا کے ایک ہزار سے زائد تعلیمی اداروں میں سے دو تہائی پرائیویٹ عطیوں اور چندوں سے قایم ہوئے ہیں اور ان کا انتظام ٹرسٹی بورڈوں کے ذریعے ہوتا ہے جن میں حکومت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ کوئی منافع نہیں کماتے۔ لیکن طلبا سے فیس اس لیے لی جاتی ہے کہ تعلیموں کی رقم میں جو کمی ہوتی ہے اس میں امدادی رقمیں شامل ہو سکیں جن طلبا کی آمدنی کم ہو وہ وظیفوں اور فالتو وقت میں کوئی کام کرنے سے ان عالا تعلیمی اداروں کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ہر تین کالج طلبا میں سے ایک طالب علم کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے تاکہ کالج کے اخراجات پورے کر سکے بعض طالب علم صرف اخراجات کے لیے کمائی کرتے ہیں۔ اور بعض تو کل اخراجات پورے کرنے کے لیے کماتے ہیں۔

امریکی آبادی کے ۴۰ فیصد حصے کو کالج ٹیکنیکل اور حرفت یا پیشہ سکھانے والے اداروں مختلف طرح کی تعلیم و تربیت دیتے ہیں امریکا نے اگر اتنی تیزی سے صنعتی ترقی کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اسکولوں نے بھاری تعداد میں جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ٹیکنیکل تربیت دی ہے۔

پچھلے چند برسوں سے امریکا کو ٹیکنیکل تربیت اور دوسرے میدانوں میں تعلیمی مرکز ہونے کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہوئی ہے انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن کے بیان کے مطابق پچھلے تعلیمی سال میں بیرونی ملکوں کے ۷۶۰۴ طلبا نے امریکا کے ۱۴۰ سے زاید کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ حاصل کیا ان میں سے ۲۰۰۰ لڑکیاں تھیں۔ صرف ہندستان کے ۱۱۳۹ طلبا تھے اور چین سیکنڈ کو جرمنی۔ کینیڈا کے طالب علموں کے مقابلے میں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہندی رسالوں کا حال بہت ہی برا ہے انہیں کوئی اشتہار نہیں ملتا اور نہ کوئی شخص ان کا خریدار بننا گوارا کرتا ہے اس لیے کہ ایسے سارے مطبوعات دشمنی گمراہی مفاد میں چھپتے ہیں کرتے ہیں ان رسالوں میں عوام کے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ان کا ایڈیٹر اعتراض کرتا ہے اس لیے کہ اگر ہندی رسالے دلچسپیوں کا سامان فراہم کریں تو ہندستان سے علم و ادب اور زبان کی سیوا کی کیا خاک شاکی جا سکتی ہے ہمارا گلا ان لوگوں سے ہے جنہیں آپ جیسے علم دوست اور ادب نواز حضرات سے اپنے رسالوں کی سرپرستی کریں خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کے خریدار بنائیں تاکہ ہندی علم و ادب کی زیادہ سے زیادہ سیوا کا موقع دیں۔

لال قلعہ

خون میں لتھڑی ہوئی لال عمارت کا وجود
ہم غریبوں کو نہیں خد کو بچانے کے لیے

اک شہنشاہ نے تعمیر کرایا اسکو
جسم کو اور گناہوں کو چھپانے کے لیے

اپنے اجداد کے خوں نے اسے سرخی بخشی
اپنے اجداد کو مقسوم ہوئی تاریکی

اس کا دعوا تھا کہ دنیا کو کرے گا روشن
آج تک پھوٹ کے نکلی نہ کرن بھی کوئی

یہیں جاری ہوئے فرمان ستم رانی کے
شاہ کو ہم نے مگر پھر بھی دعائیں دی ہیں

اس کے دامن پہ ہیں معصوموں کے خون کے دھبے
اس کے سائے میں لٹیروں نے پناہیں لی ہیں

حد انسانیت عظمیٰ سے آگے جا کر
خدغرض اور ریاکار خداؤں نے یہاں

مختلف رنگوں کی طاقت کا سہارا لیکر
روز و شب لوٹتے آئے ہیں غریبوں کے مکاں

اس شفق بار عمارت کی بلندی پہ نہ جا
اس کے آغوش میں تاریکی جنم پاتی ہے

اس نے وہ ظلم روا رکھے ہیں انسانوں پر
جس سے حیوانوں کی خصلت کو بھی شرم آتی ہے

اس عمارت سے پرے اپنی ہی کٹیاؤں کے پاس
اک نیا رنگ محل ہم کو بنانا ہوگا

چھیڑنا ہے ہمیں انسان کی عظمت کا رباب
نقش بے رحم خداؤں کا مٹانا ہوگا

ناظم حکمت ترکی

Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN)
30 MAR 1965

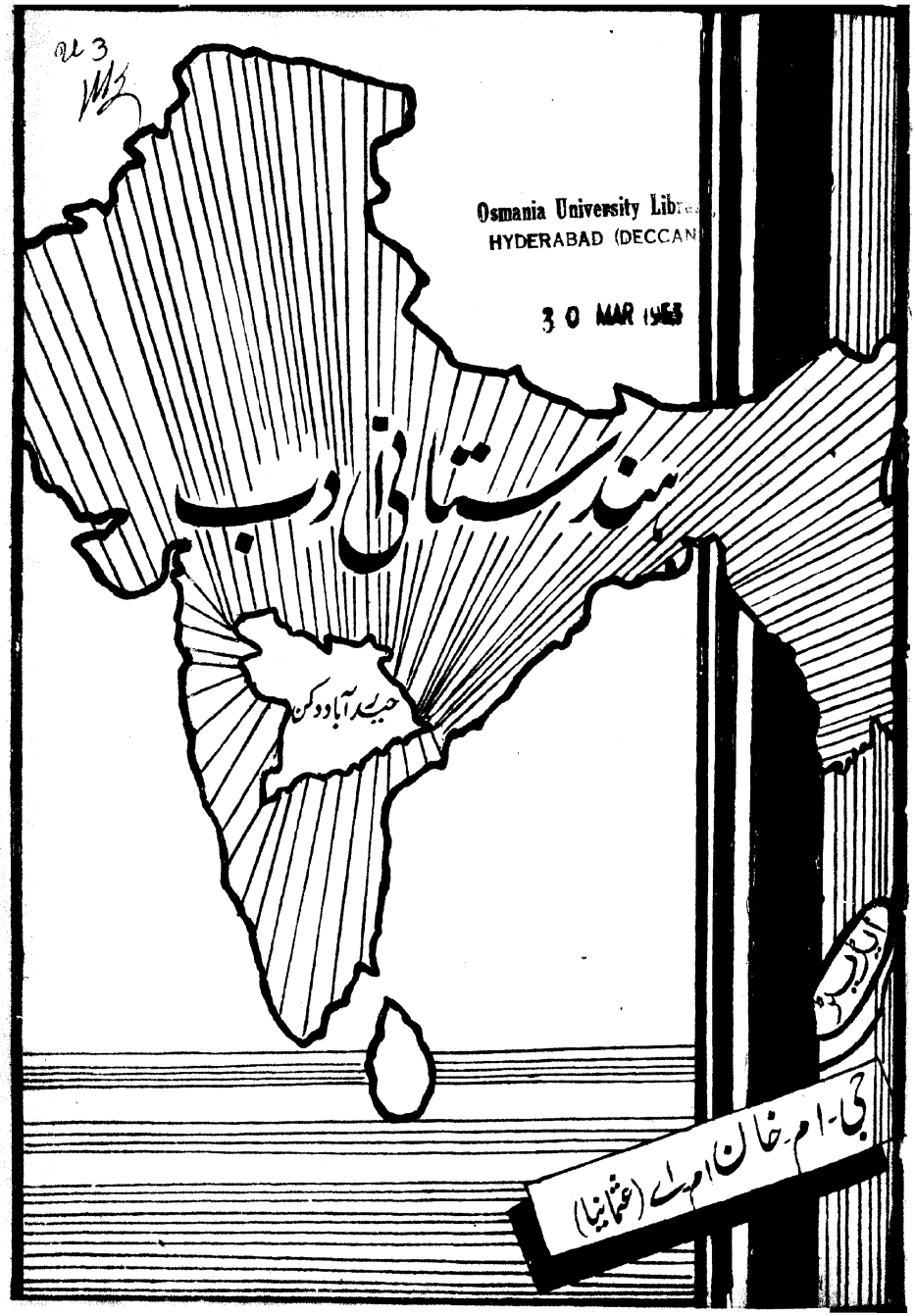

ہندستانی زبان میں آزادی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹ اے - اعظم پورہ شرقی - پی - او - جوبلی حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور شدہ

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے کاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی - ام - خان - ام - اے (عثمانیا)

چندہ سالانا چھ روپے

جلد (۱۳) نمبر (۶)

قیمت ایک پیسہ چار آنے

اردی بہشت ۱۳۶۲ف — مارچ ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
حجاج بن یوسف	میر سیادت علی خان	۹	
غزل	آوارہ (عادل آبادی)	۱۲	
وائیٹ ہاوس	یوسیس	۱۳	
حقایق و معارف	انظر سوہانی وارثی	۱۴	
دلدل	عصمت آر عصمت	۱۶	
زندگی	وحشی (بریلوی)	۱۸	
جے ہو بھارت کی			
کارل مارکس			
غزل			
سوویت یونین میں چیخوف کا شوق			
تین محبت - ایک کہانی			
غزل			
امریکا کے بعض مشاہیر			
غزل			
	احمد سعدی	۳۰	
میر (ڈاہد علی شاہد)			۱۹
بلا (سیتاپوری)			۳۱
گ - ا			۳۳
خ م عارف			۳۴
قمر لکھنوی			۳۷
یوسیس			۳۸
لاشاد			۳۹

ہمارے خیالات

آل انڈیا کانگریس اور ہندستانی

(۲)

پچھلے نمبر میں ہم نے یہ بتایا تھا کہ جنوری ۱۹۵۳ء میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس حیدرآباد میں ہوا تھا جس میں ہم نے خاص طور پر شرکت کی تھی۔ ان اجلاسوں میں شریک ہونے کا ہمارا پہلا اور آخری مقصد بھاشا یا زبان کا مطالعہ تھا۔ اس بھاری مقصد کے پیش نظر ہم نے پورے اجلاسوں میں شرکت کی اور جو چاہتے تھے اس کو پالیا۔ یعنی ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان اجلاسوں میں شرکت کے لیے ہندستان کے مختلف حصوں سے جو لوگ آئے ہیں وہ کس بھاشا میں تقریر کریں گے۔ ظاہر ہے کہ آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے ہندستان کے ہر حصے سے لوگ آئے ہونگے۔ ان میں آسامی بھی تھے اور بنگالی بھی۔ بہاری بھی تھے اور اڑیسوی بھی۔ یو۔ پی اور ایم۔ پی کے نمایندے بھی تھے۔ پنجاب، پیپسو، راجستھان، سوراشٹر، مدھیہ بھارت، بمبئی مدراس میسور، ٹراونکور کوچن کے لوگ بھی شریک تھے اگر یہ لوگ اپنی بھانت بھانت کی بولیوں میں بولنا شروع کرتے تو کانگریس کا اجلاس چیستاں بن کر رہ جاتا۔ وہ بولنا تو ضرور چاہتے تھے مگر سننے والا کون تھا۔ اور اگر کوئی بولے بھی تو اس کی آواز نہ صدا البصحرا سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی۔ جس کے ثبوت میں ہم نے تامل ناڈ کے نمایندے کی مثال پیش کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر نمایندے ایک طے شدہ پلاٹ فارم پر ایک ملی جلی بھاشا میں بولنے پر مجبور رہتے۔ اسی ملی بھاشا کو انہوں نے ہندی کا نام دیا۔ حالانکہ اس کا صحیح نام "ہندستانی" ہے ہمارے اس استدلال کو آپ ان تقریروں کی روشنی میں جانچیے جن کے بارے میں ہم مختصر طور پر نیچے لکھیں گے۔

سی راجگوپال چاری چیف منسٹر مدراس نے ہندستان کی خارجی پالیسی پر انگریزی میں تقریر کی اس کی تائید میں سیٹھ گوبند داس نے پہلے لکھی ہوئی قرارداد پڑھی اس کے بعد اپنے دو چار بیان کیے لکھی ہوئی قرارداد کمیٹی چوڑی تھی مگر آپ یقین جانیے کہ اس پوری قرارداد کا ایک شبد بھی ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ اس کا ہر شبد ٹھیٹ سنسکرت کے سانچوں میں ڈھلا ہوا تھا۔ گوبند اس یقیناً یو۔ پی بھاشا کے ماہر ہیں۔ اور انہوں نے قرارداد بڑے ہی زور شور کے ساتھ پڑھی۔ اس کے بعد سیٹھ جی نے اپنی تقریر شروع کی پہلے پہلے تو سنسکرت کے موٹے موٹے شبد استعمال کیے کہ جب روانی پر آتے تو اس تصنع یا بناوٹ کو قایم نہ رکھ سکے۔ چنانچہ فصیح "ہندستانی" میں بولے چلے جا رہے تھے۔ یہاں پر چند کی پوری تقریر کا دینا ممکن نہیں اس لیے ہم ایسے شبد اور جملے پیش کیے دیتے ہیں جن سے صاف طور پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ ہندی کا راگ الاپنے والے خود کس دھارے پر بہے جا رہے ہیں۔

ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ ناراض ہو چکے ہیں اطمینان دلاتا ہوں۔ میں آپ حضرات کو یقین دلانا چاہتا ہوں ہماری حکومت مدد کر سکے گی۔ بخوبی واقف ہوں۔ نہایت غلط آواز ہے۔ بہت زبردست غلطی ہوگی۔ نہایت ہی اہم کام انجام دیا ہے ہماری جو عزت آج دنیا میں ہے اگر ہم ایسا کریں گے تو غلطی ہوگی۔ سب کام ٹھیک ہو جائے گا اور سب سے بڑھ کر مزیدار چیز گوبند اس کا "گنا" یعنی "لذت" ملاحظہ ہو ——

یہ ہیں وہ جملے اور شبد جو ہندی کے ڈھنڈورچی سیٹھ گوبند داس نے اپنی ایک چھوٹی سی تقریر کے دوران استعمال کیے۔ گھنٹے دو

گھنٹے کی تقریر میں نہ معلوم وہ اور کیا گل کھلائیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندی، ہندی کا راگ الاپنا بہت ہی آسان ہے مگر اس کو عملی طور پر پیش کرنا بڑا ہی کٹھن کام ہے اس بارے میں ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ ہندی کو وہی اہمیت حاصل رہے گی جو برطانوی دور میں انگریزی کو تھی۔ ہندی راج بھاشا ہے نہ کہ دیس بھاشا۔ دیس کی ملی جلی بھاشا "صرف ہندستانی" ہی ہو سکتی ہے اس کا ثبوت ایک سے ایک لائق اور ان گنت موقعوں پر دیا جا سکتا ہے۔

اوپر کی قرارداد کی مزید تائید بنگالی نمایندے پربھود چندر نے کی اس مقرر نے اپنی فارسی آمیز زبان سے اکثر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ منڈپ میں بیٹھے لوگوں میں سے ایک نے تعجب کے ساتھ دریافت کیا کہ آخر یہ کس بھاشا میں بول رہے۔ ہیں ایک دوسرے نے مزاحیہ انداز میں جواب دیا۔ بنگالی ہندی میں۔ مقرر نے ہنستے ہوئے جواب دیا "میں عوام کی زبان میں تقریر کر رہا ہوں"۔

ونوبا بھاوے کے "بھودان یاگنا" کی قرارداد ایک اور بنگالی نمایندے چودھری ہرندر ناتھ نے پیش کی۔ اس کی تائید مرکزی وزیر لال بہادر شاستری نے کی ان دونوں کی تقریریں نہایت ہی فصیح "ہندستانی" میں تھیں۔ اسی لیے یہاں خاص خاص شبدوں یا جملوں کے گنانے کی ضرورت نہیں۔

جنوبی افریقا والی قرارداد بمبئی کے چیف منسٹر مرارجی دیسائی نے پیش کی۔ مرارجی دیسائی ٹھیٹ سنسکرت میں بولے جاتے تھے ہم حیران تھے کہ آیا یہ وہی مرارجی ہیں جو "ہندستانی" کے پرجوش اور پرچاری ہیں جن کی "ہندستانی پرستی" زبان زد عام ہے جو ہندستانی "ہندستانی" میں تقریر کرتے آئے ہیں۔ اور جن کی "ہندستانی نوازی" پر ہم نے انہیں صفحوں میں ایک سے زیادہ بار لکھا ہے بہرحال تھوڑی دیر کے لیے ہمارا دماغ چکرا ضرور گیا۔ ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ انہوں نے اسٹانڈ پر رکھے ہوئے کاغذات کا صفحہ الٹا۔ تب کہیں جان میں جان آئی اور دماغی پریشانی دور ہوئی۔ لکھی ہوئی قرارداد ختم کرنے کے بعد مرارجی دیسائی نے تقریر شروع کی تو یہ معلوم ہوا تھا کہ ٹھیٹ اور فصیح "ہندستانی" کے پھول جھڑ رہے ہیں۔

مرارجی دیسائی کی قرارداد کی تائید میں تین مقرروں نے نارائن واسپ چیف منسٹر راجستان جی۔ کے جوشی مہاراشٹرا اور سری کاشی رام تلواری، بہا کو نسل نے صاف ستری اور نہایت ہی پاکیزہ "ہندستانی" میں اپنے وچار بیان کیے۔

مرکزی وزیر اور صدر پانچ سالا منصوبا بندی کمیشن گلزاری لال نندا نے پانچ سالا منصوبا بندی پر ایک قرارداد انگریزی میں پیش کی اس کے بعد "ہندستانی" میں اپنے خیالات ظاہر کیے ان کی تقریر بڑی ہی لمبی چوڑی تھی اس لیے لمبی دوڑ میں اور بھی تھکتی گئی نندا جی اپنی پوری تقریر میں پچاسوں ہی فارسی ترکیبیں اور فارسی عربی کے موٹے موٹے شبد استعمال کیے۔

منصوبا بندی یا پلاننگ کمیشن کی قرارداد کے سلسلے میں کئی لوگوں نے ترمیمات پر تقریریں کیں جن میں مدھیہ بھارت کے نمایندے سری پرکاش نے ٹھیٹ "ہندستانی" میں تقریر کی اور ہم لہذا نمایندگی۔ اپنائیں۔ بخوبی۔ واقفیت بچت ایمانداری۔ قبول کریں۔ منشا یہی ہے، دانشمندی، نادار بے ایمانی۔ باوجود ان تمام مشکلات کے میں امید کرتا ہوں۔ آسانی۔ تقویت۔ میں درخواست کروں گا۔ ناممکن۔ غالب وغیرا وغیرا جیسے شبد اور جملے استعمال کیے۔

ہمیں زیادہ اچنبا تو اس وقت ہوا جب ناگپور کے ایک نمایندے بلی وال نے "ہندستانی" میں تقریر کرتے ہوئے فصاحت کے پھول جھڑانا شروع کیے چند جملے ملاحظہ ہوں شاید آپ حضرات یہ نہیں جانتے کہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہم دیس کے سپوت ہیں اس لیے ٹھیک ٹھیک نمایندگی کرنا ہمارا فرض ہے طاقت کا غلط استعمال نہایت ہی بیجا اور اس کا صحی استعمال درست اور مناسب ہوگا۔ نمایندگی تو سب ہی کرتے ہیں لیکن ذمے داری کے ساتھ بہت کم لوگ کام انجام دیتے ہیں۔ خالی خولی اپیل کرنے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں آپ سے یہ دریافت

کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات مجھے کچھ چنتی نظر نہیں آتی خامیاں نکالنا ہزاروں روپئے تنخواہ دے کر دوسروں کے لئے چھوڑ دیجئے۔ آپ سے معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا میرا تو تجربہ یہ ہے کہ مایوسی چھا گئی ہے ہم اپنی ذمے داریوں کو محسوس کریں۔

منگی داس ویاس — مدھیا بھارت کی تقریر کے چند شبد اور جملے ملا خطا ہوں خوبی ایمانداری، جواب دہی چرچے اس کے باوجود میں اچھی طرح سے محسوس کرتا ہوں۔ اصل تحریک ذمے داری آج کا اجلاس مشکل زبردست۔ رسائی۔ بھلائی۔ لے وفائی۔ شاید آپ گھبرائیں نہیں۔

اسی سلسلے کی اور کڑیاں کاشی ناتھ۔ راجستان، سیٹھ آئیل سنگھ۔ اتر پردیش۔ جیرنگبت شرما۔ اتر پردیش۔ پری پور نانداز اتر پردیش۔ گورکھ سنگھ۔ مسافر پنجاب۔ کالی کمرجی بنگال آر۔ کے سدھوا بمبئی اور سیتا یدھ ویر جیدا بادلے تلاش سبھوں نے فصیح اور بلیغ ہندستانی میں تقریریں کیں کسی ایک مقرر وں نے فارسی اور عربی کے شبد بلا تکلف استعمال کیے کالی کمرجی بنگال اور آر کے سدھوا بمبئی نے تو اپنی فصاحت سے ہمیں حیرت میں ڈال دیا ان کے علاوہ اکر شنا پیر دلی نے اس قدر آسان اور سلیس "ہندستانی" میں تقریر کی کہ ہم سوچتے تکتے ہی رہ گئے۔ ان کے بعد روپ چند ڈنگو دیا دلی اور نارائن چودھری بہار کے نمائندوں نے بھی ٹھیٹ "ہندستانی" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیتا یدھ ویر اپنی تقریر لکھے آئے تھے۔ اس میں بعض بعض جگہ سنسکرت کے کٹھن شبد استعمال کیے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا بڑا حصہ پڑھا تھا کہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے گرج کر کہا "یہ بچوں کا مدرسا نہیں جو لکھی ہوئی چیز بیں لا کر پڑھیں سچ کہنا ہو تو تقریر کرو" اس پر دیوی جی نے کاغذوں کا پلندہ چھوڑ تقریر شروع کی۔ آپ یقین جانیے کہ اس بھلی عورت نے سنسکرت کا ایک بھی لفظ استعمال نہیں کیا اور بڑی ہی روانی کے ساتھ بول چال کی بھی بھرپور فارسی عربی کے شبد بلا تکلف دا خل ہوتے تھے

لسانی صوبوں کی قرار داد امام المقررین مولانا ابوالکلام آزاد مرکزی وزیر تعلیم نے پیش کی اس قرارداد پر اور تقریروں کے بعد آر۔ ایچ ڈوبے مہاراشٹر انے ترمیم پیش کی۔ تقریر نہایت ہی فصیح اور بلیغ تھی پوری تقریر فارسی، عربی لفظوں سے بھری پڑی تھی۔ چنانچہ مقرر نے ابتدا ہی صدر محترم سے کی۔ بزرگو۔ دوستو بھائیو۔ پیچ سالا صوبا بندی بڑا ہی پیچیدہ اسوال ہے۔ اس کا اثر لازمی طور پر یہ ہوگا۔ کامل بھروسا کیجیے لہٰذا آپ کا وقت ضایع کرنا نہیں چاہتا پھر بھی گنجائش ہے میں آپ حضرات کی خدمت میں ترمیم پیش کرتا ہوں۔

مہاراشٹر اکے نمائندے آر۔ ڈے نے بھی نہایت ہی پاکیزا ہندستانی میں اس قرارداد کی تائید میں اپنے خیالات ظاہر کیے

ہر پیش چند ہیڈ اچیدا با دھندی کے زبردست حامیوں میں سے ہیں۔ جب اس قرارداد کی تائید میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ہم یہ باور کرنے پر مجبور ہو گئے کہ کہیں ہماری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں۔ اور ہمارے کان غلط تو نہیں سن رہے ہیں — آیا یہ وہی ہیڈا ہیں۔ جن کا شمار ہندی کے علمبرداروں میں ہے۔ تقریر فصیح "ہندستانی" میں تھی۔ اور شروع سے آخر تک فارسی عربی کے لفظ استعمال ہو رہے تھے۔ دیکھیے قول اور فعل میں کتنا زبردست فرق ہوا کرتا ہے۔ یعنی اصولی طور پر اگر تو الاپا کریں ہندی کا اور جب عمل کا موقع آئے تو ہندستانی تک گن گایا کریں۔ صرف ایک ہیڈا ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہم نے اوپر اس قسم کی اور بھی تو مثالیں پیش کی ہیں کہ ہندی کر پریمی اور پجاری ہونے کے باوجود جب بولنے کا وقت آتا ہے تو بات چیت اور تقریروں میں ہندی کا ٹوٹا نہیں چلتا۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ مجلس موضوعات یا سبجکٹس کمیٹی کی روداد تھی آئندہ والی سطروں میں ہم کھلے اجلاس کے مقرروں کے رنگ ڈھنگ پر روشنی ڈالیں گے۔ اس نوٹ پر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کھلے اجلاس میں بھی کم و بیش یہی کا سیب یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس

ورکنگ کمیٹی کی بنائی ہوئی قرارداد یں پہلے مجلس موضوعات میں پیش ہوتی ہیں۔ جو نمائندہ اسی قرارداد کو یہاں پیش کرتا ہے وہی کھلے اجلاس میں بھی پیش کرے گا۔ اسی طرح سے تائید کرنے والے مقرر بھی عمل کرتے ہیں۔ چونکہ ہم ان سب مقرروں کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں۔ اس لیے اب اس کو دہرایا نہیں جائے گا۔ بلکہ ہم صرف ان نئے مقرروں کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کریں گے جنہوں نے ترمیموں کے سلسلے میں تقریریں کی ہوں

کھلے اجلاس کی ابتدا پردیش کانگریس کمیٹی حیدرآباد کے صدر سوامی رامانند تیرتھ کے خطبے سے ہوئی۔ خطبا عظیٹ سنسکرت میں پڑا گیا۔ ہزاروں کے مجمع میں یقین جانیے کہ ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو پورے طور پر خطبے کو سمجھ سکے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سوامی جی سنسکرت کے ایم۔ اے ہیں اور بنارس یونیورسٹی سے ڈگری لی ہے اس لحاظ سے جس کٹھن بھاشا میں خطبا لکھا ہوگا اس کا اندازا آپ کو ہو ہی گیا۔ مگر انہیں سوامی جی نے اجلاسوں کے دوران اور اجلاس کے ختم پر جو تقریر کی وہ "چیزے دیگر است" کے مصداق تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سوامی جی نے اپنی تقریروں میں موقع موقع سے سنسکرت کے کٹھن شبد استعمال ضرور کیے لیکن سوامی جی کی تقریر ہی زبان اور لوگوں سے مٹی ہوئی نہیں تھی۔ جب سنسکرت کا ایک ماہر اور پنڈت اپنی ضد پر قائم رہنے سے بے بس اور لاچار ہو جاتا ہے تو پھر اوروں کا کیا شمار۔ مجمع میں ایک ہیجانی کیفیت اور کبھی کبھار گڑبڑ یا شور وغل یا عوام کے ادھر سے ادھر اٹھ آنے، بھاگنے، دوڑنے اور ہنگامہ وغیرہ مچانے پر جب کبھی صدر کانگریس ہر و غصے میں آجاتے بگڑ بیٹھتے اور سوامی جی پر برس پڑتے تو سوامی جی مجمع کو خاموش کرنے اور قابو میں لانے کے لیے تقریر کرتے پورے اجلاسوں میں انہیں ایک سے زیادہ مرتبا ایسی تقریریں کرنی پڑیں ہم نے اوروں کی تقریروں سے ان کی تقریروں کا موازنا کیا تو ۱۹/۲۰ سے زیادہ کا فرق نہ پایا۔ دوسروں کی تقریروں کے بارے میں ثبوت پیش کرتے ہوئے ہم نے یہ بتایا ہے کہ تقریریں ہندی نہیں ہیں لیکن ہیٹ اور خالص نہ ہندستانی ہیں۔ جب سوامی جی کی تقریریں بھی اسی کے لگ بھگ ہیں تو پھر ان کی تقریری زبان کو "ہندستانی" کا نام کیوں نہ دیا جائے۔ ہندی، ہندی کا راگ الاپنا بہت ہی آسان ہے لیکن وقت آن پڑے تو عمل کے ذریعے اس کا ثبوت دینا بہت ہی کٹھن اور مشکل کام ہو جاتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ ہندی راج بھاشا ہے، ہندی حکومت کی زبان ہے اور ہندی، ہندی پرچاروں کی جیتی بھاشا ہے، ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ ہندی کو ہندستان کے دولت مندوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ ہندی میں کثرت سے کتابیں لکھی جاتی ہیں اور آئے دن رسالے اور اخبار بھی جاری ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی ہندی کا پورے دیس کی ملی جلی بھاشا یا قومی زبان بننا ممکن نہیں۔

آپ اس بات کو خاص طور پر سمجھ لیجیے کہ جتنی بھی قراردادیں لکھ کر پڑھی گئیں وہ سنسکرت زبان میں تھیں انہیں قراردادوں کی وضاحت کے طور پر پیش کرنے والے جو تقریر کرتے وہ ہیٹ اور بعض اوقات فصیح "ہندستانی" ہوا کرتی چنانچہ مولوی رفیع احمد قدوائی نے جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے خان عبدالغفار خاں کی رہائی کے بارے میں جو قرارداد پڑھی سنسکرت آمیز تھی۔ اس کے بعد ہیٹ "ہندستانی" میں وضاحتی تقریر کی۔ اسی طرح دوسرے جنرل سکریٹری اگروال نے حکومت ہندستان کی خارجی پالیسی والی قرارداد کی تائید میں فصیح "ہندستانی" میں تقریر کی اور تقریر سے پہلے جو قرارداد پڑھی وہ ہیٹ سنسکرت میں تھی۔ اگروال کے بعد ہری ناتھ شاستری اتر پردیش نے فارسی آمیز "ہندستانی" میں تقریر کی۔ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ کئی بار یورپ اور امریکا کا سفر کیا ہے لیکن اس کے باوجود مغربی تہذیب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کہنے کے انداز، مولویانا اور تقریر کا رنگ و اعظانا تھا۔ پوری تقریر میں ایک لفظ بھی سنسکرت کا استعمال نہیں۔ اس کے برعکس فارسی

اور عربی شبدوں کی بھرمار تھی۔

خارجی پالیسی کی مزید تائید کے لیے جواہر لال نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے ابھی زبان کھولی ہی تھی کہ بعض میسوریوں اور مدراسیوں نے "انگلش، انگلش" چلانا شروع کیا۔ مگر مسز پنڈت نے جواب میں "ہرگز نہیں۔ میں انگریزی میں کبھی نہیں بولوں گی۔ میں ابھی ابھی باہر سے آئی ہوں میں اپنی بہنوں اور بھائیوں کی زبان میں بولوں گی" اس جملے کا ایک ایک شبد بلا سہارا لگاؤ وجے لکشمی کا ہے ظاہر ہے کہ مسز پنڈت نے "بہنوں اور بھائیوں" کے شبد استعمال کیے ہوں گے تو اس سے ان کی مراد پورے ہندستان کی بہنیں اور بھائی ہوں گے۔ جن میں لازمی طور پر ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی یہودی غرض کہ ہر مذہبی اور لامذہبی سب ہی بھائی بہن شریک ہوں گے ایسی صورت میں آپ خود غور فرمائیں کہ ان سب کی ملی جلی بھاشا کونسی ہوگی چونکہ یہ سب ہندستانی باشندے ہیں اس لیے ان کی ملی جلی بھاشا صرف "ہندستانی" ہی ہوسکتی ہے چنانچہ مسز پنڈت دھڑلے کے ساتھ اپنی بہنوں اور بھائیوں کی بھاشا "ہندستانی" ہی میں تقریر کی ہوسکتا ہے کہ اوروں کی طرح دیس بھاشا سے اس کی مراد ہندی ہی ہو لیکن انہوں نے تقریر جس زبان میں کی وہ نہایت پاکیزہ اور فصیح "ہندستانی" تھی۔ اس کھلے ثبوت کے بعد بھی "ہندستانی" کو زبردستی ہندی کا نام دینا پاپ نہیں بلکہ مہاپاپ ہے۔

کھلے اجلاس میں ام۔ پاٹل مہاراشٹر اے بلانگ کمیشن کی تائید میں انگریزی میں تقریر شروع ہی کی تھی کہ صدر کانگریس نہرو نے ٹوکا اور انہیں ہدایت کی کہ "جب آپ "ہندستانی" میں بول سکتے ہیں تو پھر یہ انگریزی کیوں؟" چنانچہ پاٹل نے "ہندستانی" میں اپنی تقریر شروع کی تقریر سن کر ہم بھونچکے سے رہ گئے کہ اس قدر فصیح "ہندستانی" بولنے والا شخص کدھر بھٹک رہا تھا۔ اب یقین جانیے کہ پاٹل نے نہایت ہی لطیف اور پیاری "ہندستانی" میں تقریر کی زبان کی سادگی نے تو تقریر کو چار چاند لگا دیے۔

اس سے پہلے ہمیں اس بات پر اچنبا ہو رہا تھا کہ "تلنگے، مرہٹے، کنڑے، گجراتی، بنگالی، مدراسی وغیرہ وغیرہ تو چھپے رستم ہی نکلے کہ جن سے ہمیں "ہندستانی" میں تقریر کرنے کی کم آشا تھی۔ اب اس لوبت پر ہماری حیرت اور استعجاب نے ایک دوسرا ہی رنگ اختیار کیا۔ یو۔ پی کے مشہور زمانا چیف منسٹر گووند ولبھ پنت سے کون واقف نہیں۔ یہ گووند ولبھ پنت ہی کی پیدا وار ہیں دنیا جانتی ہے کہ یو۔ پی "ہندستانی" زبان کا مرکز اور مخزن ہے وہاں کا ہر شخص چاہے کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ فصیح سے فصیح تر "ہندستانی" بولتا ہے۔ چنانچہ یو۔ پی کے ہندو بھی "ہندستانی" بلا تکلف بولتے ہیں۔ گووند ولبھ کے گھرانے سے جو لوگ واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان کے گھر کا ہر فرد فصیح "ہندستانی" بولتا ہے اور یہ خدا تو "ہندستانی" کے ماہر ہی ہیں۔ مگر آپ کو سن کر سخت ترین تعجب ہوگا کہ پاکستان اور ہندستان کے تعلقات والی قرارداد کو پیش کرتے ہوئے پنت نے جو تقریر کی تو ہم اپنے آپ کو چندر گپت موریا کے دربار میں بیٹھا محسوس کر رہے تھے جہاں کیانی اور پنڈت درباریوں کو سنسکرت میں بھاشن دے رہے ہوں۔ وزیر پنت بہت ضعیف ہو گئے ہیں ان کے ہات پیر اور جسم میں رعشا پیدا ہو گیا ہے وہ زیادہ دیر تک کھڑے نہیں رہ سکے۔ اس لیے صدر نے انہیں تخت پر بیٹھ کر تقریر کرنے کی اجازت دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بیٹھے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ تقریر کی چونکہ یہ ایک آرام کی شکل تھی پنت نے تقریر بھی لمبی چوڑی کی اور جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا زبان سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی اس ضد اور ہٹ پر آخر وقت تک قایم رہے ——

اس کو ہم "ترا تعصب" کے سوا اور کیا نام دے سکتے ہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ پنت کو ماننے والے حضرات ہماری تائید کریں گے ——

اس قرارداد کی تائید مرکزی وزیر جگ جیون رام اچھوتوں کے نمایندے نے کی۔ پوری تقریر شروع سے آخر تک صاف سادا، سلیس اور پاکیزہ "ہندستانی" میں تھی۔ زبان کا رنگ اس وقت نکھر تا نظر آیا جب انہوں نے ڈوگرا راج اور ڈوگروں کی بدتمیزیوں، بدعنوانیوں، ناانصافیوں اور ہٹ دھرمیوں کا کھلے بندوں چیڑا لیا۔ ان کی تقریر کے اس حصے کے چند جملے ملاحظہ ہوں ـــــ فرمایا وزیر نے "ڈوگرا راج کوئی قصے کہانیوں کی پرانی داستان نہیں بلکے کل ہی کی بات ہے۔ ڈوگرا راج کے مظالم بھلائے نہیں جا سکتے۔ ڈوگروں نے غریب کشمیری مسلمانوں پر کیا کیا ظلم نہیں توڑے، ان کو اچھوت اور بیگار سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ ان غریبوں کو ننگا بھوکا بچھو کا بچھو کران ظالموں کو خوشی ہوتی تھی۔ آج جبکے عبداللہ سرکار نے ان ظالموں سے زمین چھین کر ان کنگالوں اور مفلسوں میں بانٹ دی ہے تو ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اپنی زمینیں واپس لینے کے لیے بے چین ہیں۔ میں آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ یہ پرجا پریشد موومنٹ کوئی مذہبی چیز نہیں بلکے یہ سب انہیں ظالم ڈوگروں کی شرارت اور سازشوں کا نتیجہ ہے جو اپنی کھوئی ہوئی جائیداد اور زرعیات واپس لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔" ہم کہاں تک لکھیں جگہ کی تنگی قلم کو لگام دے رہی ہے یہ سمجھ لیجیے کہ اوپر جو کچھ بیان ہوا "مشتے نمونہ از خروارے" ہے ایک ہی قرارداد کے سلسلے میں اور ایک ہی پلاٹ فارم پر ایک طرف مشہور زمانا گوندولبھ پنت کی زبان پر غور کیجیے اور دوسری طرف بے چارے جگ جیون رام کی پیاری زبان کو چوم لیجیے۔ یہ بین تفاوت راہ کجاست تا بہ کجا"۔ جگ جیون رام کے بعد اسی قرارداد کی تائید میں اور بھی لوگوں نے تقریریں کیں جن میں چندن تاراین مہاراشٹر پرجھوی سنگھ دلی۔ سہی رام شنکر مہاراشٹرا دھیر و بھائی دیسائی گجرات، مانک لال راجستھان اور کرپارام یو۔ پی نے ہیڈیٹ اور فصیح "ہندستانی" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سیلون کے تعلقات پر قرارداد پیش کرتے ہوئے نارایین سنگھ یو۔ پی نے انگریزی میں تقریر کرنا چاہی مگر اس موقع پر بھی صدر نہرو نے یہ کہتے ہوئے ٹوکا کہ "دیکھتے نہیں کہ کتنے لوگ انگریزی سمجھنے والے نظر آرہے ہیں۔ اپنی زبان میں تقریر کرو"۔ چنانچہ سنگھ نے نہایت ہی فصیح اور بلیغ "ہندستانی" میں لمبی چوڑی تقریر کی اور شروع سے آخر تک وہ زبان کے اعتبار سے بھٹکنے نہ پائے۔ ان کے بعد رام چودھری بنگال نے تائید مزید کرتے ہوئے نہایت ہی فصیح "ہندستانی" میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ بنگالی نمایندوں کی تقریروں میں ہم نے ایک خاص بات یہ پائی کہ وہ فارسی کے شبدوں کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بنگالیوں نے کسی زمانے میں فارسی کے اثرات کو بڑی حد تک قبول کر لیا تھا جس کا لگاؤ اب تک بھی موجود ہے۔

جنوبی افریقا والی قرارداد کی تائید کے لیے آر۔ کے کالیلکر مہاراشٹرا کھڑے ہوئے تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ "بھائیو! میں انگریزی نہیں جانتا۔ اپنی بھاشا مرہٹی میں بولتوں تو سمجھنے کتنے لوگ اس واسطے ہندی میں جو کچھ بولنا ہے بولوں گا"۔ چنانچہ انہوں نے تقریر شروع کی زبان ٹوٹی پھوٹی سہی وہ ہندی نہیں بلکے "ہندستانی" ہی تھی۔ اس لیے کہ انہوں نے جن شبدوں میں اپنے خیالات ظاہر کیے وہ ہندی یا سنسکرت کے نہیں بلکے "ہندستانی" کے شبد تھے۔

ہم بھی تو اسی مجبوری پر بار بار زور دیتے آئے ہیں ہم نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس بات کو دہرایا ہے اور ہم ہمیشہ ہی لکھتے آئے ہیں کہ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ وہاں ہر ہندستانی شخص "ہندستانی" بھاشا کو اپنے خیالات کا ذریعہ بنانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی خاص جذبے کے تحت اس زبان کو ہندی کا نام دے لیا جائے لیکن سچ پوچھو تو وہ ہے اصل میں "ہندستانی زبان"۔

اس قرارداد کی مزید تائید میں مالویہ جی نے بھی اپنی تقریر کی سنسکرت کے شبدوں کی زیادہ استعمال تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ٹٹول ٹٹول کر ہولے ہولے شبد نکال رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ تقریر میں وہ روانی نام کو نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ مجمع میں ایک ہیجانی کیفیت جیسی ہوتی ہے کامل تھا۔ چلا رہا تھا کہ لوگوں کو ان کی تقریر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لیے بیزاری اور بے چینی کا اظہار کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ انکی تقریر کے ختم پر جب اکثریت سی دار ہولے کھڑے ہوئے تو سننے والے ان کی طرف سے توجہ ہٹ کر گوش ہو گئے۔ اور کے بارے میں ہم نے ہر چند معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کس صوبے سے ان کا تعلق ہے لیکن افسوس کہ ٹھیک ٹھیک پتا نہ چلا۔ وضع قطع اور لباس وغیرہ سے تو وہ یو۔پی کے باشندے دکھائی دیتے تھے لیکن تقریر ان کے بنگالی ہونے پر صاد کر رہی تھی۔ ممکن ہے بنگالی اصل میں اوریو۔پی میں وہ بس گئے ہوں۔ بہر حال انہوں نے صحیح "ہندستانی" میں بول رہے تھے فارسی اور عربی شبدوں کا تکلف اور کثرت سے استعمال کر رہے تھے۔ موقع موقع پر محاورے بھی پیش کیے جاتے تھے۔

داور کے بعد راجا صاحب محمود (یو۔پی) نے تقریر کی شروع شروع میں سنسکرت کے شبدوں کی بھرمار تھی۔ مگر بعد میں وہ "ہندستانی" کے آسان اور سلیس شبد استعمال کرنے لگے۔ اور آگے چل کر تو وہ روانی ہی بھول گئے یعنی تقریر کے آخر حصے میں سنسکرت کا ایک شبد بھی استعمال نہیں کیا۔ لکھے نہایت ہی پاکیزہ اور آسان "ہندستانی" بولے چلے جا رہے تھے۔ دیکھ لیا آپ نے کہ تصنع یا بناوٹ کی نہ پائیدار عمارت کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ آخر اس کا پول کھل جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر اس کو اوندے منہ گرنا ہی پڑتا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس ظاہرداری سے آخر کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ ہزار کوشش کر لیں اصل کو کبھی بھی نہیں دکھایا جا سکتا نقل نقل اور اصل اصل۔ اصل کا جیتا ہی جاگتا ہی پول مالا رہا ہے اسی لیے نقلی شبدوں کی کھینچ تان کر کے اصلی شبدوں کا مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک عارضی کشمکش ہے جس کا پردہ چاک ہوتے ہی اصل یا حقیقت اپنے سچے روپ میں جلوہ گر ہو ہی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ہندستان کے اس اہم اور سیاسی میلے میں ہم نے وہ وہ تماشے دیکھے جن کو کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور ہم نے وہ سب کچھ پا لیا جس کے حاصل ہونے کا ہمیں پہلے ہی سے یقین تھا۔

ہمارا یہ نعرہ کہ "ہندستانی" پورے ہندستان کی ملی جلی بھاشا ہے کوئی نیا نعرہ نہیں ہمارا یہ دعویٰ بہت پرانا ہے تیرا سال پرانا دعویٰ ہے شروع ہی سے ہم اس کے دعویدار رہے ہیں۔ اور خاص بات یہ کہ رتی برابر بھی ہمارے اس دعوے میں تزلزل نہیں آنے پایا۔ ہم اپنی ایک ہی بات پر قائم ہیں کہ دیس بھاشا "ہندستانی" بھاشا کی زبان "ہندستانی" اور عوام کی بولی "ہندستانی" ہی ہم سب کی ملی جلی زبان ہے جو بولنے کی حد تک تو ایک ہے مگر اس کے لکھنے کے طریقے دو ہیں یعنی ناگری اور فارسی دونوں لکھاوٹوں میں لکھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ مگر افسوس کہ اس اجازت پر حکومت نے جبری قبضہ کر لیا ہے نہ معلوم یہ جبری عمل کب تک جاری رہے مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ حکومت عوام کے روشن پر فیصل کیسے لگا سکے گی۔ تاکہ لوگ "ہندستانی" بولنے نہ پائیں یہ ایک غیر فطری اور ناممکن سی چیز ہے اس لیے حکومت بھی بے بس سی نظر آتی ہے اگر حکومت اور کانگریس کے ارکان میں یہ چیز ہوتی تو آل انڈیا کانگریس کے پلاٹ فارم پر "ہندستانی" نہیں بلکہ سنسکرت آمیز ہندی یا ٹھیٹ سنسکرت ہی میں تقریر ہندستانی دیتیں۔ اگر کانگریس کے پلاٹ فارم نے ثابت کر دیا کہ جنتا کی بولی ہندی یا سنسکرت آمیز ہندی یا یہ کہ ٹھیٹ سنسکرت نہیں بلکہ ہندستان کے باسیوں کی واحد ملی جلی زبان صرف اور صرف "ہندستانی" ہی ہو سکتی ہے اور ہر ہندستانی اپنی بھاشا (یعنی ہندستانی) میں بولنے اور تقریر کرنے پر مجبور ہے۔ اس کھلے ثبوت کے بعد بھی ہٹ دھرمی اور مضحکہ خیز طلب ہو جاتی ہے کانگریس کا یہ اجلاس ہٹ دھرم اور مضحکہ لوگوں کے لیے (EYEOPENER) ہونا چاہیے کہ ان کے اختلافات محض تعصب پر مبنی ہیں۔ ورنہ اصل پوچھو تو پورے ہندستان میں سوائے "ہندستانی" کے کسی اور بھاشا کا یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ اپنی تنگ نظری کو دور کر دیں تو نہایت آسانی سے دیس بھاشا کی ترقی کے ذریعہ اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ہندی کو حکومت نے راج بھاشا تو بنا لیا ہے لیکن وہ اس کو دیس بھاشا یا جنتا کی زبان بنانے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور اگر "ہندستانی" ہی کو زبردستی بھی ہندی کا نام دے لیا جائے یعنی وہ بھی ہندی ہوں گے کہ عوام کی طرح حکومت کے بھی قول اور فعل میں فرق ہے

ہندستانی اور ہندی کا اصل جھگڑا یہی ہے کہ ہندی والے ہندستانی کو بھی ہندی کہتے ہیں

(بارویں قسط)

ڈاکٹر میاں سید عبدالحفیظ عثمانی

حجاج بن یوسف

باب ۱۱ مسلسل فتوحات

حجاج بن یوسف کی شہرت دوام کے لیے فتوحات وسط ایشیا جو بلا مبالغہ تاریخ عالم میں بے مثال ہیں ضامن ہیں۔ نیز فتوحات سند بھی متعدد لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہیں۔

فتوحات وسط ایشیا

سیاسی حالت عربی فتوحات کے وقت جیحون کے دونوں جانب کے باشندوں میں نسلی اور مذہبی یکانگت تھی۔ جیحون اور سیحون کے درمیانی ملک کے دو حصے تھے۔ وادی زرافشان اور صغدانیہ۔

صغدانیہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی مملکتیں تھیں تجارت اور ایک ہی خاندان شاہی واسطہ اتحاد تھا چھ سات سو سال کی حکمرانی کی وجہ سے یہ حکمران بھی ایرانی رعایا میں گھل مل گئے تھے یعنی بلحاظ عادات و اطوار ایرانی ہو گئے تھے۔ قتیبہ کی فتح صغدانیہ کے وقت ان مملکتوں میں اتحاد نہ تھا عربوں کے تمام مفتوحہ ممالک میں یہی ملک زیادہ متمدن اور مہذب تھے اور ان کے باشندوں کی جنگجو یا نا عاقبت اندیشوں کے سبب ان پر قبضہ رکھنا نہایت ہی دشوار ثابت ہوا۔ وادی زرافشاں صغدانیہ سے علیحدہ تھی۔ حکومت میں بھی اور ایک حد تک نسل میں بھی ترکی شادمان حکمران تھے۔ مغربی ترکستان کے ترکوں میں ایک خانہ جنگی کے بعد ایک سابق شاد کے لڑکے نے وادی زرافشاں میں شاہی خاندان، خاندان تقارستان صنغونیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کا اقتدار IRON GATE سے زابلستان اور KAPSIA تک اور ہرات سے ختن تک پایا جاتا تھا لیکن سوائے بالائی طخارستان کے اس کا اقتدار برائے نام تھا۔ سومان اوختس و نیز ممالک کے چھوٹے حکمران آزادانہ عمل کرتے تھے۔ عربوں کے حملے کا بار زیرین طخارستان پر پڑا یعنی IRON GATE (آئرن گیٹ) صفانیاں۔ بلخ۔ جوزجان۔ بادغیس اور ہرات پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ۱۰۷ھ تک ان ممالک میں عربوں کو جن فوجوں سے سابقہ پڑا ان میں تقریباً تمام ایرانی طوائف شہروں کے سپاہی تھے الدیہ کے مقام پر ترکوں سے مقابلہ ہوا تھا عربوں کی موافقت میں جو امو تھے اس سے عاجز آ کے دن کی جنگوں سے تنگ آ گئے تھے۔ جو ایک قوی مستحکم اور مستقل حکومت چاہتے تھے چنانچہ عربوں کی خواہش بھی یہی تھی۔ اور یہ کہ عربوں کی حکومت غیر مانوس اس لیے نہیں تھی کہ اس میں ایرانی بھی شامل تھے۔

برخلاف اس کے جن قوتوں سے عربوں کو لڑنا پڑا وہ ایرانیوں کی قومی اسپرٹ قومی عز و وقار کا احساس تھا جو آخر میں ایک نہ ایک ان قومی حکومت قایم کرنے میں کامیاب ثابت ہوا۔ نیز ایرانیوں کا تجارتی مفاد تھا گو بہ نسبت خراسان و ایران کے چین و ترکستان سے ماوراء النہر سے تعلق زیادہ گہرا تھا اور اسی لیے جب دو میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا موقع ملا تو اہل ماوراء النہر ایرانیوں پر چین اور ترکستان کو ترجیح دی

فتح طخارستان زیرین حضرت عثمان کے عہد میں عبداللہ ابن عامر عامل بصرہ نے خراسان

اور ماوراء النہر کے فتوحات کی ابتدا کی۔ لیکن زیاد ابن ابیہ کے وقت تک ان حملوں کی اہمیت بڑھے چلنے پر تاخت و تاراج سے زیادہ نہ تھی۔ ۶۷۰ء میں فتوحات کا منصوبا بنایا گیا۔ طخارستان اور گرجستان فتح کر لیے گئے اور پرویز بن یزدجرد کو چین بھگا دیا گیا تھا۔ زیاد الحرث نے بحستان اور بلخ فتح کیا، اور کوہستان میں بھی ایک بھاری فتح حاصل کی۔ مرصفانیان زم امل اور نیز خوارزم پر حملے کیے گئے۔ غرض تین دفعہ ان ممالک میں باقاعدہ فتوحات حاصل کی گئیں اور خراسان میں پچاس ہزار کی ایک نوآبادی بھی بسائی گئی۔

بخارا اور صغد پر پہلا حملہ

۶۷۴ء میں عبداللہ ابن زیاد نے پہلے بکند پھر بخارا پر حملہ کیا۔ اور خراج پر بخارا سے صلح ہو گئی۔ ۶۷۶ء میں سعید بن عثمان نے صغدیوں کو شکست دی پچاس ضمان لیے اور نرشخ پر قبضہ کرتے ہوئے واپس ہوا۔ اس طرح پر صغد کے بعد صغانیان کو بھی فتح کیا گیا۔ جس سے ایک مستقل اور معقول منصوبے کا پتا چلتا ہے۔ ۶۷۹ء میں سلم بن زیاد نے ماوراء النہر پر حملہ کر کے سمرقند پر قبضہ کر لیا۔ اہل بخارا کی بغاوت بھی ہادی اور خاتون کو صلح کرنے اور خراج دینے پر مجبور کیا۔ عربوں کی یہ فتوحات حیرت ناک تھیں۔ ایک سبب اس کا مغربی ترکوں کا چین سے شکست کھا جانا اور اس علاقے کو ملحق کر لینے کے بعد تبت سے سخت جنگ میں مصروف ہو جانا بھی تھا جس کی وجہ سے صغدی شہزادے بے یار و مددگار رہے۔ اگر عہد فتنہ ۶۳ھ تا ۷۳ھ کی خانہ جنگی نہ ہوتی تو عرب ماوراء النہر کو بھی مثل خراسان کے بہت پہلے ہی فتح کر لیتے۔ عہد فتنہ کے بعد جب عربوں نے ان ممالک کو فتح کیا تو زیادہ مزاحمت نہ کی گئی۔ عہد فتنہ میں سالہا سال قبائلی لڑائیوں کی وجہ سے مقامی شہزادے خود مختار ہو گئے زیریں طخارستان عربوں کے قبضے سے نکل گیا۔ بلکہ خراسان پر حملے ہونے لگے۔ امیر بن عبداللہ بن خالد بن رشید کی نگرانی میں طخارستان پر برابر عربوں کا اقتدار قایم رہا۔ ترمذ پر مہلب بن ابی صفرہ حیرت ناک طور پر ۶۹۶ء میں خوارزم پر ایک کامیاب حملا کیا گیا۔ اسی اثنا میں کجر بن وشاح نے بغاوت کی۔ اس نے ایرانیوں کے خراج کی معافی کا لالچ دے کر نازک شکل پیدا کر دی تھی۔ ثابت بن قطبہ کی جو مشرقی خراسان کے موالیوں کا نمائندا تھا، وساطت سے حالت ایک حد تک قابو میں آ گئی۔ لیکن امیہ کے دوبارا خراج لگانے سے بے اطمینانی پھیل گئی۔ اس پر عبدالملک نے دیکھا کہ یہ آگ زیادہ تر قتیبہ کی لگائی ہوئی ہے۔ مہلب جیسے جنگجو کو والی خراسان کر دیا تاکہ ان کو بیرونی جنگوں پر لگائے رہے۔ ۹ سال تک کشمکش میں مقیم رہا۔ اور اطراف و جوانب میں تاخت و تاراج کراتا رہا۔ اس لیے کہ اس کا خیال مستقل قبضے کا نہ تھا۔

۷۰۲ء میں مہلب کا انتقال ہو گیا اور یزید جانشین ہوا یزید نے کوئی جنگ نہیں کی۔ فیصلی نزاعات کو بھی نہ سنبھال سکا۔ کیونکہ وہ بھلے طور پر اپنے قبیلے کا طرف دار تھا۔ سوالی بھی بدظن تھے۔ مہلب نے ثابت بن قطبہ کے بھائی کو ایک نافرمانی پر کوڑے لگوائے تھے اس سے سخت برافروختہ ہو کر یہ دونوں بھائی سوئی بن ماذنہ کے پاس آ گئے تھے۔ اور اپنے اثر سے طخارستان میں بغاوت پھیلائی۔ شاہ صحانیان اور باز فخش کے خیزک نے شرکت کی۔ بعض قیسی بھی شریک تھے اور قبر وزین یزدجرد کے طخارستان کو جانے سے ایرانی بھی شامل تھے۔ صغانیان سے یزید کے عامل نکالے گئے۔ باذغیس پر یزید کی فتح سے بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اور فیروز ابھی طخارستان میں تھا۔ خراسان کی اس حالت پر دمشق میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

حجاج نے دیکھا کہ جب تک یزید ہے عربوں میں اتفاق نہیں ہو سکتا۔ امر قضیا طلب۔ یہ تھا کہ اس کا جانشین کوئی ایسا شخص ہو جو قتیبوں کو پسند ہو اور زیادی اس کی وجہ سے باغی نہ ہو جائے۔ حجاج نے اس مشکل مسئلے کا حل قابل تعریف طور پر کیا۔ پہلے فضل یزید کے بھائی کو اس کا جانشین بنانے سے یزید کی وجہ سے جو خطرا تھا وہ جاتا رہا۔ پھر چند مہینوں بعد

قتیبہ کو تاراج کیا۔ قتیبہ نے عراق اور رے میں اپنے جوہر دکھلائے تھے۔ اس کی کوئی قبائلی جماعت نہ ہونے کی وجہ سے بھی وہ حجاج کا بڑی حد تک مطیع بن گیا تھا۔ اس اثنا میں فضل نے موسیٰ بن عازم کو قتل کروا کے ترمذ چھین لیا تھا اس لیے حجاج نے قتیبہ کو خراسان کا والی بنا دیا۔

فتوحات قتیبہ بن مسلم

ولید کے عہد حکمرانی میں وسط ایشیا کی بے مثال فتوحات اصل میں حجاج کی بے نظیر رہبری اور رہنمائی اور قتیبہ کی فوجی خداداد قابلیت کے باعث ہے۔ حجاج ہر نازک موقع پر قتیبہ کو ہدایات دیتا رہا اور اس خصوص میں حجاج نے قتیبہ کی بڑی تعریف کی ہے کہ وہ اس کی ہدایتوں پر پورا پورا عمل کرتا رہا۔ خراسان کے قیسی وازدی اور دیگر سرکردہ قبایل نے سمجھ لیا کہ قتیبہ کے پیچھے حجاج کی طاقت کام کر رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حجاج کی عزت اور عظمت ان لوگوں کے دلوں پر چھا گئی جس کے نتیجے کے طور پر سارے قبایلی جھگڑے بھلا دیے گئے تھے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قتیبہ کی فتوحات میں ایرانیوں کے اعتماد کو بھی بڑا دخل تھا۔ قتیبہ پہلا والی خراسان ہے جس نے اس کی قدر و قیمت سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی "تالیف قلوب" سے کام لے کر قتیبہ نے ایرانیوں کا اعتماد حاصل کیا تھا اور خود بھی ان پر پورا پورا بھروسا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایرانیوں کو سفارت جیسے اہم کام پر بھی بھیجتا تھا۔

خارجی حالات بھی قتیبہ کے حمد و معاون ثابت ہوئے شمالی اور مشرقی ترکستان چین سے آزاد ہو گیا تھا اور ۶۹۹ء سے ۷۱۱ء تک متواتر "طرحوں" سے جنگ میں مشغول رہا۔ جس کی وجہ سے صغد کو ترکستان سے کچھ مدد نہ مل سکی۔

قتیبہ کے ماوراالنہر پر سالانا حملے اعداد میں بارہ گنے جاتے ہیں۔ لیکن بلحاظ نتایج ان کو چار حصوں میں تقسیم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ۸۶ھ زیرین طخارستان کی فتح ثانی (پہلا حملا)
(۲) ۸۸ھ۔ فتح بخارا (دوسرا، تیسرا، چوتھا، اور پانچواں حملا)
(۳) ۹۱ھ تا ۹۳ھ۔ وادی جیحون میں عربی اقتدار کی تنظیم و تیسرا اور اس کا سغد پر پھیلنا (چھٹا۔ ساتواں، آٹھواں، نواں حملا)
(۴) ۹۴ھ تا ۹۶ھ۔ سیحون پر حملے۔

زیرین طخارستان

قتیبہ کا پہلا حملا یزید بن المہلب کے عہد کی بغاوت کو جو زیرین طخارستان میں پھیل گئی تھی فرو کرنے کی غرض سے ہوا تھا۔ قتیبہ سرو سے چل کر سروالرود اور طالقان سے ہوتے ہوئے بلخ پہنچا۔ بموجب ایک روایت کے بلخ بلا کسی حملے کے فتح ہو گیا بلکہ جب قتیبہ طالقان پر تھا تو وہاں بلخ کے اکابرین سے مل گئے تھے۔ بموجب ایک دوسری روایت کے بلخ میں ایک بغاوت ہوئی جس کو قتیبہ نے فرو کیا اس جنگ میں براکہ کی ایک عورت گرفتار ہوئی تھی۔ بلخ کی مہم میں قتیبہ نے ترمذ پر جیحون کو عبور کیا صغانیان کا بادشاہ (بیش الاطود) تحائف اس سے ملا۔ اور اپنے ملک کی کنجیاں جو سونے کی بیش قتیبہ کے حوالے کر کے وہاں آنے کی دعوت دی۔ وجہ یہ تھی کہ آخرون وشومان کے ہمسایا بادشاہوں نے اس کو تنگ کر رکھا تھا۔ اسی طرح بادشاہ کلکھان نے بھی ہدیے پیش کیے اور اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی قتیبہ صغانیان گیا۔ بادشاہ نے اطاعت قبول کر لی۔ یہاں سے قتیبہ نے آخرون وشومان پر جو بہ قول طبری طخارستان (یعنی بالائی طخارستان) میں تھے پیش قدمی کی۔ ان ممالک کے بادشاہ غیلسان نے ہدیے اور تحفے دے کر خراج پر صلح کر لی۔

اب قتیبہ خدمرو واپس ہوا۔ اور لشکر پر صالح بن مسلم کو سردار مقرر کیا۔ بہ قول بلاذری اور ابن اثیر صالح نے قتیبہ کی واپسی کے بعد کاشان، وارد شت کو جو مرغان میں تھے فتح کیا۔ اور مرغانا کے قدیم بادشاہ سے سخت اختیارات کو بھی منوا لیا

طبری میں کاشان کے حملے کا ذکر صاف طور پر نہیں ہے صرف اتنا لکھا ہے کہ قتیبہ کی واپسی کے بعد صالح نے "یاسار" فتح کیا جس کو لاطینی مؤرخین نے "کاشان" ہونے کا قیاس کیا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے نقشے کی توضیح میں تفصیل سے بحث کی ہے صالح کی یہ فتوحات شومان کے اطراف و جوانب ہی تک محدود تھیں۔

بلخ اور بالائی طخارستان کو اس طرح زیر کر لینے سے تیرک زیرین طخارستان میں اکیلا رہ گیا۔ اب قتیبہ نے سلیم کو سفیر بنا کر بھیجا اور تیرک آخر کار قتیبہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور طے پایا کہ بارمش میں دخل نہ ہوگا۔ اور تیرک قتیبہ کے ساتھ جنگ کرے گا اس طرح ہر ایک باعزت صلح ہوگئی۔ یہ دمر کے بیٹے کو جلیس و ایرانشاہ

فتح بخارا

فتح بخارا کے سلسلے میں قتیبہ نے ۹۰ھ تا ۹۳ھ یہ سلسل چار سال چار حملے کیے اور چھٹے سال کامیاب ہوا۔ اس سلسلے میں پہلا حملہ بکیند کے مقام پر ۹۰ھ میں ہوا۔ قتیبہ مرو سے نکل کر مرو الروذ آیا پھر آمل گیا اور پھر ذم پر پہنچ کر جیحون کو عبور کیا اور بکیند پہنچا۔ یہ بخارا کا جیحون سے قریب ترین شہر تھا اور یہاں بہت بڑی تجارت کی منڈی شاہراہ پر واقع تھی۔ ہم نے پہلے ہی بیان کر دیا ہے کہ بخارا کا بادشاہ نابائع تھا اور خاقان اس کا نائب تھا۔ گپ "ترکشنی" کے حوالے سے لکھتا ہے کہ یہاں امرا میں باہمی جنگ تھی اور طبری میں صغد سے امداد طلبی کا جو ذکر ہے اس کو گپ کہتا ہے کہ یہ سال آئندہ کا واقعہ ہے۔ لیکن اس کو بھی اس کا اقرار ہے کہ یہاں قتیبہ کے دو ہمسلے صرف ہوئے اور نہ ہی اس نے طبری کے اس قول کی تردید کی ہے کہ قتیبہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے خراسان سے اس کا رسل و رسائل منقطع ہو گیا۔ حجاج کو اس کی کچھ خبر نہ پہنچی اور اس نے مسجدوں میں دعائیں کرائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قتیبہ کو سخت مقابلا تو ہر حال کرنا ہی پڑا۔ مغنیوں سے مرعوب ہو کر اہل بکیند نے صلح چاہی۔ قتیبہ نے قبول کر لیا۔ بنو تغلبہ میں سے ایک کو وہاں عامل (رزیڈنٹ) چھوڑ کر واپس ہوا۔ وہ پانچ فرسخ ہی گیا تھا کہ اہل بکیند نے نقض عہد کیا اور عامل اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور اس کا فشلہ کیا۔ قتیبہ واپس ہوا اور پھر ایک مہینے کی سخت لڑائی کے بعد ان کو صلح چاہنے پر مجبور کیا۔ لیکن صلح قبول نہیں کی بلکہ لڑتا رہا۔ اور آخر میں شہر کو فتح کیا۔ تمام لڑنے والوں کو قتل کر دیا۔ بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔ مسلمانوں کو اس مال غنیمت سے جس کو قتیبہ نے فراخ دلی سے تقسیم کیا بہت تقویت حاصل ہوئی انہوں نے ہتھیار خریدے۔ اچھے گھوڑے لیے اور ظاہری ہیئت اور ساز و سامان درست کرنے کی طرف راغب ہوئے۔ یہاں تک کہ نیزے گراں ہو گئے کیونکہ صغدی نیزے بہت اچھے ہوتے تھے۔ حماسہ میں "ضع صفہ" کی تعریف مثل "منع دادو" کہی گئی ہے۔ نیزوں کی گرانی کی وجہ سے قتیبہ نے مرو واپس ہو کر حجاج سے اجازت لے کر اسلحہ خانے سے نیزے تقسیم کیے۔ گپ نے لکھا ہے کہ مال غنیمت میں ایک "اسلحہ خانا" بھی ہاتھ آیا تھا۔ حجاج کی اجازت سے اس کو مال غنیمت میں شریک نہیں کیا گیا۔ اور فوج کی آراستگی کے کام میں لایا گیا۔ لیکن یہ طبری کی عبارت کو غور سے نہ پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تقسیم مرو کو واپس آنے کے بعد یہاں کے اسلحہ خانوں سے کی گئی۔

اہل بکیند سے قتیبہ کے برتاؤ نے تیرک اور دیگر "دیسی شہزادوں" کو بتا دیا کہ اگر عربوں کی اطاعت کی جائے گی تو شائستہ برتاؤ ہوگا وگرنہ باغیانہ کوششوں کو تلوار سے دبایا جائے گا۔

غزل

آوارہ (عادل زادہ)

مجھے پھر یاد کوئی آ رہا ہے — دل مضطر جو ڈوبا جا رہا ہے
مسیر تھے کبھی لطف و مسرت — محبت میں گراب کیا رہا ہے
نشہ جوش مستی کا تصدق — ملک پر چاند بھی شرما رہا ہے
میری قسمت کا ہر خاکا ہے غم — بناتا ہوں بگڑتا جا رہا ہے
جسے آوارہ کہتا ہے زمانا
وہ جام چشم تر چھلکا رہا ہے

یو ایس

وائیٹ ہاؤس

امریکا کے پریسیڈنٹ کی سرکاری قیام گاہ وائیٹ ہاؤس کا دل چسپ حال

جس طرح ہندستان میں راشٹرپتی بھون ہندستان کے پریسیڈنٹ کی سرکاری قیام گاہ ہے اسی طرح امریکا کے پریسیڈنٹ کی قیام گاہ امریکا کا مشہور تاریخی محل وائیٹ ہاؤس ہے اس عمارت سے امریکا کی تاریخ کے اہم باب وابستا ہیں۔ ذیل میں اس کے متعلق کچھ دل چسپ حالات ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

۳۰ جنوری کو افتتاحی رسم کے بعد امریکا کے نئے صدر ڈوائیٹ ڈی ایسنہور نے امریکا کے پریسیڈنٹوں کی سرکاری قیام گاہ میں سکونت اختیار کرلی ہے امریکا کے دوسرے صدر جان ایڈمس نے ۱۸۰۰ء میں سب سے پہلے نیم مکمل وائٹ ہاؤس کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا۔

اس لحاظ سے مسٹر ایسنہور اب ۳۴ ویں صدر ہیں جو وائیٹ ہاؤس میں قیام کریں گے۔

اگرچہ وائیٹ ہاؤس امریکا کے پریسیڈنٹوں کی ہمیشہ قیام گاہ اور ان کے سرکاری دفتر کی جگہ رہا ہے تاہم یہ عمارت عوام کی ملکیت ہے اور اس مشہور عمارت میں قیام کے لیے امریکا کے لوگ ہی اپنے ووٹوں سے صدر کا انتخاب کرتے ہیں پچھلے انتخاب میں امریکا کے لوگوں نے ۶ کروڑ ووٹ ڈالے، جن میں سے ۳۰ کروڑ ۳۰ لاکھ ووٹ مسٹر ایسنہور کو ملے اور اس طرح کم سے کم چار برس کے لیے وائیٹ ہاؤس میں ان کا قیام یقینی بنا دیا۔

وائیٹ ہاؤس کی اندرونی مرمت

اگرچہ مسٹر جان ایڈمس کے وقت کی شکل وصورت میں نہیں بدلا ہے لیکن نئے صدر دیکھیں گے کہ پچھلے تین برس میں اس کی اندرونی صورت میں نئی نئی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور یہ عمل اس کی تاریخ میں سب سے پہلی بار کیا گیا ہے اس مرمت وغیرہ پر ۵ لاکھ ۲ ہزار ڈالر صرف ہوئے تھے اس کی مرمت کے انچارج انجینروں نے اس بات کو مدنظر رکھا کہ اس کی بیرونی شکل وصورت اور پرانے ڈھنگ پر ہی قایم رہے اور ویسا ہی نظر آئے۔ لیکن اندرونی طور پر اس کے کمروں کو پہلے سے ڈیڑھ گنا زیادہ کشادہ بنا لیا گیا۔

عمارت کی وسعت

وائیٹ ہاؤس ۷، ۱ ایکڑ زمین کے قطعے میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے ارد گرد کے باغ اور درخت بڑی بہار دکھاتے ہیں۔ اس کی تین منزلیں، دو تہ خانے اور دو فاتحہ کے لیے دو حصے ہیں۔ کمروں کی تعداد ۱۰۷ ہے جن میں سے ۳۱ خواب گاہیں ہیں۔ ۶ برآمدے۔ ۱۹ غسل خانے اور ۱۲ بیت الخلا ہیں۔

سابق صدر مسٹر ٹرومین نے وائیٹ ہاؤس کی عمارت میں خستگی اور لچکاؤ کے کچھ آثار دیکھے تو جنوری ۱۹۴۸ء میں ماہرین تعمیرات اور انجینروں کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ وہ عمارت کا پورا معائنا کریں ان کے معائنے کا نتیجا یہ نکلا کہ اس کے سارے اندرونی ڈھانچے کی نئے سر سے مکمل تعمیر عمل میں آئی۔

برطانوی حملے کے دنوں میں آتشزدگی

۲۴ اگست ۱۸۱۴ء

میں برطانوی حملے کے دنوں میں اس کے نذر آتش ہونے کے بعد ۱۸۱۷ء میں اس کی دوبارا تعمیر کے وقت سے اس عمارت میں پہلی بار اندرونی

تعمیر اور مرمت ہوئی ہے۔ اس عمارت کا اصلی نقشہ بنانے والے مسٹر جیمز ہوبن تھے۔

اس مرمت کے دوران میں اس کی شکستہ دیواریں دوبارہ بنائی گئیں۔ نئی چھت تعمیر کی گئی اور دیواروں کی حاشیہ آرائی کی گئی۔

جارج واشنگٹن کا مشورا

امریکا کے سب سے پہلے صدر جارج واشنگٹن نے ۱۷۹۱ء میں پریسیڈنٹ کی سرکاری قیام گاہ کی تعمیر کے لیے موزوں جگہ ڈھونڈنے میں مدد کی۔ اور اس مقصد کے لیے نوآباد شہر واشنگٹن کا دورا کیا۔ اس کے ابتدائی حالات میں بتایا گیا ہے کہ عمارت کو اونچی جگہ پر تعمیر کرنے کا فیصلا ہوا۔ جو پوٹ مک ریا سے دور نہ ہو اور جہاں سے "سرکاری دفاتر کی عمارت نیشنل کیپٹل" بھی نظر آئے۔

عمارت کا سنگ بنیاد

اس عمارت کا سنگ بنیاد اگرچہ ۱۳ اکتوبر ۱۷۹۲ء میں رکھا گیا تھا لیکن ۱۸۰۰ء تک اسے سکونت کے لیے تیار نہ کیا جا سکا۔ پھر بھی یہ عمارت ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوئی تھی اور جو لوگ اس میں پہلے پہلے آکر ٹھہرے انہیں بہت سی تکلیفوں کا سامنا رہا۔ یہاں تک کہ صدر جان ایڈمز کی بیوی کو بھی کہنا پڑا کہ اگرچہ یہ عمارت سکونت کے قابل بن گئی ہے لیکن اس میں ایک بھی کمرا اچھی طرح مکمل نہیں ہوا ہے۔

عمارت کی وجہ تسمیہ

یہ بات یقینی نہیں کہ ۱۸۱۷ء میں اس کی دوبارا تعمیر کے بعد اس پر جو رنگ روغن کیا گیا تھا اس کی وجہ سے یا اس کی تعمیر میں سفید پتھروں کے استعمال کے باعث اس کا نام وائیٹ ہوس پڑا ہے بہرحال ۱۹۰۲ء میں امریکا کے صدر تھیوڈور روزویلٹ کی حکومت کے دنوں میں سرکاری طور پر اس کا نام "وائیٹ ہاوس" مقرر ہو گیا اور اس وقت سے سرکاری کاغذوں میں اس کا ذکر اسی نام سے کیا جاتا ہے۔

مرمت اور تبدیلیاں

۱۸۱۷ء سے ۱۸۸۶ء تک وائیٹ ہوس میں معمولی فروعی تبدیلیاں ہوتی رہیں جو مختلف صدروں کی بیویوں کی ہدایت پر عمل میں آتی تھیں لیکن ۱۸۸۶ء میں جب صدر کلیولینڈ اور ان کی بیوی وائیٹ ہاوس سے باہر چلے گئے تھے تو اس میں بھاری ترمیم اور مرمت ہوئی۔

دفتروں کے لیے اضافا

۱۹۰۲ء میں امریکا کی کانگریس نے ایک رقم منظور کی تاکہ پریسیڈنٹ کے دفاتر کے لیے جگہ بنائی جائے اس کی وجہ سے وائیٹ ہاوس کی کنزرویٹری کا حصا جو عمارت کے مغرب میں تھا گرانا پڑا جہاں نئے کمرے بنائے گئے اور سرکاری دفاتر کے کمروں کو نئے سامان سے آراستا کیا گیا۔

۱۹۲۰ء میں وائیٹ ہاوس کی مرمت ہوئی اور اسے نئی شکل دی گئی۔ بالائی حصے پر چھت کو تبدیل کر کے بغیر تیسری منزل بنائی گئی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء میں جنگ کی وجہ سے جگہ کی کمی محسوس ہونے لگی اور مشرقی سرے کی طرف ایک اور حصا تعمیر کیا گیا تاکہ مہمانوں کے قیام اور ان کی خاطر مدارات کے لیے جگہ بن نکل آئے۔

پابندی

دوسری عالمی جنگ میں پہلی منزل کے کمرے مہمانوں کے لیے بند کیے گئے تھے۔ لیکن امریکا کی خانہ جنگی کے دنوں میں جب لنکن ۱۸۶۵ - ۱۸۶۱ء تک امریکا کے صدر رہتے یہ کمرے عوام کے لیے بند نہیں تھے اور لوگ "وائیٹ ہاوس" کے اصلی مالکوں کی حیثیت سے اس کی سیر کرتے اور آتے جاتے رہتے۔ لنکن کے قتل اور ان کے بعد کے صدروں کو قتل کیے جانے کی کوششوں سیاحوں کا اچھی طرح جایزا لیا جانے لگا اور اس کی سیر کے وقفات مقرر کیے گئے۔

آج کل اتوار، سوموار اور عام تعطیل کے دنوں کو چھوڑ کر، دس بجے صبح کو اس کے صرف چند کمرے سیاح دیکھ سکتے ہیں۔

باقی آنے جانے والے یا تو وائیٹ ہاوس میں ملازم ہیں یا کسی سرکاری کام یا پہلے سے مقرر کی ہوئی ملاقات وغیرا

کے لیے آسکتے ہیں۔

لنکن کا کمرا

دوسری اور تیسری منزل سیاحوں کے لیے بند ہے۔ دوسری منزل میں پریسیڈنٹ کی خانگی، مطالعے کا کمرا اٹھنے بیٹھنے اور معزز مہمانوں کی اوبھگت کے لیے کمرے مخصوص ہیں۔

اسی منزل میں امریکا کے خانہ جنگی کے وقت کے صدر ابراہیم لنکن کا وہ مشہور تاریخی کمرا ہے جہاں حال ہی میں اس کا ۷ فٹ لمبا پلنگ دوبارا بچھا دیا گیا ہے۔

لنکن اسی کمرے کو مطالعے کے لیے استعمال کرتا تھا اور اسی کمرے میں غلامی کو ختم کرنے والے اعلان پر لنکن نے دستخط کی تھی

پرانی یادگاری چیزیں

وائیٹ ہاوس میں پرانے فرنیچر میں سے صدر لنکن کا پلنگ بھی پرانی تاریخی یادگاری چیزوں میں سے ایک ہے۔ سنر کمرے میں کانسی کا ایک (کلاک) دیواری گھڑی اب بھی استعمال ہو رہی ہے۔

اس میں HANNIBAL کی تصویر بنی ہوئی ہے یہ گھڑی صدر منرو نے فرانس میں خریدی تھی۔

اس عمارت کے فرنیچر میں انگریزی، فرانسیسی اور امریکا کے ابتدائی طرز کی چیزیں پائی جاتی ہیں چینی کمرے میں کوئی تین سو۔ چینی، چاندی شیشے کے برتن سامان، اور متفرق چیزیں رکھی ہوئی ہیں جو تاریخی اہمیت رکھتی ہیں، اور جو سابق صدور کی ملکیت تھیں۔

جائیداد کے لحاظ سے وائیٹ ہاوس کی قیمت ۲ کروڑ ڈالر ہے یا تقریباً ۶۰ کروڑ روپے ہے لیکن امریکا کے لوگوں کے لیے یہ عمارت لڑائی پتھروں اور فولاد کے ڈھانچے سے نہایت زیادہ اہمیتی اور اہم ہے۔ وائیٹ ہاوس امریکا کی آزادی اور خودمختاری کا مظہر ہے۔

جواب کے لیے بھیجا جوابی خط بھیجے ورنہ جواب نہ دیا جائیگا

خفایق ومعارف

اک جھلک ان کے روے روشن کی
آج تک آبرو ہے ایمن کی
مئے کی حاجت نہ سیر گلشن کی
مستیاں فطرتی ہیں ساون کی
اف یہ کالی گھٹائیں ساون کی
اور وہ زینت ہوں نرم دشمن کی
درد دل کو کوئی دیکھ سکتا ہے
تم تو کرتے ہو خند لڑکپن کی
میری بربادیوں کا افسانہ
بے کسی کہہ رہی ہے مدفن کی
بن گیا آشیاں قفس خدری
ہم کو یاد آئی جیب نشیمن کی
کیا کریں گے وہ قتل مجھکو بھلا
اٹھ چکی ان سے تیغ آہن کی
موت کی چھا رہی ہے بیہوشی
اب ضرورت ہے ان کے دامن کی
میں قفس میں ہوں اور گلشن میں
ڈھونڈتی ہے خاک میرے نشیمن کی
چین سے مرنے والا سوتا ہے
خاک اڑاتا ہے کوئی مدفن کی
بدلیں سو کروٹیں زمانے نے
جب صدا گونجی میرے شیون کی
جب وہ جان بہار یاس نہ ہو
کیا امنگیں ہوں دل میں ساون کی
خشک گل سبز اشک شمع خموش
کوئی دیکھے بہار مدفن کی
خون روتا تھا خنجر قاتل
جب گلے کٹ رہی تھیں گردن کی
آشیاں میرا کیا جلا افسوس
بات ہی وہ رہی نہ گلشن کی
افسر موہانی وارثی

دلدل

عصمت آپا عصمت

اس نے اپنی کلائی پر بندی ہوئی حسین سی گھڑی دیکھی "ساڑھے پانچ — اوہ ٹو پچ ٹائم" اور دھیرے دھیرے سنگار ریسٹر کے سامنے جاکر اپنے بچھے دار بالوں پر برش پھیرنے لگی۔ دستک ہوئی "کم اِن" وہ بھنکی۔

مسٹر اکرم اندر داخل ہوتے ہی پھوٹ پڑے "ہیلو سوفی! ارے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ تمہیں شاید یاد نہیں آج اتوار ہے۔ ہمیں آج شو دیکھنے چلنا ہے۔"

"اوہ ویری سوری۔ مسٹر اکرم میں آج نہ جا سکوں گی میرا آج ریڈیو پر پروگرام ہے اور واپسی پر شوٹنگ کے لیے بھی جانا ہے"

مسٹر اکرم کا موڈ اُتر گیا "سوفیٹ سوفی تمہاری یہی باتیں مجھے پسند نہیں میں جب بھی تم سے کچھ کہتا ہوں تم ادھر اُدھر میں ٹال جاتی ہو۔۔۔۔"

"نہ نہ یہ بات نہیں مسٹر اکرم" سوفی نے مسٹر اکرم کی بات کاٹ دی "یہ تو محض اتفاق ہے"

"تو کل چلو"

"وعدا نہیں کرتی، شاید کل بھی شوٹنگ ہو۔ اور مسٹر اکرم جانے کے لیے پلٹے تو ان کی بڑی ہی نرم آواز ابھری "بیٹھیے گا نہیں۔ کم سے کم شام کی چائے تو پیتے جائیے — میں نے بھی اب تک چائے نہیں پی ہے" اور مسٹر اکرم نہایت بے دلی سے گوندے ہوئے آٹے کے موندے کی طرح صوفے میں دھنس کر فرش پر بچھی ہوئی ایرانی قالین کے نرم بالوں کو گاہوں سے ٹٹولنے لگے۔

چائے پیتے وقت دونوں طرف خاموشی چھائی رہی سوفی سوچ رہی تھی کہ یہ شخص بھی عجیب احمق ہے کہ گھر میں جان چھڑکنے والی بیوی اور پھول جیسے بچوں کو چھوڑ کر جب دیکھو یہاں گھسا رہتا ہے چائے ختم ہوتے ہی وہ نہایت خامشی سے میز سے اٹھ کھڑی ہوئی ملازم سے ٹیکسی لانے کو کہا، اور مسٹر اکرم کو رخصت کر کے ریڈیو اسٹیشن چلنے کی تیاری کرنے لگی نہ جانے کیوں اسے رہ رہ کر آج کی سرد مہری کا خیال آرہا تھا جو اس نے مسٹر اکرم سے برتی تھی۔ کیونکہ اس کا پیشا تو اسے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ دکھاوے کی محبت — اسے جھوٹا پیار کرنے کی ہی تعلیم ملی تھی زندگی کے اس تھوڑے سے سفر میں اسے ہر مرحلے پر جیسے بات ٹکی ہوئی نظر آئی تھی "آج کی زندگی دکھاوا ہے — محض دکھاوا" اور بھاگتی ہوئی ٹیکسی کی گدی میں دھنسی وہ سوچنے لگی "سچ مچ آج کی زندگی دکھاوا ہی تو ہے — ان اونچی اونچی حسین عمارتوں کے پیچھے جانے کتنی ہی زندگیاں، گندگی کے کیڑوں کی طرح کلبلا رہی ہیں۔ کتنے ہی آنسو بہل رہے ہیں مگر کس کمال خوبصورتی سے انہیں سلک، وجارجیٹ کی ساڑیوں گیبرڈین اور ڈوسٹرڈ کے سوٹوں — ریڈیو کی تانوں اور بلند بانگ قہقہوں میں چھپا دیا گیا ہے — ڈھک دیا گیا ہے۔"

اور دوڑتی ہوئی ٹیکسی جب ایک طرف کو مڑی تو وہ بھی اسی طرف کو تھرے ڈھلک گئی اس لمحے نے اس کے دماغ کو جھنجھلا دیا۔ اس کے خیالات کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر مل گیا وہ سوچنے لگی جیسے اس نے زندگی کا اتنا بڑا سفر صرف ٹیکسی ہی میں طے کیا ہو کہ جب بھی کہیں موڑ آیا ہے وہ ادھر کو ہی ڈھلک گئی ہے اسے ادھر کو ہی ڈھلک جانا پڑا ہے جدھر کو ٹیکسی گھومی ہے — ماضی کی یاد اس کے دماغ میں الجھی ہوئی سوت کی انٹی کی طرح ٹھنی ہوئی تھی جسے فرصت اور تنہائی میں بیٹھ کر

وہ سلجھاتی رہتی۔ گویا لے دے کے اس کے یہی مشاغل رہ گئے تھے ناچنا ــــ گانا ــــ لوگوں کو نچانا اور اپنی ماضی کی یاد سے دل بہلانا پچھلے دنوں تو وہ ایک عورت نہیں کرکٹ کی گیند بن کر رہ گئی تھی جب بھی وہ بلے سے ٹکرا کر تیزی سے بھاگتی تو کسی کے ہات میں ہوتی پھر زور سے پھینکی جاتی بلے سے سرمار کر بھاگتی اور پھر پکڑ لی جاتی ــــ اور اس گرد غبار نے اسے وہاں پہنچا دیا جہاں سے کھڑے ہو کر دیکھنے پر دنیا بڑی بھیانک نظر آتی ہے مگر بالکل قریب ہوتے ہوئے بھی دنیا سے بہت دور تھی ــــ اس کی موجودہ زندگی نے اس کے اور اس دنیا کے بیچ ایک وسیع دل دل حایل کر دیا تھا جسے عبور کرنا اسے اپنے بس کا روگ نظر نہ آتا تھا۔ اور اب تو اس نے ہتیار ڈال دیے تھے تگ و دو تک ترک کر دی تھی۔

اس سے پہلے اس نے کئی بار جھٹ سے اپنی ہستی کو نیچے گرا کر چکنا چور کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ یہ بات نہیں کہ اسے دنیا سے بڑی محبت تھی بلکہ وہ اپنے پیچھے "بزدل" کا خطاب نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ کئی بار ایسا کرنے کے باوجود وہ آج تک اسی چھت کے نیچے سانس لے رہی تھی۔

اپنا بھانجی اسے حرف بہ حرف یاد تھا اور اکثر اپنے ملنے والوں کے سامنے ایک ہونہار بچے کی طرح اس نے اپنا یہ اسوختا دہرایا بھی تھا اور سب سے آخر میں مسٹر اکرم کی زبان بند کر کہ "تم کہانیاں تو اچھی کہہ لیتی ہو" اس کے جی میں آئی تھی کہ مسٹر اکرم کو زور سے اپنے کمرے کے باہر ڈھکیل دے تاکہ سیڑھیوں پر سے لڑکتا ہوا جب وہ نیچے جا گرے تو اس کا مغز تک باہر آ جائے مگر اسی وقت اس کی نگاہ مسٹر اکرم کی جیب پر پڑ گئی جس میں سو سو روپے کے نوٹ جھانک رہے تھے اور وہ اپنا غصا پیتے ہوئے طنز بول اٹھی "جی یہ سب آپ لوگوں کی ہی ذرہ نوازی ہے"

شوٹنگ کے دوران میں کئی بار نئے ہیرو مسٹر کنور نے جب اسے کئی بار للچائی ہوئی اور بھوکی نگاہوں سے گھورا تو اچانک اس کے غصے کا پارا اونچا ہو گیا نہ جانے کیوں اسے اس ماحول کی ہر چیز کو دیکھ کر غصا آنے لگا ــــ شدید غصا۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگا اور تو ٹنگ ملتوی ہو گئی وہ اپنے پلنگ پر لیٹی اپنے غصے کے مطابق غور کر رہی تھی ــــ اور ماضی کے کہرے میں چھپی ڈھلی ایک لگاؤ اس کے دماغ کی سطح پر لہراتی ہوئی غصا اور نفرت کے جذبے کو دوچند کیے دے رہی تھی۔

ایک لگاؤ ــــ جس نے اسے ایک عمارت کی تیسری منزل کے نیچے پٹخ دیا۔ اتنی دور سے کہ وہ لڑکتی ہوئی گناہ کے کیچڑ میں دھنس گئی ــــ دھنستی چلی گئی۔

اس کے دماغ کی سطح پر وہ آبو ختا جسے کئی بار دہرا کئی لوگوں کے سامنے دہرا چکی تھی زور لگانے لگا۔ کالج میں فسٹ ایر میں داخلہ لیے ابھی بہت تھوڑا عرصا ہوا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ کئی لڑکوں اور پروفیسروں کی مرکز نگاہ بن گئی ہے ــــ حسن میں پروفیسر محسن نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا رکھتا تھا۔ وجیہہ اور تنومند پروفیسر کی محبت پاکر وہ پھولی نہ سمائی اور محسن کے ایک ماہ کی چھٹی لینے کی خبر سن کر تو وہ عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ جیسے پروفیسر ہی اس پوری کالج میں اس کا واحد شناسا تھا اور بقیا سارے لڑکے اور لڑکیاں اس کے لیے اجنبی تھیں۔ قطعی اجنبی۔

ایک دن محسن اچانک سے رستے میں مل گیا تو وہ مارے خوشی کے اچھل پڑی۔

اور پروفیسر کی چاے کی دعوت قبول کر کے اس نے بڑی فرحت محسوس کی ــــ اس نے رات کا کھانا بھی پروفیسر کے ساتھ کھایا اور جب گھر لوٹی تو اپنا جو ہر کھو چکی تھی۔ مگر خوش تھی ــــ اس کا بات اپنی بن ماں کی بچی کو بھائی بھائی کرتی بڑی کوٹھی میں خوش نہ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا اور اچانک اپنی چہیتی بیٹی کے کھلے ہوئے ہونٹ دیکھ کر تو چیخ پڑ

اس کا دل بھی کھل اٹھا اور اسے یہ گمان بھی نہ ہو سکا کہ یہ وقتی مسکراہٹ بڑے خسارے کا سودا ثابت ہوگی اور چند لمحوں کی مسکراہٹ بخشنے والے پروفیسر کی محبت جب اس کی بیٹی کے شکم میں پروان چڑھنے لگی تو اس کے پھولتے ہوئے پیٹ کے ساتھ اس کے باپ کے ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے اور اس نے اپنے چند معتبر آدمیوں کے ساتھ اپنی بیٹی کو شہر سے کہیں دور بھیج دینے ہی میں عافیت جانی اور اس خبر پر کے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی اس کی بیٹی گاڑی سے لاپتا ہوگئی تھی تو اس نے اور اپنے ملازموں کا سر پیٹتے پیٹتے لہولہان کر دیا تھا۔

وہ گاڑی سے اتر کر سیدھی پروفیسر کے پاس آئی پروفیسر کے کمرے سے کسی دوسری کالج کی لڑکی کی آواز آ رہی تھی۔

اور پروفیسر کی مقناطیسی نگاہوں سے ایک نفرت ہوگئی اس نے اپنی زندگی کے لالازاروں میں پہنچنے کے لیے خشک آبلہ امیدوں کا جو پل باندھا تھا وہ ٹوٹ کر گر پڑا۔ مگر اس کی روح اب تک ناپاک نہ ہوئی تھی۔ وہ اپنی بچی کچی عزت آبرو کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ اپنی علمی استطاعت کے مطابق اس نے استانی گیری کرنا چاہی مگر اس راہ میں بھی چندنگاہوں نے اس کا تعقب کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی بچی کچی عصمت کی پوٹلی دبائے بھاگی۔ مگر ہر موڑ پر جب اس نے پلٹ کر دیکھا لپلپاتی ہوئی نگاہیں اس کے بالکل قریب تھیں اس نے ستیا ناس ہے یا ناس کہہ کر بیٹھ گئی کتنے ہی ہلوں کو خس کیا کتنے ہی لوگوں کی گود میں کھیلی اور ایک فلم پروڈیوسر نے خوش ہو کر اسے اپنی فلم میں کام کرنے کی دعوت دی اور وہاں بھی وہ ڈائریکٹر سے لے کر سائیڈ ہیرو تک کی گودوں سے کھیلتے دیگرے پھسلتی ہوئی اپنی نئی فلم کے رنگین پوسٹر میں چمک گئی۔ یہ تھا اس کی زندگی کا آموختہ اور آج بھی جب اسی قسم کی ایک نگاہ نے پھر اس کا تعقب کیا۔ جس نے اس کی زندگی کو اس دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے اور دنیا کے مابین ایک وسیع خلیج حائل کر دیا تھا تو تیز ارادی طور پر غصے کی شدت سے وہ کانپنے لگی وہ قطعی بھول گئی کہ وہ کیا ہے ٹیکسی بھاگی جا رہی تھی۔ وہ سوچے جا رہی تھی "آج اسے ریڈیو اسٹیشن سے فراغت پاتے ہی بقیا سٹوڈنگ مکمل کرنی ہے۔ پھر بیٹھے ہوئے اسے یاد آگیا تھا وہ کیا ہے"

ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی "ریڈیو اسٹیشن ——

میم صاب" ڈرائیور نے اسے چونکا دیا۔

ٹیکسی کا کرایا ادا کر کے وہ کھٹ کھٹ کرتی ریڈیو اسٹیشن کی بلند ٹانگ میں جگمگاتے ہوئے بلب کی روشنی کو چیرتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

زندگی

—— وحشی (بریلوی)

زیست بھلو نہیں ہے جب وہ جان زندگی
زندگی کا ہر نفس ہے نوحہ خوان زندگی
آشنا بھی غیر بھی سب ہے مگر دیکھا کیے
موت نے لوٹا ہے جس دم بوستان زندگی
ہر نگاہ ناز جس کی موت کا پیغام ہو
کیا سنائے کوئی اس کو داستان زندگی
سٹ گیا جب دل ہی تو پھر آرزوئے دل کہاں
اک وہی لے دے کے تھا روح رواں زندگی
دیدنی تھا یہ تماشا بھی زمانے کے لیے
لٹ گیا منزل پہ آکر کارواں زندگی
نفس موج فنا کی یہ تلاطم خیزیاں
ڈگمگاتا جا رہا ہے بادباں زندگی
تھک گئے چلتے چلتے آتے آتے قبر تک اہل عدم
اب قیامت ہی پہ ٹھہرے گی شتابان زندگی
بحر ہستی کچھ نہیں جز حلقۂ موج سراب
اک طلسم رنگ و بو ہے گلستان زندگی
کوئی محو خواب راحت کوئی سرگرم فغاں
اک وہ شان زندگی ہے اک یہ شان زندگی
عمر بھر کی کوششیں انجام میں یوں مضمحل
ایک بھولی سی حسیں گردے داستان زندگی
کس قدر بھی ہو کھائی اپنے وحشی سے نہیں
موت پر بھی اس کی ہے ان کو گمان زندگی

کارل مارکس

میرزا ہادی علی شاد

آج جبکہ دنیا کی دو تہائی آبادی اشتراکی حکومت کے زیر نگیں ہے اور اس سے بھی زیادہ متاثر تو قدرتی طور پر اشتراکی فلسفے (COMMUNISM) یا (MARXISM) اور اس کے فلسفی کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے کہ آخر وہ کیسا مفکر تھا جس نے اپنے فلسفے کے ذریعے دنیا کی بیشتر آبادی کو اپنا مقلد بنا دیا اس مضمون میں براہ راست اس کے فلسفے پر نقد و تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے سیاسی اور معاشی رجحانات کی مختصر سی نشاندہی کرنی ہے۔ کسی اور موقع پر اس کے فلسفے پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ اس اشتراکی فلسفے کا بانی کارل مارکس (KARLMARX) ہے۔ یہ پرائن لینڈ (جرمنی) کے شہر ٹرائر (TRIER) میں ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا اگرچہ اس کا خاندان برائے نام حلقہ بگوش عیسائیت ہو چکا تھا۔ لیکن خاص کر اس کی طبیعت کے رجحانات عیسائیت کے خلاف واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین نے اسے یہودی نسل شمار کیا ہے۔ بچپن ہی سے ماحول کے اثرات کو خاطر میں نہ لانا اس کی ایسی فطرت کو ظاہر کرتا ہے جو عام طور پر وقت کے دھارے کو پلٹ دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آزاد خیالی کی بے باکی اور مجرد عقل کی پیروی اس کی فطرت تھی۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر اس کی نظر مادیت سے ہٹ کر عینیت اور روحانیت کی طرف نہ جا سکی۔ اس نے کائنات سے لے کر پوری انسانی تاریخ تک کو مادیت کے رنگ میں رنگ دیا تھا اس کا خیال تھا کہ اس کارخانہ کائنات کا کوئی کارخانہ دار نہیں یہ آپ سے آپ چند مادی تھالیس کے امتزاج سے وجود میں آگیا ہے۔ اور تاریخ انسانی کے انقلابات خیر و شر کا نہیں بلکہ معاشی بحران کا نتیجہ ہیں۔ برن کی یونیورسٹی میں اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ تاریخ قانون اور فلسفے میں اس کا رجحان اور مضامین سے زیادہ رہا اس کے بنیادی نظریات اس کے ہم عصر اور قبل کے معلمین کے رہین منت ہیں۔ جس میں معاشیات کے اصول اس نے انگلستان کے ریکارڈو (RECARDO) اور آدم اسمتھ (ADAM SMITH) سے اخذ کیے۔ سیاسی تصورات فرانس کے والٹر (VOLTAIRE) اور روسو (ROUSSEAU) سے قبول کیے اور فلسفیانہ تغیرات کے لیے جرمن کے مشہور فلسفی ہیگل (HEGAL) کے نظریات سے استفادہ کیا۔ مگر ہیگل کے فلسفے سے پوری طرح مستفید ہونا یہ اپنے حق میں جائز نہیں سمجھتا تھا۔ ہیگل عینیت اور مادیت دونوں کا قایل تھا۔ لیکن مارکس نے اس کے نظریۂ مادیت (MATERIALISTIC THEORY) کو اپنایا اور پھر اس کی تعبیرات (INTERPRETATIONS) میں اپنی آزاد خیالی اور جدت طبع سے وہ تبسیر کی۔ کہ ہیگل کے مقلدین کو بھی حیرت ہونے لگی۔ یوں تو مارکس اپنی اشتراکیت کو جہاں تک تعبیر تاریخ کا تعلق ہے ہیگل کے فلسفے سے مستعار بتلاتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہیگل کے فلسفے کی ہیئت ترکیبی ہی کو اس نے سرے سے بول کر اس میں اپنی طبیعت کی بعض چیزیں لے لی تھیں ہیگل کے نزدیک جہان جدلی عمل (DIALECTICAL PROCESS) تھا وہاں اس کے ذہن میں ایک تصور مطلق (ABSOLUTE IDEA) بھی تھا جو ذات باری کی قادریت کا اعتراف تھا مگر مارکس چونکہ محض مادی ذرائع سے انقلاب لانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے صرف "جدلی عمل" کو مستعار لیا اور "تصور مطلق" کی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ رسمی تعلیم ختم کرنے کے بعد صحافت جیسی پر خطر وادی میں اس نے قدم رکھا۔ کلب سے پہلے ایک مقامی اخبار (RHENISCHI ZICTING) کے مدیران میں شامل ہو کر اپنے انقلابی خیالات کی خوب جولانیاں دکھلائیں۔ ۱۸۴۱ء جس کے

نتیجے میں حکومت وقت نے ۱۸۴۳ء میں یہ اخبار بند کر دینا پڑا۔ اس کے بعد بھی اس نے کئی بار کوشش کی کہ اپنے اشتراکی خیالات کے اظہار کے لیے کسی اخبار یا رسالے سے منسلک ہو جائے مگر اس میں ناکام رہا۔ اور جیورگ ۱۸۴۴ء کے وسط میں پیرس چلا گیا جس کو اپنے وطن کے مقابلے میں اشتراکی تبلیغ کے لیے زیادہ ہموار پایا۔ پیرس کے کسی جرمن رسالے میں اس نے کئی مضامین لکھے جس کا اسلوب بیان وہاں کی آبادی کے لیے ایک انقلاب پرور تحریک کا پتا دیتا تھا۔ اس کے بعد ایک ورسالا (VORMOOTS) میں بھی اس نے انقلابی مضامین لکھے جس کے ردعمل میں وہاں کی حکومت نے اس کو فرانس چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پیرس ہی کے دوران قیام میں اس کو ایک ایسا مخلص رفیق مل گیا تھا جس نے آگے چل کر اشتراکیت کی ایسی سرگرم تبلیغ کی جس سے اشتراکیت صحیح معنی میں برگ و بار لانے کے قابل بن گئی۔ اس کا یہ رفیق فریڈرک اینجلز (FREIDRIC ENJELS) ہے جو پہلے ہی سے اشتراکی رجحان رکھتا تھا اس سے قبل رابرٹ روئن (ROBERT OAIN) سے یہ کافی متاثر معلوم ہوتا ہے جو خود بھی اشتراکی فلسفے کا مقلد تھا مگر مارکس کی رفاقت سے قبل انجلز انقلابی اشتراکیت (COMMUNISM) کا قایل نہ تھا بلکہ وہ جمہوری طریق پر اشتراکیت کی تبلیغ کرنا چاہتا تھا) اشتمالیت (SOCIALISM) مارکس کی عملی زندگی دراصل پیرس سے روانہ (BRUSSELS) آنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس نے یہاں اگرچہ کچھ عرصے تو یوں ہی پرودھوں پر جو انارکزم (ANARCHISM) کا مبلغ تھا۔ کافی تنقیدیں کیں مگر بعد میں صحیح راہ عمل سے نظر آگئی اور اس نے انجلز کی ہمراہی و اعانت سے جرمن مزدوروں کی ایک خفیہ اشتراکی تحریک کو جو "انجمن ابن لیبنہ" (LEAGUE OF PEACE) کے نام سے منسوب تھی۔ اشتراکیوں کی انجمن (LEAGUE OF COMMUNISTS) کے نام سے بدل دیا اور اس کی شاخیں پیرس، لندن اور سوئٹزر کے اطراف و جوانب میں پھیلا دیں۔ اشتراکیوں کی انجمن ہی وہ پہلی انجمن ہے جس نے باقاعدہ بلند پیمانے پر متعارف کروایا۔ مارکس نے اس دوران میں اپنی معرکہ آرا تصنیف "منشور اشتراکیت" (COMMUNIST MANIFESTO) کی ترتیب شروع کر دی تھی۔ (فروری ۱۸۴۸ء) مارکس کی بدنصیبی کہیے یا حسن نصیبی کہ یکایک فرانس میں ایک انقلاب کا لاوا پھٹ پڑا اور اس کی باقی ماندہ زندگی کو گم نامی عسرت اور پریشانی سے دوچار کر دیا۔ گرحسن نصیبی اس لحاظ سے ہوئی کہ جس اشتراکی انقلاب کو برپا کرنے کی جدوجہد میں یہ لگا ہوا تھا اس کے لیے فرانس کے اس انقلاب نے کسی قدر راستہ ہموار کر دیا۔ اسی انقلاب میں بروسیلز (بیلجیم) سے یہ جلاوطن کر دیا گیا اس لیے مجبوراً سے کولون (COLOGNE) جرمنی میں پناہ لینی پڑی مگر یہاں بھی اسے چین نہ ملا۔ اس پر مقدمہ چلا اور یہ بھاگ کر پیرس چلا آیا آخر کار یہاں سے بھی نکالا گیا تب اس نے لندن کی راہ لی اور وہیں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گیا لندن میں یوں تو اسے اور طرح کا سکون رہا مگر اس کی اپنی معاشی حالت کافی ناگفتہ بہ ہو گئی۔ تھوڑے بہت رضامین لکھ کر کچھ پیسے کما لیتا مگر یہ اس کی گذر اوقات کے لیے ناکافی ثابت ہوتے۔ انجلز اس سلسلے میں اکثر و بیشتر اس کی امداد کرتا تھا۔ لندن میں اس کا مشغلہ خالص علمی اور تحقیقی رہا۔ انقلاب انگیز اور انتہا پسند خیالات کی پاداش میں اسے کافی صعوبتیں اٹھانی پڑی تھیں مگر اس کے باوجود مزدوروں کے لیے اپنے طور پر اس نے بہت کچھ کیا۔ مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی (FIRST INTERNATIONAL) جو ۱۸۶۴ء میں قایم ہوئی تھی۔ یہ اس کا روح رواں شمار کیا جاتا تھا اس طرح تقریباً زندگی کے ۳۴ سال لندن میں گذار کر یہ اپنے پیچھے اشتراکیت کا فلسفہ چھوڑ گیا۔

اس کا انتقال ۱۸۸۳ء میں ہوا تھا۔ مارکس نے تقریباً ۳۴ سال سے زیادہ عرصے تک اشتراکیت کے نظام کو برپا کرنے اور اس کے اصول و مبادی کو ایک منشور کی شکل میں مستقل کرنے میں صرف کر دیے۔ اپنی زندگی میں اشتراکیت نے نظام کو تو برپا نہ کر سکا۔ البتہ اشتراکیت کو ایک منشور کی شکل میں پیش کر دیا۔ تصانیف: اس نے اپنی زندگی میں کل تین کتابیں تصنیف کیں

اشتراکی منشور (COMMUNIST MANIFESTO) نظام معیشت پر تنقید (CRITIQUE OF POLITICAL ECONOMY) اور سرمایا (DAS KAPITAL)، ان تینوں میں اشتراکی منشور ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اشتراکیت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ طبقاتی جنگ (CLASS WAR) ارتقائے جدلیں (DIALECTICAL EVOLUTION) قومی ملکیت (NATIONALISATION) مذہب پر تنقید بورژوا (BOURGEOIS) یعنی سرمایا دار اور پرولتاریا (PROLITARIAT) یعنی محنت کش عوام سب ہی پر اس میں بحث کی گئی ہے۔ مگر بحث کا اسلوب بیان علمی (SCIENTIFIC) ہونے کی بجائے جذباتی اور تبلیغی ہے۔ اشتراکیت سے متعلق جو باتیں اس میں کہی گئی ہیں۔ وہ ہر چند نئی نہیں مگر مزدوروں اور محنت کش طبقا (پرولتاریا) کی حمایت میں جو تاریخی فلسفا پیش کیا گیا ہے وہ البتا نیا ضرور ہے یعنی اسے دنیا کے تمام انقلابات کو بورژوا اور پرولتاریا کی باہمی کش مکش کا نتیجا بتایا ہے۔ مارکس سے قبل ایک فرانسیسی مفکر وکٹر پرسپر کوسیڈرنٹ (VICTOR PROSPER COUSIDURANT) کا منشور جمہوریت (MANIFESTO de la DEMOCRACY) بھی اشتراکیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ تنقید و بحث کے علاوا اس کتاب میں بعض لائحہ عمل (PROGRAMME) بھی ملتے ہیں مثلاً انفرادی ملکیت کو ختم کر کے قومی ملکیت کے اصول پر نظام معیشت کی ترویج نظام وراثت جو انفرادی ملکیت کی سب سے بڑی نشانی ہے اس کو قطعی طور پر منسوخ کرنا ذرایع نقل و حمل اور ملکی تجارت کا لین دین حکومت کے توسط اور قومی بنک کے ذریعے ہونا۔ قومی کارخانوں کے آلات کا اور زرعی منصوبہ بندی اور اس کے توزو فلاح کے تمام ذرایع حکومت کے اختیار میں ہونا ملک کی کل آبادی کو ایک مجوزہ اشتراکی پروگرام کے مطابق کام کرنا اور سکول کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمے دار ملک کا قومی و فنڈ

دوسری کتاب "نظام معیشت" پر تنقید میں سرمایا دارانا نظام کا تجزیا اور اس سے متعلق تنقیمہے۔ سرمایا داری کے تمام گوشوں پر محاکمہ کر کے اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ نظام سرمایا داری ایک ایسا نظام ہے جو عوام کے لیے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا بلکہ وہ یہاں تک کہہ گذرا ہے کہ اگر رائے عامہ سے استصواب کیا جائے تو ہر شخص یہی کہے گا کہ اس سڑے ہوئے نظام کو جلد سے جلد دفن کر دینا چاہیے۔ ورنا اس کی عفونتیں ہر کسی کی زندگی کو بھی ختم کر کے رکھ دیں گی۔ شروع سے آخر تک جو طرز بیان اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے اس سے مقصود سرمایا دارانا نظام کی تردید کے ساتھ اپنی اشتراکیت کی تبلیغ بھی ہے اس کی تیسری کتاب سرمایا ہے یہ تقریباً ڈھائی ہزار صفحے والی ضخیم کتاب تین جلدوں میں منقسم ہے۔ مارکس نے دراصل یہ کتاب مزدوروں کی محنت کا نظریہ قدر (LABOUR THEORY OF VALUE) ثابت کرنے کی غرض سے لکھی تھی جس کو وہ اپنی اصطلاح میں قدر زاید (SURPLUS VALUE) کہتا ہے۔ مزدوروں کی قدر محنت کو وہ بہت زیادا اہمیت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ صرف محنت ہی (VALUE) پیدا کرتی ہے۔

غزل

ملا (سیتا پوری)

ترس آتا نہیں تم کو مرے حال زبوں پر
ستم پر یوں ستم ڈھانا ہو اک محبوب انساں پر

کلیجے میں کسک دل میں کھٹک ہے لب پہ نالی ہے
جلے جاتا ہے دشمن اس ہمارے سازو ساماں پر

گریباں کی طرح اڑتا پھرا کرتا ہے دامن بھی
مرا وحشت جنوں میں ان کے دامن کے گریباں پر

یہاں تک کھینچ کر لائی ہے یاد دشمنان تم کو
کسی سے بس نہیں چلتا آ گئے تم کو نگہباں پر

بجائے جس کے وعدہ کو سمجھا ہوں نہ ایماں لیکن
سمجھتا ہوں اسے ایماں کیے جاتا ہوں جاں پر

یہ کہتا ہے آج اک دل جل چکی ہے جس پہ تن من دھن
یہ کون آیا ہے ہر ذرہ کو ہے ہر ذرہ حیراں پر

بتوں کو سجدا کرتے کس نے دیکھا ہے تجھے ملا
ارے توبا معاذ اللہ یہ تہمت اہل ایماں پر

سوویت یونین میں سیر و سفر کا شوق

گ۔ا

دن بہ دن سوویت یونین میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جو اپنی چھٹیاں سیر و سفر میں گذارتے ہیں۔ ذوق سفر سوویت یونین میں عام ہے۔

سوویت یونین کی مزدور سبھاؤں کی کل یونین کونسل کا ایک خاص ادارہ سیر و سفر سے متعلق ہے جس کے ستر مرکز ملک کے پر فضا مقامات پر اور بڑے بڑے شہروں میں قایم ہیں۔ بحر اسود کے قفقاز کے ساحلوں پر کارپلیں خاکستانے کی جھیلوں کے کنارے ٹرانس کارپیتھیا میں، کرائمیا کے پہاڑوں پر جھیل سیلیگر کے کنارے شہروں میں سے لینن گراڈ، ماسکو، روستوف، کیف اور دوسرے مقامات پر آپ کو سیر و سفر کے مرکز ملیں گے۔ سیاحوں کے مرکزوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ مثلاً ۱۹۵۲ء میں پانچ نئے مرکز کھولے گئے ہیں جو دامرکزوں کو بہتر بنانے کے لیے ۵ لاکھ روبل منظور کیے گئے ہیں۔

مزدور سبھاؤں کی مرکزی کونسل کا سیاحت کا ادارہ ۴۰ مختلف راستوں سے سفر کے انتظامات کرتا ہے کسی ایک راستے کا پاس حاصل کرنے کے بعد سیاح کو مرکز پر کھانے پینے اور دوسری قسم کی سہولتیں ملتی ہیں۔

سیر کرنے کے لیے اس کو تجربہ کار گائیڈوں کی خدمات حاصل ہوتی ہیں تاریخی یادگاروں اور عجایب گھروں کو دیکھنے اور معلومات حاصل کرنے کی آسانی ہوتی ہے کل اخراجات میں سے سیاح کو اپنی جیب سے صرف تیس فیصدی خرچ دینا پڑتا ہے باقی رقم مزدور سبھا ادا کرتی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں سوویت مزدور سبھاؤں نے مزدوروں اور ان کے بال بچوں کے لیے سیر و سفر کے پاس خریدنے پر دو کروڑ دس لاکھ روبل صرف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہزاروں سیاح سیاحی مرکزوں کے بنائے ہوئے راستوں کے برابر اور اس سے بھی زیادہ اپنے بنائے ہوئے راستوں پر سفر کے لیے روانا ہوتے ہیں۔ مثلاً ماسکو کے اسالن کارخانا موٹر سازی کے مزدوروں کے جتھے یورال اور قفقاز جائیں گے۔ ماسکو مشین سازی کارخانے کے سیاحوں نے ایک دل چسپ سفر کا پروگرام بنایا ہے۔ یہ لوگ کارخانے کے اسپورٹس گروپ کی چھوٹی یا دبائی کشتیوں پر روانا ہوں گے اور ولگا یا چوسووا شمالی دونا بگ اور اوکا دریاؤں میں سے کشتیوں پر گذارتے ہوئے ماسکو سے قفقاز تک پہنچ کر لوگ اپنی اپنی موٹر سائیکلوں پر جائیں گے۔ سورد لوشک کے استادوں کے مدرسے کے طلبا یورال کے سابلیا اور نارودنایا پہاڑوں پر کوہ پیمائی کریں گے ان کے ساتھ کے دوسرے طلبا وسط ایشیا کے پہاڑوں میں سفر کریں گے۔ ماسکو کے طبی کارکنوں کے ایک جتھے نے ارطائی کا سفر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہزاروں سیاح سیاحی مرکزوں کے بنائے ہوئے راستوں کے برابر اور اس سے بھی زیادہ اپنے بنائے ہوئے راستوں پر سفر کے لیے روانا ہوتے ہیں۔ مثلاً ماسکو کے اسالن کارخانا موٹر سازی کے مزدوروں کے جتھے یورال اور قفقاز جائیں گے۔ ماسکو مشین سازی کارخانے کے سیاحوں نے ایک دل چسپ سفر کا پروگرام بنایا ہے۔ یہ لوگ کارخانے کے اسپورٹس گروپ کی چھوٹی یا دبائی کشتیوں پر روانا ہوں گے اور ولگا یا چوسووا شمالی دونا بگ اور اوکا دریاؤں میں سے کشتیوں پر گذارتے ہوئے ماسکو سے قفقاز تک پہنچ کر لوگ اپنی اپنی موٹر سائیکلوں پر جائیں گے۔ سورد لوشک کے استادوں کے مدرسے کے طلبا یورال کے سابلیا اور نارودنایا پہاڑوں پر کوہ پیمائی کریں گے ان کے ساتھ کے دوسرے طلبا وسط ایشیا کے پہاڑوں میں سفر کریں گے۔ ماسکو کے طبی کارکنوں کے ایک جتھے نے ارطائی کا

سفر کرنے کا فیصلا کیا ہے۔ ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی کے طلبا سایان کے پہاڑوں اور توا علاقے کی سیر کریں گے ــــ

ماسکو کی راہو چی اسٹریٹ پر ایک دو منزلا سفید عمارت ہے یہ ہے سیاحوں کا کلب، یہاں اکثر سیاحوں کے جلسے ہوتے ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ رپورٹیں سنائی جاتی ہیں اور مشورے کیے جاتے ہیں۔ یہاں آپ کو سیاحت کے نئے شوقین بھی ملیں گے جو پہلے اتوار کی سیاحت کے لیے رستے کے انتخاب کا مشورا لینے آتے ہیں۔ اور پرانے سیاح بھی کندھوں پر سفری سامان کے جھولے لٹکائے جو ہزاروں میل کا سفر کر چکے ہیں، کلب میں صلاح اور مشورا کرنے آتے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنی سیاحت کے قصے سناتے اور چند اس علاقے کے متعلق کتابوں کا مطالعا کرتے ہیں جہاں کی سیر کا انہوں نے پروگرام بنایا ہے کلب کی لائبریری میں پندرا ہزار خاص کتابیں ہیں۔ ان میں بہت سی کتابیں نایاب اور بیش قیمت ہیں۔ کلب میں سیاحت کے مختلف شعبے ہیں۔ پیدل سفر، کشتی کا سفر، سائیکل کا سفر، موٹر اور موٹر سائیکل کا سفر۔ نیا اور فوٹو گرافی کے سیکشن بھی ہیں۔ کلب سے خیمے سفری تھیلے بستر اور بادبانی کشتیاں کرائے پر حاصل کرنے کا بھی انتظام ہے ہر ہفتا کلب کی طرف سے ایک دن یا ہفتے کے آخری دنوں میں ہر فضا مقامات ماسکو کے آس پاس کے تاریخی مقامات کی سیر کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ سیاحوں کے ایسے ہی کلب سوویت یونین کے دوسرے کئی شہروں میں موجود ہیں۔

ایک روز سیر کا انتظام سیاحوں کے کلب ہی نہیں بلکے فیکٹریوں اور کارخانوں، دفتروں اور تعلیمی اداروں کے سیاحوں کے شعبے بھی کرتے ہیں۔ ماسکو میں گھڑی ساز کی سب سے پہلی فیکٹری کے شمالی چھاپے خانے کے نوجوان مزدور، لنن گراڈ میں کیروف کارخانے اور "سکور دخود" فیکٹری کے مزدور، یورال میں شہر سیروف کے کارخانے آہن و فولاد کے مزدور اور دوسرے شہروں اور قصبوں کے ہزاروں سیاح ہر اتوار کو اپنے آس پاس کے مقامات کی سیر کو جاتے ہیں ــــ

موٹر کاروں کا سفر دن بہ دن زیادا مقبول ہو رہا ہے ماسکو کے سیاحوں کے کلب کے ممبر اپنی ذاتی موٹروں میں ماسکو سے ٹالنس کا پریتیجیا، تفقاز کرائمیا اور یوکرین جایا کرتے ہیں۔ تاشقند کے سیاح اپنی موٹروں میں ترکمانی بڑی نہر کے نئے رستے کی سیر کرنے آتے ہیں ــــ

جنگ کے بعد کے زمانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سوویت یونین کے بچوں میں سیاحت کا بڑا شوق پیدا ہو گیا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے پچھلے سال اسکولوں کے اسی لاکھ بچے پیدل سفر پر تفریح کر کے باہر گئے اس سال یہ تعداد اور بھی بڑھ جائے گی۔

پندرا برس سے زیادا عرصا ہوا کہ سیاح سوویت یونین کا تمغا جاری کیا گیا تھا نیلے رنگ کے اس خوبصورت تمغے پر قطب نما اور ڈیرے کا خاکا کھدا ہوا ہے۔ اب تک سیاح یہ تمغا لگائے نظر نہ آئیں گے۔ ۱۹۵۱ء میں ۲۵ ہزار لوگوں کو یہ تمغا انعام دیا گیا۔ لیکن یہ تمغا حاصل کرنے کے لیے نہ صرف ایک خاص رستے پر جہاں کچھ مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے سفر کرنا پڑتا ہے بلکے ایک خاص پروگرام کے برابر ایک امتحان بھی پاس کرنا ہوتا ہے۔ کھلاڑیوں کی لیاقت کے اظہار کے لیے ۱۹۳۴ء سے سیاحت کے مختلف درجے رکھے گئے ہیں اور باہر کھلاڑی کا خطاب جاری کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں مانے ہوئے سیاحوں اور تربیت پائے سیاحوں (یعنی کسی نہ کسی ایک درجے میں ماہر) کی تعداد تقریباً تگنی ہو گئی۔

سوویت یونین کے بہت سے شہروں میں سیاحوں کے جلسے باقاعدا ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں سیر و سفر کے بہت سے شوقین جوق در جوق شریک ہوتے ہیں۔

اندازا ہے کہ اس بار سیاحوں کی تعداد میں اور بھی زبردست اضافا ہو گا۔ ہزاروں ہی نوجوان لڑکے لڑکیاں ابھی سے طویل اور مختصر سفر کی تیاریاں کر رہے ہیں ــــ

تین محبت — ایک کہانی

خ۔ م۔ عارف

شعلاپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں۔

جہاں بہت سی زندگیاں قلابازیاں کھا رہی تھیں وہاں سات سال اور پانچ سال کے دو زندگیاں اور کلیلیں کر رہی تھیں فرزانا اور فرزانا کا طارق بھیا۔ ہاں وہ اسے طارق بھیا ہی کہا کرتی تھی۔ دنیا کی اس نامہوار شاہراہ پر چلے جا رہے تھے۔ شانا بہ شانا۔ ہر لمحہ ان کا ایک دوسرے کے لیے تھا۔ مگر فرزانا کے کھیل میں۔ مولوی صاحب کی گراہ کن جھڑپوں کے سائے تلے۔ اسکول کے ماسٹروں کی بے معنی بکواس میں ہمیشہ پہلو بہ پہلو رہتے اور زندگی کی اس چکنی راہ پر چلنے والے نئے راہی اکثر حیران رہا کرتے تھے کہ آخر لوگ زندگی کو اس قدر بھیانک کیوں بنایا کرتے ہیں زندگی بڑی حسین تھی۔ اس وقت اور انہی ایام کا ایک معصوم مگر تاریخی دن طارق نہیں بھلا سکا اور اسی لیے فرزانا بھی نہ بھلا سکی۔

اپنے والدین سے چھپا کر اپنے مکان کے پائین باغ میں نیم کے درخت کی جڑ پر اور عشق پیچاں کی لٹوں کی اوٹ میں بیٹھ کر وہ پہلی بار ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے اس لیے کہ انہیں اس کی ممانعت تھی۔ اور وہ پہلی بار محبت اور محبت کے ہولناک انجام کو دیکھ کر کانپ اٹھے اور ایک نے دوسرے کو تھام لیا اور پھر فضا میں دو معصوم تھرائی ہوئی آوازیں کانپیں، ابھریں اور پھر گم ہو گئیں۔

"فرزانا ہم کبھی محبت نہیں کریں گے۔"

"ہاں طارق بھیا! محبت بہت بری چیز ہے۔"

اس وقت کی فضا نے تو انہیں جذب کر لیا مگر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ یہ آوازیں فرزانا اور طارق کے شعور کی پردے پر منقش ہوتی رہیں ابھرتی رہیں۔ نمایاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جب طارق کی زندگی نے سولہویں کروٹ لی تو وہ سوچنے لگا خاب کی تعبیریں عموماً الٹی ہوا کرتی ہیں۔ بچپن کی باتیں بھی تو ایک خاب ہیں جس کی تعبیر شباب ہے۔ اور ان دونوں کے خاب کی تعبیر الٹی پڑ چکی تھی وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے مگر بچپن کے دیے ہوئے انوکھے وعدوں کے بھلانے میں ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے وہ محبت کر رہے تھے مگر کہہ رہے تھے "ہمیں محبت نہیں کرنا چاہیے" وہ جتنے اس سراب سمجھ کر محتاط ہو رہے تھے۔

شیر اور شکر کی طرح ہم آہنگی نے ان دونوں کے کردار خیالات تصورات اور روح کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ فرزانا اور طارق فرزانا بن کر رہ گیا تھا۔ جسے طارق نے اس وقت محسوس کیا اور رشدت سے محسوس کیا جبکہ وہ حصول تعلیم کے لیے گاؤں چھوڑ رہا تھا اور فرزانا کی آنکھیں دو مدور شہاب ثاقب توڑتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

یہ مشعلیں جلتی رہیں گی اسی کے لیے اسی کی راہ کو روشن کرنے کے لیے زندگی کی اندھیری طوفانی راتوں میں بھی جب تک کہ تیل کا آخری قطرہ موت کے خوف ناک تشنہ لب چوس لیں اور موجود انتظام زندگی اس کی زبان بن کر چیخ رہی تھی "ہیں طارق بھیا! محبت بہت بری چیز ہے۔"

گاؤں سے دور شہر کی چہل پہل اور کالج کی رنگین فضاؤں میں کھیل کے میدان کا ہیرو اور اپنے درجے کا اول طالب علم طارق ہی تھا جس کے رگ و پے میں دوڑتی ہوئی فرزانا کی یاد اور اس کی دلائی ہوئی ہمت نے اسے ایک نمایاں ہستی بنا دیا تھا اور وہ جگمگاتی ہوئی مشعلیں خضر راہ بنتی رہیں وہ چڑھ گیا سیڑھیوں پر بلندیوں پر، ثریا کی طرف ——

لیکن زندگی کی اس چکنی راہ پر اب خشگوار دشواریاں بھی شروع ہوگئی تھیں پھولوں میں لپٹے ہوئے کانٹے دلکش نظر آنے لگے۔ اور کانٹوں کی چبھن کا احساس لذت بخش معلوم ہونے لگا۔ طارق کے انسان میں خابیدا ایک حسی انسان نے انگڑائی لینی شروع کی۔ کونپلیں پھوٹنی شروع ہوئیں تاریں ٹوٹنے شروع ہوئے ذہن میں گھنٹیاں بجنے لگیں ——

اور ایک بار پھر ہوا نے آرام کے قدم ڈگمگا دیے

اب طارق کو حسن لطیف میں نئی نئی دلچسپیاں نظر آنے لگیں۔ رستا چلتے والی ہر لڑکی کم سے کم ایک بار ضرور مرکز نظر بنتی اور خراج تحسین لیتی۔ جن سے محظوظ ہو کر اس نے اپنے دوستوں سے ایک دن کہہ ہی ڈالا کہ "دراصل قدرت نے کائنات کی تخلیق دو چیزوں سے کی ہے۔ پہاڑوں کی سختی اور کھردری چٹانوں کے ٹکڑوں سے انسانیت کا نرم و نازک طبقہ بنا اور قوس قزح کے ٹکڑے کیے گئے تو طبقہ لطیف" اور اس کی نظریں ان قوس قزح کے ٹکڑوں سے ٹکراتی رہیں جن سے اسکی آنکھیں سیراب ہوتی رہیں۔ رگیں سیراب ہوتی رہیں جسم سیراب ہوتا لیکن ذہن الجھتا رہا۔ دماغی سکون لٹتا رہا۔ اس کے اندر کا انسان سوتا رہا جس جاگتا رہا گھنٹیاں بجتی رہیں تارے ٹوٹتے رہے۔

لیکن اپنی قوس قزح کے درمیان اسے کبھی کبھی ایک عجیب سی چیز نظر آجاتی۔ چند قوس قزح کے ٹکڑے برق کی چمک بن جاتے اور آنکھیں خیرا ہو جاتیں اور ان بجلیوں کی تڑپ کے پس پردہ اسے دور ٹمٹماتی ہوئی مشعلیں نظر آنے لگتیں جو اس سے دور ہوتی جاتیں۔ دور ہوتی جاتیں یہاں تک کہ شہر سے پرے افق کی سیاہی پر دو گہری جھیل کی مانند پر معنی آنکھوں میں تبدیل ہو جاتیں اور ان سے دو شہاب ثاقب ٹوٹتے نظر آتے پھر وہ اندھیرے میں ڈوب جاتے اور پھر انسان بیدار ہونے لگ جاتا جنس مردار ہونے لگ لگتا، گھنٹیوں کی آواز ڈوب جاتی۔ دل کی رفتار تیز ہونے لگتی پھر سکون ..... ایک خاص قسم کا ذہنی ٹھہراؤ جسے طارق بتا نہ سکتا۔ سمجھ نہ سکتا۔ وہ سوچتا ایسا کیوں ہوتا ہے کیا وہ ایک ہی انسان ہے اگر ایک ہے تو اس میں دو مختلف جذبات کیوں بیدار ہوتے ہیں۔ باہر قوس و قزح کے ٹکڑے دو قسم کے کیوں ہیں۔ ایک انسان جگاتے ہیں اور دوسرے جنس جگاتے ہیں ایسا کیوں ہے ——

اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں اس کی الجھنیں بڑھتی گئیں

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن قوس قزح کا ایک برق پاش ٹکڑا اس سے بہت نزدیک سے ٹکرا ہی گیا۔ لاجونتی کی شکل میں ——— لاجو۔ اس کے کالج کی طالبہ اور کلاس فیلو تھی

دونوں چند ہی دنوں میں بہت نزدیک ہو گئے طارق محسوس کرتا کہ جذبات بیدار ہوتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں وہی مشعلیں جگمگا یا کرتی تھیں۔ وہی شہاب ثاقب ٹوٹا کرتے ہوں گے ان کی ایک معصوم دوشیزہ نے اسے وقت رخصت بخشی تھی۔ فرزانا کی تصویر دم بھر کے لیے اس کی نظروں کے سامنے آتی اور پھر اچانک حرف غلط کی طرح مٹ جاتی اور اسی مشعل سے ایک دوسری مشعل روشن ہو جاتی ——— لاجو ——— ایک کی روشنی کم ہوتی گئی دوسری کی تیز ایک کا روغن کھو کر دوسری میں بھرا جانے لگا۔ راہی وہی تھا مشعل کا روغن وہی تھا مشعل دوسری تھی۔ شاہراہ وہی تھی قدرت ہنستی رہی۔ راہی کچھ سمجھ نہ سکا۔

شروع میں فرزانا کے یہاں "ڈاکیا ماہ میں آٹھ بار آیا کرتا۔ اب ایک بار یا وہ بھی نہیں۔ شروع میں طارق اور لاجو کئی کئی دنوں میں ملتے اب دن میں آٹھ بار یا اس سے بھی زیادہ اور انہیں دنوں کا اس کی زندگی کا دوسرا تاریکی دن طارق نہ بھلا سکا اور اسی لیے لاجو نہ بھلا سکی ——

کالج کی لائبریری میں وہ دونوں ایک ان تنہا رہ گئے اور تنہائی نے انہیں جذباتی بنا دیا اور ایک بار پھر کائنات کی اس فضا میں اس بار دو بجائے تین کانپ اٹھیں۔

لرزیں اور پھر گم ہوگئیں۔

"لاجو! ہم محبت کو ایر بنا کر دنیا کے سامنے پیش کریں گے"

"طارق میں نے ہمیشہ تمہیں دیوتا سمجھا ہے اور تمہاری باتیں آکاش بانی"

اور اس طرح فرزانا کی یاد جگانے والی لاجو کی معیت میں طارق کا انسان ابھرتا رہا۔ اور شہر کے پارکوں ہوٹلوں سینماؤں، رقص، گانوں اور بابل کی جھنکاروں میں طارق کا جنس جاگتا رہا۔ پر وہ ان چڑھتا رہا۔

اور پھر ایک ملک نے دو ملک جیتے دو پرچم لہرا گئے ہلالی اور ترنگا۔

جانے سے پہلے پرانے حکمران دیوتاؤں کی قربان گاہ پر خوں کی بھینٹ چڑھائی جانے لگی۔ عصمت کی بھینٹ انسانیت کی بھینٹ۔

اور اس وقت رامانند ساگر کا انسان مرگیا۔ خاجا احمد عباس کے سرد ارجی نے جنم لیا۔ قدرت الله شہاب خدائی کو للکارتا ہوا بلبلا اٹھا۔ تم اس کی کن نعمتوں کو جھٹلا سکتے ہو۔ دنیا کی ساری طنزیات ماند پڑ گئیں نیٹو نے لوگوں کو ٹھنڈ کرنے کے لیے کنوؤں میں چینی کے بورے گھول گھول کر پلوائے۔ لیکن نہ جانے کیوں لوگوں کو زہر کی طرح کڑوے معلوم ہوئے ——

اور اس آزادی کے طوفان میں تنکوں کے مانند طارق اور طارق کا گھرانا بہتا رہا۔ اور جب طوفان تھما تو ان لوگوں نے خدکو پاکستان کی سرحدوں میں پایا۔ اس درمیان زمینوں کی مدد اور خدا [illegible] طارق کے ڈاکٹر بننے کا محرک ہوا وطن عزیز کے متعلق طارق نے سنا کہ ہندستان میں شعلا پور کو فسادات کے شعلوں کی خون آشام زبانوں نے جلا ڈالا تھا۔ اس نے یہ بھی سنا کہ وہاں کے کنوئیں سے ایک لاش برآمد ہوئی۔ لاش کا جسم جل چکا تھا۔ آنکھیں جل چکی تھیں۔ ہات جل چکا تھا۔ مگر ہات میں پکڑی ہوئی ایک تصویر کا اوپری حصا صحی سالم تھا مگر اتنا حصا نہ بچ سکا جلنے والے نے خد جل جانے کے باوجود اس تصویر کو جلنے نہ دیا اس نے یہ بھی سنا کہ وہ تصویر طارق ہی کی تھی۔

ذہن پر ایک ہتوڑا لگا۔ زمین ناچنے لگی۔ آسمان ناچنے لگا چاند تارے ناچنے لگے۔ ادھر مشعلیں، ادھر مشعلیں نیچے مشعلیں اوپر مشعلیں ہر طرف مشعلیں بکھر گئیں۔ چہار اندھیرا مکمل اندھیرا۔

دو —— اسی کے لیے جنتی رہنے والی مشعلیں شعلوں کے اندھیرے میں ڈوب چکی تھیں تیل کا آخری قطرا نچوڑ لیا گیا تھا۔ وہ مشعلیں ابھر نہ سکیں جی نہ سکیں۔ ظاہر نہ ہو سکیں مسکتی رہیں جیت نہ سکیں۔ ہار نہ سکیں۔ اور جلتے جلتے ڈوب گئیں۔

اور پھر کا ایک حقیر ٹکڑا ایورسٹ کی چوٹیوں سے سمندر کی گہرائی کی طرف لڑھکنے لگا

ڈنکل کاٹھ کی ہماہمی میں ناکامیوں اور پستیوں میں گھری ہوئی ایک گم نام ہستی طارق کی بھی تھی۔ اب اس کے اندر کا جنس مرد ہو چکا لیکن صرف انسان اور وہ بھی آدھا انسان کلبلا رہا تھا جو کہ ان ساتھ دینے والی راہ دکھانے والی مشعلوں سے محروم لڑکھڑا رہا تھا کہ اچانک اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نظر آنے والی ایک ہلکی سی کرن نے اس کو تھام لیا۔

سفید روح۔ سفید جسم۔ سفید لباس کی مالکا ایک زندگی نے ایک مرد نے ایک مونا لیزا نے ایک فرزانا نے ایک لاجو نے اسے جگا دیا مشعلیں روشن ہو چکی تھیں۔ رستا دکھنے لگا

—— ارہ یہ ہے انسان نے کروٹیں لینی شروع کیں۔

شاہین کو دیکھ کر طارق حیران رہ گیا۔ وہی خدو خال، وہی رفتار و گفتار وہی عزم و تبسم وہی سنجیدگی۔ . . . اور فرزانا . . . مگر . . . مگر . . . مشعلیں وہ بھی وہی تھیں قریب قریب مگر نہ جانے کیوں۔ اسے احساس ہوتا کہ یہ کسی اور مشعلوں سے جلائی گئی ہیں۔

شاہین کی طرف نہ جانے کیوں اس کے قدم خد بخد اٹھنے لگ جاتے وہ روز آتا جاتا اسے دیکھتا اور چلا آتا۔ شاہین کی

نظریں اٹھتی اور ایک غمگین ہلکے سے تبسم کے ساتھ گر جاتیں ایسا بہت دنوں تک ہوتا رہا۔

پھر طارق نے دیکھا کہ ایک دن وہ مشعلیں یک لخت روشن ہوگئیں۔ اس کی جانی پہچانی مشعلوں کی طرح ۔ ۔ ۔ ۔ فرزانا کی طرح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاجو کی طرح۔ اور پھر وہ نزدیک ہوتے گئے بہت ہی قریب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل قریب۔

انہی دنوں ایک بار اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس بار آخری بار۔ فضا میں پھر چند آوازیں لہرائیں۔ ایک رومال پیش کرتے ہوئے جس کے کونے پر لکھا تھا "دیوتا کو بھینٹ" شاہین نے کہا۔ طارق! یہ خون سے سینچے ہوئے تحفے کو قبول کرو۔"

"شاہین! میں بھی کتنا بدنصیب ہوں کہ اس کے بدلے میں میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ اس آزادی کی نذر ہوگیا۔ سوائے ایک مرد اجسم کے"

یوں نہ کہو طارق! میں نے بھی تو سب کچھ قربان کر دیا ہے اے۔ اٹھائے، دولت و ثروت لٹائی روح لٹائی۔ سہاگ لٹا مانگ کا سیندور لٹایا۔

دماغ میں ایک بار پھر ہتوڑے پڑے۔ زمین ناچنے لگی آسمان ناچنے لگا۔ تارے ناچنے لگے پھر اندھیرا چاروں طرف اندھیرا

شاہین نے جب آنکھیں کھولیں تو طارق جا چکا تھا۔ ۔ ۔ اور رومال طارق کے نقش پا پر پڑا ہوا تھا۔ دیوتا نے بھینٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مندر کی گھنٹیاں بجتی ہی رہ گئیں۔

اور پتھر پھر لڑھکنے لگا۔ تیزی سے اتھاہ گہرائیوں کی طرف۔

ڈنکل کالج کے انفکشس آئیسولیشن وارڈ میں ایک طالب علم بستر پر بیہوش پڑا تھا۔ اور ہلکے ہلکے بخار، کھانسی اور سوجھ سے نکلی ہوئی خون کی لکیروں نے ڈاکٹروں کے تجربے کا رہنما نے مائیکروسکوپ اور ایکسرے نے ایک ایسے مرض کی تصدیق کر دی تھی جس کا واحد علاج موت تھا۔

سفید لباس میں ملبوس ایک ہستی بیمار طارق کو دیکھنے، ورنا آتی مگر اس وقت جبکہ وہ بے خبر سویا ہوتا یا بیہوش رہتا۔

ایک دن طارق نے دیکھا دو ٹمٹماتی ہوئی مشعلیں شہاب ثاقب ٹوٹتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھایا وہ دو۔ بھاگنے لگیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے بھاگنے لگا بھاگتا رہا۔ بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے دیکھا کہ اس نے انہیں چھو لیا ہے پتھر لڑھکتا ہوا سمندر کی تہ کو پہنچ چکا تھا۔

دوسرے دن دنیا والوں نے کہا طارق مر گیا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محبت کی کامرانیاں ہستی ہیں ایک اور واقعہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکا ——

شاہین کی میز پر دو مردوں کی تصویریں تھیں ایک کے ساتھ خدشاہین کی تصویر تھی۔ دوسرے کے چرنوں میں ایک رومال اور چند بکھرے پھول۔

اس کے بعد کسی نے شاہین کو کبھی نہ دیکھا کبھی نہ سنا۔

غزل

مہر (لکھنوی)

تصور سے ترے دل خود بخود محو گفتگو ہوگا
نہ خواہش ہوگی منزل کی نہ دنیا جستجو ہوگا

ذرا کانٹا سا چبھنے تو دو وہ وقت آنے دو
لگا شوق ہوگی اور جمال زخم رو ہوگا

ابھی کیا ہے ابھی تو دیکھنا باقی ہے لفظ میں
ہر انداز جفا جب شمع ہر آرزو ہوگا

سمجھ جاؤ گے تم کیوں چاہتے جانے والے
کبھی ان اتفاقی آشنا سے روبرو ہوگا

اگر یہ ہی ہیں تیری نیند ضبط محبت میں
یہ خنجر ہی تصور مجھ سے پھر ہوگا

نہ سمجھا تھا کہ روکے گا مجھے تیرے سے پانا کا
سر محفل ہر اک شمن خیال آرزو ہوگا

یہی تغافل ہے اگر اے جانِ جاں تیرا
حسین کی ہر کیاری میں خزاں کا لہو ہوگا

کسی کی بے نیازی کا گلہ دل سے نہ کر اے مہر
مری قسمت میں جب لکھا تھا خون آرزو ہوگا

امریکا کے بعض مشاہیر

یو سیس

امریکا کے نئے صدر جنرل آئسنہور۔ جنرل ومر بریڈلے امریکا کی سپریم کورٹ کے جسٹس فریڈ وسن۔ ولیم ڈوگلس اور ٹام کلارک لڑکپن میں اخبار بیچا کرتے تھے

امریکا کے آزاد جمہوری نظام میں ہر اولوالعزم بڑے سے بڑے عہدے پر پہنچ سکتا ہے۔ وہاں امیروں اور غریب بچی لوگوں کے لڑکے کوئی کام کرنے میں عار اور شرم محسوس نہیں کرتے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ امریکا نے اتنی ترقی کی ہے ذیل کے مضمون میں آپ دیکھیں گے کہ وہاں اخبار فروش لڑکوں کی کتنی قدر ہوتی ہے۔

امریکا کے ایک شہر پڈوکا کینٹکی کے باشندوں نے ایک صبح کو جب اپنے گھروں کے دروازے کھولے تو امریکا کے سابق نایب صدر نے انہیں تسلیمات عرض کی۔ مسٹر البن ڈبلیو بارکلے امریکا میں دوسرے سب سے بڑے عہدے پر برسر اقتدار تھے (ان کے عہدے سے بڑا عہدہ صرف امریکا کے پریسیڈنٹ کا ہے)۔

بات یہ تھی کہ اس دن امریکا بھر میں اخباری لڑکوں کا دن منایا جا رہا تھا اور مسٹر بارکلے نے اپنے بھتیجے کی جگہ اس دن لوگوں کو اخبار تقسیم کرنے کا کام سنبھالا تھا۔

جہاں تک پتا چلتا ہے کہ اس سے پہلے امریکا کے کسی دوسرے نایب صدر نے اخبار بیچنے کا تھیلا اپنے کندھے پر لٹکا کر اور لوگوں میں اخبار تقسیم کرنے کا کام نہیں کیا تھا لیکن امریکا کے بہت سے دوسرے مشاہیر نے اپنے لڑکپن میں اخبار بیچنے کا کام کیا ہے۔

چنانچہ ڈوائٹ ڈی جنرل آئسنہور (امریکا کے نئے صدر) جنرل اومر بریڈلے امریکا کی سپریم کورٹ کے جسٹس فریڈ وسن ولیم ڈوگلس اور ٹام کلارک بھی بچپن میں اخبار بیچنے کا کام کرتے رہے ہیں۔

امریکا کی ریاستوں کے کئی گورنر میں کیلی فورنیا کے گورنر اول وارین۔ نیو ایک کے گورنر تھامس ای ڈیوی بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ بچپن میں اخبار بیچ کر اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔ اسی طرح امریکا کے قومی کھیل بیس بال کے مشہور کھلاڑی مسٹر جیکی رابنسن اور جو ڈیمیگیو اور رالف کائیر بھی پہلے اخبار بیچا کرتے تھے۔

پچھلے دنوں تم اکتوبر کو اخباری ہاکر لڑکوں کا دن امریکا بھر میں منایا گیا اور ان کی رضاکارانہ خدمات کا پورا پورا اعتراف کیا گیا۔ اس دن امریکا کے محکمہ ڈاک نے ۳ سینٹ کے ٹکٹ ان اخبار فروش لڑکوں کی ان خدمات کے اعتراف میں جاری کیے جو انہوں نے امریکا کے بچاؤ کے سلسلے میں انجام دی تھیں اور اس طرح ان کی عزت افزائی کی گئی۔ پھیلے گیا رابرس میں ان اخبار فروش لڑکوں نے اپنے بندے ہوئے اخباری گاہکوں کو ڈیفنس اور جنگی سیونگ کی ۲ ارب مالیت کے ٹکٹ بیچے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ان لڑکوں نے امریکا کے لوگوں کے گھروں میں ۲ کروڑ ایسے پمفلٹ اور پرچے پہنچائے جن میں سے کارجی ڈیفنس سیونگ بانڈوں میں روپیہ لگانے کے متعلق بہتر مواقع کی تشریح کی گئی تھی۔

۳۵ ہزار اخبار فروش لڑکوں میں ۷ فی صد تو چھوٹے چھوٹے تاجروں کی حیثیت رکھتے ہیں وہ تجارت کا اولین تجربا اخبارات کو خرید کر معمولی سے منافع پر

منڈی میں فروخت کرنے سے حاصل کرتے ہیں (یعنی ۹ ۵ اخبار بڑی تعداد میں تھوک خرید کر دوسروں کو تھوڑے سے منافع پر بیچنے کے لیے دے دیتے ہیں) وہ اخباروں کی بکری سے بڑے اتنا ہی ان کو زیادہ منافع بھی ملتا ہے۔ بعض لڑکے ۹ سے ۱۵ ڈالر تک فی ہفتا کماتے ہیں جس کا انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ وہ سنڈے ایڈیشن کس قدر بیچتے ہیں۔

انہیں روزانہ ایک گھنٹا کام کرنا پڑتا ہے اور ہفتے میں مزید دو گھنٹے گاہکوں سے چندا اکٹھا کرنے پر لگانے پڑتے ہیں۔

امریکی محکمہ خزانہ کے سیونگس شعبے کے ایک افسر نے بتایا کہ مجھے یقین ہے کہ اخبار فروشی کا رستا اختیار کرنے سے چال چلن کی تعمیر میں بھی مدد ملتی ہے اور نوجوان لڑکوں کو اس طرح ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے جس طرح میں نے ان کی اس ترقی کا مشاہدہ کیا ہے اگر ان لڑکوں کے والدین بھی کریں تو مجھے یقین ہے کہ بہت سے والدین اخباروں کی بکری شعبے کے ڈائریکٹروں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہوئے نظر آئیں گے تاکہ ان کے لڑکوں کو اخبار بیچنے کا کام مل سکے۔

اخبار فروشی کے اس پیشے کی ابتدا ۱۸ ویں صدی کے امریکا میں پڑی ہے امریکا کے مشہور فلاسفر اور مدبر بنجامن فرینکلن نے اپنی زندگی کے حالات میں لکھا ہے کہ چھاپے خانے میں اخبار کے صفحوں کے ٹائپ جوڑنے اور چھاپنے کے بعد مجھے گاہکوں کو شہر کی گلیوں میں جاکر اخبار تقسیم کرنے پر لگایا جاتا تھا۔ اس میری عمر بارہ برس کی تھی۔" ہو سکتا ہے کہ بنجامن فرینکلن ہی امریکا کے سب سے پہلے اخبار فروش لڑکے ہوں۔ لڑکین کے ایک اور سابق اخبار فروش یونائیٹڈ سٹیٹس سٹیل کمپنی کے صدر مسٹر فی الف فیرلیمن ہیں ان کا کہنا ہے کہ اخبار فروشی کا کام میں نے شروع کیا تھا اس وقت سے اب تک میں کوئی زیادہ انتدیلی نہیں آئی ہوگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ کام تکلیف دہ اور کسی قدر دشوار ضرور تھا لیکن مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس سے آمدنی بھی ہوتی ہے اور ایک تسلی بخش کام ہونے کے ساتھ بعد کی زندگی کے لیے اس سے اچھی تربیت بھی ملتی ہے۔

حال ہی میں برطانیا کی ایک جماعت امریکا میں اخباری کام کے طور طریقوں کا مطالعہ کرنے کے لیے آئی تھی اس نے اپنے ملک کی سفارش کی ہے کہ وہ بھی امریکا کی طرح اخبار فروش تاجر لڑکوں کا طریقا اختیار کرے اس کمیٹی نے اپنی ۲۶ سفارشوں میں اوپر کی تجویز بھی شامل کی تھی تاکہ برطانیا میں اخباری صنعت کو ترقی مل سکے اور مزید لکھا تھا کہ برطانیا کے مختلف پیشہ ور لوگوں کو اس بات کا یقین دلایا جانا چاہیے کہ امریکا کی طرح اخبار فروش تاجر لڑکوں کا طریق کار یہاں بھی رائج کرنا ایک صحت مند اور مفید کوشش ہوگی۔ اس سے لڑکوں کی تعلیم میں کوئی ہرج نہیں ہوتا اور لڑکوں میں ابتدا سے ہی تجارت کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ امریکا میں لوگوں کے ہر طبقے کے لڑکے اخبار فروشی کا کام کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

غزل — نوشاد

بعید دیں بے ضبط گریا تو نہیں ہوتا
ہے جھوٹ کہ راز اپنا آشنا تو نہیں ہوتا

مل جاتے ہی دریا سے بن جاتا ہے دریا وہ
آنسو کا اک قطرا دریا تو نہیں ہوتا

حیرت ہے یقین دل کو آتا ہے کہوں کیوں کر
وعدا کسی صورت سے ایفا تو نہیں ہوتا

کہتے ہیں تڑپ دل میں آنکھوں میں نمی تھی رہے
پھر تجھ سے کسی رت پر دا تو نہیں ہوتا

گستاخیٔ بیجا ہی جو میری نہ سنی ہے
احوال کسی کا بھی ایسا تو نہیں ہوتا

جاتا ہے آخر میں جو عشق کا روگی ہو
پھنستا ہے جو اس دل میں چھٹا تو نہیں ہوتا

ہر ایک ہے ہر آن میں ہر وقت ہر ایک سے
ہر ایک سے جب جا اب جھگڑا تو نہیں ہوتا

اب دل میں یہ ارادہ ہے اب گھر کو لوٹ شاد ان کے
جائیں گے چھپی چوری جس سے چرایا تو نہیں ہوتا

جئے ہو بھارت کی

احمد سعدی

نئی روزی رورہی ہے اور اس کی چیخ میرے کانوں میں برمے کی طرح چبھ رہی ہے۔ جب سے میں اس مکان میں آیا ہوں نئی روزی کی چیخ برابر میرے کانوں میں برمے کی طرح چبھتی رہتی ہے۔ صبح شام دوپہر ہر وقت اس کی چیخ فضا میں بھرتی رہتی ہے۔ اور گھنٹوں میرے کانوں میں برمے چبھوتی رہتی ہے۔ صبح شام دوپہر ہر وقت اس کی چیخ فضا میں ابھرتی رہتی ہے اور گھنٹوں میرے کانوں میں برمے چبھوتی رہتی ہے میرے ذہن میرے خیالات کو منتشر کرتی رہتی ہے۔

مجھے اس نئے مکان میں آئے ہوئے تین دن ہو گئے ہیں۔ آبادی سے دور ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے کھجوروں کے پیڑوں کے جھرمٹ میں یہ چھوٹا سا دو منزلا مکان واقع ہے جو اپنی شکستہ حالی میں ماضی کے کتنے ہی حادثات چھپائے ہوئے ہے۔ کتنی ہی یادوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اپنے اندر کتنے ہی آنسوؤں اور سسکیوں کو جذب کیے ہوئے ہے اس مکان میں کل چار کمرے ہیں اوپر کے دونوں کمروں کو مالک مکان نے اپنے اور اپنی بیوی کے لیے ریزرو کر رکھا ہے اور نیچے کے دونوں کمروں کو کرائے پر دیدیا ہے۔ نئی روزی میرے بغل کے کمرے میں اپنے بدحال باپ اور ماں کے ساتھ رہتی ہے کہنے کو تو ان دو کمروں میں دو خاندان کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان کمروں میں رہنے والے چاروں افراد کے درمیان صرف ایک دیوار حائل ہے۔ جس کی اینٹوں میں جگہ جگہ مرض کوڑھ کی طرح ٹوٹا لگ گیا ہے اور اتنے بڑے بڑے سوراخ ہو گئے ہیں کہ اگر انہیں کاغذ چپکا کر تیار نہ کیا جاتا تو اس پار کی تمام چیزیں اس پار اور اس پار کی تمام چیزیں اس پار نظر آسکتی ہیں اور شاید اسی لیے ان دونوں میاں بیوی نے دیواروں پر جگہ جگہ یہ اخباروں کا ٹکڑا چسپاں کر دیا ہے لیکن پھر بھی اس سے کوئی خاص فائدہ انہیں کیونکہ اس پار کی چیزیں دیکھنے کے لیے اب بھی بے شمار سوراخیں موجود ہیں۔ اس کمرے میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ صرف معلوم ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ضرور ہوا ہے اس کمرے کی ہلکی سی آہٹ کا بھی مجھے پتا چل جاتا ہے اور صرف وہی بات نہیں سنی جاتی جو دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے کانوں میں سٹ کر کیا کرتے ہیں ورنہ دنیا جہاں بھر کی ساری باتیں یوں سنائی دیتی ہیں جیسے کوئی اسی کمرے میں بیٹھا ہوا مجھے مخاطب کر کے بول رہا ہو۔

ابھی کل کی بات ہے کہ شوہر نے شکایت کی۔

"آج ٹیوشن پڑانے نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟" بیوی نے متفکر ہو کر پوچھا۔

"سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"لاؤ، میں دبا دوں"

اور اس کے بعد چوڑیوں کی کھن کھناہٹ سے مجھے صاف پتا چل گیا کہ وہ اپنے شوہر کا سر دبا رہی ہے۔ اور جب یکایک چوڑیوں کی کھن کھناہٹ رک گئی تو میں نے بیوی کو شوہر سے کہتے ہوئے سنا "لاؤ۔ تمہارے پاؤں دبا دوں ہر روز تین میل پیدل چلتے ہو" اور پھر جب چوڑیوں کی ہلکی کھن کھناہٹ پر چارپائی کی چرچراہٹ غالب آگئی تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اپنے شوہر کا پاؤں دبانے لگی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کے گھر کی تمام باتیں

معلوم ہیں۔ پہلے دن نئی کو روتے ہوئے دیکھ کر یہ ضرور سوچا تھا۔ نہ جانے یہ چھوٹی سی بچی کیوں رو رہی ہے اگر وہ کسی چیز کے لیے رو رہی ہے تو اس کی ماں اسے نہیں دے سکتی۔ اور وہ کون سی چیز ہے کہ جس کے لیے نئی روزی گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی ہے لیکن اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جب اس کا باپ گھر واپس لوٹا تو پہلے تو اس نے اپنے کو اپنی تیز چبھتی ہنسی ہوئی چارپائی پر ڈال دیا۔ اس کی ماں اس وقت باورچی خانے میں کوئی ترکاری پکا رہی تھی کیونکہ مجھے باورچی خانے کی طرف سے تیل گرم ہو کر چھننے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا باپ تھوڑی دیر تک خدا کو چارپائی پر پڑے پڑے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اس نے کمزور آواز میں بیوی سے پوچھا "روزی کیوں رو رہی ہے؟"

"بھوک لگی ہے اسے" بیوی نے باورچی خانے ہی سے جواب دیا

اس کے بعد کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ شوہر نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ بیوی ترکاری پکاتی رہی اور نئی روزی چیختی رہی روتی رہی۔ اور اس کے رونے کی آواز مسلسل فضا میں گونجتی رہی میرے کانوں میں بھی آتی رہی۔

"بھوک لگی ہے اسے" بیوی نے کمرے میں آکر کہا۔ شاید وہ ترکاری پکا چکی تھی۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے کا باورچی خانے سے اٹھتا ہوا ہلکا شور اب ڈوب گیا تھا۔ ایک روٹی میں اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ کہتی ہے روٹی سے میرا پیٹ نہیں بھرتا ہے۔ اب اسے کون سمجھائے کہ روٹی سے اگر پیٹ نہیں بھرتا ہے تو بھی اسے کھانا ہی پڑے گا۔ کیونکہ یہ گورنمنٹ کا قانون ہے۔ راشن میں صرف چاول نہیں مل سکتا۔ گورنمنٹ یہ تھوڑے ہی دیکھتی ہے کہ کس کا پیٹ روٹی سے نہیں بھرتا۔ وہاں تو قانون بن گیا ہے کہ چاول کے ساتھ گیہوں بھی لینا پڑے گا۔ اب چاہے گیہوں سے کسی کا پیٹ بھرے یا خالی رہے" وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئی اور شوہر کے لیے کھانا نکالنے لگی۔ برتن کی جھنجھناہٹ اور چمچے کی آواز کمرے میں ابھرنے لگی۔

یہاں یہی کیا کم ہے کہ دونوں وقت ایک روٹی بھی کھانے کو مل جاتی ہے ورنہ حالت تو یہ ہے کہ کسی دن اس کے بھی لالے نہ پڑ جائیں۔ مگر کون سمجھائے اسے — لو کھانا کھا لو۔

شوہر اٹھ کر بیٹھ گیا اور چارپائی دلدوز آواز میں چرچرائی جیسے اپنے بدبوجھ اٹھانے کی اس میں طاقت باقی نہ رہی ہو۔ شوہر نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا "تو پھر تم نے میرے حصے کا بھات تھوڑا سا دیدیا ہوتا"

بیوی کچھ نہیں بولی، لیکن وہ اپنے دل میں ضرور کہہ رہی ہوگی۔ تم پوچھتے ہو، میں نے تمہارے حصے میں سے اسے کیوں نہیں دیدیا۔ کیسے دیدیتی صبح اٹھ کر تم ایک مدّ سوکھی روٹی چبا کر ٹیوشن پڑھانے کے لیے دوڑ پڑتے ہو وہاں لڑکے تمہارا دماغ چاٹتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد تم اسکول لوٹتے ہو جہاں لڑکوں کے ساتھ تمہیں گھنٹوں بکنا پڑتا ہے۔ چیختے رہنا پڑتا ہے اور تم نے ہی تو ایک دن کہا تھا کہ ماسٹر کی زندگی اور ایک گدھے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ بھی گھنٹوں بھونکتا ہے اور یہ بھی بھونکتے ہیں۔ اور جب تم گھنٹوں چیختے رہنے کے بعد گھر لوٹتے ہو تو تمہیں بھر پیٹ کھانا بھی ملے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نئی روزی تو بچی ہے۔ دن بھر کھیلتی رہتی ہے بھاگتی، دوڑتی رہتی ہے۔ تمہاری طرح اسے بھونکنا تھوڑا ہی پڑتا ہے۔ تم اگر بھر پیٹ نہیں کھاؤ گے تو اسکول میں کس چیز سے چیخ سکو گے۔ کتنے دن بھونک سکو گے؟

"لے بیٹا، روزی۔ لے میرے ساتھ کھا" آکر شوہر نے اسے پچکارا۔

اور تقریباً ایک گھنٹا بعد روزی کی چیخ بند ہو گئی فضا میں چھایا ہوا انتشار ختم ہو گیا۔ اور میرے ذہن کو سکون حاصل ہوا۔ تھوڑی دیر تک دادنوں باپ بیٹی چپ چاپ کھاتے رہے پھر یکایک روزی کو کچھ یاد آیا اور وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے کہاں چلی پیٹ بھر گیا اتنی جلدی" باپ نے پیار سے پوچھا۔

"تم نے اپنے حصے کا بھات ہم کو دیا ہے نا ابا۔ تو یہ میرے حصے کی روٹی تم کھا لو۔" نئی روزی نے باپ کی طرف روزی بڑھا دی۔

"اچھا" باپ بیٹی کی ہمدردی سے بہت خوش ہوا۔ "لیکن تمہارے حصے کی روٹی تو تم کھا چکی۔ پھر یہ دوسری روٹی کہاں سے آئی؟"

"ماں نے دیا تھا۔"

کہنے لگی۔ "ایک روٹی سے پرا پیٹ نہیں بھرتا۔" تو میں نے کہا لے دو روٹی کھا لے۔ پیٹ بھر جائے گا۔ لیکن اسے تو بھات کھانے کے لیے بھوک لگتی ہے اب کہ بیوی نے جواب دیا۔

شوہر نے محبت بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا وہ مونھ سے تو کچھ نہیں بولا۔ مگر وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا تو گویا تم اپنے حصے کی روٹی اسے دے سکتی ہو۔ خدا بھوکی رہ سکتی ہو۔ مگر میرے حصا کا بھات اسے نہیں دے سکتی۔ تم بھی عجیب ہو۔ میرے حصے کا بھات بھی تمہارا سے دے سکتی تھی اور جبکہ ہر روز میں تھوڑا سا کھا کر ضرور چھوڑ دیا کرتا ہوں۔ اس سے یہی ہوتا کہ میں رکابی چاٹ کر کھا لیتا۔ مگر میری نئی روزی کو گھنٹوں چیخ چیخ کر رونا تو نہ پڑتا اسے روتا ہوا دیکھ کر تم بھی دیکھنا نہ چاہتی ہو گی۔

"ایا جی۔ امی نے ہم کو بد دعا دیا ہے کہا کہ تم کبھی نہیں جاتی"

"اچھا" باپ نے تعجب کا اظہار کیا اور بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "کیوں جی، تم نے ایسا کیوں کہا؟"

"کہتی نہیں تو کیا کرتی۔ کھانے کے لیے یہ میری جان کھا رہی تھی۔ میں نے عاجز آ کر کہہ دیا۔" وہ زور سے ہنس پڑی مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جیسے اپنی بات یاد کر کے اس کا دل بھر آیا ہو۔ درد کرنے لگا ہو۔

اور آج نئی روزی پھر رو رہی ہے۔ اس کے مسلسل رونے کی آواز فضا میں گونج رہی ہے اور اشتہار کو چیر دے رہی ہے میرے کانوں میں برچھے چبو رہی ہے اور مجھے نئی روزی پر پیار بھی آ رہا ہے اور غصہ بھی۔ میرا ایک دل چاہتا ہے نئی روزی کا گلا دبا دوں اور پھیلے ہوئے اشتہار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں تاکہ میرے کانوں میں یہ چیخیں نہ ہو سکے لیکن دوسرا ہی لمحہ میرا دل پیار سے بھر جاتا ہے اور میرا ہاتھ اس کے سنہرے بالوں بڑی بڑی آنکھوں اور سنہری ہوئی رنگت پیار کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں نفرت کرنے کے لیے نہیں میں جانتا ہوں اس طرح چیختے رہنے سے کوئی مزا نہیں ملتا بلکہ سخت تکلیف ہوتی ہے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ شوق سے ہرگز نہیں چیختی تھی، وہ تو چیخنے کے لیے مجبور کر دی گئی ہے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اگر اس کا باپ ایک معمولی اسکول ماسٹر نہ ہوتا اگر اس کے گھر میں مٹی کے دو برتناں صرف دو روٹی نہ پکتی تو آج نئی روزی کی چیخ کوئی بھی نہ سنتا۔ کوئی بھی نہیں لیکن یہ چیخ صرف چیخ ہی تو نہ تھی کون جانے وہ اپنے بھوک کی شدت اور باپ کی بدحالی کے خلاف احتجاج کرنے کا یہی طریقہ جانتی ہو۔ پھر تو یہ چیخ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک اس کا باپ خوشحال نہ ہو جائے جب تک اس کے گھر میں اتنی روٹیاں نہ پکنے لگ جائیں جس سے دونوں ماں بیٹی شکم سیر ہو کر کھا سکیں۔ اور۔۔۔

"اور تو پھر کیوں رو رہی ہے بیٹا؟ باپ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا

"اسکی تو یہی ایک آگ ہے۔ بھوک لگی ہے ماں نے جواب دیا۔

"تم نے کھلا کیوں نہیں دیا؟"

"بھات مانگ رہی تھی"

"بلا سے" شوہر نے لاپروائی سے جواب دیا۔ آج سے روزی میرے حصے کے بھات میں کھایا کرے گی" وہ بیوی کو مخاطب کر کے بولا۔ اور روزی کے حصے کی روٹی تم کھا لیا کرو گی سمجھیں؟"

"خاک"

"خاک اک کچھ نہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ سننا نہیں چاہتا جب تم اپنے حصے کی روٹی روزی کو کھلا سکتی ہو تو کیا میں اپنے حصے کا بھات روزی کو نہیں کھلا سکتا ابھی میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوا۔ میرے ان نحیف بازوؤں میں اب بھی طاقت باقی ہے" اور اس نے اپنی آستینیں چڑھا لیں۔ "لاؤ تمہیں ٹیکا لگا دوں کہیں نظر نہ لگ جائے" اور بیوی نے شوہر کے کالے بھرا ہات شوہر کے رخسار پر رکھ دیا۔

"یہ بات ہے" شوہر نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

اور جب نئی روزی نے اپنا پیٹ بھر لیا تو گڑیا سے کھیلنے لگی اور کھیلتے کھیلتے جانے کیا ہوا کہ وہ پھر رونے لگی۔ اور وہ روتی ہوئی کہتی جا رہی تھی ۔۔۔ نئی قمیص لے گا بیٹا منے، ہمیں نئی قمیص کہاں سے لا کر دیں۔ کھانے کو تو بھر پیٹ ملتا نہیں۔ ہم قمیص کے لیے پیسے کہاں سے

لائیں ماں۔ ایں۔ ایں۔ اسے ضد کر رہی تھی۔ ماں کی بات مان کر وہی قمیص پہنے ہوئے اسکول چلے جاؤ۔ میں نے سوراخ سے جھانک کر دیکھا وہ رو

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN.)
27 MAY 1955

استالن اعظم

نمبر

ایڈیٹر

جی - ام - خان

ام - اے (عثمانیا)

استالن اعظم نمبر

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے۔اعظم پورہ شرقی۔پی۔او۔جوبلی۔حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور را

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

چندہ سالانہ چھ روپے — جلد (۱۳) — قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

خرداد ۱۳۶۲ف — نمبر (۷) — اپریل ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	کمیونسٹ پارٹی کے نئے پروگرام کا نام مرکز دکمیٹی سوویت یونین ۱۸
استالن اعظم	ایڈیٹر	۳	استالن ایک عظیم اور سادہ انسان اے۔ایچ۔بیفو۔علی ۲۰
سوویت یونین کے مجلسوں کے منتخبین کی تقریب	ناٹیکوف	۱۱	سوویت یونین کی قوموں کے میل ملاپ اور دوستی کا عظیم دا[illegible] [illegible] ۲۶
استالن کے دیے ہوئے سیاسی آئندہ کے خطوط	ام۔راگنکی	۱۵	جہاں استالن نے علالت کے ایام بسر کیے ای۔کوڈین ۳۱

ہمارے خیالات

علم و ادب کے سرپرست عالا کے نام

ہو سکتا ہے کہ "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو یہ اپنا سا ہو کہ "ہندستانی ادب" سے اشتراکیوں کا کیا گٹھ جوڑ ہو سکتا ہے۔ اشتراکیت اور علم و ادب کا سرپرست ۔۔۔ شاید یہی حیرت اور تعجب میں ڈال دینے والی بات معلوم ہو۔ اشتراکیت کو تو دنیا ایک زبردست سیاسی اور مدبر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اشتراکیت کو مغربی لوگ ضدی، ہٹیلا، ضد رائے، بد فطرت، ظالم، دشمن دین اور ڈکٹیٹر جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ اور مشرق کے بسنے والے اس کو صاحب رائے، معاملا فہم، موقع شناس، مدبر و انسانیت اور امن کا علمبردار کہتے ہیں۔ یورپ بچھم میں یہ خصائی جنگ ہوتی ہی رہی اور ان دونوں نے کوئی قطعی تصفیہ کرنے نہ پایا کہ ان دونوں کی بھلائی بہتری چاہنے والا آخر کار چل بسا۔

مگر اس سے بہت پہلے دیکھنے نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ مغرب والوں کی رائے میں مشرق والوں کے خیالات غلط سہی لیکن شائستگی کی ایک خوبی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا وہ یہ کہ اشتراکیت علم و ادب کی پروردگار مربی اور سرپرست ضرور ہے۔

اس کو بتانے کی ہمیں اس سے قطع کوئی بحث نہیں کہ اشتراکیت نے سیاسی دنیا میں کیا کیا اور کیا کچھ نہیں کیا۔ ہم اس پر ہر گز روشنی ڈالنا نہیں چاہتے کہ اشتراکیت ظالم تھا یا مظلوم، وہ ضد رائے اور ضدی تھا یا معاملا فہم اور موقع شناس اس نے جو کچھ کیا دنیا کی بھلائی کی خاطر یا صرف روسی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے۔ یہ تمام سیاسی گتھیاں ہیں جن کو میدان سیاست کے شہسوار ہی بہتر طریقے پر سلجھا سکتے ہیں۔ اس کے قطع نظر "ہندستانی ادب" نے اپنے نقطۂ نظر سے اشتراکیت میں ایک ایسی بھلائی دیکھی جس کی ٹوہ میں آج تیسرا سال ہے "ہندستانی ادب" "ضد بھی لگا ہوا ہے ساری دنیا جانتی ہے کہ زنگی ماما ظالم زار روس کے دور میں روس میں جہاں مرتبہ کی برائی کا دور دورہ تھا وہاں پورا ملک علم سے بھی بالکل ہی

"ہندستانی ادب" کا نشان رقوم کے فرق سے یہ نیا زہے اس کا پہلا اور آخری مقصد علم و ادب اور زبان کی سیوا ہے اسی لحاظ سے یہ رسالہ روسی ادب کے بہترین جوہر پیش کرتا چلا آیا ہے اور چونکہ روس کے محسن اعظم اشتراکیت کے مظہر اول وجود میں آئے تھے۔ اس لیے "ہندستانی ادب"

یہ شہر تھا جہالت عام تھی اور غریبی اسی تعلیم کے نام سے کوسوں دور رہتے اکثر پیشہ کے بھاری انقلاب نے عوام سامان زار کے لیے لینن جیسے سورما کو جنم دیا اس نے آزادی کے پاک جذبے کے بھالی قوت سے حکومت زار کے تختے کو الٹ دیا۔ روس سے علم و ستم کا بھیانک نظام ختم ہوا اور اس کی جگہ امن چین نے جنم لیا۔ لینن اور اس کے ساتھیوں نے روس کی ہر طرح کی ترقی اور بھلائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی

لینن کے بعد اشتالن نے روسی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اس نے روس دیس کی سیوا کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور اس کی ترقی میں چار چاند لگا دیے یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اشتالن نے جہاں روس کی سیاسی معاشی اور معاشرتی ترقی کی طرف دھیان دیا وہاں اس نے تعلیم جیسے بھاری سلسلے سے بھی غفلت نہیں برتی ظلم زار کے دور میں روس میں تعلیم کا فی صد ۵۔ اسے زیادہ نہ تھا۔ علم حاصل کرنے کے دروازے صرف بیروں کی اولاد کے لیے کھلے ہوئے تھے غریب جاہل جوہڑے انہیں علم سے کیا واسطا ہو سکتا تھا یا انقلاب نے ان فرق کو مٹا دیا لینن کی جمہوریت پسند حکومت نے بوڑھے بچے ساوات اور برابری کا سبق پڑھایا اسی انصاف پسند طرز عمل کا نتیجہ تھا کہ غریب سے غریب روسی دھیرے دھیرے علم و ادب کی دولت سے مالا مال ہونے لگے لینن نے علم و ادب کی جوت کا جو بیش بہا تحفہ ملک و قوم کی بھلائی اور ترقی کے لیے پیش کیا تھا اس کو اشتالن نے ایک امانت سمجھ کر صرف اس کی رکھوالی ہی نہیں کی بلکہ دولت کے زور سے اس کی روشنی میں دن افزائی کرتا رہا ایک وقت ایسا بھی آیا کہ روس کی شمع نے جہالت کی تاریکی کو دور کر دیا اور سارا ملک علم و ادب کی روشنی سے جگمگ اٹھا۔

اشتالن کا یہی وہ بہتر کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک یاد گار رہے گا آج روس کی ۸۰ فی صد آبادی پڑھی لکھی ہے گاؤں گاؤں، قصبوں اور دیہاتوں میں تک علم کے چرچے ہیں وہاں تعلیم پہلے کی طرح کسی کی میراث نہیں بلکہ عام ہے سبھی لوگ اس کو آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں اشتالن ہی کی تعلیمی اسکیم کے ماتحت ایک نئی کروڑ ۱۵۔ ۲۵۔ ۳۰ سال کے عرصے میں

ایڈیٹر

استالن اعظم

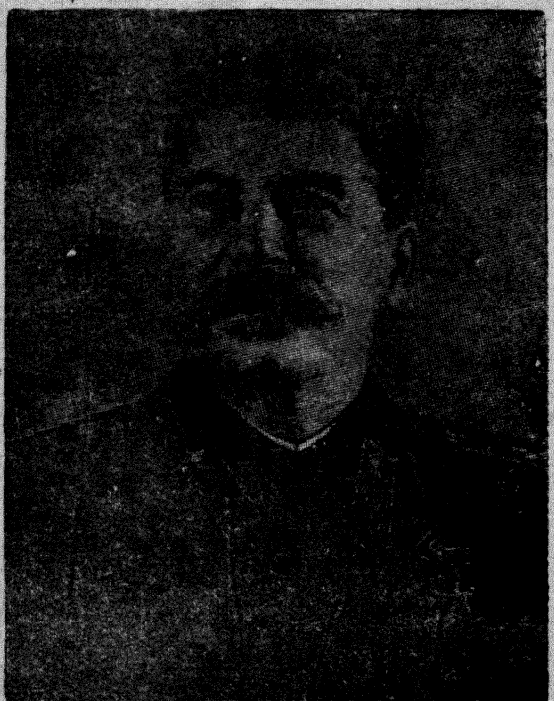

ترکی کی طرح روس بھی یورپ اور ایشیا دونوں براعظموں میں پھیلا ہوا ہے لیکن روس کا علاقہ ترکی کی نسبت کہیں بڑا ہے۔ روس کا جملہ رقبہ پچاسی لاکھ مربع میل ہے اس میں سائبیریا کا لاکھوں مربع میل کا علاقہ بھی شامل ہے۔ روس کی آبادی بیس کروڑ ہے روس کو عام طور پر روسی سوویت وفاقی اشتراکی جمہوریا U. S. S. R کے مختصر سے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس بڑی جمہوریا یا یونین فیڈریشن میں اصل میں سولہ جمہوریتیں شامل ہیں۔ ان جمہوریتوں کے نام یہ ہیں۔

روسی سوویت فیڈریٹو سوشلسٹ ریپبلک۔ یوکرینیا۔ بیلوروشیا۔ ازبکستان۔ قزاقستان۔ آذربائیجان۔ جارجیا۔ مولدویا۔ لیتوانیا۔ لٹویا۔ کرغیزستان۔ تاجکستان۔ آرمینیا۔ ترکمانیا۔ ایستونیا۔ کاریلو فنی سوویت اور جارجیا شامل ہیں۔

خاندان

اسٹالن اعظم اسی آخری جمہوریا جارجیا کی پیداوار ہے جارجیا کے صدر مقام تفلس سے باطوم کو ریل کا سفر کریں تو درمیان میں ایک چھوٹا سا قصبا گوری پڑتا ہے اسٹالن کا باپ YISSRIOMD JUGASHVILI اس قصبے کا ایک پشتی موچی تھا۔ اسٹالن کی ماں کا نام KATHERINE تھا یہ ایک کسان کی لڑکی تھی اور اپنے شوہر کی طرح بلکل ہی جاہل اور ان پڑھ تھی۔

پیدائش

اسٹالن ۲۱ دسمبر ۱۸۷۹ء کو گوری میں پیدا ہوا۔ باپ نے جوزف JOSEPH نام رکھا۔ بعد میں ماں باپ نے لاڈ سے سوسو SOSOW کے نام سے پکارنا شروع کیا تو یہی نام چل پڑا آگے چل کر اس نے اپنا نام کوبا COBA رکھا یہ نام بھی پسند نہ آیا تو ایک دوا اور نام بھی بدلے اور آخر جیل یوانوویچ IVANOVICH کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اسٹالن STALIN نام اس کے پیر یاست لینن LENIN کا دیا ہوا ہے روسی بھاشا میں اسٹالن کے معنی فولادی آدمی کے ہیں چونکے اسٹالن عزم اور ارادے میں فولاد جیسا کڑا اور سخت واقع ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے لینن نے اس کو یہ نام دیا۔

اسٹالن کا تعلق جس قوم سے ہے اس کے مرد عام طور پر لمبے چوڑے اور قوی ہیکل ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عورتیں پست قد ہوتی ہیں۔ یہاں کی عورتیں حسن کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اپنے ہم وطن مردوں کے برخلاف اسٹالن اپنی ماں کی طرح پست قد اور گٹھیلے جسم کا واقع ہوا تھا۔ اس کے رگ پٹھے ورزشی جسم کا ثبوت دیتے تھے آنکھیں چھوٹی اور غرور و تکبر میں ڈوبی ہوئیں بھویں گھنی اور لمبائی دار تھیں۔ مونچھیں اونچی اور نیچے کی طرف لٹکی ہوئیں۔

تعلیم و تربیت

بچپن میں اسٹالن کو گوری کے مدرسے میں شریک کرا دیا گیا اس کو تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر اس کے باوجود وہ مدرسے جایا کرتا تھا۔ اسٹالن ابھی گیارہ ہی سال کا تھا کہ اس کے باپ کا سایا سر سے اٹھ گیا۔ دو تین سال یوں ہی بیکاری میں گذر گئے۔ اس کے بعد اس کی ماں نے مذہبی تعلیم دلانے کا ارادہ کیا۔ کیتھرائین خود بھی مذہبی عورت تھی۔ اسی لیے اس نے ۱۸۹۴ء میں ۱۴ سال کی عمر میں سوسو کو تفلس کے GREEK ORTHODOX THEOLOGICAL SEMINER میں شریک کروا دیا۔ اب چونکے اسٹالن شہر آ چکا تھا اس لیے شہریوں سے ملنے ملانے اور ان سے خیالات کا تبادلا کرنے کے ذریعے بات آسے اسٹالن کو فطری طور پر مذہب سے کوئی لگاؤ نہ تھا ماں کے جبر پر وہ مذہبی مدرسے میں شریک ہو گیا تھا وہ مدرسے تو جاتا لیکن مذہبی کتابوں کا مطالعہ نہ کرتا۔ اس کو خدا اور مسیح سے کہیں زیادہ کارل مارکس اور زیرزمین کارناموں میں دلچسپی لینے کا اشتیاق تھا اس نے شہر کے نوجوانوں سے میل جول بڑھایا اور جو لوگ مارکسی عقیدے کے تھے ان سے مارکس کی کتابیں لے لے کر خوب ہی مطالعہ کیا۔ اس سے تفلس اور دہریت اس میں سرایت کر گئی۔ اسٹالن کے ان خیالات کے چرچے مذہبی مدرسے میں بھی ہونے لگے۔

مذہبی مدرسے سے علحدگی

اسٹالن کے گہرے مطالعے نے اس کو کچھ بے باک سا بھی بنا دیا تھا۔ چنانچے اس نے مدرسوں میں اپنے ہم جماعتوں سے کھلم کھلا مباحثے بھی شروع کر دیے تھے۔ یہ خبریں مدرسے کے صدر پادری تک پہنچیں۔ اس پر پادری نے اسٹالن کو بلا کر خوب ڈانٹا اور ڈرایا۔ لیکن اسٹالن پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا ایک سے زیادہ مرتبا اس کو مدرسے سے خارج کر دینے

کی دھمکیاں دی گئیں۔ مگر اسٹالن کے رویے میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ بلکہ اس کی چھیڑ چھاڑ اور بھی بڑھتی ہی چلی گئی۔ پادریوں نے اس کو ایک خطرہ محسوس کیا۔ اور آخر کار ۲۹ مئی ۱۸۹۹ء میں اس کو مدرسے سے خارج کر دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً ۲۰ سال کی تھی۔

سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلق اور ملازمت

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی مدرسے میں تعلیم پاتے ہوئے بھی اسٹالن نے ٹفلس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے اپنا ربط قائم رکھا تھا۔ اور جب اس کو آزادی مل گئی تو وہ اس جماعت کا باقاعدہ ممبر بن گیا۔ اس وقت اسٹالن ایک زبردست انقلابی بن چکا تھا۔ اس پارٹی کا نظام خفیہ تھا۔ اس لیے ممبروں کا حال بھی مشکل ہی سے معلوم ہو سکتا تھا۔ صرف پارٹی کا ممبر بن جانے سے وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ گذر بسر کا سامان کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ اس لیے اس نے ٹفلس کی رصد گاہ میں بہ حیثیت کلرک ملازمت اختیار کر لی۔ دفتری اوقات کے بعد وہ پورا بچا ہوا وقت پارٹی کے خفیہ کاموں میں دیتا تھا۔ دو سال تک اسٹالن نے پارٹی کی ایسی انتھک خدمات انجام دیں کہ آخر میں اس کو مجلس عاملہ کا رکن چنا گیا۔ اب تو اس کے کارناموں کا دایرا اور بھی وسیع ہو گیا اور وہ راست جماعت کے کاموں کی نگرانی اور رہبری کرنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اسٹالن اپنے ساتھیوں پر فوقیت لے گیا۔ اس کی آواز میں وزن پیدا ہو گیا ہر نئی اسکیم میں اس کی رائے اور مشورے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

لینن سے غایبانا عقیدت

روس میں لینن کا نام زبان زد عام تھا خصوصاً سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے لیے اس کا نام بڑی ہی اہمیت رکھتا تھا۔ اسٹالن اس وقت تک جارجیا سے باہر نہیں گیا تھا اس لیے لینن کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر پارٹی کے تعلق سے وہ لینن کے نام اور اس کے بے مثال کارناموں سے خوب واقف تھا اس لحاظ سے اسٹالن کو لینن سے غایبانا عقیدت ضرور ہو گئی تھی اور اس کے دل میں اس بات کی لگن تھی کہ ایک نہ ایک دن لینن سے ضرور ملے۔ بس اسی دھن میں وہ پارٹی کا کام کیے جا رہا تھا۔ اس کی عین خواہش تھی کہ اسی غیر معمولی کارنامے اس کو لینن سے قریب تر کر دیں۔ ۱۹۰۱ء میں لینن کو سائبیریا میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں اسٹالن لینن کے خیالات اور پرچار سے اس حد تک متاثر ہو گیا تھا کہ وہ تقریباً اس کے نام کی مالا جپنے لگا تھا۔ نظر بندی سے رہائی پا کر لینن پہلے سوئٹزرلینڈ چلا گیا تاکہ وہاں چین سے بیٹھ کر اپنے عقاید کا پرچار کرے۔ چنانچہ اس کام کو آگے بڑھانے کی غرض سے لینن نے "اسکرا" یا شعلہ نامی ایک خبار جاری کیا۔ اس طرح پر لینن کے چرچے اور بھی زیادہ ہو گئے۔ اس کا اخبار اور پمفلٹ ٹفلس بھی آیا کرتے تھے۔ اسٹالن کو لینن کے خیالات کا راست مطالعہ کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس سے وہ پھولے نہ سماتا تھا۔

پہلی بار جیل کی ہوا کھائی

جب ٹفلس سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے کارنامے حکومت کی نظروں میں چبھنے لگے تو آخر کار ایک روز پولیس نے اس کے خفیہ دفتر پر دھاوا ہی بول دیا۔ پولیس خاص طور پر اسٹالن کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ اور قریب کے پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ کچھ عرصا بعد جب گرفتاری کے امکانات کم ہوتے نظر آئے تو وہ پھر سے میدان عمل میں کود پڑا اور مختلف کارناموں میں مشغول رہنے لگا۔ ۱۹۰۲ء میں شہر ٹفلس میں حکومت کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے۔ ان مظاہروں میں اسٹالن نے سنڈیاں حصا لیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر اس کو

گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا۔ ۲۰ مہینے جیل میں گزارنے کے بعد وہ باہر آیا ہی تھا کہ حکومت نے اس کو خطرناک آدمی قرار دے کر ۳ سال کے لیے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا۔ مگر افسوس کہ اس بارے میں پولیس کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اس لیے کہ سائبیریا کے صوبے آرکھانگ کے شہر انڈایا اوا میں پولیس نے اس کو اتارا ہی تھا کہ وہ چلی دے کر وہاں سے بچ نکلا اور آنکھ بچا کر مالی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ رات کے گپ اندھیرے اپنے گھر پہنچ گیا۔

لینن اور ٹراٹسکی سے پہلی ملاقات

یہاں سے بچ بچا کر استالن نکل گیا اور کسی نہ کسی طرح فن لینڈ کے شہر تامیر فورس پہنچ گیا۔ ان دنوں لینن اور دوسرے مشہور مشہور قومی لیڈر یہیں رہتے تھے اور کئی ایک لیڈر خلاصی مویہ پارٹی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ استالن نے پہلی بار کانفرنس میں شرکت کی۔ اور خاموش بیٹھا تقریریں سنتا رہا۔ جب دو بار کسی پارلیمنٹ میں اپنے کمیٹی والوں کو بھیجکر کام لینے کا سوال پیدا ہوا تو استالن جھٹ سے کھڑا ہوا۔ اور ایک مختصر سی مگر جوشیلی تقریر میں اس کی شدت سے مخالفت کی۔ اور آخر میں کہا کہ ہماری پالیسی تو یہ ہونی چاہیے کہ "تشدد کا جواب تشدد سے دیا جائے"۔ اس پر کانفرنس ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لینن اس وقت ۴۰ سالا نوجوان کے جوش و خروش سے بے حد متاثر ہوا۔ اور کانفرنس کے ختم پر اس سے ملاقات کی۔ اس واقع کے بعد استالن ہمیشہ ہی لینن سے قریب رہنے لگا۔ لینن بھی اس کو پیار کرنے لگا۔ اور یہ کہ اصل میں اور ذمے دارانہ کام بھی استالن کے سپرد کیے اسی سلسلے میں مرکزی پارٹی کمیٹی کے ایک سرگرم رکن ٹراٹسکی سے بھی ملاقات ہو گئی۔

استالن کی بار بار جلاوطنی اور شادی

۱۹۰۵ء کے انقلاب کے وقت استالن باکو میں تھا۔ تیل کے چشموں کے مزدوروں سے ہڑتال کروا رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ استالن کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ یہ قول اس کے ایک دوست اور ساتھی بالشوک لیڈر KAMENEV استالن ایک نوآموز کا کن کی طرح سیاسی ہتھکنڈوں کے تجربے حاصل کر رہا تھا۔ ۱۹۰۵ء کا انقلاب ناکام رہا جس کے نتیجے کے طور پر بہت سے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور بعض کو جلاوطن کر دیا گیا۔ انہیں میں استالن بھی تھا۔ چنانچہ دوبارا اس کو سائبیریا بھیجا گیا۔ یہاں سے کئی بار وہ بھاگ نکلا اور جب کبھی پکڑا گیا پھر سے بھیجا گیا۔ اس مرتبا بھاگ کر اس نے اپنے ایک پرانے دوست اور ساتھی SYANDIZE کے گھر پناہ لی۔ چند مہینے بعد اس کی بہن CATHERINE سے استالن کی شادی ہو گئی۔ اس سے ایک لڑکا JACOB پیدا ہوا تھا جو دوسری جنگ میں جرمنوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی کچھ عرصا بعد دق میں مبتلا ہو کر مر گئی۔

شادی کے بعد استالن بخیت گھر نہ بیٹھا رہا بلکہ ہر وقت باہر جا کر کام کرتا اور پھر گھر لوٹ جایا کرتا تھا۔ وہ ایک دو روز کے لیے نہیں بلکہ مسلسل مہینوں غایب رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ بیوی اس سے کبھی راضی نہ رہی۔ اور اسی دکھ اور رنج کے باعث شاید اس کا انتقال ہو گیا مگر اس واقعے کا استالن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک کئی بار اس کو گرفتار کیا گیا۔ مگر ہر مرتبا وہ بھاگ نکلتا تھا۔ بھاگ نکلنا اور جیکما دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۱۲ء میں گرفتار کر کے اس کو فلوگدا جیل بھیجا گیا۔ چند ہی روز بعد وہ وہاں سے غایب ہو گیا۔ اور سینٹ پیٹرزبرگ جا دھمکا۔ پھر گرفتار کر کے اسی جیل خانے بھیجا گیا پھر سے رفو چکر ہو گیا۔ اس کے بعد گرفتار کر کے اب کی دفعا نرم کے جیل خانے روانا کیا گیا مگر ۱۲ اپریل ۱۹۱۲ء کو نجات حاصل کر لی۔ اس دفعہ MOLOTOV بھی جو اس کے ساتھ جیل بھگت رہا تھا بھاگ نکلا۔

اخبار "پراودا"

آخری مرتبا سینٹ پیٹرزبرگ آنے کے بعد پولیس نے اس کا پیچھا نہ کیا۔ لینن نے محسوس کیا کہ ایک کام کا آدمی بلاوجہ بھاگ دوڑ کی مصیبتیں جھیل رہا ہے۔ اس لیے اس نے اسٹالن کو صحافت کے مستقل کام پر لگا دیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کا آرگن "پراودا" کئی بار بند ہوا اور جاری بھی ہوا تھا۔ یہ اخبار لینن کی ادارت میں نکلتا تھا۔ لینن زیادہ تر کاموں میں رہتا تھا۔ اسی لیے جیسی کہ چاہیے اخبار کی نگرانی نہیں ہو سکتی تھی اسی بنا پر یہ کام اس نے اسٹالن کے سپرد کر دیا۔ اور اسٹالن کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ جس طرح اپنی پالیسی پر عمل کرے اسٹالن نے بڑی ہی سلجھی ہوئی پالیسی اختیار کی۔ اس سے اخبار کی ترقی میں چار چاند لگ گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصا بعد اسٹالن نے اخبار کے کالموں میں بالشوک حکومت کے فوری قیام پر زور دیا۔ اس وقت تک لینن پیٹروگراڈ آچکا تھا۔ لینن کو یہ بات سخت ناگوار گذری۔ اسٹالن نے اس سے معافی بھی چاہ لی۔

اسٹالن ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے

سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو پیسے کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ کوئی تدبیر سجھائی نہ دیتی تھی کہ کس طرح اور کہاں سے رقم حاصل کی جائے۔ اتفاق سے یہ خبر ملی کہ کھلنس کے بنک سے ۳½ لاکھ روبل کی رقم پائے تخت آنے والی ہے۔ یہ سن کر ارکان پارٹی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مشورے ہوئے کہ اس رقم کو کس طرح پر ہتھیایا جائے۔ سب کہتے ضرور تھے مگر کوئی اعلیٰ کام کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ اسٹالن نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ دو چار جانبازوں کو مسلح کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔ شہر سے بہت دور سنسان مقام پر تاک میں بیٹھا رہا۔ جب خزانا قریب آیا یہ لوگ ایک دم ٹوٹ پڑے دو چار سپاہی جو بھی تھے انہیں مار بھگایا۔ اور پوری رقم اپنے ہاتھ کر لی۔ اس سے پوری پارٹی اور خصوصاً لینن بہت خوش ہوا۔ یہ واقعہ ۱۳ جون ۱۹۱۷ء کا ہے۔

اکتوبر انقلاب اور اسٹالن کا عروج

کچھ عرصا پہلے لینن، اسٹالن کی جس بات پر بگڑا تھا اب حالات کو موافق پاکر خود اس نے یہ تصفیا کیا کہ حکومت کی باگ سنبھالنی چاہیے۔ اس نے اپنا یہ فیصلا ۲ ستمبر ۱۹۱۷ء کو پیٹروگراڈ کی مجلس عمل کے نام لکھ بھیجا۔ لینن کے اس فیصلے سے اسٹالن کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس لیے کہ اصل تحریک تو اسٹالن ہی کی تھی۔ بہر حال روس کے سب سے زبردست "انقلابی" کی تیاریاں نہ صرف زوروں پر بلکہ نہایت ہی تیزی اور تنظیم کے ساتھ شروع ہو گئیں۔

مئی ۱۹۱۷ء سے حکومتی فوجوں کی حالت خراب ہوتی گئی اور ان میں سخت انتشار پیدا ہو گیا۔ سرخ چھاپا مار دستوں نے حکومتی فوجوں کو کئی ایک جگہ سخت ہزیمت دی۔ اور بعض اوقات تو ہتیار رکھوا لیے۔ ان واقعات کے بعد رہی سہی فوجوں کا دل ٹوٹ گیا۔ چنانچہ کبھی کبھا یسا بھی ہوتا کہ پوری پلٹن کی پلٹن سرخ دستوں سے آملتی۔ اکتوبر کے مہینے میں تو یہ وبا ایک بھاری انقلاب کی شکل میں پھوٹ پڑی جس سے سرخ فوجوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ حکومتی فوجیں ہراساں اور پریشان ہو کر تتر بتر ہو گئیں۔ شہر کے ایک وسیع حصے پر بالشوکوں کا قبضا ہو گیا۔ مگر جنوبی حصے میں ابھی جنگ جاری تھی۔ اس محاذ پر اب تک اسٹالن ڈٹا ہوا تھا۔ چنانچہ ۵ جنوری ۱۹۱۹ء کو اسٹالن نے لینن کے نام ایک خط میں لکھا "تیسری فوج کے تیس ہزار آدمیوں میں سے گیارہ ہزار باقی ہیں۔ اور ان میں اتنی سکت نہیں کہ دشمن کا مقابلا کر سکیں۔ تراسکی نے جو کمک بھیجی تھی وہ بھروسے کے قابل نہ نکلی"۔ اس سے لینن بے حد متاثر ہوا۔ اور اسٹالن کی ہر طرح سے مدد کا بیڑا اٹھایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ لینن نے اسٹالن کو پورے اختیارات بھی دیدیے۔ اس سے اسٹالن کے حوصلے بڑھ گئے اور ڈٹ کر مقابلا شروع کر دیا۔

اس کے بعد سے کئی ایک محاذوں پر اس کو کامیابی ہوئی۔ خصوصاً جنرل IVANKOV اور جنرل RANGEL کے تو اس نے دانت کھٹے کر دیے۔ آخر ۱۹۲۰ء میں فیصلاکن جیت کا سہرا اسٹالن کے سر رہا۔ لینن کے نزدیک اس کی قدر اور اہمیت بہت بڑھ گئی۔

قلمدانِ وزارت اور جنرل سکریٹری

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد سوویت یونین کا پہلا صدر باتفاق آرا لینن چنا گیا۔ کابنیا میں اور شخصیتوں کے علاوہ اسٹالن بھی شامل تھا جس کو قوموں کی دیکھ بھال کا غیر اہم قلمدان دیا گیا تھا۔ جب لینن کی صحت جواب دینے لگی تو اس کو ایک مستعد اور کارگذار سکریٹری کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ اس نے ٹراٹسکی پر اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ اسٹالن کو یہ خدمت دی جانی چاہیے۔ چونکہ اسٹالن سے ٹراٹسکی کے تعلقات پہلے ہی سے کشیدہ تھے۔ اس لیے اس نے پہلے تو ناک بھوں چڑھائے اس کے بعد خاموش ہو رہا۔ مگر لینن نے اپنا آخری اور اٹل فیصلا سنا ہی دیا چنانچہ جنوری ۱۹۲۲ء سے اسٹالن نے یہ کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ اسٹالن نے چند ہی مہینوں میں پارٹی کے کام کو تیز کر دیا اتنا تیز جس کو خود لینن بھی پسند نہ کرتا تھا۔ اسٹالن کی ان جلد بازانہ حرکتوں سے لینن بھی تنگ آگیا تھا وہ ابھی اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ مئی ۱۹۲۳ء میں اس پر فالج کا حملا ہو گیا داہنی جانب کا پورا آدھا جسم معطل ہو گیا۔ اب اسٹالن نے ٹراٹسکی کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی مگر وہ اکڑا ہی رہا۔

کچھ عرصا بعد جب لینن کو تھوڑی بہت صحت ہو گئی اور اسٹالن کے آمرانا افعال کی خبریں اس کے کانوں میں پہنچیں تو اس کو بڑا ہی دکھ ہوا۔ مگر وہ عمل کچھ کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس کی یہ صحت عارضی تھی۔ جب حرارت بڑھنے لگی تو ڈاکٹروں کے مشورے سے اس کو قفقاز کے شہر سوکھوم تبدیل آب و ہوا کی غرض سے بھیجا گیا لیکن دسمبر ۱۹۲۳ء میں آخر کار اس کا انتقال ہو گیا۔

لینن کے بعد

لینن کی بیماری کے زمانے ہی سے اسٹالن اپنے لیے میدان ہموار کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس لیے کہ اس کو ٹراٹسکی سے بہت زیادا ڈر لگا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے زنوویف اور کامینیف پارٹی کے دو بہودی سرگرم ارکان کو ہم خیال بنا لیا تھا سو لوٹف تو ہمیشا ہی سے اسٹالن کا ہم نوا تھا۔ زنوویف بخارن۔ زنکنسی اور لوموف بے خطر آدمی تھے۔ جن کو ہم خیال بنا لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

اسٹالن نے چال یہ چلی کہ جنرل سکریٹری کے انتخابی جلسے میں تحریک تو زنوویف سے کروائی اور تائید کامینیف سے۔ ان دونوں نے اسٹالن کی تائید میں وہ دھواں دھار تقریریں کیں کہ ٹراٹسکی مونھ ہی تکتا رہ گیا۔ دوسرے ارکان بھی بے حد متاثر ہوئے۔ جس کے نتیجے کے طور پر اسٹالن بلا اختلاف پارٹی کا جنرل سکریٹری چن لیا گیا۔

اسٹالن بحیثیت لیڈر پارٹی

لیڈر آف دی پارٹی بننے کے بعد اسٹالن حکومت روس کا کرتا دھرتا بھی بن گیا۔ اس سے پہلے اس نے ایک کمزور آدمی ایکوف کو لینن کا جانشین یعنی صدر چنوا لیا تھا۔ یہ شخص بے ضرر اور بے خطر اور برائے نام تھا۔ کامل اختیارات کی باگ تو اسٹالن ہی کے ہاتھ میں تھی جنوری ۱۹۲۵ء میں اسٹالن نے ٹراٹسکی سے وزیر جنگ کا عہدا چھین لیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ اگر وہ چاہے تو بیرونی مراعات کا عہدا قبول کر سکتا ہے۔ ٹراٹسکی نے اس خدمت کو قبول کر لیا۔ بعد میں بیمار ہو کر برلن گیا۔ علاج کے بعد واپس آ کے حکومت کے معاملات میں پھر سے مداخلت شروع کر دی۔ مئی ۱۹۲۶ء کی عام ہڑتال اور اکتوبر ۱۹۲۶ء میں لینن گراڈ کے زیر دست

مظاہرے میں تراتسکی کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ مظاہرہ اسکو میں بھی کروایا گیا۔ اب وہ کھلے طور پر پارٹی کا مخالف بن گیا۔ اس کی شاطرانہ چالوں سے نجات پانے کے لیے اسٹالن نے جنوری ۱۹۲۸ء میں اس کو جلاوطن کر دیا۔ ۱۹ر فروری ۱۹۲۹ء کو وہ ترکی پہنچا۔ وہاں سے فرانس اور انگلستان گیا۔ یہاں پناہ نہ ملنے پر وہ میکسکو چلا گیا۔

بہرحال اپنے بھاری دشمن تراتسکی کے چلا جانے کے بعد اسٹالن کو دوسرے چھوٹے موٹے مخالفوں کی طرف دھیان دینا پڑا۔ یہ کام اس نے نہایت آسانی سے کر لیا۔ دیس کے نئے نظم و نسق کو سنبھالنے اور سدھارنے کی غرض سے اسٹالن کو بڑی پالیسی سخت سے سخت تر کر دینی پڑی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ایک نئے انقلاب کی فراتفری دور نہ ہو سکتی بلکہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں پانسا نہ پلٹ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی سخت گیر پالیسی اور تدبر سے اس نے دیس دشمن عناصر کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دیں۔ اس سخت پالیسی کے سبب اس کو ڈکٹیٹر کا لقب دیا گیا۔

پانچ سالا منصوبا اور اسٹالن کے قتل کی سازش

دیس کی حالت انقلاب سے پہلے ہی سے خراب تھی، انقلاب کے بعد تو دیس اور بھی تباہ ہو چکا تھا۔ اس گری حالت کے پیش نظر اسٹالن نے پانچ سالا منصوبا بنایا۔ اس منصوبے یا اسکیم کے دو بھاری مقصد تھے۔ اول یہ کہ ملک کی پیداوار بڑھائی جائے اور پورے دیس میں صنعتوں کا جال پھیلا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے طے یہ پایا کہ ملک کے اندر ہی بھاری قرضا حاصل کیا جائے اور یہ کہ جنتا سے چندے بھی وصول کیے جائیں۔ چندوں کی وصولی کے سلسلے میں بڑی بددلی پھیل گئی۔ بہرحال انگلستان اور یورپ کے دوسرے دیسوں سے ٹریکٹر منگوا کر کاشت کی گئی۔ پہلا ہی تجربا ناکام رہا۔ دشمنوں کو موقع ہاتھ آیا انہوں نے جنتا کو اکسا بھڑکا کر فساد پر آمادا کر لیا۔ طے یہ پایا کہ جنرل واسلی بلوکر کو روس کا ڈکٹیٹر بنایا جائے اور اسٹالن کو قتل کر دیا جائے۔ سازش معلوم ہو گئی دشمنوں کو بری طرح سے نہ اچھلنا پڑا۔ اسٹالن پست ہمت نہ ہوا۔ کام کو آگے بڑھاتا ہی گیا۔ دو سال بعد سے کام کے اچھے نتیجے نکلنے لگے اس سے متاثر ہو کر پوری جنتا اس طرف دھیان دینے لگی۔ آخر میں پانچ سالا منصوبا کامیاب ہو کر ہی رہا۔ اس کے بعد اسٹالن نے ایک دوسرا پانچ سالا منصوبا شروع کیا۔

دوسری عالمگیر جنگ اور اسٹالن

اگرچہ ۱۹۲۷ء میں اسٹالن نے روس کا سیاسی اقتدار حاصل کیا تھا۔ اس کے عہدہ سنبھالنے کے بعد سے وہ روس دیس کا مالک حالا اور ڈکٹیٹر بن گیا تھا ڈکٹیٹر بھی ایسا کہ جس کے آگے کوئی چوں تک نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے زار ان روس جیسی ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت کی زندگی بسر نہیں کی وہ ایک سیدا سادا انسان تھا اس کی غذا اور لباس میں تک سادگی تھی۔ اس نے کبھی بھی عیش و آرام کی زندگی بسر نہیں کی۔ اس نے اپنے آپ کو دیس اور جنتا کی سیوا کے لیے وقف کر دیا تھا اور مرے دم تک وہ اپنے اس طرز عمل پر قایم رہا۔

جب جرمن قوم نے روس پر حملا کر دیا تو ۱۹۴۱ء میں اسٹالن نے پہلی بار وزیر اعظم کا لقب اختیار کیا اور ساتھ ہی روسی فوجوں کا کمانڈر انچیف بھی کہلوایا۔ ۱۹۴۳ء میں اس کو مارشل کا لقب دیا گیا اور جون ۱۹۴۵ء میں وہ جنرلاسمو آف U.S.S.R کہلوایا گیا۔

۱۹۴۵ء جبکہ دوسری عالمگیر جنگ زوروں پر تھی اسٹالن نے ایران کے پایہ تخت طہران میں امریکا کے صدر روزولٹ اور انگلستان کے وزیر اعظم چرچل سے پہلی بار ملاقات کی۔ تین بڑوں کی یہ کانفرنس جنگی مسئلوں پر تبادلہ خیال کرنے اور جنگ کے ختم ہونے والے مسئلوں پر بحث و مباحثہ کرنے

غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ کانفرنس اپنی نوعیت سے کامیاب رہی۔ اس کے چند ہی مہینے بعد ایک ورایسی ہی کانفرنس یقام یالٹا منعقد کی گئی۔ اس میں بھی یہی مسایل زیر بحث رہے۔ اس سلسلے کی تیسری اور آخری کانفرنس ۱۹۴۵ء کے اواخر میں بمقام پوٹسڈم منعقد ہوئی۔

اوپر بتائی ہوئی تینوں کانفرنسوں میں استالن نے چرچل اور روزولٹ کو خوب خوب ہی الو بنایا۔ اپنی دیس کی گری ہوئی حالت کا دکھڑا روتے ہوئے ان دونوں اور خاص طور پر روزولٹ سے آلات حرب اور دولت کھینچی۔ اپنے مالیے کو محفوظ رکھ کر ان سے حاصل کی ہوئی دولت اور سامان سے دشمن کا مقابلہ کرنا استالن کے گہرے تدبر اور دور اندیش سیاست دانی کی دلیل ہے جس کو نہ صرف نیا بلکہ خود چرچل اور روزولٹ بھی قایل ہو گئے تھے۔

ان تینوں دلوں کا یہ اتحاد محض دودھ کا ابال ثابت ہوا۔ جنگ کے ختم پر دو بڑے ملک انگلستان اور امریکا دنیا میں اپنی پالیسی چلانا چاہتے تھے۔ استالن ان کی چالوں کو بھانپ گیا تھا۔ اس لیے اس نے ان دونوں سے اپنا ناتا رشتا توڑ لیا۔ چاچے اس وقت سے ان تینوں ملکوں میں سرد جنگ (اعصابی جنگ) شروع ہو گئی ہے۔ ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو استالن کے انتقال نے اس اہم مسلے کو پھر سے غور و فکر کا مرکز بنا دیا ہے۔

امن کا علم بردار سوویت یونین امن کا حامی اور امن کا علم بردار ہے۔ سوویت یونین قوموں کے بیچ ملاپ اور دوستی کی تلقین کرتا اور جنگ کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے سوویت خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے اکتوبر انقلاب عظیم کی ۳۶ ویں سالگرہ کے موقع پر جی۔ ایم۔ مالینکوف کی رپورٹ میں امن کا سوویت پروگرام مفصل طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس پروگرام میں بڑی طاقتوں کا باہمی تعاون، تنظیم جائز میں تخفیف اور ایٹمی ہتیاروں کی غیر مشروط ممانعت بھی شامل ہیں۔

استالن ہی نے ماسکو کی تہذیبی زندگی میں جان ڈالی

ماسکو کے تہذیبی اداروں کے کارکنوں کے ایک جلسے میں سوویت راجدھانی میں تہذیبی اور تعلیمی کام کی بے پناہ وسعت کے متعلق دلچسپ اعداد و شمار سننے میں آئے۔

آج کل ماسکو میں ۲۶۶ کلب گھر، تہذیب گھر اور تہذیب محل تین ہزار سے زیادہ مطالعہ خانے، سینکڑوں لائبریریاں عجایب گھر نمایش گاہیں اور سینما موجود ہیں۔ ان سب کا مقصد، کش عوام کے تہذیبی اور نظریاتی معیار کو بلند کرنے میں بڑا اہم حصہ ہے۔ گذشتہ سال ماسکو میں سیاسی اور تعلیمی موضوعات پر نوے ہزار سے زیادہ لیکچر ہوئے اور بیس ہزار سے زیادہ کانفرنسیں منائی گئیں۔ رقص و سرود، ڈراما اور فنون لطیفہ میں شوقیہ حصہ لینے والوں کے مظاہروں سے پتا چلا کہ کارخانوں اور دفتروں کے مزدوروں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں اور انہوں نے اس سلسلے میں بڑی ترقی بھی کی ہے۔

پچھلے پانچ برسوں میں اجدھانی کی پبلک لائبریریوں اور مزدور سبھا کے کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد پچاس فیصدی بڑھ گئی اور ایک کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ ہے لائبریریوں سے فایدہ اٹھانے والوں کی تعداد بھی ۴۰ لاکھ سے بڑھ کر ۶۰ لاکھ ہو گئی ہے۔ ان میں مزدوروں سے ملاقاتیں سائنسدانوں اور انجینیروں سے ملاقاتیں منظم کرائی جاتی ہیں۔ ماسکو کے بارکوں میں جہاں تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیاں وسیع پیمانے پر ہوتی ہیں، ہر سال ۲ کروڑ سے زیادہ لوگ آتے ہیں۔

خرداد ۱۳۶۲ ش — ہندوستانی ادب — اپریل ۱۹۵۳ء

سوویت یونین کی مجلسِ وزرا کے صدر نشین (وزیرِ اعظم) اور کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری گ۔م مالینکوف کی تقریر

پیارے ہم وطنو! ساتھیو! دوستو! اور دوسرے ملکوں کے بھائیو!

ہماری پارٹی سوویت عوام کل انسانیت کا شدید ترین ناقابلِ تلافی نقصان ہو گیا ہے ہمارے معلم اور رہنما انسانیت کے عظیم ترین عالم جوزف وساریونووچ اسٹالن کی تابناک زندگی کا رستا آخری منزل پر آ گیا۔

ان صبر آزما دنوں میں سوویت عوام کے انتہائی شدید غم میں کل ترقی یافتا اور ترقی پسند انسانیت شریک ہے۔۔

سوویت مرد اور عورتوں کو دنیا کے تمام خطوں کے عوام کو اسٹالن کا نام بے انتہا پیارا ہے۔ سوویت عوام کے لیے اور سارے دیسوں کے محنت کش عوام کے لیے کامریڈ اسٹالن کے کاموں کی عظمت اور اہمیت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اسٹالن کا نصب العین لازماً صدیوں باقی رہے گا۔ اور احسانمند نسلیں اسٹالن کے نام کو اتنی ہی عظمت دیں گی جس طرح کہ ہم دیتے ہیں۔

کامریڈ اسٹالن نے مزدور طبقے اور تمام محنت کش عوام کو لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے ظلم اور ان کی غلامی سے آزاد کرے۔ تباہ کن جنگوں سے انسانیت کو نجات دلانے کے لیے کرہ ارض پر محنت کشوں کے لیے آزادی اور سکھ کی زندگی کی جد و جہد کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

ہمارے زمانے کے بڑے مفکر کامریڈ اسٹالن نے نئی تاریخی صورت حالات میں مارکسزم۔ لینن ازم کی تعلیمات کو تخلیقی طور پر ترقی دی۔ انسانیت کی پوری تاریخ کی عظیم ترین ہستیوں ۔ مارکس۔ اینگلز۔ لینن کے ناموں کے ساتھ بجا طور پر اسٹالن کا نام آتا ہے۔

ہماری پارٹی مارکسزم لینن ازم کی عظیم تعلیم پر چلتی ہے جو پارٹی اور عوام کو ناقابلِ تسخیر قوت تاریخ میں نئی راہیں روشن کرنے کی استعداد بخشتی ہے۔

روپوشی کی سخت مصیبتیں جھیل کر لینن اور اسٹالن روس کے عوام کو شخصی حکومت کی غلامی سے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ظلم و استبداد سے چھٹکارا دلانے کے لیے برسوں تک جد و جہد کرتے رہے لینن اور اسٹالن کی رہنمائی میں سوویت عوام نے بنی نوع انسان کی تاریخ میں سب سے بڑا موڑ پیدا کیا ہمارے دیس میں سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کیا اور ایک نئے رستے پر۔ اشتراکیت کے رستے پر چل پڑے۔

لینن کے کام کو جاری رکھتے ہوئے اور ہماری پارٹی اور سوویت ریاست کے سامنے رستے کو روشن کرنے والی لینن تعلیم کو متواتر ترقی دیتے ہوئے کامریڈ اسٹالن نے ہمارے دیس کو اشتراکیت کی وہ فتح دلوائی جس نے ایک نئے دور کا آغاز کیا جس نے انسانی سماج کے وجود کو ہزارہا سال کے عرصے میں پہلی بار انسان کے ہاتھوں انسان کی لوٹ کھسوٹ کے خاتمے کی ضمانت دی۔

لینن اور اسٹالن نے دنیا کی سب سے پہلی مزدوروں اور کسانوں کی ریاست کی بنیاد رکھی۔ ہماری سوویت ریاست کی بنیاد رکھی۔ کامریڈ اسٹالن نے سوویت ریاست کو طاقتور بنانے کے لیے انتھک کام کیا۔ ہماری ریاست کی ٹھوس قوت اور بلاواسطہ ہمارے دیس میں کمیونزم کی کامیاب تعمیر کی اہم ترین لازمی شرط ہے۔

اپنی عظیم اشتراکی ریاست، امن اور قوموں کی حفاظت کے قلعے کو بغیر تھکے اور ہر طرح سے مستعد مضبوط کرتے رہنا ہمارا مقدس فرض ہے۔

کامریڈ اسٹالن کے نام کے ساتھ سماج کے ارتقاء کی تاریخ کے ایک نہایت پیچیدہ اور اہم تاریخی دور کا نام جڑا ہوا ہے۔ یہ دور ہے سوشلزم کی تعمیر کا دور۔ مفکر کامریڈ اسٹالن نے تاریخ میں پہلی بار ایک بہت بڑی اور بہت سی قوموں والی ریاست میں صدیوں پرانے قومی لڑائی جھگڑوں کے خاتمے کی ضمانت دی۔ کامریڈ اسٹالن کی رہنمائی میں ہماری پارٹی نے پہلے کی مظلوم قوموں کی اقتصادی اور تہذیبی پسماندگی کو ختم کیا۔ سوویت یونین کی تمام قوموں کو نیل ملاپ والے ایک کنبے کو متحد کیا اور قوموں کو باہمی دوستی کے رشتے میں جوڑا۔

سوویت ریاست کی قوموں کے اتحاد اور ان کی دوستی کو اور زیادہ ٹھوس بنانے، بہت سی قوموں والی سوویت ریاست کو طاقتور بنانے کی ضمانت کرنا ہمارا مقدس فرض ہے۔

براہ راست کامریڈ اسٹالن کی رہنمائی میں سوویت فوج بڑی اور طاقتور ہوئی۔ کامریڈ اسٹالن اس بات پر ہر وقت نظر رکھتے تھے کہ ملک کی مدافعتی قوت مستحکم ہو اور سوویت مسلح فوجیں طاقتور بنیں۔ عظیم سردار جنرلیسمو اسٹالن کی قیادت میں سوویت مسلح فوجوں نے دوسری عالمی جنگ میں تاریخی فتح حاصل کی۔ اور یورپ و ایشیا کی قوموں کو فاشسٹ غلامی کے خطرے سے نجات دلائی۔

طاقتور سوویت مسلح فوجوں کو ہر طرح تقویت پہنچانا ہمارا مقدس فرض ہے۔ دشمن کے ہر حملے کا منھ توڑ جواب دینے کے لیے ہمیں انہیں لڑائی کے لیے پوری طرح لیس رکھنا چاہیے۔

کامریڈ اسٹالن کی انتھک کوششوں کی بدولت ان کے بنائے ہوئے منصوبوں کے مطابق ہماری پارٹی نے پہلے کے پس ماندہ ملکوں کو زیردست صنعتی اور پنچایتی فارم والی ریاستوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایک نیا اقتصادی نظام بنایا جو اقتصادی بحرانوں اور بیروزگاری سے بالکل پاک ہے۔

اشتراکی وطن کی مزید ترقی کی ضمانت کرنا ہمارا مقدس فرض ہے۔ ہمیں اشتراکی صنعت کو ہر طرح ترقی دینی چاہیے جو ہمارے ملک کی ٹھوس قوت اور طاقت کا سنگ بنیاد ہے۔ ہمیں پنچایتی فارم کے نظام کو تقویت دینی چاہیے۔ سوویت دیس کے تمام پنچایتی فارموں کی مزید ترقی اور خوش حالی کی کوشش کرنی چاہیے۔ مزدور طبقے اور پنچایتی فارم کے کسانوں کے اتحاد کو مستحکم کرنا چاہیے۔

اندرونی پالیسی کے سلسلے میں ہماری سب سے بڑی توجہ اس بات پر ہے کہ مزدور، پنچایتی کاشتکاروں دانشوروں تمام سوویت عوام کی مادی سہولتیں مزید بہتر ہوں۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ان کی مادی اور تہذیبی ضرورتیں زیادہ سے زیادہ پوری کرنے کے لیے ہر طرح اور ہمیشہ انتھک محنت کرنے کا فرض ہماری پارٹی اور حکومت کا قانون ہے۔

لینن اور اسٹالن نے ہماری پارٹی کو سماج میں تبدیلی لانے کی زبردست قوت کی حیثیت سے پیدا کیا اور بنایا۔ زندگی بھر کامریڈ اسٹالن ہمیں سکھاتے رہے کہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہونے سے زیادہ اہم اعزاز اور کوئی نہیں ہے دشمنوں کے خلاف مسلسل جدوجہد میں کامریڈ اسٹالن نے ہماری پارٹی کے اتحاد اور اس کی ٹھوس یک جہتی کو سنوارا۔

عظیم کمیونسٹ پارٹی کو طاقتور بناتے رہنا ہمارا مقدس فرض ہے۔ پارٹی کی صفوں میں اتحاد اور یک جہتی

عزم و عمل کا اتحاد۔ اپنے عزم کو پارٹی کے عزم اور خواہشات میں مدغم کرنے کی پارٹی ممبروں کی اہلیت ہماری پارٹی کی طاقت اور ناقابل تسخیر قوت ہے۔ عوام سے ہماری پارٹی کے اٹوٹ بندھن اس کی طاقت اور ناقابل تسخیر قوت ہیں۔ عوام کے مفادات کے لیے پارٹی کی پرعزم خدمت پارٹی اور عوام کے اتحاد کی بنیاد ہے پارٹی کے اتحاد کو ہمیں اپنی آنکھ کی پتلی کی طرح حفاظت کرنی چاہیے۔ عوام سے پارٹی کے اٹوٹ بندھنوں کو اور بھی زیادہ مضبوط کرنا چاہیے۔ کمیونسٹوں اور تمام محنت کش عوام کو تہایت عالا چانے کی سیاسی خبرداری اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خلاف جدوجہد میں کسی قسم کا سمجھوتا نہ کرنے اور ضعفوں سے کام لینے کی تعلیم دینی چاہیے۔

عظیم استالن کی قیادت میں امن جمہوریت اور اشتراکیت کا ایک طاقتور محاذ قایم ہو گیا ہے۔ اس محاذ میں سوویت عوام کے ساتھ قریبی دوستانا تعاون قایم کر کے قدم سے قدم ملاے عظیم چینی عوام، پولینڈ، چیکوسلواکیا، بلغاریا، ہنگری، رومانیا، البانیا، جرمن جمہوری ری پبلک، منگولیا کی عوامی جمہوریاؤں کے عوام آگے بڑھ رہے ہیں۔ کوریا کے بہادر عوام زبردست معرکوں میں اپنے وطن کی خودمختاری کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ویت نام کے عوام اپنی آزادی اور قومی خودمختاری کے لیے ہمت و شجاعت کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔

عوام کی سب سے بڑی جیت — امن، جمہوریت اور اشتراکیت کے محاذ کی حفاظت کرنا، طاقت پہنچانا، جمہوری محاذ کے ملکوں کے عوام کے ساتھ دوستی اور تعاون کے رشتے کو مستحکم کرنا ہمارا مقدس فرض ہے۔ سوویت یونین کی عظیم چینی قوم کے ساتھ تمام عوامی جمہوریتوں کے محنت کش عوام کے ساتھ دائمی، اٹوٹ برادرانہ دوستی کو ہمیں ہر طرح مضبوط اور محفوظ کرنا چاہیے۔

تمام ملکوں کی قومیں کامریڈ استالن کو امن کے عظیم عام برادری کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ تمام ملکوں کی قوموں کے لیے امن برقرار رکھنے کے واسطے کامریڈ استالن نے سب سے زیادہ کوششیں کیں۔ اپنے علم و دانش کو وقف کیا۔ سوویت ریاست کی خارجہ پالیسی امن اور قوموں میں باہمی میل ملاپ کی پالیسی ایک اور جنگ جلد شروع کرنے کی کوششوں کی راہ میں فیصلہ کن رکاوٹ ہے اور تمام قوموں کے اہم ترین مفادات کے عین مطابق ہے۔ سوویت یونین نے ہمیشہ ہی امن کے کاز کو اپنایا ہوا اور اب بھی اپنایا ہے کیونکہ امن عالم کے کاز سے اس کے مفادات کو کبھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ سوویت یونین امن کو محفوظ رکھنے اور تقویت پہنچانے کی کیساں پالیسی پر ایک اور جنگ کی تیاری اور جنگ چھیڑنے کے خلاف جدوجہد کی پالیسی پر، قومی تعاون اور تمام ملکوں سے تجارتی تعلقات بڑھانے کی پالیسی پر و مختلف نظاموں ـــ سرمایہ داری اور اشتراکی نظاموں کے طویل عرصے تک پہلو بہ پہلو موجود رہنے اور پرامن باہمی مقابلے کے امکان سے متعلق لینن اور استالن کی تصریحات کے مطابق مرتبا پالیسی پر چلتی رہی اور چلتی ہے۔

استالن عظیم نے ہمیں بے انتہا خلوص کے ساتھ عوام کے مفادات کی خدمت کرنے کی اسپرٹ میں تربیت دی۔ ہم عوام کے وفادار خادم ہیں اور عوام امن چاہتے ہیں وہ جنگ سے نفرت کرتے ہیں۔ کاش لاکھوں کا خون بہائے جانے کو روکنے کی عوام کی خواہش، سکھ چین کی زندگی کی پرامن تعمیر کی حفاظت کرنے کی خواہش ہم سب کے لیے مقدس رہے۔

خارجہ پالیسی میں ہماری سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایک اور جنگ نہ ہونے دیں۔ تمام ملکوں کے ساتھ امن چین کی زندگی بسر کریں۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی اور سوویت حکومت کی رائے ہے کہ سب سے زیادہ اہمی ضروری اور مقصد خارجہ پالیسی تمام قوموں میں باہمی اعتماد پر مبنی امن کی پالیسی حقایق پر مبنی

اور حقایق سے تصدیق شدہ کارگر پالیسی ہے جو حکومتوں کو اپنے عوام کی پرخلوص خدمت کرنی چاہیے اور عوام امن کی آرزو ہے اور جنگ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ حکومتیں جو عوام کو دھوکا دینا چاہیں گی اور جو امن برقرار رکھنے اور ریک اور خونریزی کو روکنے کی عوام کی مقدس خواہش کے خلاف عمل کریں گی وہ مجرم ہوں گی۔ کمیونسٹ پارٹی اور سوویت حکومت کی رائے ہے کہ قوموں میں امن برقرار رکھنے کی پالیسی ہی واحد صحیح پالیسی ہے جو تمام قوموں کے اہم ترین مفادات کے عین مطابق ہے۔

ساتھیو! ہمارے رہنما اور استاد استالن اعظم کے اٹھ جانے سے تمام سوویت مرد اور عورتوں پر فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ سوویت عوام کے سامنے جو شاندار کام ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے اپنی کوششیں دوچند کر دیں۔ کمیونسٹ سماج کی تعمیر اپنے سب کے اشتراکی وطن کی قوت اور مدافعتی صلاحیت بڑانے کے مشترکہ مقصد کی تکمیل میں اپنا حصا بڑا دیں۔

سوویت یونین کی محنت کش عوام دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں ہمارا طاقت ور ریاستی کا میابیوں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ مکمل کمیونسٹ سماج کی تعمیر کے لیے ہمیں ضرورت کی ہر شے مہیا ہے۔

اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی قوتوں اور صلاحیتوں پر اٹل بھروسے کے ساتھ سوویت عوام کمیونزم کی تعمیر کا عظیم الشان مقصد عملی طور پر پورا کر رہے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو کمیونزم کی جانب سوویت سماج کی زبردست پیش قدمی کو روک سکے۔ الوداع ہمارے استاد! ہمارے رہنما۔ ہمارے پیارے دوست! ہمارے اپنے پیارے کامریڈ استالن۔

آؤ ہم سب لینن اور استالن کے عظیم الشان ضبط العین کی کامل فتح کی شاہراہ پر آگے بڑھتے چلیں۔

نیویارک ٹائمز کے سیاسی نامانگار جیمز لیسٹن کے سوالات پر جے وی استالن کے جوابات

(۲۱ دسمبر ۱۹۵۲ء)

سوال۔ سال نو کی آمد پر اور ریاست ہائے متحدہ میں نئے انتظامات کے آغاز پر کیا آپ کا اب بھی یہی عقیدہ ہے کہ سوویت اشتراکی جمہوریوں کی یونین اور ریاست ہائے متحدہ آنے والے زمانے میں امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں؟

جواب۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا اور سوویت یونین کے درمیان جنگ کو ناگزیر تصور نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ ہمارے ملک امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں

سوال۔ آپ کی رائے میں موجودہ بین قومی کشیدگی کے سرچشمے کہاں ہیں؟

جواب۔ ہر جگہ اور ہر اس شے میں جہاں سوویت یونین کے خلاف "سرد جنگ" کی پالیسی کے جارحانہ عمل ظہور پذیر ہوتے ہیں

سوال۔ عالمی کشیدگی کو دور کرنے کے لیے آپ کی اور جنرل آیزن ہور کی ایک ملاقات کے امکان کے لیے کیا آپ نے آیزن ہور انتظامات کے نمایندوں کے ساتھ سفارتی گفت و شنید کو خوش آمدید کہیں گے؟

جواب۔ میں ایسی تجویز کو مناسب حال تصور کرتا ہوں۔

سوال۔ جنگ کوریا کا خاتمہ کرنے کی غرض سے کسی نئی سفارتی گفت و شنید میں کیا آپ تعاون کریں گے۔

جواب۔ میں تعاون کرنے کو راضی ہوں۔ کیونکہ کوریا میں جنگ کا خاتمہ کرنے سے سوویت یونین کو دلچسپی ہے۔

سوال۔ کیا آپ واقعی امن کے سچے علم بردار ہیں۔

جواب۔ اس کا بہتر جواب سارا زمانہ دے گا۔

استالن کے دیے ہوئے سوویت باشندوں کے سیاسی حقوق

ام۔ راگنسکی

سوویت یونین میں جہاں حکومت کی باگ ڈور عوام کے ہاتھوں میں ہے، شہروں اور دیہات کے کئی لاکھ محنت کش عوام سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ سوویت یونین کے تمام باشندوں کو بلا لحاظ قومیت و نسل تمام بنیادی آزادیاں اور حقوق حاصل ہیں۔

سب سے زیادہ اہم حق ریاستی اداروں کا انتخاب کرنے اور منتخب ہونے کا حق ہے۔ سوویت یونین میں حکومت کے تمام ادارے گاؤں اور شہر کی بستیوں سے لے کر کل سوویت یونین کی مجلس علا تک اور ان کے علاوہ اعدائتوں کا انتخاب بھی عام مساوی اور براہ راست حق رائے دہندگی کے بنیاد پر ہوتا ہے اور ووٹ تنہائی اور راز میں ڈالے جاتے ہیں۔

عام حق رائے دہندگی کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام سوویت باشندوں کو جن کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی ہو بلا لحاظ نسل و قومیت، جنس، عقیدہ، تعلیم، رہایش، سماجی پیشہ جائیداد اور گذشتہ سرگرمیوں کے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ نمایندے منتخب کریں۔

سوویت یونین کے دستور حکومت کے مرتب کیے ہوئے حق رائے دہندگی کو سوویت عوام پوری طرح استعمال کرتے ہیں۔ ملک کی کل بالغ آبادی انتخابات میں حصہ لیتی ہے۔ مثلاً فروری ۱۹۵۴ء میں سوویت یونین کی مجلس علا کے جو انتخابات ہوئے تھے ان ۹۹٫۷ فیصدی رائے دہندگان نے ووٹ ڈالے۔ یہ انتخابات بھی اور تمام انتخابات کی طرح بھی معنوں میں ملک گیر تھے۔

بورژوا ممالک میں درحقیقت عام حق رائے دہندگی کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ مختلف پابندیاں عاید کر کے برسر اقتدار طبقے محنت کش عوام کے بہت بڑے حصے کو حق رائے دہندگی سے محروم کر دیتے ہیں۔ اور سیاسی زندگی کے دروازے ان پر بند ہو جاتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک کروڑ تیس لاکھ سے زیادہ حبشی رہتے ہیں لیکن ان کی بہت بڑی اکثریت کو حق رائے دہندگی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ریاست الاباما میں ۱۱۰۰۰۰ حبشی رہتے ہیں لیکن کو رائے دینے کا حق صرف ۴ ہزار کو ہے لیکن ان حبشیوں کو بھی جو حق رائے دہندگی سے محروم نہیں ہوئے ہیں دھمکیوں اور دہشت پسندی سے ووٹ نہیں ڈالنے دیے جاتے۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو امریکی فاشیوں نے جارجیا کے نیگرو روبرٹ میلارڈ کو صرف اس لیے مار ڈالا کہ اس نے اپنا حق رائے دہندگی استعمال کیا تھا۔ جس "امریکی جمہوریت" کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں اور جسے پروپگنڈے کے ذریعے "مغربی جمہوریت" کا نمونہ بتایا جاتا ہے ایسی مثالیں وہاں عام ہیں۔

آزادی تقریر، آزادی صحافت، جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کی آزادی وہ اہم حقوق ہیں جو سوویت یونین کے تمام باشندوں کو حاصل ہیں۔

سوویت یونین کے باشندے ریاست اور سماج کے متعلق تمام معاملات پر اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر سکتے ہیں۔ کسی صنعتی کارخانے یا دفتر کے طریق کار کے متعلق وہ اپنی تجاویز پیش کر سکتے ہیں اور حکومت کے قوانین پر مباحثے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

سوویت مزدور، کسان اور دانشور اپنے ملک کے مختار ہیں۔ اور وہ ملک کے مفادات دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ بیشتی، سرکاری، مزدور سبھاؤں اور دیگر تنظیموں کے کام میں کسی قسم کی خرابیوں اور لاپرواہیوں کو ذرا بھی برداشت نہیں کرتے۔ ان کوتاہیوں کے خلاف وہ جہاد کرتے ہیں۔ جلسوں اور اخبارات میں ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں حکومت اس نکتہ چینی کی ہمت افزائی کرتی ہے اور ایسے باشندوں کو پورا تحفظ دیتی ہے جو کہ افسروں کی نامناسب حرکتوں کا پردہ فاش کرتے ہیں۔

عوام میں ترقی پسند خیالات کی تشہیر عوام کی تعلیم و تربیت اور سوشلسٹ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے سوویت اخبارات اہم اور موثر وسیلہ ہیں۔

سوویت یونین کے تمام باشندوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی نکتہ چینی اور اپنے مشورے اخبارات کے ذریعے عوام کے روبرو پیش کریں۔

سوویت یونین کے محنت کش عوام کو سوویت باشندوں کی تمام سیاسی آزادیاں حاصل ہیں اور ان کی تنظیموں کو چھاپے خانے کاغذ کے ذخیرے عمارتیں ذرائع رسل و رسائل اور وہ تمام ضروریات بہم پہنچائی جاتی ہیں جو ان حقوق کو عملی طور پر کام میں لانے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔

بورژوا ممالک میں بالکل ہی مختلف کیفیت نظر آتی ہے وہاں کی حکمراں طبقے لوگوں کے خیالات نظریات اور ذاتی ہمدردیوں پر بھی کنٹرول رکھتے ہیں۔

یہ بات کچھ سمجھ میں آتی بھی ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کے محنت کش حکمران گروہ اپنے ملک کے لوگوں کی خاطر کش کے آزادانہ اظہار سے ڈرتا ہے کیونکہ یہ گروہ عوام کے حقوق اور ان کے مفادات نہایت ناقابلیت سے پامال کیا کرتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تمام سرکاری ملازمین کی وفاداری کی جانچ پڑتال ہوتی ہے اور اس امتحان سے کوئی نہیں بچ سکتا اگر وہ سامراجیت اور جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے کی پالیسی کی ذرا بھی مخالفت کریں۔ اگر وہ امن اور جمہوریت کی حفاظت کے لیے اپنی آواز بلند کریں تو انہیں ملازمت سے برطرف کر دیے جانے اور جیل بھیجے جانے کی دھمکی دی جاتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ ایٹمی جنگ کے انسانیت سوز پروپگنڈے کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

بورژوا ممالک میں عرصہ ہوا کہ چند سرمایہ داروں نے صحافت کو ایک کاروبار بنا لیا ہے یہ سرمایہ دار اخبارات کو حکمران طبقوں کے مفادات کی خاطر عوام کو گمراہ کرنے اور دھوکا دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مزدوروں کے اور دیگر ترقی پسند خیالات پر جور و ستم ہوتے ہیں۔

۱۲ جنوری ۱۹۴۹ء کو امریکہ سے شائع ہونے والے جاپانی اخبار "امریکا جاپان" کے تمام پرچے پولیس نے ضبط کر لیے اور محض اس وجہ سے کہ اس میں جاپانی پارلیمنٹ (دارالعوام) کے انتخابات میں کمیونسٹ پارٹی کے امیدواروں کی تصاویر اور ان کے نام شائع ہوئے تھے۔

سوویت یونین کے دستور حکومت کے بموجب آزادی تنظیم و اجتماع کی ضمانت کی گئی ہے۔ سوویت باشندے انجمنیں اور محنت کش عوام کی سوسائٹیاں بنا کر اس حق سے حقیقی معنوں میں استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ حکومت عوامی تنظیموں اور محنت کش عوام کی سوسائٹیوں کو اپنی سرگرمیاں وسیع تر کرنے کے تمام تر لوازمات مہیا کرتی ہے۔

مزدور سبھائیں محنت کش عوام کی سب سے بڑی عوامی انجمنیں ہیں۔ ان میں ملک کے تقریباً تمام مزدور اور دفتروں کے ملازمین منظم ہیں۔ سوویت ریاست کی زندگی میں مزدور سبھائیں بڑا اہم حصہ ادا کرتی ہیں۔ مزدور سبھاؤں کی تنظیم جمہوری بنیادوں پر ہوتی ہے یعنی مزدور سبھاؤں کے تمام اداروں کا انتخاب عمل میں آتا ہے اور یہ ادارے

راے دہندگان کے روبرو جواب دہ ہوتے ہیں۔

سرمایا دار ممالک میں بھی عوامی تنظیموں میں متحد ہونے کا حق رسمی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن کسی ایک بھی سرمایا دار ملک میں محنت کش عوام حقیقی معنوں میں اس حق سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتے۔ سرمایا دار ممالک کے حکمران طبقے جانتے ہیں کہ محنت کش عوام کا اتحاد ان کی لوٹ کھسوٹ کی راہ میں حایل ہوتا ہے۔ جمہوری تنظیموں کی سرگرمیوں میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لیے سب ہی جتن کیے جاتے ہیں۔ ریاست ہاے متحدا کی کیفیت اس کا روشن ثبوت ہے اس ملک میں جمہوریت پسند مزدور سبھاؤں کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ ہڑتالیں نہایت بے دردی سے کچل دی جاتی ہیں۔ اور اجتماعی طور پر مطالبات پیش کرنے کے مواقعات محدود کر دیے گئے ہیں۔ سرمایا دار مزدور تحریک کے خلاف کارروائیوں کے لیے بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے ہیں ریاستہاے متحدا میں صرف جنرل موٹرز کارپوریشن نے ہی اس مقصد کے لیے دس کروڑ ڈالر علحدہ رکھے ہیں۔ جرمن فاشستوں کے نقش قدم پر چلتے ہوے امریکی رجعت پسندوں نے "سرخ خطرے" کے خلاف جدوجہد کرنے کے بہانے مزدور طبقے کے ہراول دستے امریکی کمیونسٹ پارٹی پر وار کرنے شروع کر دیے تھے۔ اس کی شہادت ریاست ہاے متحدا کی کمیونسٹ پارٹی کے ۱۲ لیڈروں پر جھوٹے الزامات پر مقدمات اور غیر قانونی سزا کا فیصلا ہے۔

آزادی اعتقاد سوویت یونین کے باشندوں کی اہم ترین آزادیوں میں سے ہے۔ اس آزادی کے معنی یہ ہیں کہ ہر باشندے کو حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی مذہب میں اعتقاد رکھے یا کسی مذہب میں بھی اعتقاد نہ رکھے۔

سوویت یونین کا دستور حکومت سوویت باشندوں کو مذہبی رسومات ادا کرنے کا حق بھی دیا ہے آزادی اعتقاد میں کسی قسم کی کمی یا مداخلت قانوناً جرم ہے۔

نو زائدہ ممالک میں درحقیقت اعتقاد ایسی آزادی ہے ہی نہیں۔ وہاں غبار رکھنے والی عبادت گاہیں اب بھی موجود ہیں کسی خاص اعتقاد کے لوگوں کو مراعات حاصل ہیں اور جو کسی بھی مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتے ان پر جور و ستم ہوتے ہیں اور ان کی لے دے ہوتی ہے۔

ریاست ہاے متحدا کی ریاست کا نساس کا دستور حکومت سرکاری دفاتر میں ملازمت کرنے اور عدالت میں گواہی دینے سے ان تمام لوگوں کو باز رکھتا ہے جو خدا کے معتقد نہیں ہیں

سرمایا دار ممالک کی اصلی کیفیت یہ ہے۔

صرف سوویت یونین ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کے باشندے بڑی بڑی سیاسی آزادیوں سے مستفید ہوتے ہیں جو انہیں استالن دستور حکومت نے دی ہیں۔

جوزف سٹالن کی لاش والے سارکوفیگس کو رکھنے کی جگہ کے متعلق سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور سوویت یونین کی مجلس وزرا کا فیصلا

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور سوویت یونین کی مجلس وزرا فیصلا کرتی ہیں۔ جے۔ وی استالن کی لاش والے (SARCOPHAGUS) سارکوفیگس کو (لاش کو محفوظ رکھنے کے لیے بلور کا بنا ہوا مخصوص صندوق لال چوک کے مقبرے میں وی آئی لینن کے سارکوفیگس (SARCOPHAGUS) کے پہلو میں رکھا جائے۔

دستخط

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی
مرکزی کمیٹی سوویت یونین کی مجلس وزرا

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی سوویت یونین کی مجلس وزرا اور سوویت یونین کی مجلس عالا کی مجلس صدارت کی طرف سے کمیونسٹ پارٹی کے تمام ممبروں کے نام سوویت یونین کے تمام محنت کش عوام کے نام

پیارے ساتھیو اور دوستو!

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی سوویت یونین کی مجلس وزرا اور سوویت یونین کی مجلس عالا کی مجلس صدارت نہایت رنج و غم کے ساتھ پارٹی اور سوویت یونین کے تمام محنت کش عوام کو مطلع کرتی ہیں کہ سوویت یونین کی مجلس وزرا کے صدر نشین اور سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری جوزیف وساریونووچ استالن شدید بیماری کے بعد ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو رات کے ۹ بجکر ۵۰ منٹ پر چل بسے۔

لینن کے رفیق کار اور ان کے نصب العین کے فکر و خیال کے سلسلا گیر، کمیونسٹ پارٹی اور سوویت عوام کے دانش مند رہنما اور معلم جوزف وساریونووچ استالن کے دل کی حرکت رک گئی۔

استالن کا نام ہماری پارٹی کو سوویت عوام کو ساری دنیا کے محنت کش عوام کو بے حد پیارا ہے لینن کے ساتھ مل کر کامریڈ استالن نے کمیونسٹوں کی طاقت ور پارٹی بنائی، اس کی پرورش کی۔ اس کو بنایا کہ لینن کے ساتھ کامریڈ استالن اکتوبر اشتراکی انقلاب عظیم کے بانی اور رہنما دنیا کی سب سے پہلی اشتراکی ریاست کے جنم داتا تھے۔ لینن کے لافانی مقصد کی تکمیل کی راہ پر چلتے ہوئے کامریڈ استالن نے ہمارے ملک میں اشتراکیت کی فتح میں سوویت عوام کی رہنمائی کی اور ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ دوسری عالمی جنگ میں کامریڈ استالن کی قیادت میں ہمارے ملک نے فاشزم پر فتح حاصل کی جس نے یورپی ممالک کی قوتوں کی صورت حال کو بنیادی طور پر بدل دیا۔ کامریڈ استالن نے پارٹی اور کل عوام کو سوویت یونین میں کمیونزم کی تعمیر کرنے کے لیے ایک عظیم الشان اور واضح پروگرام سے آراستا کیا۔

کامریڈ استالن کی موت جنہوں نے اپنی ساری زندگی کمیونزم کے عظیم کاز کی بے لوث خدمت کے لیے وقف کردی تھی پارٹی کے لیے سوویت یونین، اور ساری دنیا کے محنت کش عوام کے لیے شدید ترین نقصان ہے۔

کامریڈ استالن کی موت کی خبر سے ہمارے ملک کے مزدوروں اور کسانوں، کارکنوں، دانشوروں اور سارے محنت کش عوام کے دل ہماری بہادر فوج اور

بحریے کے جانبازوں کے دل دنیا کے تمام ملکوں کے کروڑوں محنت کشوں کے دل درد و کرب سے تڑپ اٹھیں گے۔

غم و اندوہ کے ان دنوں میں ہمارے ملک کی تمام توجہ لینن اور اسٹالن کی بنائی اور بڑھائی ہوئی کمیونسٹ پارٹی کی آزمائی اور جانچی ہوئی رہنمائی میں ایک بڑے میل جول والے کنبے میں اور بھی زیادہ متحد ہو رہی ہیں۔

سوویت عوام کو اپنی کمیونسٹ پارٹی پر مکمل اعتماد ہے اس سے انہیں نہایت پرجوش محبت ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پارٹی کی تمام سرگرمیوں کا عالاترین قانون عوام کے مفادات کی خدمت کرتا ہے۔

ہمارے ملک کے مزدور، پنچایتی کاشتکار، دانشور تمام محنت کش عوام ہماری پارٹی کی مرتب کی ہوئی پالیسی پر صحیح عمل کرتے ہیں اور یہ پالیسی محنت کش عوام کے اہم ترین مفادات کے عین مطابق ہے اور اس کا مقصد اپنے اشتراکی وطن کی طاقت کو اور بھی زیادہ مستحکم کرنا ہوتا ہے کمیونسٹ پارٹی کی اس پالیسی کے صحیح ہونے کا امتحان برسوں کی جدوجہد میں لیا جا چکا ہے۔ اس نے سوویت یونین کے محنت کش عوام کو اشتراکیت کی تابناک فتوحات دلائی ہیں۔

اسی پالیسی سے جوش و خروش حاصل کر کے سوویت یونین کی توموں کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں اپنے ملکوں میں کمیونسٹ تعمیر کی فتح کا سیاہاں واصل کرنے کے لیے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔

ہمارے ملک کے محنت کش عوام جانتے ہیں کہ آبادی کے تمام طبقوں مزدوروں، پنچایتی کاشتکاروں اور دانشوروں کی مادی فلاح و بہبودی پوری سوسائٹی کی روز افزوں مادی اور تہذیبی ضرورتوں کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ حد تک پورا کرنا کمیونسٹ پارٹی اور سوویت حکومت کی خصوصی توجہ باعث بن رہا ہے اور رہے۔

سوویت عوام جانتے ہیں کہ سوویت ریاست کی مدافعتی صلاحیت اور قوت بڑھ رہی ہے۔ اور مضبوط ہو رہی ہے۔ پارٹی سوویت فوج اور بحریہ اور تحفظ کے اداروں کو ہر طرح مضبوط بنا رہی ہے تاکہ کسی بھی حملہ آور کو موثر توڑ جواب دینے کی تیاری برابر بڑھتی رہے۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کی خارجہ پالیسی ہتھیاروں کو یہ قرار رکھنے اور مستحکم کرنے ایک اور جنگ کی تیاری اور اس کو شروع کرنے کے خلاف جدوجہد کرنے کی غیر متزلزل پالیسی ہے۔ بین قومی تعاون اور تمام ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھانے کی پالیسی رہی ہے اور اب بھی ہے۔

سوویت یونین کے عوام پرولتاری بین قومیت کے وفادار علمبردار ہیں اور عظیم جینی توموں سے تمام عوامی جمہوریوں کے محنت کشوں سے برادرانہ دوستی کو تقویت دے رہے ہیں۔ امن جمہوریت اور اشتراکیت کے لیے سرمایہ دارانہ اور نو آبادیاتی ملکوں کے محنت کش عوام سے دوستانہ رشتہ قائم کر رہے ہیں اور اس کو ترقی دے رہے ہیں۔

پیارے ساتھیو اور دوستو! ہماری کمیونسٹ پارٹی کمیونزم کی تعمیر میں سوویت عوام کی بڑی رہنما قوت ہے پارٹی کی صفوں میں اٹل اتحاد اور ٹھوس یک جہتی پارٹی کی قوت اور طاقت کی لازمی شرائط ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم پارٹی کے اتحاد کی اپنی آنکھ کے تارے کی طرح حفاظت کریں کمیونسٹوں کی تربیت اس طرح کریں کہ وہ پارٹی کی پالیسی اور فیصلوں کی تعمیل کرنے کے لیے سرگرم سیاسی مجاہد ہیں۔ تمام محنت کش عوام سے مزدوروں اور پنچایتی کاشتکاروں اور دانشوروں سے پارٹی کا رشتہ اور بھی زیادہ مستحکم کریں۔ کیونکہ ہماری پارٹی کی قوت اور ناقابل تسخیر ہونے کا راز عوام سے اس اٹوٹ رشتے ہی میں مضمر ہے۔

کمیونسٹوں اور تمام محنت کش عوام کو عالا سیاسی خبرداری اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خلاف جدوجہد میں کسی قسم کا سمجھوتا نہ کرنے اور عزم و استقلال کا سبق دینا پارٹی

اپنے اہم ترین فرایض میں سے تصور کرتی ہے۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی سوویت یونین کی مجلس وزرا اور سوویت یونین کی مجلس عالا کی صدارتی مجلس پارٹی اور عوام کو ان المناک دنوں میں خطاب کرتے ہوئے اس مستحکم اعتماد کا اظہار کرتی ہیں کہ پارٹی اور ہمارے وطن کے تمام محنت کش عوام مرکزی کمیٹی اور سوویت حکومت سے اور بھی زیادہ قریب ہو کر متحد ہو جائیں گے۔ اپنی تمام قوتیں اور تخلیقی صلاحیتیں اپنے دیس میں کمیونزم کی تعمیر کے عظیم الشان مقصد کے لیے مجتمع کریں گے۔

استالن کا لافانی نام سوویت عوام اور کل ترقی پسند انسانیت کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

مارکس، انگلس، لینن، استالن کی عظیم ہمہ گیر تعلیمات زندہ باد!

ہمارا طاقتور اشتراکی دیس زندہ باد!

ہمارے بہادر سوویت عوام زندہ باد

سوویت یونین کی عظیم کمیونسٹ پارٹی پایندہ باد!

دستخط

مرکزی کمیٹی کمیونسٹ پارٹی سوویت یونین

مجلس وزرا سوویت یونین

مجلس صدارت مجلس عالا سوویت یونین۔

مورخہ ۵ مارچ ۱۹۵۳ء

کامریڈ استالن کے جنازے کی تنظیم کرنے والے کمیشن کی طرف سے

سوویت یونین کی مجلس وزرا کے صدر نشین اور سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری جوزیف ساریونووچ استالن کا جنازہ بروز سوموار مورخہ ۹ مارچ ۱۹۵۳ء دوپہر کو بارا بجے رکھا جائے گا۔ عوام کو آجازت دیجائے گی کہ وہ نہایت ہی ادب احترام اور خاموشی کے ساتھ اپنے محبوب قاید کا آخری درشن کر لیں

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور سوویت یونین کی مجلس وزرا کا فیصلا

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور سوویت یونین کی مجلس وزرا فیصلا کرتی ہے کہ:-

عظیم رہنماوں ولادیمیر ای ایچ لینن اور جوزیف ساریونووچ استالن کی دایمی یادگار قایم کرنے نیز لال چوک میں کریملن کی دیوار کے اندر کمیونسٹ پارٹی اور سوویت ریاست کے جن ممتاز رہنماوں کی استھیان رکھ دی گئی ہیں ان کی بھی دایمی یادگار قایم کرنے کے لیے ماسکو میں ایک یادگاری عمارت — مشاہیر کا ایک مقبرا — سوویت دیس کے مشاہیر کی دایمی عظمت کی یادگار تعمیر ہو۔

مشاہیر کے مقبرے کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد وی۔ آئی۔ لینن کی لاش والا سارکوفیگس اور جے وی استالن کی لاش والا سارکوفیگس نیز کمیونسٹ پارٹی اور سوویت ریاست کے ممتاز رہنماوں کی استھیاں جو کریملن کی دیوار میں بند کی ہوئی ہیں وہاں منتقل کر دی جائیں۔ اور محنت کش عوام الناس کے لیے اس مقبرے مشاہیر کے دروازے کھول دیے جائیں۔

دستخط سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی سوویت یونین کی مجلس وزرا

اے۔ الف۔ یعقوب علی

استالن ایک عظیم اور سادا انسان

"ہیرو آف دی سوشلسٹ لیبر" یاکولین ہوائی جہازوں کے ڈیزاین بنانے کے ماہر ہیں انہوں نے متعدد جنگی ہوائی جہازوں کے ڈیزاین تیار کیے ہیں ان کا عہدہ کرنل جنرل ہے اور وہ فضائی فوجوں کے انجنیئر ہیں ٹیکنیکل سائنسیوں کے ڈاکٹر سائنٹفک کینڈیڈ سوویت یونین کے صناعتی نمبر اور استالن پرایزیافتہ ہیں یاکولیف کی تصنیف "زندگی کے اف نے ماسکو سے ۱۹۴۳ء میں شایع ہوئی تھی اسی میں جے وی استالن سے ان کی ملاقاتوں اور گفتگو کا یہ تذکرا بھی ہے۔

کامریڈ استالن سے پہلی ملاقات کے بعد سے مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ان سے ملنے کے اور بھی مواقع نصیب ہوے اور ہر بار مجھے اس عظیم انسان کے کردار کی نئی گہرائیوں کا علم ہوا۔

استالن کی نجی زندگی میں انتہائی انکسار تھا ان کا لباس انتہائی سادا ہوتا تھا جنگ سے پہلے وہ خاکی سالمیا کوٹ یا بلوز کیسے آرام دہ وردی پہنا کرتے تھے۔ خاکی پتلون اسی کپڑے کا ہوتا تھا اور نرم چمڑے کے ہلکے آرام دہ بوٹ ہوتے تھے۔

گفتگو کرتے وقت وہ مطالعاگاہ میں دبے قدموں سے ٹہلتے رہتے جب کوئی دوسرا بول رہا ہوتا تو وہ کبھی کبھار ہی قطع کلام کرتے اور اسے جس طرح وہ چاہے پوری طرح اظہار خیال کرنے دیتے تھے۔

سرکاری اداروں کی کانفرنسوں میں میں نے دیکھا ہے کہ ان کے پاس پرچے بھیجے جاتے تھے۔ وہ بہتیا ان پرچوں کو پڑھتے نہایت صفائی سے موڑ کر تہہ کرتے اور جیب میں رکھ لیا کرتے تھے

ان میں سے ایک پر بھی ایسا نہیں ہوتا جس پر وہ توجہ نہ دیتے ہوں۔

استالن بے کار باتوں کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے اور جو لوگ کسی مسئلے پر بحث کے دوران میں اس معاملے میں کم علمی یا لاعلمی کا ثبوت دیتے تو ان کی وہ ذرا بھی رعایت نہیں کرتے تھے وہ ایسے لوگوں کی نہایت تلخی اور تیز آمیز تنقید کرتے ایسی کہ پھر کوئی اور ان کی موجودگی میں غیر سنجیدہ گفتگو کرنے کی ہمت نہ کرے۔

استالن کی کردار کی خصوصیت کام میں سخت گیری تھی۔ میں نے بارہا یہ کہتے سنا ہے کہ افسر کو کوئی کام انجام دہی کے لیے سپرد کیا جاتا تو افسر کہتا۔

"کامریڈ استالن! وقت بہت تھوڑا ہے اور کام ہے انتہائی مشکل۔"

اور استالن جواب دیتے۔

"یہاں ہم مشکل معاملات کی ہی گفتگو کرتے ہیں۔ ہم لوگوں نے تمہیں بلایا ہی اسی لیے ہے کہ کام مشکل ہے۔ تم تو ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہیں مدد کیا چاہیے۔ اور پھر جو کچھ کرنا ہے وہ سب کرو۔ اور جلدی۔"

استالن اس بات کو پسند کرتے تھے کہ ان کے سوالات کے جوابات مختصر جامع اور ٹھیک ٹھیک ہوں۔ اور کوئی تصنع نہ ہو۔ عام طور پر ایسا ہوتا کہ جب ان سے کوئی پہلی بار ملنے آتا تو ان کے سوال کا جواب دینے سے پیشتر پڑی دیر تک پس و پیش کرتا جواب کو خوب بھی طرح تولنے کی کوشش کرتا تاکہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جائے کہ بعد میں ندامت ہو۔ شروع میں میں نے بھی کامریڈ استالن کے سوال کا جواب دینے میں پس و پیش کیا۔ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا چھت کو تاکنے لگا۔

استالن نے مسکرا کر کہا۔

"چھت کی طرف دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں [illegible]

نہیں لکھا ہے تم تو میری طرف دیکھو جو کچھ ذہن میں ہے کہہ ڈالو صرف یہی تم سے چاہیے۔"

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے ایک غیر متوقع سوال کا جواب دینے مجھے بن نہ پڑا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کامریڈ استالن اس سے کیا اخذ کریں گے۔ جو کچھ میں کہنے والا تھا آیا وہ اسے پسند بھی کریں گے۔

انہوں نے یہ بات بھانپ لی اور پر اشتیاق انداز میں کہا۔

"برائے مہربانی جو کچھ تم سوچ رہے ہو وہی کہہ ڈالو۔ ایسی باتیں کہنے کی کوشش مت کرو جو مجھے پہلی معلوم ہوں۔ میرے ساتھ گفتگو میں یہ غیر ضروری ہے اگر تم میری پسند اور خواہش کا اندازہ لگانے کی کوشش کرو گے تو ہماری گفتگو کا فائدہ ہی کیا ہوگا۔ یہ نہ سوچو کہ اگر تمہاری بات میری رائے مطابقت نہ کرے گی تو یہ برا ہوگا۔ تم ایک ماہر ہو۔ ہم لوگ تم سے اس لیے تبادلہ خیالات کرتے ہیں کہ تم سے کچھ سیکھیں۔ تمہیں محض سکھانا ہی ہماری گفتگو کا مقصد نہیں ہوتا۔"

کچھ عرصہ پہلے ایک بڑے افسر کو عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کامریڈ استالن نے کہا۔

"اس کی غلطی کیا ہے؟ کسی سوال کا جواب دینے سے پیشتر وہ تمہاری آنکھوں میں پڑھنا چاہتا ہے کہ کوئی غیر موقع بات کہہ دینے سے بچنے کے لیے کیا جواب دیا جائے خوش کرنے کی خاطر کیا جواب دیا جائے۔ اس قسم کا شخص بہت بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے حالانکہ وہ خود جان بوجھ کر نقصان نہ پہنچانا چاہتا ہو۔"

ایک مرتبہ استالن نے کہا۔

"اگر تمہیں کامل اعتماد ہے کہ تمہاری رائے صحیح ہے اور تم ثابت کر سکو کہ تم ہی صحیح رہنے پر ہو تو پھر تم کسی دوسرے کی رائے مت مانو۔ اور وہی کرو جو تمہارا ضمیر تم سے کہتا ہے۔"

استالن جہالت برداشت نہیں کرتے تھے۔ اگر انہیں کوئی ایسی دستاویز دیتا جو لاپروائی سے مرتب کی گئی ہو تو وہ برہم ہو جاتے تھے۔

"یہ لیجیے حضرت جاہل آپ کے سامنے موجود ہیں۔ اور ذرا انہیں کچھ کہیے تو ذرا اپنی جہالت کی تاویلیں پیش کرنے لگیں گے کہ میں تو مزدور طبقے سے آیا ہوں یا کسان طبقے سے آیا ہوں۔ غلط ہے یہ کلچر کی کمی ہے پھوہڑ پن ہے۔ ملک کی حفاظت کے معاملات میں تو اپنی خامیوں اپنے ناکافی ٹیکنیکل علم کلچر کی کمی یا جہالت کی تشریح کرنے کے سلسلے میں اپنے کسان یا مزدور ہونے کی دلیل پیش کرنے کی تو اجازت دی ہی نہیں جا سکتی۔ دشمن تو ہمارے سماجی نسب کے لیے کوئی رعایت نہیں کریں گے خاص طور پر اسی وجہ سے کہ ہم مزدور اور کسان ہیں ہمیں تمام مسایل پر پوری دسترس اور پورا عبور حاصل کر لینا چاہیے۔ کوئی خامی نہیں رہنی چاہیے۔ اور دشمن سے کسی طرح حقیر نہ ہونا چاہیے اپنی علمی خامی اور خاص طور پر فوجی ٹیکنیک میں اپنی خامیوں کو اپنی ذاتی دلیری اور خطرے سے لاپروائی سے پورا کرنے کی کوشش کرنے والے کچھ فوجی افسروں سے استالن نے یہ کہا۔

"تم لوگوں میں سے اکثر اپنی دلیری پر گھمنڈ کرتے ہیں لیکن فوجی ٹیکنیک میں عالا ترین مہارت حاصل کیے بغیر صرف اسی سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ امریکا کے ریڈ انڈین بہت بہادر تھے لیکن بندوقوں سے مسلح گوروں کے خلاف اپنی تیز کمانوں سے وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔"

جب کوئی مسئلہ اس سے متعلق لوگوں کے حلقے میں زیر بحث ہوتا تو استالن ہر ایک کو بولنے کا موقع دیتے وہ خود بھی کچھ لوگوں کی رائے دریافت کرتے اور پھر پوری بحث کا خلاصہ پیش کر دیتے تھے اس کے بعد پھر وہ کاغذ اور پنسل حاضرین میں سے کسی کے آگے سرکا دیتے ہوئے کہتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر وہ کسی اہم دستاویز کی عبارت لکھوانی شروع کر دیتے تھے۔

ایک دفعہ ان کی رپورٹ مجھے لکھنی پڑی۔ ان کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے میں نے ذہن پر بڑا زور دے کر کوشش کی کہ کریمر کی کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔ وہ رپورٹ لکھواتے رہے اور بیچ بیچ میں میری پشت سے جھانک کر لکھی ہوئی عبارت دیکھتے رہے۔ یکبارگی وہ رک گئے۔ لکھی ہوئی عبارت کو غور سے دیکھا اور میرا ہات پکڑ کر وقف کا نشان (،) بنوا دیا

کسی ایک اور موقع پر جملے کی ترکیب کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی اسٹالن نے کہا۔

"تم نے مسند کے بعد جو کامیوں لکھا ہے، تمہارے بتلاؤں میں کچھ خامی نظر آتی ہے۔ یہ اس طرح ہونا چاہیے تھا:" اور انہوں نے اصلاح کر دی۔

اس واقعے کے بعد میں نے ایک روسی گرامر کی کتاب لے کر اس کا دو بار اپنور مطالعہ کیا۔

کامریڈ اسٹالن خیالات کو صحیح طور پر اور سلسلے وار پیش کرنے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

"اگر کوئی شخص اپنے خیالات کا اظہار سلسلے وار اور صحیح طور پر نہیں کر سکتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے خیالات بھی بے ربط اور غلط ملط ہیں۔ جو کام اسے سونپا گیا ہے اس میں وہ انظم کیسے پیدا کر سکتا ہے؟"

اسٹالن خود اور ان کے قریبی شرکا سے کام اپنا کام نہایت پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

ایک مرتبہ اسٹالن نے مجھے بلوایا۔ اور ایک اہم کام سونپا میں نے اسے انجام دینے کی ذمے داری قبول کر لی۔

اسٹالن نے کہا۔

"یہ ایک ضروری کام ہے اور اسے بہت جلد انجام دینا ہے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ کہنہیں سونپا جائے۔ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟"

میں نے جواب دیا "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے لیے میرے پاس سب کچھ موجود ہے۔"

"خیر اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو پس و پیش نہ کرنا۔ ٹیلیفون کرنا اور مانگ لینا۔"

اس لمحے مجھے کچھ یاد آیا۔

"کامریڈ اسٹالن، ایک درخواست ہے لیکن بات بڑی معمولی سی ہے۔ اس کے لیے اب آپ کو کیا "تکلیف دی جائے" فرمایئے"

"اس فریضے کی انجام دہی کے لیے ہوائی اڈے تک بار بار آنا جانا ہوگا اور میرے کار خانے میں موٹر کاروں کی قلت ہے مجھے دو ۱۔ M موٹر کاریں چاہئیں۔"

"اور تو کچھ نہیں؟ صرف دو موٹر کاریں؟"

"جی ہاں، اور کچھ نہیں۔ باقی میرے پاس سب کچھ ہے"

میں نے رخصت چاہی اور سیدے کار خانے پہنچا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا میرا اسسٹنٹ ملا اور کہا۔

ایلیگزینڈر۔ سرگی یے وچ! ابھی ابھی "آٹو موبائل اور ٹریکٹر انڈسٹری کے محکمے سے ٹیلیفون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ کسی کے ہاتھ خط بھیج کر دو ۱۔ M موٹر کاریں منگا لی جائیں

اس نے مجھے دستخط کرنے کے لیے خط دیا۔ میں نے دستخط کر دی اور بیالیس منٹ بعد دو بالکل نئی کاریں کارخانے میں آ پہنچیں۔

ایک گھنٹا بعد کامریڈ سولوٹوف کے سکریٹری نے دریافت کیا کہ آیا کاریں مل گئی ہیں۔ یقینی حکم کی تعمیل کے طور پر میں نے دل میں سوچا یہ اسٹالن کا طریق کار ہے ہم سب کو بھی اسی طرح کام کرنا چاہیے۔

اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے کامریڈ اسٹالن بہت کم تعداد میں لوگوں سے ملتے رہتے تھے وہ ان لوگوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ کرتے۔ یہ معلوم کرتے کہ کون کیسا ہے۔ وہ کیا کر سکتا ہے اسے کیا کام سونپا جا سکتا ہے انہیں لوگوں کا بڑا شوق تھا۔ کام کے متعلق ان کی گفتگو پر لطف جملوں اور چست فقروں سے دلچسپ ہو جاتی تھی۔

لیکن مرتبا ہم لوگ کسی کام سے کامریڈ اسٹالن کے دفتر

ہیں تھے ۔ اور ان گفتگو میں کچھ ایسے افسروں کا ذکر آیا ہے جنہوں نے اپنا کام ٹھیک طرح انجام نہیں دیا تھا اور اسٹالن نے جرجستا جلاچیست کیا ۔

"یہ ہیں راموسکوا زبیچیے ۔ کے ملٹی ایڈزا اور ٹھیمسٹوکلس" پکارتے ہوئے انہوں نے متجسس نگاہیں ہم لوگوں پر ڈالیں کہ ہم سمجھے بھی یا نہیں ۔ میں کچھ اچھی طرح سمجھ نہیں سکا اور دریافت کیا ۔

"راموسکوا ریجیے کے کیوں ؟"

"اور یہ جانتے ہو ملیٹی ایڈز اور تھیمسٹوکلس کون تھے ؟"

"یونان میں فوجی لیڈر تھے ۔"

"اور وہ مشہور کس لیے تھے ؟"

"انہوں نے کچھ لڑائیوں میں حصہ لیا تھا لیکن مجھے ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ وہ مشہور کس لیے تھے ۔"

بڑی ندامت ہوئی کہ قدیم یونان کی تاریخ کا مجھے اتنا کم علم تھا ۔

ایک روز کسی افسر کا ذکر کرتے ہوئے اسٹالن نے اس کا موازنہ جیخوف کے افسانے "شادی" کے ایک کردار سے کیا ۔ انہوں نے یہ کہا اور پھر یکایک رک گئے اور دریافت کیا ۔

"یاد ہے یہ کہانی ؟"

"نہیں کامریڈ اسٹالن مجھے تو یاد نہیں ۔"

"جیخوف نہیں پڑھا تم نے ؟"

"جیخوف کی تمام تصانیف میں نے کئی بار پڑھی ہیں لیکن یہ افسانہ مجھے یاد نہیں آرہا ۔"

"کچھ ایسی بھی چیزیں ہوتی ہیں جو ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتی ہیں ۔"

ایک بار پھر مجھے احساس ندامت ہوا ۔ اس کے باوجود میں سمجھتا رہا ہوں کہ میرا مطالعہ کافی وسیع ہے اور میں ایک متمدن شخص ہوں ۔

گفتگو چاہے تکنیکی معاملات پر ہو یا سیاسی موضوع پر اسٹالن تاریخ حیاتیات اور کلاسکی ادب کی مناسب مثالیں پیش کرنا پسند کرتے تھے ۔

غیر معمولی ذوقی ظرافت سے وہ سالتی کوف شچیدرین کی "ایک شہر کی کہانی" سے مثالیں پیش کرتے اور ان لوگوں کو جو بلاوجہ رعایت شرم دلاتے تھے جنہیں اب بھی ان کرداروں کی عادات اور خصلت باقی تھی جو روس کے عظیم طنز نگار نے پیش کی تھی ۔

ایک روز یہ طے پایا کہ ایک نئی مشین کا امتحان کیا جائے یہ کام فوری تھا ۔ سالتی کوف شچیدرین کے ناول کے کرداروں سے مشابہ کچھ لوگوں نے تجویز کیا کہ مشین کو ٹسٹ کرنے کے لیے کارخانے سے بہت دور ایک مقام پر بھیجا جائے ۔ کیونکہ امتحان کرنے والے ہوا بازوں ہی میں مقیم تھے ۔

اسٹالن نے کہا ۔

"مشینیں وہاں کیوں بھیجی جائیں ؟ ہوا بازوں کے لیے یہاں آنا آسان ہے اس طرح بھی کوئی کام کرنا ہے ۔ تم لوگ سوچتے کیوں نہیں ؟ کلوپوف میں رہنے والے لوگوں کی تضحیک کرتے ہو ۔ یاد ہے وہ لوگ ایک بچھڑے کو کس طرح فضلن نے کی چھت پر گھسیٹ کر لے گئے تھے اور کس طرح انہوں نے جمی کا آلو دریا میں ڈبو دیا تھا ؟"

ایک مرتبہ ہم ان کے دفتر میں کسی کام کے متعلق گفتگو کرنے گئے گفتگو طویل ہو گئی اور رات زیادہ ہو گئی اسٹالن نے ان تمام لوگوں کا جو وہاں موجود تھے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی

"معلوم ہوتا ہے آج کا کام تو کافی ہو گیا معلوم نہیں تم لوگوں کا کیا حال ہے لیکن مجھے تو بڑی بھوک لگی ہے ۔ میں کسی کو خاص طور پر تو دعوت نہیں دے رہا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اس پر کوئی فرض عاید کیا جا رہا ہے لیکن جو کھانا کھانا چاہیے وہ میرا مہمان ہے ۔"

اب اسٹالن کے ساتھ شریک طعام ہونے سے انکار ہی کیسے ہوتا ؟ بھلا ایسی دعوتیں کسی کو بار بار تھوڑا ہی ملا کرتی تھیں ۔۔۔

ہم سب ان کے ساتھ دن کے مکان کو روانہ ہو گئے ۔

مہمانوں کے آتے آتے میز پر کھانے چن دیے گئے تھے۔ کمرے میں فرنیچر معمولی اور سادا تھا۔ کتابوں کی کثیر تعداد پر حیرت ہوتی تھی۔ کھانے کے کمرے میں بھی کتابوں کی الماریاں تھیں اور سب کی سب بھری پڑی تھیں۔

کھانے کے دوران میں گفتگو ہر ہر موضوع پر ہوتی رہی۔ سیاست کے متعلق خارجی معاملات پر انجینئرنگ کے مسائل پر ادب پر آرٹ پر ہر شخص نہایت تکلفی سے گفتگو میں حصہ لے رہا تھا۔ ماتحتی یا پابندی کی فضا بالکل بھی نہ تھی۔ سب برابر تھے

اسٹالن اکثر اوقات کتابوں کے حوالے دیا کرتے تھے۔ کسی موضوع بحث میں غرق ہو کر وہ کتابوں کی الماری کے پاس جاتے اور جس کتاب کی ضرورت ہوتی نکال لیتے تھے اگر گفتگو جغرافیا کے متعلق ہوتی تو وہ اپنا پرانا نقشہ اٹھا لیتے اور کہتے۔

"لو میرا نقشہ دیکھو۔ پھٹا پرانا تو ہے ضرور ہے لیکن پھر بھی کام دیتا ہے۔"

اسٹالن کی گفتگو میں ادبی مثالیں ہمیشہ بہت زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ ان کی یادداشت بے نظیر تھی۔ وہ بڑے بڑے اقتباسات زبانی اور تقریباً لفظ بہ لفظ دے سکتے تھے انہیں خاص طور پر گورکی، چیخوف اور سالٹی کوف شچیدرین بہت پسند تھے۔

ایک مرتبہ گفتگو کا رخ جاپانی کے افسانوں یعنے ریڈ اور فنی مور کوپر کی تصانیف کی جانب ہو گیا۔ اسٹالن نے کہا کہ بچپن میں ان کے لکھے ہوئے ناولوں کو بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ لوگوں سے ملنے جلنے میں اسٹالن انتہائی موقع شناسی سے کام لیتے تھے جو لوگ ان سے ملاقات کرنے آتے تھے ان سے دوبدو شائستگی اور توجہ سے ملتے تھے جب وہ لوگوں کو جانے میں تو ہمیشہ سوا اچھا کہا کرتے تھے۔

"آپ بہت مصروف تو نہیں ہیں؟" یا

"کیا آپ اپنا کام ہرج کیے بغیر مجھ سے ابھی ملے آسکتے ہیں؟"

"بے تکلف کامریڈ اسٹالن"

"تو پھر جتنی جلدی ہو سکے آیئے۔"

اسٹالن بارہا ولاڈیمیر ایلیچ لینن کی زندگی اور ان کی تصانیف بطور قابل تقلید مثال پیش کرتے تھے۔ لینن سے مختلف موقعوں پر اپنی ملاقاتوں کی یاد تازہ کرنا پسند تھا۔

اپنے کام کے دوران میں جن لوگوں کا کامریڈ اسٹالن سے براہ راست سابقہ پڑتا تھا انہیں نہایت عالا درجہ ملنا تھا ان سے ہر ایک گفتگو ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتی تھی ان سے ہر ایک ملاقات یہ احساس پیدا کرتی تھی کہ سیاسی اعتبار سے بھی اور اپنے مخصوص میدان عمل میں بھی کچھ نئی چیز حاصل کر لی ہے۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور سوویت یونین کی مجلس وزرا کا فیصلہ

اس سال بتاریخ ۹ مارچ بروز پیر سوویت یونین کی مجلس وزرا کے صدر نشین اور کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری جنرل یعنی جوزیف وساریونووچ اسٹالن کی لاش مقبرے میں رکھے جانے کے لیے ماسکو کے وقت کے مطابق دوپہر کے ٹھیک بارہ بجے ماسکو وفاقی جمہوریہ کی راجدھانیوں، لینن گراڈ، اسٹالن گراڈ، سیوسٹوپول اور اولیسے کے سورما شہروں نیز کالینن گراڈ لووف خابا روو سکالیا واستک میں توپوں کی سلامی دی جائے۔

دوپہر کو ٹھیک بارہ بجے سوویت یونین کی سرزمین کے تمام کارخانوں میں کام ریل، پانی اور سڑکوں کے ذریعے آمد و رفت پانچ منٹ کے لیے بند کر دی جائے سوا ان کارخانوں کے جہاں کام کا بند ہونا ترجمہ ناممکن بالکل لازم ہے۔

دوپہر کو ٹھیک بارہ بجے فیکٹریوں، کارخانوں میں ریلوے یارڈ، دریائی اور سمندری جہازوں پر تین منٹ تک سیٹیاں بجا کر سلامی دی جائے

[illegible] سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی سوویت یونین کی مجلس وزرا

سوویت یونین کی قوموں کے میل ملاپ اور دوستی کا جنم داتا

جے۔ وی۔ استالن

باین ابن غفور

۴ دسمبر ۱۹۳۵ء کو تاشقند اور ترکمانیا کے مشہور مرد عورتوں پنچایتی کاشتکاروں پارٹی اور حکومت کے لیڈروں کی ایک کانفرنس میں جے۔ وی۔ استالن نے قوموں کے میل ملاپ اور دوستی کے متعلق اپنی تاریخی تقریر کی تھی جس کا خلاصہ نیچے دیا جاتا ہے استالن نے کہا:۔

"سوویت یونین کی قوموں کی باہمی دوستی ایک بہت بڑی اور اہم کامیابی ہے کیونکہ جب تک یہ دوستی باقی رہے گی ہمارے ملک کے عوام آزاد اور ناقابل تسخیر رہیں گے۔ جب تک یہ دوستی زندہ اور پائندہ رہے گی ہمیں کسی کا خوف نہیں ڈگمگیو دشمنوں کا اور نہ غیر ملکی دشمنوں کا۔ سمجھیئو! آپ کو اس میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے۔"

یہ دیکھ کر کہ سوویت یونین کی قوموں میں آپس کی سابقہ بے اعتمادی عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہے اور یہ کہ قوموں کی باہمی دوستی بڑھ رہی اور گہری ہو رہی ہے۔ جے۔ وی استالن نے اس عمل کو بالشوک قومی پالیسی کا انتہائی جیتا جاگتا مجسمہ کہا۔

استالن کی اس اہم تقریر کے بعد سے اب تک سوویت یونین کی قوموں کی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ ہٹلر جرمنی اور سامراجی جاپان کے خلاف سوویت یونین کی دیش بھگتی کی جنگ کے دوران میں سوویت یونین کی قوموں کی دوستی سب سے بڑے امتحان میں کامیاب ثابت ہوئی اور دوستی کا یہ رشتہ اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔ کمیونسٹ سماج کی فاتحانہ تعمیر میں سوویت یونین کی قوموں کو یک جان کرنے والے دوستی کے اٹوٹ بندھن اور بھی زیادہ مضبوط ہو رہے ہیں۔

سوویت یونین کی قوموں کی دوستی کا ارتقاء اور استحکام لینن اور استالن کی قومی پالیسی کی حقیقی کامیابی کا ثبوت ہیں۔

اکتوبر انقلاب سے بہت پہلے ہی کمیونسٹ پارٹی اور اس کے لیڈروں لینن اور استالن نے قومی مسئلے پر پارٹی کا نظریہ اور پروگرام پیش کر دیا تھا۔ جے۔ وی۔ استالن کی کلاسکی تصنیف "مارکسزم اور مسئلہ قومیت" قوموں کے متعلق مارکسی نظریے کی تشکیل کرتی قومی مسئلے پر بالشوک پارٹی کی پالیسی کو نظریاتی تفویت پہنچاتی ہے۔ بورژوا قوم پرستی کے نظریے کے مقابلے میں لینن اور استالن نے پرولتاری بین قومیت کا بنیادی نظریہ یا قوموں کی آزادی مساوات اور دوستی کا نظریہ پیش کیا۔

۴ دسمبر ۱۹۳۵ء کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے استالن نے کہا "اکتوبر ۱۹۱۷ء میں جبکہ ہمارے ملک میں پرولتاری انقلاب عظیم شروع ہوا جب ہم نے زارشاہی زمینداروں اور سرمایہ داروں کی حکومت کا تختہ الٹا تو ہمارے استاد بابو اور مشیر لنن العظم نے کہا کہ اب سے کوئی قوم حاکم ہو گی نہ محکوم۔ تمام قومیں برابر اور آزاد ہوں گی۔ اس طرح سے انہوں نے پرانی زارشاہی بورژوا پالیسی کو فنا دیا۔ اور نئی بالشوک پالیسی دوستی کی پالیسی ہمارے ملک کی قوموں کے باہمی بھائی چارے کی پالیسی کا اعلان کیا۔"

اکتوبر سوشلسٹ انقلاب عظیم کی فتح اور سوویت یونین میں اشتراکیت کی تعمیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومیت کے مسئلے پر لینن

اور اسٹالن کی تعلیمات زندگی کا جزو بن گئی ہیں۔

سوویت حکومت نے قومی مراعات اور اقتصادات ختم کرنے کے لیے جو کارروائیاں کیں یعنی قوموں کی مساوات اور حق خود اختیاری کے اعلان سے قوموں میں باہمی اعتماد پیدا کرنے اور آپس کے دوستانہ تعلقات کو تقویت پہنچنے میں بڑی مدد ملی۔ اس کا انحلال، وفاقی اور خود اختیار جمہوریتوں کے قیام اور بعد میں ان کے اشتراک سے سوویت سوشلسٹ جمہوریتوں کی یونین (U.S.S.R) کے قیام سے ہوا۔ بالشوک پارٹی اور سوویت حکومت نے اس حقیقی غیر مساویت کو ختم کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا جو قوموں کو پرانے نظام سے وراثت میں ملی تھی۔

سوویت یونین میں قومی مسئلے کو حل کرنے کے متعلق بالشوک پارٹی کی تمام تر سرگرمیاں براہ راست جے۔ وی۔ اسٹالن کے زیر ہدایت تھیں۔ روس کی قوموں کے حقوق کا منشور جس کا مسودہ جے۔ وی۔ اسٹالن نے تحریر کیا تھا زبردست سیاسی اہمیت کا حامل ہے۔ دسویں اور بارہویں پارٹی کانگریسوں اور سوویت یونین کی پنچایتوں کی پہلی کانگریس [illegible] پر رپورٹیں پیش کرتے ہوئے جے۔ وی۔ اسٹالن نے ایک متحدہ قومی اشتراکی ریاست کی نشوونما اور ترقی کے لیے ایک مفصل پروگرام پیش کیا۔ اسٹالن اعظم سوویت یونین کے دستور کے مصنف تھے۔ کامیاب و کامران اشتراکیت کے دستور کے مصنف لینن اور اسٹالن کی قومی پالیسی کی مکمل تکمیل سے زار شاہی روس کی سابق مظلوم قومیتوں کو نیا جنم ملا۔ ان کی معیشتی اور تہذیبی ترقی ہوئی اور وہ ترقی یافتہ اشتراکی قوموں میں تبدیل ہوگئیں۔

تاجکستان کی مثال سے لینن اور اسٹالن کی قومی پالیسی کی شاندار کامیابی کا مدلل ثبوت ملتا ہے۔

اکتوبر انقلاب سے پہلے تاجکستانیوں کی سرزمین زار شاہی روس کے انتہائی پسماندہ سرحدی علاقوں میں سے تھی۔ ملک میں غیر مہذب جاگیردارانہ نظام کا دور دورہ تھا۔ انقلاب سے پہلے تاجکستان میں دستکاری کے چھوٹے چھوٹے کارخانے کے علاوہ صنعتیں تقریباً تھی ہی نہیں۔ زراعت پرانے فرسودہ طریقوں سے ہوا کرتی تھی اور نہایت ہی بری حالت میں تھی۔ لوگ مفلوک حال اور فاقہ زدہ تھے آبادی میں ان پڑھ لوگوں کا اوسط ۹۹٫۶ فی صدی تک تھا۔ سرزمین تاجکستان پر ایک بھی کالج یا ایک بھی ہائی اسکول نہ تھا۔

زار شاہی روس کے دوسرے سرحدی علاقوں کی طرح یہاں بھی زار شاہی حکومت نے ہر ممکن طریقے سے امیر بخارا کی سلطنت کے قرون وسطا کے مطلق عنان نظام حکومت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

اکتوبر اشتراکی انقلاب عظیم کے بعد جب تاجکستانیوں کی سرزمین سے امیر بخارا کو نکال باہر کیا گیا تو ہراول پارٹی صدیوں پرانی لیسماندگی کو ختم کرنے کا پہاڑ سا کام درپیش تھا تاکہ ہم اپنی جمہوریا کو روس کے وسطی علاقوں کے معیشتی اور تہذیبی معیار تک لے جاسکیں۔

تاجکستان میں سوویت حکومت کے قیام کے بعد جمہوریہ میں قومی صنعت کی نشوونما اور ترقی پر شروع کے چند برسوں میں بڑا دھیان دیا جانے لگا۔ آج کل تاجکستان کی صنعتی پیداوار کا مقدار کے اعتبار سے انقلاب سے پہلے کی بہ نسبت ایک سو گنا ہے۔

بالشوک پارٹی اور سوویت حکومت نے تاجکستان کی زراعت کو ترقی یافتہ کرنے میں بڑی امداد بہم پہنچائی ہے۔ ذرائع آبپاشی بحال کرنے اور نئی نہروں کی تعمیر سے بیاباں ہونے والے رقبے میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ پنچایتی کاشتکاری کے نظام کی کامیابی کے بعد زراعت کو مشینی کر دینے کی رفتار تیز کرنے میں سہولت ہوگئی۔ سوویت یونین کے وسطی علاقوں سے جمہوریا کو ٹریکٹر، موٹر لاریاں، زراعتی کلیں، کیمیائی کھاد اور عمارتی سامان روز بروز زیادہ تعداد اور مقدار میں ملنے لگے۔ آج کل تاجکستان کی زراعت ترقی یافتہ اور مشینی فصلوں کی پیداوار میں سال در سال اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۱۳ء کی بہ نسبت کپاس کی فصل کی مجموعی پیداوار کئی گنا

ہوگئی ہے ۱۹۳۵ء میں ہے۔ وی استالن نے نہایت اختصار سے کہا تھا کہ یہاں کپاس کی کاشت خوب ترقی پا رہا ہوگی۔ ان دنوں کی پیداوار کی بہ نسبت بھی آج کل کپاس کی پیداوار کافی زیادہ ہے

کپاس کی کاشت کے ساتھ ہی ساتھ جمہوریا میں زراعت کے دوسرے شعبوں میں بھی کامیابی کے ساتھ ترقی ہو رہی ہے مثلاً ریشمیوں کی افزائش نسل، غلے کی پیداوار، باغبانی، انگور کی بیلوں کی کاشت ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے شہتوت کے درختوں کی کاشت ۱۹۴۲ء میں تاجکستان کے پنچایتی فارموں کی آمدنی ۱۹۳۵ء کی بہ نسبت ۳۰ گنی زیادہ تھی۔

پورے ملک کی طرح تاجکستان میں بھی ہمہ گیر تہذیبی انقلاب آیا سوویت دور حکومت میں ان پڑھپن ختم کیا جا چکا ہے۔ آج کل جمہوریا میں ہزاروں اسکول ہیں۔ حالانکے انقلاب سے پہلے تاجکستان میں صرف چند ہی تھے۔ استالن آباد میں تاجک اسٹیٹ یونیورسٹی ہے۔ اور سوویت یونین کی سائنسی اکیڈیمی کی ایک شاخ ہے جمہوریا میں قومی سوویت آرٹ اور ادب کا ارتقا ہوا۔ اور ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۶ء میں ماسکو میں منعقد ہونے والے تاجک آرٹ اور ادب کے جشن میں تاجکستان کے سوویت فن کاروں نے اپنی کامیابیوں کا مظاہرہ کیا۔

سب سے بڑی کامیابی قومی کارکنان کی تربیت ہے جنہوں نے دسمبر ۱۹۳۵ء میں کریملن میں منعقد ہونے والی تاریخی کانفرنس میں شرکت کی تھی ان میں سے اکثر آج ممتاز ریاست دان بن چکے ہیں شریف جوان ویروں ایک معمولی پنچایتی کاشتکار بیچس آج سوویت یونین کی مجلس عالا کی رکن اور ملیات ضلع پنچایت کی مجلس عالا کی صدر ہیں۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے والے پنچایتی کاشتکار دو بے خواندہ تو فی آج کل ہیرو تاجکستان کی مجلس عالا کے رکن اور ایک سب سے بڑے لکھ پتی پنچایتی فارم کے صدر ہیں ۴ دسمبر ۱۹۳۵ء کی کانفرنس میں شرکت کرنے والے وہ ہیں سب سے چھوٹے پنچایتی کاشتکار مملکت جنہیں کپاس کی فصل جمع کرنے کے کام میں ہر تمنا تاریخ

حاصل کرنے کے صلے میں لینن تمغا انعام ملا تھا۔ چند سال پہلے ماسکو کے ایک کالج سے عالا تعلیمی سند حاصل کر چکے ہیں۔

تاجکستانیوں کے اپنے ۲۰ ڈاکٹر اپنے ماہرین آبپاشی انجینیر اور سائنسداں ہیں جو ایم۔ ایس۔ سی اور ڈی۔ ایس سی کی سندیں حاصل کر چکے ہیں۔ جن تاجک ادیبوں نے سوویت دور میں یہ فن حاصل کیا انہوں نے سوویت یونین کی قوموں کے ادب میں اپنی تخلیقوں کا اضافہ کیا۔

تاجک قوم کے نئے جسم کی مثال وہی ہے جو زار شاہی روس کی سابقہ پس ماندہ اور معلوم اقوام کی ہے۔

معیشتی اور تہذیبی اعتبار سے نیا جنم لینے والی وسط ایشیائی جمہوریتوں کی زبردست کامیابی ہے۔ وی استالن کے اس قول کو صحیح ثابت کرتی ہے کہ جو قومیں ابھی اپنے ارتقائی دور کی سرمایہ دارانہ منزل سے نہیں گذری ہیں صنعتی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک میں تحمند پرولتاریا کی امداد سے سرمایہ داری کی تکلیف دہ منزل سے گذرے بغیر چھلانگ لگا کر براہ راست اشتراکیت کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتی ہیں"

سوویت یونین کی قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے استحکام اشتراکی تعمیر میں ان کا باہمی تعاون اور سابقہ مظلوم اور پس ماندہ اقوام کو عظیم الشان روسی قوم کی روز بروز کی امداد سے تمام قومی جمہوریتوں کی تیز رفتار معیشتی اور تہذیبی ترقی کے لیے جاگیردارانہ نظام سے چھلانگ لگا کر حقیقی معنوں میں اشتراکی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لاانتہا مواقعات پیدا ہو گئے۔

مثلاً کپاس کی کاشتکاری ہی کو لیجیے۔ سوویت یونین کی تمام قوموں کی امداد کے بغیر وسط ایشیائی جمہوریتوں کے کاشتکار ۳۰ برسوں کے دوران میں کپاس کی فصل کی مجموعی پیداوار دگنی اور تین گنی نہیں کر سکتے تھے کپاس کی کاشت کرنے والے وسط ایشیا کے کاشتکاروں کو غلاموں کی جمہوریتوں سے مہیا کیا جاتا ہے۔ استالن گراڈ چیلیابنسک

اور دوسرے کارخانوں سے ٹریکٹر۔ ماسکو اور گورکی کے کارخانوں کی موٹر لاریاں مہیا کی جاتی ہیں۔ وسط ایشیا میں عمارتی لکڑی کی کمی ہے۔ ماورہیں سائبیریا سے عمارتی لکڑی روز بروز زیادہ مقدار میں مل رہی ہے۔ وسط روس کے کیمیکل کارخانے وسط ایشیا کے کپاس کی کاشتکاری کے اضلاع کو کیمیائی کھادیں مہیا کر رہے ہیں۔ اس کے بدلے وسط ایشیا کی قومیں سوویت یونین کے دیگر علاقوں اور خاص طور پر روسی فیڈریشن کی سوتی کپڑے کی صنعت کو خام اشیا مہیا کر رہی ہیں۔

سوویت یونین کی دوسری قوموں اور خاص طور پر روسی قوم کی امداد کے بغیر وسط ایشیا میں بجلی گھروں معدنی کانوں فیکٹریوں اور ملوں کی تعمیر ناممکن ہوتی۔

اسے قومی کلچر کے ارتقا کے لیے بھی وسط ایشیا کی قومیں روسی قوم اور سوویت یونین کی دوسری قوموں کی برادرانہ امداد کی مرہون منت ہیں۔

سوویت یونین کی قوموں کے کلچر کی ترقی۔ جو ہیئت کے اعتبار سے قومی اور مواد کے اعتبار سے اشتراکی ہے۔ دوسری قوموں کے کلچر کے باہمی اور سود مند اثرات میں رچی ہوئی ہے تاجکستان ازبکستان، قزاقستان اور دیگر جمہوریتوں کے دانشور مزدور اور کھیتی کاشتکار سوویت یونین کی دوسری قوموں کے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ روسی اور اپنی قومی زبانوں میں کر سکتے ہیں۔ تاجک، ازبک کرغیز اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف تمام سوویت عوام کو مہیا ہیں ان کا مطالعہ ہمارے ملک کے تمام علاقوں کے کروڑوں عوام کرتے ہیں۔

یہی کیفیت کلاسکی ادب دینے کی ہے۔ پشکن، طالسطائی لرمونتوف چیخوف، گورکی، نظامی، نوائی، رستہاویلی، شیو چینکو اور ابائی کی تصانیف تاجکستان بڑے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ تاجکستان کے کلاسکی ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف روسیوں، یوکرانیوں، بیلوروسیوں، قزاقستانیوں اور دوسری قوموں میں بہت مقبول ہیں۔

اکتوبر انقلاب سے قبل تاجکستانیوں کا ایک حصہ ترکستان میں شامل تھا جو ایک گورنر کے ماتحت تھا اور ایک دوسرا بڑا حصہ جو روسی سلطنت کے ایک خطے میں آباد تھا امیر بخارا کے زیر حکومت تھا۔

سوویت حکومت کا صدر شکر ہے کہ لینن اور استالن کی قومی پالیسی کی تکمیل کے نتیجے کے طور پر تاجک قوم کے منتشر ٹکڑوں کو ایک جمہوریا میں متحد کر دیا گیا۔ اس طرح سے تاجک قوم کی تیز رفتار معیشتی اور تہذیبی ترقی کی ضمانت ہو گئی اور ایک اشتراکی قوم کی بنیاد پر اس کا نیا جنم ہوا۔

سوویت دور میں سوویت یونین کی تمام قوموں میں بے مثل شعور پیدا ہوا۔ قومی جمہوریتوں کے سوویت مورخین نے اپنی قوموں کی تاریخ کے متعلق مستند مارکسی تصانیف کیں۔ ان کی تاریخ اب تک صرف ان روایتوں اور داستانوں پر مشتمل تھی جو زبان در زبان چلی آتی تھیں۔ ماہرین آثار قدیمہ نے قدیم عمارتیں یادگاریں اور تصاویر ڈھونڈ کر نکالی ہیں جو پتا دیتی ہیں کہ صدیوں قبل یہ قومیں تہذیب اور تمدن کے خود اپنے خزانوں سے مالا مال تھیں۔ قومی جمہوریتوں کے ادیبوں نے اپنے عظیم رہنے والے اسلاف کے ان شاہکاروں کو ایک بار پھر تازہ کیا جنہیں وقت نے فراموش کر دیا تھا۔

بورژوا ماہرین مشرق نے تاجکستانی قوم کی تہذیبی وراثت کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور اسے عربوں ایرانیوں اور ترکوں سے وابستہ کر دیا تھا۔ تاجکستانیوں کا یہ اور تاب انہیں واپس دیا جا رہا ہے۔ تاجکستانیوں کے عظیم مرتبے والے اسلاف فردوسی، ابو سینا، امیر خسرو، عمر خیام، سعدی حافظ، جامی، کمال ہوجندی، عبید زاکانی، لسنی اور احمد دانش تاجک قوم کے مایۂ ناز شاعر ہیں۔

لیکن سوویت یونین کی قوموں کا سب سے اہم اور سب سے عالا قومی افتخار ان کا یہ احساس ہے کہ وہ عظیم الشان سوویت

یونین کا ایک حصا ہیں کہ اشتراکی سماج کی تعمیر کا فخر سب سے پہلے انہیں حاصل ہوا۔

سوویت یونین کی قوموں کی حیات بخش سوویت حب وطنی کا لازوال سرچشمہ کمیونزم کی تعمیر کا مشترک مقصد ہے۔

دیش بھکتی کی جنگ عظیم کے دوران میں ہے۔ وی۔ اسٹالن نے کہا تھا۔ سوویت حب وطنی کی سرشت حقیقت یہ ہے کہ اس کی بنا نسلی یا قومی تعصبات نہیں بلکہ سوویت مادر وطن سے عوام کی انتہائی عقیدت اور وفاداری ہے ہمارے ملک میں بسنے والی تمام قوموں کے محنت کش عوام کا برادرانہ تعاون ہے۔ سوویت حب وطنی قوموں کی اپنی قومی روایات اور سوویت یونین کے تمام محنت کش عوام کے اہم ترک مشترک مفادات کا ہم آہنگ امتزاج ہے سوویت حب وطنی تعصبات پیدا نہیں کرتی بلکہ ہمارے ملک میں بسنے والی تمام قوموں اور قومیتوں کو ایک برادر انہ خاندان میں متحد کرتی ہے۔

سوویت یونین کی قوموں میں کبھی نہ ٹلنے والی اور روز افزوں دوستی جو موجود ہے اسی کو اس کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔"

کمیونزم کے عالا لفظ رات کی تکمیل کے لیے جدوجہد میں محنت کش عوام کی سرگرمیوں میں جوش و خروش سوویت حب الوطنی ہی پیدا کرتی ہے۔

قوم پرستی کے تعصبات اور بورژوا بین قومیت کے رجعت پسند نظریات سوویت محبان وطن کے لیے بلکل اجنبی ہیں۔ سوویت محبان وطن قوم پرستی اور بین قومیت پرستی کے بچے کچے اثرات کا پردہ فاش کر رہے ہیں اور انفصلیت کے رجحانات اور ماضی کے متعلق غیر تنقیدی رویے کی قلعی کھول رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں قومی مسئلے کا شاندار حل سوویت یونین کی قوموں میں آپس کی دوستی کا مضبوط ہونا نیز اشتراکی قوموں کا اتحاد اور استحکام سوویت یونین کی تمام قوموں کی بے مثل معیشی اور تہذیبی ترقی سراپا دارا نا نظام پر اشتراکی نظام کی زبردست فوقیت پر بار بار شہادت کرتی ہے۔

نوآبادی اور محکوم ممالک کی مظلوم قوموں کو سوویت یونین کی مثال قومی مسئلے پر لینن اور اسٹالن کی تعلیمات صحیح ہونے کا مدلل ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔

سوویت یونین میں لینن و اسٹالن کی قومی پالیسی کی شاندار کامیابی تمام دنیا کی مظلوم قوموں کو سامراجیت کے خلاف اور آزادی و خود مختاری کے لیے جمہوریت دانشتراکیت کے لیے جدوجہد کرنے کا جوش و خروش دلاتی ہے۔

جے وی اسٹالن نے سوویت یونین کی قوموں میں باہمی میل ملاپ اور دوستی پیدا کرنے کا شاندار کام انجام دیا۔ جے وی اسٹالن کی قیادت میں سوویت یونین کے مختلف قوموں کے عوام نے عظیم اشتراکی ملک میں معیشی اور تہذیبی ترقی حاصل کی۔ اسٹالن جے۔ ایسے کارکن ہمارے ملک کی قومیں فاشی حملہ آور کے خلاف موت اور حیات کے معرکے میں سینہ سپر ہو گئیں اور اسے شکست فاش دی۔ "اسٹالن عظیم" سے جذبہ جوش و خروش حاصل کر کے سوویت یونین کی اقوام نے جنگ کا استالینی پانچ سالا منصوبہ کامیابی کے ساتھ پورا کر دیا ہے۔

تمام قوموں کے خیالات اور ان کی آرزوئیں اپنے محبوب لیڈر اور معلم جے۔ وی اسٹالن پر مرکوز تھیں۔

اسٹالن کا نام سوویت سماج کے اخلاقی اور سیاسی اتحاد کا نشان ہے، سوویت یونین کی قوموں کی الوالعزمی جانبازی اور عظمت کا نشان ہے عظیم مادر وطن کی خدمت کے لیے نئے کارہائے نمایاں انجام دینے کی للکار ہے "اسٹالن اعظم" کی قیادت میں سوویت قومیں کمیونزم کی فتح کی جانب تیزی سے قدم بڑھا رہی تھیں اور اب ان کے فنا ہونے والے نام پر اپنی کوششوں کو اور بھی تیز تر کریں گی۔

اسٹالن اور غیر معمولی قابلیتوں کا لوہا ان لیا انسان حقیقت میں ایک عظیم انسان تھا۔

جہاں استالن نے جلاوطنی کے ایام بسر کیے

(سولوی چے گودسک کا عجایب گھر)

ای۔ کوکودین

سولوی چے گودسک کا قدیم شہر شمالی دریائے دوی نا معاون ندی وی چیگدے کے بلند ساحل پر واقع ہے۔ اس شہر کا نام مرکب ہے لفظ "سول" (بمعنی نمک) اور دریائے وی چیگدے کے نام کا۔ گذشتہ صدیوں میں یہاں نمک نکالنے کا بہت بڑا کاروبار تھا اور نمک کی کانوں کا مالک سترا گونوف تاجروں کی ملکیت تھیں۔ درحقیقت خاندان سترا گونوف والے ہی سولوی چے گودسک کے خدمختار حکمران تھے اور انہوں نے یہاں کی کسان رعیت کا خون چوس چوس کر بے انتہا دولت جمع کر لی تھی۔ انہوں نے یہاں رئیسی ٹھاٹ کے بڑے بڑے محل گرجا گھر اور خانقاہیں تعمیر کرائیں وہ یہاں عمارت بھی کیا کرتے تھے اور صدقہ خیرات بھی دیتا کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام پر کانکنی کے ذخیرے دریافت ہونے کے بعد وی چیگدے کا کارخانہ داروں کی توجہ کا مرکز نہ رہا۔ اس شہر کا زوال شروع ہو گیا۔ تجارتی مرکز کی جگہ ایک گاؤں رہ گیا جہاں موسم سرما میں آمد و رفت بھی مشکل ہو گئی۔ زار شاہی حکومت نے معتوب لوگوں کو جلاوطن کرنے کے لیے سولوی چے گودسک کو ایک مناسب مقام تصور کر لیا۔

۲۷ فروری ۱۹۰۹ء کو جوزف استالن کی سردی کا دن تھا پولس کے افسران کی ایک خصوصی کانفرنس کے فیصلے کے بموجب جلاوطنوں کے ایک قافلے کے ساتھ جوزف اوساری اونووچ استالن اس شہر میں پہنچے۔ چار مہینے بعد ۲۴ جون کو وہ یہاں سے بھاگ نکلے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ واپس آ کر گرفتار کر لیے گئے۔ استالن کو ولوگدا کے گورنر کی درخواست پر سولوی چے گودسک واپس بھیجا گیا۔ جہاں وہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو پہنچے۔

زار شاہی افسران سمجھتے تھے کہ جے۔ وی استالن کو جلاوطن کر کے وہ انہیں انقلابی تحریک سے عوام سے الگ تھلگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن دور دراز سولوی چے گودسک میں بھی استالن نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ انہوں نے بہت کام کیا۔ اور ولادیمیر آئی اولیانوف لینن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔

دو چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ مکانات سڑک کے دونوں جانب آج تک اسی حالت میں موجود ہیں ان میں استالن نے اپنی جلاوطنی کے دن گزارے تھے ۱۹۳۳ء میں ان میں سے ایک میں عجایب گھر بنایا گیا۔ دوسرے مکان میں ایک کمرا اسی فرنیچر سے جوں کا توں سجا دیا گیا ہے جو استالن استعمال کیا کرتے تھے یہ مکان بھی عجایب گھر کا ہی ایک حصہ ہے اس عمومی سے کمرے میں داخل ہو کر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور جی بھر آتا ہے اسی کمرے میں "استالن اعظم" رہتے اور کام کیا کرتے تھے۔

یہاں ایک چھوٹی سی میز ہے۔ چند کرسیاں چوبی پلنگ گلدان اور ایک لوہے کا چولھا ہے۔ یہی وہ میز ہے جس کے آگے بیٹھ کر جوزف استالن نے پیرس میں لینن کے نام اپنا تاریخی خط تحریر کیا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سیاسی جلاوطنوں کے جلسے منعقد ہوا کرتے تھے جوزف استالن سے مشورا کرنے کسان یہاں آیا کرتے تھے رات کے وقت پولیس کے جاسوس انہیں کھڑکیوں سے جھانکا کرتے تھے اور استالن کی حرکات و سکنات معلوم کیا کرتے تھے۔

اس مکان کے مقابل دوسرے مکان میں جہاں اسٹالن کے کچھ عرصہ قیام کیا تھا چند چیزیں دستاویزات کے فوٹو اور تصاویر جمع کی گئی ہیں، جو محنت کش عوام کے قایدِ اعظم کی اس زندگی کی عکاسی کرتی ہیں جو انہوں نے سولوی چے گوسک اور وولوگدا میں اپنی جلاوطنی کے دور میں گذاری۔

اس زمانے میں ہے۔ وی اسٹالن نے انتہائی مشکل حالات میں زندگی گذاری اور تصنیف و تالیف کا کام کیا۔

ان میں سے ایک مکان کی مالکا نے اپنے کرائے دار لینن اسٹالن کے متعلق یہ بیان کیا:۔

"میں نے دیکھا کہ وہ بہت تھکے ماندے معلوم ہوتے تھے اس کی وجہ بھی ظاہر تھی کیونکہ وہ اس سے پہلے کچھ عرصہ قید خانے میں بھی رہ چکے تھے۔ اور پھر قافلے کے ساتھ آنے کی پریشانیاں اور تکلیفیں بھی جھیل چکے تھے۔ جلاوطنی میں بھی صحت کی اصلاح کرنے کے ذریعے موجود نہ تھے جو ذرف وساری اولوویچ کو کھانے اور کرائے کے لیے صرف سات روبل اور بہ کوپک ملا کرتے تھے۔ ان کی ضروریات بھی نہایت معمولی تھیں۔ وہ صبح سے ایک لوٹا بھر دودھ خریدتے تھے جس میں پانچ گلاس بھر دودھ آتا تھا اور وہ اسے دو دن چلاتے تھے دودھ کے ساتھ کھانے کے لیے وہ ایک چھوٹا نان پاؤ خرید لیتے تھے وہ کھانا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ باہر کھایا کرتے تھے۔

سولوی چے گوسک میں اسٹالن کو بازار میں جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ گاؤں والوں کی محفل نعقاد و سرود میں شامل ہونے پر اسٹالن پر جرمانا ہوا اور جلاوطنوں کے ایک جلسے میں شرکت کرنے پر انہیں صلیب کے پولیس افسر نے تین دن کے لیے قید کر دیا ۲۳ جون سے ۲۶ جون ۱۹۱۴ء تک اسٹالن تھانے کی حوالات کے آہنی دروازوں میں بند رہے یہ حوالات تھانے کی ایک منزلہ عمارت میں تھی۔ یہ عمارت سولوی چے گوسک میں آج تک موجود ہے۔

جلاوطنی کی مدت ختم ہونے کے بعد اسٹالن وولوگدا چلا گئے انہیں کاکیشیا میں اسکومیں اور کسی بھی صنعتی مرکز میں رہائش اختیار کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود تھوڑے ہی دنوں بعد اسٹالن خفیہ طور پر پیٹرسبرگ پیٹرس برگ کے لیے روانا ہو گئے۔

ہر سال سولوی چے گوسک کا عجایب گھر دیکھنے ہزاروں مزدور، کاشتکار، طلبا، اسکول کے بچے اور سوویت فوج کے سپاہی آتے ہیں۔ رائے کی کتاب میں بے شمار رائیں درج ہیں سوویت عوام کو سترتوں سے ہم کنار کرنے والے انقلاب کے روح رواں اسٹالن سے انتہائی محبت اور عقیدت سے یہ رائیں لکھی ہوئی ہیں۔

زارووینا کی دستخط سے یہ تحریر درج ہے "ایک زمانے میں جس چھوٹے سے مکان میں ہمارے قائد اعظم اور معلم رہتے تھے وہاں جب میں داخل ہوا تو ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ عجایب گھر میں جو چیزیں جمع کی گئی ہیں وہ میری جانی پہچانی ہیں اور اس وجہ سے مجھے اس بات کا اور بھی گہرا احساس ہوا کہ وی آئی لینن اور ہمارے وی اسٹالن کی قیادت میں بالشوکوں نے کتنا زبردست کام انجام دیا۔ میں اس عجایب گھر کو دیکھنے کا واقعہ کبھی بھی نہیں بھولوں گا جس نے میری معلومات کو اور بھی وسعت دی"

ایک افسر کوتلیاریوسکی نے رائے کی کتاب میں نیچے کی سطریں لکھی ہیں۔

"وہ مقام دیکھ کر جہاں ہمارے رہنما بنی نوع انسان کے زبردست عالم کا مربی اسٹالن رہتے تھے اور جہاں انہوں نے خدمت کو مزید جدوجہد کے لیے محنت کش عوام کی خوشحالی کی جدوجہد کے لیے تیار کیا۔ میرے ذہن میں وہ نقوش چھوڑے ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتے۔" ایک اور رنمایاں تحریر ہے جس کے نیچے یہ ہیں "ہم اسٹالن عجایب گھر دیکھنے اس روز آئے جب ہمیں کمسومولسٹ پارٹی کی صفوں میں شامل کیا گیا تھا ہم یقینی طور پر اسی طرح زندگی بسر کریں گے اور کام کریں گے جس طرح عظیم اسٹالن اور لینن کی ہدایت کی عاملانہ زندگی بسر کرتے اور کام کرتے ہیں۔

26 JUN 1953

Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN)

ہندستانی دب

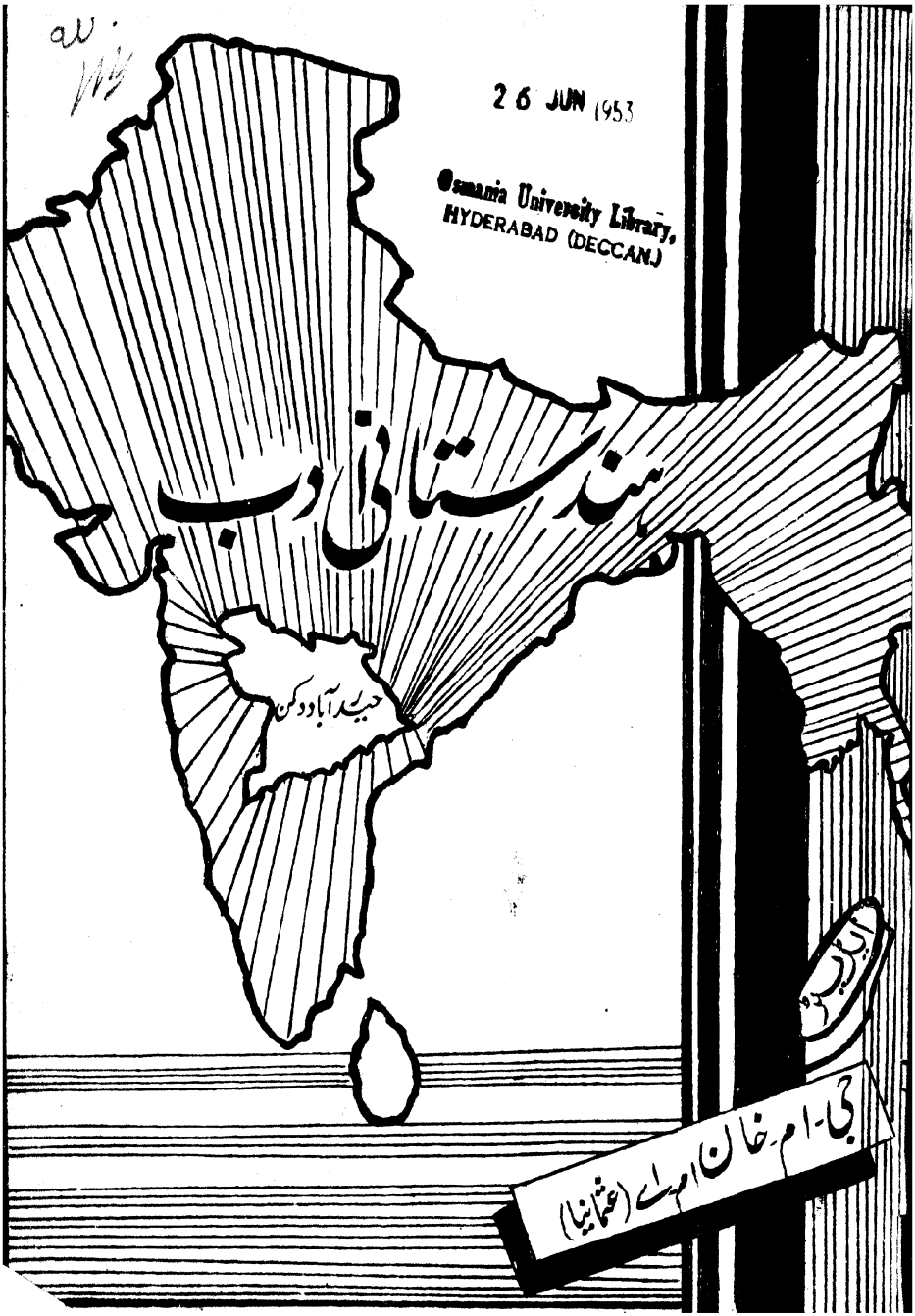

جی۔ ام۔ خان ایم اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصوں پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے۔اعظم پورہ شرقی۔پی۔او۔جوبلی حیدرآباد دکن

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور شدہ

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

چندہ سالانا چھ روپے

جلد (۱۳) نمبر (۸)

قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

تیر ۱۳۶۲ف مئی ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	حجاج بن یوسف		
حقایق ومعارف	افقر موہانی وارثی	۳	تضاد		
آب بیتی	پرویز انجم	۴	ایک بند رکا خط		
قطعہ	انور (بلگرامی)	۶	ملکا میرکا		
انتباہ	شاہر صدیقی	۶	بیہوشیاں		
آفتاب جو کبھی غروب نہیں ہوتا	محمد علی خان	۷	یو۔این۔او کی شاندار عمارتیں		
شاہوں کے جلال	صلاح الدین محمد	۱۲	ریت کی دیوار		
غزل	واصف (بنارسی)	۱۲	غزل		
	رازؔ شہباز پرویز	۲۸			

ڈاکٹر ہپسیادت علی خان ۱۳

بدرالحسن خنداں ۱۶

آیاز عصمی ۱۸

ب۔ل ۲۰

ہوشش (بلیح آبادی) ۲۱

یوسیس ۲۲

قمرالدین قمر ۲۴

نصیر کوٹی ۲۷

ہمارے خیالات

ہندی مشکل ہی سے ہماری قومی بھاشا کہلائی جاسکتی ہے

یہ ہے وہ خیال جو شری کیتی سام ساکن کرکی صوبہ بمبئی نے ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء کے ہیرلڈ ٹریبیون اخبار "فری پریس جرنل" (بمبئی) میں ظاہر کیا ہے۔

آج کل "فری پریس جرنل" کی گنتی ہندستان کے چوٹی کے اخباروں میں ہو چلی ہے۔ ہندستان کا سب سے زیادہ اثر انگیز اور جھپنے والا اخبار "ٹائمز آف انڈیا" ہے اسکی اشاعت ایک لاکھ ستر ہزار سے بھی اونچی ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر "فری پریس جرنل" ہے اس کی تعداد اشاعت ۸۰ ہزار کے لگ بھگ ہے اس لحاظ سے اس اخبار کی بھی کوئی کم اہمیت نہیں پورے ہندستان میں روزانہ لاکھوں ہی لکھے پڑھے لوگوں کی نظر سے گذرتا ہے۔

"فری پریس جرنل" میلی ایڈیٹر کے نام خطوں کا ایک خاص کالم ایڈیٹوریل کے بازو ہی ہوا کرتا ہے اس کالم میں صرف خطوں ہی کو جگہ دی جاتی ہے۔ یہ خط مختلف موضوع پر ہوا کرتے ہیں جن میں ہر شخص اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے چنانچہ ایک ایسے ہی خط میں انگریزی کی اہمیت IMPORTANCE OF ENGLISH کے عنوان سے سام ماد راس تھے چیف منسٹر اسی راج گوپال چاری کے اس خیال کی تائید کی ہے جو انہوں نے انگریزی کی غیر معمولی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں ظاہر کیا تھا۔ راج گوپال چاری نے یہ خیال صرف ایک بار ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اپنی ہر پبلک تقریر میں موقع موقع سے وہ اس خیال کو دہراتے آئے ہیں۔ سی آر کے اسی خیال کے بارے میں شری متی جی لکھتی ہیں۔

"میں شری سی راج گوپال چاری چیف منسٹر مدراس کی اس اپیل کی تائید کرتی ہوں جو انہوں نے انگریزی کو موجودہ حالات اور دور میں برقرار رکھنے کے بارے میں کی ہے اور بہت سے لوگوں کے برخلاف ہندستان میں کسی ایک صوبائی زبان کے صوبوں پر پورے دیش کا بھروسہ کرنے میں ہچکچاتی ہوں۔ ہماری راج بھاشا ایک کونے میں سکیڑ کر رہ جاتی ہے وہاں بھی صرف دفتری کاروبار کی حد تک اس کا زور ہے۔ بھاشائیں موجود ہیں اس لیے ان میں سے کسی ایک بھی بھاشا کا ابھارنا اپنا خاص مقام پیدا کرنا ممکن نہیں۔ رہی ہندی اس کو حکومت نے زبردستی بھی پورے دیش کا لادو دیا ہے مگر یہ یاد رہے کہ ہندی کسی صوبے میں بھی اپنا خاص مقام نہیں پیدا کر سکتی۔ پورے ہندستان کا لحاظ کرتے ہندی کا کام دوجا فیصلہ سے زیادا نہیں ہو سکے اس لیے ہندی ابھی مشکل ہی سے ہماری قومی بھاشا کہلائی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ ہندی ہمارے دیس کے ایک بہت بڑے حصے میں اب تک بھی نہ بولی جاتی ہے اور سمجھی جاتی ہے"

اس نوٹ پر ہم انگریزی کی ضرورت اور اہمیت یا غیر اہمیت کے جھگڑے میں جانا نہیں چاہتے اس عنوان پر خدا خدا کے ایک زیادہ تر ہمارے صفحوں پر اپنے وچار ظاہر کیے ہیں اس وقت تو ہمیں سام کے اس حقیقت افروز وچار سے بحث ہے کہ "ہندی مشکل ہی سے ہماری قومی بھاشا کہلائی جاسکتی ہے" یہ وچار بھی "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کے لیے کوئی نیا وچار نہیں ہے بلکہ جہاں تک ہندی کو قومی بھاشا کا غلط نام دیا گیا ہے اس وقت سے ہم اس خیال کی مخالفت کرتے آئے ہیں اور پچاسوں ہی واجبی دلیلوں کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ ہندی راج بھاشا یا حکومت کی زبان کہلوائی جاسکتی ہے اس کو ضمناً کی زبان یا دیس بھاشا کہنا سراسر غلط اور ایک طرح سے ہٹ دھرمی بھی ہے۔ چنانچہ ہمارے اس وچار کی پوری پوری تائید سام کے اوپر کے خیالات سے ہوتی ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ عظیم ہندستان میں یو۔ پی۔ ایم۔ پی۔ بہار اور راجستھان کو چھوڑ کر ہندستان کے باقی صوبوں میں ہندی کا کوئی خاص مقام نہیں۔ آسام میں آسامی، اور بنگال میں بنگالی کا بول بالا ہے۔ پنجاب میں پنجابی کو اچھالنے کی کوششیں جاری ہیں۔ بمبئی مدراس اور جنوب کے تمام علاقوں میں یہ قول راج گوپال چاری "انگریزی کو خاص اہمیت حاصل ہے" سو فیصد اسٹیٹ میں پہلے ہی سے انگریزی کا رواج عام ہے اور جب دیکھا جائے تو ابھی اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے جب ہم

افقر موہانی
وارثی

حقایق و معارف

کون مجبور وفا مقتل میں قرباں ہوگیا
ختم کس پر امتحان تیغ براں ہوگیا

موت آئی زندگی کا راز عریاں ہوگیا
بڑھ گیا حد سے جو دل کا درد درماں ہوگیا

ایک خاموشی سے کل عالم پریشاں ہوگیا
مطمئن لیکن مریض شام ہجراں ہوگیا

اس سے دل کی کیفیت کا کوئی اندازہ کرے
آنکھ تک آیا نہ تھا قطرہ کہ طوفاں ہوگیا

اب الٹ ہی کیوں نہ دے پردا حریم ناز کا
کام جو ہونا تھا وہ اے حسن جاناں ہوگیا

وہ جو اک ہستی ازل میں تھی سراپا سوز و ساز
محفل دنیا میں اس کا نام انساں ہوگیا

ایک ٹوٹا سا پیالا اک پھٹا سا بوریا
عید ہے اپنی میسر جب یہ ساماں ہوگیا

چاک پیراہن جو ہوتا سینہ گر کرتا رفو
کیا علاج اس کا کہ دل ہی چاک داماں ہوگیا

شمع محفل میں رہی باقی نہ پروانے رہے
صبح ہوتے ہوتے سب کا حشر یکساں ہوگیا

ہے مرے عہد اسیری کی نمایاں یادگار
وہ لہو جو زینت دیوار زنداں ہوگیا

کچھ نہ پوچھو خانہ بربادی کی میری کیفیت
جس مکاں میں دو گھڑی بیٹھا بیاباں ہوگیا

مرنے والے کی کوئی مجبوریاں دیکھے ذرا
اک چراغ گور کو محتاج انساں ہوگیا

ان کے تیروں سے نئی آباد دنیا ہوگئی
ہر خدنگ ناز میرے دل کا ارماں ہوگیا

لے رہے ہے قسمت طالع الفت میں مرمٹنے کی داد
دل کا ہر ذرہ غبار کوے جاناں ہوگیا

کیا مزار بیکساں کو احتیاج روشنی
چار جگنو جب چمکے اٹھے چراغاں ہوگیا

عشق ہی اک نظر یا ہے حسن کے معیار کا
جس کی صورت بھا گئی وہ ماہ تاباں ہوگیا

دل گلستاں تھا تو افقر ہر طرف تھی اک بہار
یہ بیاباں کیا ہوا عالم بیاباں ہوگیا

آپ بیتی

پرویز انجم

(طویل مشتبہ نظم)

پیش لفظ

اب تو اظہار نا بھی کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے
بھول تھی میں نے محبت کی تھی
ایک بیدرد سے الفت کی تھی
خدکو دیوانا تھی کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے

(۱)

بجھ گئی اب سینۂ سوزاں کی آگ!
کوئی بھی شعلا نہیں کوئی بھی چنگاری نہیں
"زلیخا" جیسے رہگزار بیکراں
آرزوئیں ــــ رنقش پائے کارواں
نقش پائے کارواں کے بھی نشاں ملتے نہیں
ڈھونڈ تو آکر تمہیں ــــــــ
دل کا ویرانا بھی ہے جیسے اداس
اب کہاں کھلتے ہیں یادوں کے کنول
دیکھ تو سونا پڑا ہے اپنی ہستی کا محل
کوئی بھی شعلا نہیں کوئی بھی چنگاری نہیں
اور علاج درد دل اپنی یہ بیچارگی نہیں
آگ بجھو نکی تھی تمہیں نے آگ سے کھیلیں تھیں تم
جل بجھا میں ــــ جل بجھی دنیا میری
ہوگیا قصہ تمام ــــــــ
اور اب اس رہگزار بیکراں میں کچھ نہیں
کچھ نہیں بیتے دنوں کی داستاں میں کچھ نہیں

(۲)

ایک شعلا سا لپکتا تھا کبھی روح کے نہاں خانے سے
کبھی ڈھل جاتی تھی آنکھوں میں محبت کی شراب
پھول کھلتے تھے تو آجاتی تھی ہونٹوں پہ ہنسی
تارے ہنستے تھے تو ہوتی تھی نظر بھی بیتاب
کتنی مدہوش تھی ــــ مدہوش جوانی اپنی
اور بیتاب امنگیں کہ تقاضائے شباب
ڈھونڈتی تھیں کسی شہناز کو آنکھیں میری
ایک انجان حقیقت تھا جوانی کا یہ خواب
میں تو انجان تھا، انجان ہی رہتا لیکن
رقص ناہید پہ پھیر چھیڑ دیا کس نے رباب
اب تو گہرائی میں سینے کے سلگتی ہے اک آگ
اور جذبات کا دل میں ہے مسلسل گرداب

(۳)

اے شام غم کے ولولو میری دنیا سے جاؤ اب
جاؤ کہ اب تو زیست کی محفل اداس ہے
اجڑ لگا کوئی چاند نہ پھیلے گی چاندنی
اب کشتی حیات ہی ساحل کے پاس ہے
یک لحظہ زندگی کی تمنا میں آج تک
بیتاب رہا ہوں آس کی دنیا لیے ہوئے
ہر تلخی حیات کو پیتا رہا ہوں میں!
بیتاب آرزوئیں تمنا لیے ہوئے
کانٹوں کی سیج پر ہے محبت کی آرزو
شعلوں پہ سو گئی ہے میرے دل کی آرزو
ایسے میں کوئی آئے بھی گر میرے روبرو

پھر تلخیِ حیات، کہ زہراب کا ہو جام!
اشکوں کی موج ہو کہ ہو طوفان کا خرام
بس ایک پل میں اپنا بنا لوں کہو جسے
صبحِ ازل ہو یا کہ ابد کی ہو کوئی شام
دستِ جنوں کی زد سے کسی کو مفر نہیں
یہ زندگی ہے گردشِ شام و سحر نہیں

(۴)

اے میری انجان سی ساتھی تیرا روپ منوہر
مین کنٹوری نرمل جل سے دھلی ہوئی اک شام
ہونٹوں پہ مسکان کی چندا، ماتھے پہ اوشا کی کرن
بھولی بھالی، انجانی سی اک پنچھی کا روپ لیے
من مندر کے اونچے کلس پر آ بیٹھی بہروپ لیے
میں تو ایک پجاری روپ درشن کا متوالا
مکھ درشن سے تو نے پاپی ہردے کو پرچایا
میں نے تجھکو دیوی سمجھا مندر میں بٹھلایا
چرن میں تیرے ڈالدی میں نے جیون بھر کی مایا
میں یہ سمجھا یہ جیون ہے چڑھتی ڈھلتی چھایا
تجھکو پاکر جیون بگ پر چھا جائے اجیارا
اس آنس پہ جی کر خد کو میں نے دنیا سے سرایا

(۵)

دوسری صبح جب من مندر کے دوار کھلے
سونی سونی دل کی دنیا سونا سونا مندر تھا
کوئی دیوی نہ کوئی پنچھی، پتھر کی اک مورت
کس سے دل کی بات میں کہتا کس کو اپنا تا
کھو گئی آخر تاریکی میں چڑھتی ڈھلتی چھایا
اب میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کیا کھویا کیا پایا

(۶)

در و دیوار کا سودا ہے نہ صحرا کی تلاش
آج دیوانا تیرا دور بہت دور نکل آیا ہے
قیس و فرہاد کے افسانوں کی تعمیر ہو کیونکر ممکن
وقت نے موڑ دیا بڑھ کے زمانے کا نگام
وادی نجد میں ہے اب بھی مگر لوگوں کا ہجوم
اب بھی محمل میں اسی شان سے لیلیٰ کا گذر ہوتا ہے
پر کوئی قیس نہیں، کوئی بھی دیوانا نہیں
لوٹ لے ہوش و خرد گر دشِ دوراں میں وہ پیمانا نہیں
اب تو ہر گام پہ جیسے نئی منزل کا گماں ہوتا ہے
کیسی خاموشی ہے دنیائے محبت پہ سکوں طاری ہے
اور ایسے میں میرا قافلۂ عمر و داں گم ہوتا ہے

اے میری قافلۂ عمر کی تنہا ساتھی!
تم کہاں ہو کسی ویرانے سے آواز تو دو
تھک گیا راستہ و منزل کے تمہارا انجم
تم اگر ساتھ نہ دو ہمت پرواز تو دو
تاکہ میں گا تو سکوں محفلِ زیست کو گرما تو سکوں
اپنی بیتاب امنگوں کو دل زار کو بہلا تو سکوں

(۷)

یہ نغمۂ حیات ہے، یہ زندگی کا ساز
جنوں کی زد پہ ہے دیکھو جہاں کی پنہائی
بجھی بجھی سی جو شمعِ حیات تھی اپنی
کسی کے رخ سے چرا لائی تابِ رعنائی
کہاں کہاں ہے گذر آج عشق رسوا کا
پہنچ چکی ہے وہ عالم میں اپنی رسوائی
بہت عزیز سہی ان کو اپنا حسن و جمال
مجھے بھی ہے دلِ ناداں پہ ناز یکتائی

اب تک اسی یہ گیت سناتا رہا ہوں میں
دنیا سے دل میں لاکھ چراغاں ہوا مگر
پلکوں پہ اک چراغ جلاتا رہا ہوں میں
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے
اشکوں سے دل کی پیاس بجھاتا رہا ہوں میں
اے دل کی آرزو وہ تمہیں اب جواب دو
دل کسکی آرزو میں جلاتا رہا ہوں میں
مانا کہ پر قریب ہے دنیا بہت مگر
دنیا کا یہ فریب بھی کھاتا رہا ہوں میں

اختتامیہ

شمع جلی پروانے جو چکے وقت سے پہلے محفل اٹھی
درد کی لذت دل کا فسانا کوئی مگر کہتا ہی رہا
موجیں ابھریں طوفاں اٹھے ساحل ٹوٹا کشتی ڈوبی
وقت کا یہ انجان سفینہ پھر بھی یوں ہی بہتا ہی رہا
کتنی ہی مجبور امیدیں کتنے ہی رنجور ارادے
دل کی تہ میں پنہاں تھے اس چوٹ کو جو سہتا ہی رہا
آ آ اے دل والو، درد کا درماں کچھ تو کرو
دنیا والے سنتے رہے دیوانا کوئی کہتا ہی رہا

قطعہ

ساقی ہوئی دنیا بھی بہار ہستی
اٹھتا ہوا ایک دلفگار ہستی
اے وائے کھلا کب مئے ہستی کا خمار
انور نہ ہوا جبکہ خمار ہستی

انور جمالی

انتباہ

ملت و قوم کے ہمدرد وطن کے رہبر
کھیل لو کھیل لو انسان کی مجبوری سے
چند روزہ اور حکومت کا سہارا لے کر
رشک چنگیز بنو قوم کی مظلومی سے
باغباں تم ہو گلستاں پہ تمہارا حق ہے
چھین لو نکہت گل لوٹ لو تزئین چمن
شیش محلوں کی فضا واں میں سنورنے والو
چھین لو شوق سے مزدور کی لاشوں سے کفن
ہاں مگر ذہن میں رکھو یہ ستم کے بندو
رات جب جلد سے گذرتی ہے تو ہوتی ہے سحر
ایک امید سحر چہرہ ہے گذرا اپنا
ہو ہی جائے گی بہر طور سیہ رات بسر

شاعر صدیقی

آفتاب جو کبھی غروب نہیں ہوتا

محمد علی خان

وہ ایک سحر آگیں رات تھی دن بھر متواتر چلتے رہنے کے بعد تیز و تند ہوا رات آتے ہی اچانک پرسکون ہو گئی تھی۔ درختوں کی پھننگوں سے ہوا یوں تھوم کر نیچے گری تھی جیسے کسی غیر ماہر شکاری کی گولی اس کے آگر لگی ہو اور وہ اپنے پر سکوڑ کے زمین کو گلے لگائے چپ چاپ پڑی ہو۔

اب پوری فضا گہری خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ پتا تک نہ کھڑک رہا تھا۔ گاؤں کے پاس والے جنگل نے ایک گہری سانس لی۔ اور عضلات کی نیند سو گیا۔ سناٹے سے پہلے جو پرند ہوا میں جھولتی ہوئی شاخوں پر بیٹھے بے آرامی سے اونگ رہے تھے وہ اب سکون کے تخالیہ اکر رہے تھے۔

اس یک لخت سناٹے نے ہی عرصہ اعزت کو سوتے سے جگا دیا تھا۔

اس نے سکلیہ (قفقازی جھونپڑی) کی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر جھانکا دودھیائی رات تھی۔ درختوں کے پتے بے حس و حرکت تھے بلند و بے پایاں آسمان پر صرف تارے جھلملا رہے تھے۔

غروب آفتاب سے پہلے آسمان کا جھکا ہوا گنبد معلوم ہوتا تھا کہ اب اچانک یکبارگی بڑے بھاری پتھر کی طرح کھل گیا ہے اور اس کی اتھاہ خلا میں تارے جڑے ہیں۔

بوڑھی عزت نے اپنی بوڑھی گرو پر نظر ڈالی جو اسی کے پہلو میں لیٹی ہوئی سو رہی تھی۔ اٹھارہ سالہ انوجوان دوشیزہ لیچا میٹھی نیند سو رہی تھی کہ اسے جگانے کو بڑیا کا دل نہ مانا۔ یہاں کی رات کی خاموشی میں گرو کے دل کی دھڑکنیں ایک پر بہار دھن مسرت گیت گا رہی تھیں۔

اور جیسے ہی بوڑھی عزت کھڑکی پر جھکی اسے وہ گیت سنائی دینے لگا۔ وہ اسے خوب پہچان گئی یہ وہ گیت تھا جو مدتوں سے ہوا لنان کے سینے میں چھپا ہوا تھا اور بہار کی ایسی

راتوں میں پہلے پہل پیدا رہو کر عجیب اور حیرت انگیز باتیں سنا جاتا بڑیا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ اس گیت کے مدھر رس میں ڈوب جائے کہ اچانک اسے ایک درد ناک سنائی دیا جو باغ میں دور کہیں سے آ رہا تھا اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور غور سے سننے لگی۔

ہاں یہ پرند کی آواز تھی، اسی پرند کی۔

بڑیا جگانے کی غرض سے اپنی پوتی پر جھکی اور سینے پر پڑتی ہوئی چاند کی کرنوں میں اس نے دیکھا کہ لڑکی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔

"مجھے بھی سنائی دی وہ آواز، دادی" گرو نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "کیا یہ وہی پرند ہے؟"

"وہی ہے" بڑیا نے جواب دیا "اٹھ جا بیٹا"

گرو کا چہرا خشی سے دمکنے لگا۔ اور وہ بستر میں سے نکل آئی۔ دادی اور پوتی دونوں نے چپ چاپ کپڑے بدلے اور فوراً باہر چلی گئیں۔ سوتے گاؤں کی کشادہ سڑک پر سے گذرتے ہوئے وہ پہاڑوں کی طرف روانا ہو گئیں۔

تنگ پگڈنڈیوں کے رستے بلندی پر چڑھتے ہوئے گرو کے دل کی حرکت تیز ہو گئی تھی۔ آخر کار مدتوں انتظار کے بعد اس پرند نے گانا شروع کر دیا تھا اس کے گیت نے پیش گوئی کی کہ آج کی رات پہاڑوں کی بلندی پر پودینے کی وادی میں وہ پیش بہا پھول کھلے گا۔ جس سے سوت بنگنے کے خوب صورت پکے رنگ بنائے جا سکتے ہیں۔

گرو نے اپنی دادی سے اس پھول کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اس روز کا اسے بہت دنوں سے انتظار تھا اور وہ اپنی دادی سے برابر کہی جا رہی تھی کہ وہ پھول مجھے جلد دکھاؤ لیکن بوڑھی عورت بڑے صبر کے ساتھ اس سے انتظار کرنے کو کہتی رہتی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ پھول اس وقت تک نہ کھلے گا جب تک کہ وہ پرند جس کے متعلق صرف اسی کو علم تھا گانا شروع کر دے۔

گرو بے قرار تھی۔ وہ دوڑ کر آگے نکل جاتی اور اکثر اسے رک کر انتظار کرنا پڑتا۔ کیونکہ بوڑھی عزت پہاڑی پر آہستہ آہستہ چڑھ رہی تھی۔

جب صبح کا ستارا ان سے ملاقات کرنے آسمان پر نمودار ہوا تو وہ پہاڑ کے پہلے درے پر پہنچ چکے تھے انہوں نے گھڑی بھر ٹھہر کر دم لینے کا فیصلا کیا۔ بڑیا ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی گرو خاموش کھڑی پہاڑی کے اس پار آسمان پر بڑتی ہوئی روشنی کو دیکھ رہی تھی۔ ویران آسمان پر ستاروں کے کارواں رفتہ رفتہ بلند ہو کر بے پناہ خلاؤں میں غایب ہوتے جا رہے تھے۔

گرو کا جی چاہتا تھا کہ چاروں طرف جو کچھ اس کو دکھائی دے رہا تھا اس کے بارے میں اپنی دادی سے باتیں کرے لیکن مہر خموشی توڑنے پر بھی وہ خود کو آمادہ نا پاتی تھی اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی اس کا اظہار خاموشی گفتگو سے زیادہ اچھی طرح کر رہی ہے۔

گرو نے سہارا دے کر اپنی دادی کو اٹھایا اور وہ دونوں پھر چاندنی میں اپنی راہ تلاش کرتی آگے کو روانا ہو گئیں۔ پھولوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلانوں سے بل کھاتی لہراتی گذرتی ہوئی پگڈنڈی جب انہیں گلابانوں کے پڑاؤ پر لے گئی تو آسمان کا رنگ موتیائی ہو گیا تھا۔ چونکہ شفق پھولنے لگی تھی۔ اس لیے انہوں نے طے کر لیا کہ گلابانوں کے پڑاؤ پر رکیں گی نہیں بلکہ وادی پر اور اوپر چڑھ جائیں گی۔

انہوں نے ایک پہاڑی چڑھ لی اور ہوا کا ایک جھونکا تیز اور مسحور کن خوشبو لے کر آیا۔ یہ پہاڑی پر پودینے کی خوشبو تھی۔ لڑکی رکی اور اس خوشبو میں گہری سانس لی۔ لیکن اس خوشبو سے بڑیا کا سر چکرانے لگا۔ تھکن کے مارے اس کی کمر دوہری ہو گئی اور اس نے اپنی لاٹھی سے چھوٹی سی وادی کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔

"لو ہم پہنچ ہی گئے آخر تمنا۔ یہ ہے پودینے کی وادی"

گرو نیچی تیزی سے اڑتی ہوئی وادی میں اتر

لگی اس بیش بہا پھول کو ڈھونڈنے کے لیے۔ لیکن پھولوں کے ایک سمندر کے بیچ پہنچکر حیران و پریشان کھڑی رہ گئی جس پھول کی اسے تلاش تھی اس کو اتنے سارے پھولوں میں پہچانے کیسے۔

اور لڑکی نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں بڑیا کو آواز دی:۔

"دادی، کہاں ہے وہ؟"

جواب میں بڑیا صرف مسکرادی۔ پھر وہ مسکرادی۔ پھر وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ وادی میں اترنے لگی۔ رینگنے میں بے شمار پھول تھے۔ مگر وہ ان سب کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ اس نے پوری وادی پار کرلی اور ایک خاردار جھاڑی کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور لڑکی نے جو کہ بڑیا کے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی جھاڑی کے نیچے چھپے ہوئے نازک اور ننھے پھولوں کے تروتازہ اڈنٹل دیکھے۔

"وہ یہ رہا، اس کو جڑوں سمیت کھود لو" بڑیا نے کہا۔

اور گمرو نے احتیاط کے ساتھ انہیں کھود کر نکالنا شروع کردیا جب تک گمرو کا رومال گہری کتھئی جڑوں سے بھرے ساری وادی غیر مرئی پرندوں کی آوازوں سے گونجنے لگی تھی۔ بڑیا واپس جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن گمرو اتنی جلدی واپس لوٹنے ہچکچا رہی تھی۔ وادی کی خوشبوؤں سے مسحور ہوکر وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہی تھی۔ اس دل کش وادی کے تمام حسین رنگوں کو اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے پی رہی تھی کو یا انہیں بھی وہ رومال میں جمع کی ہوئی جڑوں کی طرح اپنے ساتھ ہی لے جائے گی۔

"آؤ، جلدی چلنا چاہیے" بوڑھی عورت نے اچانک کہا اور لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "طوفان آنے والا ہے"

گمرو جیسے خواب سے بیدار ہوگئی گردن اٹھا کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا تیز ہوا میں چٹانوں پر سیاہ پرندے کے پھیلے ہوئے پروں کی طرح کالے کالے بادل منڈلا رہے تھے۔ گمرو نے جلدی سے اپنی دادی کا ہاتھ تھام لیا۔

پرندوں کی آوازیں یک بارگی خاموش ہوگئی تھیں۔ چاروں طرف ایک بوجھل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

بڑیا اور اس کی پوتی ایک چٹان کے نیچے پناہ لینے پہنچی ہی تھیں کہ گھن گرج کے ساتھ طوفان پھٹ پڑا۔

پہاڑ لرز اٹھے۔ آس پاس کی پہاڑیاں اور وادیاں بارش کی دھند میں چھپ گئیں اور کڑکتی ہوئی بجلی کے نیزے چٹانوں کی چوٹیوں پر چلنے لگے۔

گرجتا کڑکتا طوفان وادیوں پر سے گزرتا چلا گیا جب گلابانوں کے بڑا اوپر بادل چھٹ گئے اور نیلا شفاف آسمان پھر دکھائی دینے لگا تو اسے ایک جگہ سے دھنواں اٹھتا دکھائی دیا اور اس نے اپنی دادی کو دکھایا۔

ہاں گلابانوں نے الاؤ جلایا ہے۔ بڑیا نے کہا۔ چلو چلیں ہم بھی آگ تاپ لیں اور اپنے کپڑے بھی سکھالیں"

دونوں اپنی پناہ گاہ سے نکلیں اور گڈریوں کی جانب چل کھڑی ہوئیں ان کو آتا دیکھ کر وہ لوگ کھڑے ہوگئے پھر دو چھوٹے چھوٹے پتھر لاکر ڈالدیے اور اپنے مہمانوں کو ایسی جگہ بٹھادیا کہ دھنواں ان کے پاس نہ آئے۔

"کہاں سے آرہی ہو، عزت دادی!" ایک بوڑھے گلابان نے بڑیا کو باہر وقت انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"پودینے کی وادی سے" اس نے آگ کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ہم رنگوں کے لیے جڑیں جمع کررہے تھے۔"

بوڑھے گڈریے نے الاؤ سے آگ لے کر اپنا پائپ جلایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"اپنے رنگوں کا راز اپنی پوتی کو بتا رہی ہو۔ کیا یہ دوشیزہ اپنی شادی کے لیے غالیچا بنائیگی؟"

بڑیا نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد گمرو کے چہرے کی طرف دیکھا جو آگ کی گرمی سے یا شاید شرم و حیا کے مارے سرخ ہوگیا تھا اور پھر فخریہ لہجے میں بولی:۔

"نہیں، وہ ان رنگوں سے اپنے ابا کی ایک تصویر غالیچے میں بننا چاہتی ہے"۔

"اپنے ابا کی؟" بوڑھے گڈریے نے بڑیا کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اری اس نے اپنی ساری زندگی میرے ساتھ ان پہاڑیوں میں بسر کی۔ اس تو مرے تو ایک مدت ہو گئی۔ اس کی کوئی تصویر یا یاد بھی نہ ہوگی اور یہاں کہیں تو کسی کے پاس اس کی تصویر بھی نہیں ہوگی۔ کہ اسی کو دیکھ کر بنا لیتی"

"بڑے میاں، تم میرا مطلب نہیں سمجھے" داوی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ تو اس شخص کی تصویر بننا چاہتی ہے جو تمام لوگوں کا بابا ہو گیا ہے"

بڑیا یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اور اسی لمحے سب گڈریوں کے مونھ سے نکلا "دلینن!" ایک ساتھ سب کی نگاہیں گمرو کی طرف ہو گئیں اور وہ عزت و احترام کے جذبے سے اس کو دیکھتے رہے وہ گردن جھکائے بیٹھی رہی۔

بوڑھے گڈریے نے گہری سانس لی اور ——

—— جہر خموشی توڑی ——

"بنو (لڑکی) ضرور بنو" اس نے کہا میں تمہاری کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ ایسی تصویر بنانا کہ اس کے ایک ایک کا رنگ بھی نہ برف باری سے ماند پڑے نہ بارش سے نہ طوفانوں سے" اور پھر بوڑھے گڈریے نے افسوس کرتے ہوئے کہا "امسال ہم ان کی تصویر یہاں پہاڑیوں میں اپنے ساتھ لائے تھے لیکن طوفان نے ہمارے خیمے اکھاڑ پھینکے اور ہمارا سارا سامان بارش میں شرابور ہو گیا اور ان کی تصویر کاغذ کا مسلا ہوا پرزا ہو کر رہ گئی۔ ان کی تصویر کے بغیر ۔۔۔۔ اب ہم گرمیوں کے آخر تک ان پہاڑیوں میں یتیموں کی طرح رہ گئے ہیں"

بڑیا خاموش ہو گئی۔ گمرو نے نظریں اٹھائیں۔ گڈریوں کے چہرے کو دیکھا اور ان کی غمزدہ آنکھوں کو دیکھ کر گہری سوچ میں پڑ گئی۔

الاؤ پر آگ تاپنے کے بعد بوڑھی عزت اٹھ کر کھڑی ہو گئی ایک نوجوان گڈریا انہیں خرانی تک پہنچانے آیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو گمرو نے جو سارے رستے خاموش اور متفکر تھی۔ اچانک بڑیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"داوی، جب میں غالیچہ مکمل کر لوں گی تو پھر اپنے ان نگہبانوں کو ہم تحفے میں دیدیں گے تاکہ وہ ان کی تصویر کے بغیر پہاڑیوں میں تنہائی محسوس نہ کریں"

نوجوان گڈریا حیرت مجسم بن گیا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اس نے لڑکی کا نازک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بھینچا۔ اور اس کے حیرت انگیز وعدے کی خبر اپنے دوسرے ساتھیوں کو سنانے دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

بوڑھی عزت نے بڑوں کو ابالا اور مختلف رنگوں میں سوت رنگا، اور ایک روز صبح اٹھ کر گمرو نے دیکھا کہ اس کے کرگھا رنگ برنگ سوت کی چھوٹی بڑی گیندوں سے سجا ہوا ہے وہ خوش ہی اپنے کرگھے پر جا بیٹھی ان تمام حسین و دل فریب پھولوں کا عکس اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا جو اس نے یودینے کی وادی میں دیکھے تھے اور اس کے چلتے ہوئے ہاتھوں کے نیچے خوب صورت بیل بوٹے تیار ہونے لگے جن کا رنگ کبھی ماند نہ پڑے گا۔

جاڑا آ گیا۔ پہاڑوں پر اور وادیوں میں برف کی تہیں جم گئیں لیکن گمرو کی آنکھیں صرف بہار کے پھولوں کے دیدہ زیب رنگ دیکھ رہی تھیں اور ہر روز اس کے بیل بوٹوں میں نت نئے بھڑکیلے رنگ اور انتہائی نازک امتزاج پیدا ہوتے رہے۔

اس کے خاکوں کا تانا بانا بھی رنگوں کا ہوتا تھا۔

اور خاکوں میں اس کو نئے نئے امتزاج سوجھتے رہے۔

لیکن جس روز گمرو نے اپنا غالیچہ بن کر تیار کر لیا اور جب جنوری کی برف باری سے زمین ڈھکی ہوئی تھی ——

اس سفید پوش جاڑے کے دن گرو کے گھر کا دروازہ ایک غمناک خبر نے کھٹکھٹایا۔

لڑکی چونک پڑی اور اچھل کر کھڑی ہو گئی اس نے کھڑکی کھول کر گاؤں کی برف پوش سڑک دیکھی اور اس نے دیکھا کہ سرخ جھنڈے سرنگوں ہیں ان پر سیاہ حاشیا لگا ہوا ہے گرو کھڑکی سے ہٹ آئی اور اپنے کرگھے پر پھر آن بیٹھی اس کے ہاتھوں نے جواب دے دیا۔ آنسو امنڈ آئے گا رندگیا اس نے تصویر پر نظر ڈالی اور پھوٹ پڑی ہچکیاں بندگئیں اور اس کا سر غالیچے پر ٹک گیا۔

جب لڑکی نے اپنا سر اٹھایا تو سرمائی سورج برف پوش پہاڑوں کے پیچھے جا کر دھندلا ہو چکا تھا اور سفید برفیلی وادیوں پر تاریک سائے رینگنے لگے تھے اور بہاروں کی وادی کے تاپتے ہوئے رنگ اس کی آنکھوں میں ایک دم تاریک ہو گئے۔ اور پھر بجھ گئے۔

محنت و شفقت کی زندگی۔ بوڑھی عزت کو نہ جھکا سکی تھی لیکن اس خبر کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری ہو گئی۔ اس نے غالیچے میں بنی ہوئی تصویر کو دیکھا۔ اپنی غمزدا پوتی کو دیکھا۔ اور جھنڈوں کے سیاہ حاشیے کو پھر اس نے سفید سوت کی ایک پلی لی۔ اور گویا خواب میں چلتے ہوئے جیسے ہی اس کو کوئی نکا لا رنگ ملا اس نے وہ پلی رنگ لی۔ بعد میں یہ کالا سوت اس نے اپنی پوتی کو دیدیا۔

اور گرو نے اپنے بنائے ہوئے غالیچے کے چاروں طرف ایک سیاہ حاشیے میں اپنا غم بن دیا۔

اگلے روز گڈریے ماتمی جھنڈے لیے آئے۔ گرو کی کھڑکی کے سامنے گہری اور غمناک خاموشی کے ساتھ رک گئے گڈریوں نے اس کا غالیچا اس کے کندھوں پر اٹھایا اور یہ جس راہ آئے تھے اسی راہ آہستہ آہستہ واپس ہو گئے اور وہ سیاہ جاڑا بھی ختم ہو گیا۔

بہار ایک بار پھر واپس آ گئی۔ گلہ بان پھر اپنے گلے ہانکتے ہوئے پہاڑیوں میں چلے گئے اور اپنے ساتھ دو دراز چرا گاہوں میں گرو کے ہاتھوں کا بنا ہوا غالیچا بھی لے گئے لیکن گرو اب بھی بے چین و بے قرار تھی۔ سیاہ حاشیا اس کے دل پر ایک پتھر تھا۔

ایک رات گرد آلود شور نے اس کو جگا دیا۔ پہاڑوں میں بے پناہ طوفان آیا ہوا تھا۔ یہ اسی کی گرج تھی۔ ساری رات صبح ہوتے تلک طوفان کی تباہ کاریاں جاری رہیں۔ پہاڑیاں اور وادیاں دہلتی رہیں اور ساری رات صبح کے انتظار میں گرو جاگتی رہی۔ صبح سویرے ہی اس نے اپنی دادی کو جگا دیا "اٹھو دادی اماں۔ چلو پہاڑیوں پر چلیں۔ میں اپنے غالیچے کو دیکھنا چاہتی ہوں"

بڑیا اٹھ بیٹھی اور بلا عذر کپڑے بدل لیے اور دونوں روانا ہو گئیں۔ مانوس رستوں سے بلکل خاموشی کے ساتھ پہاڑیاں چڑھتی گئیں اور گویا خواب کی حالت میں بہار کے پھولوں میں سے گذرتی گئیں جو سارے رستے لاتعداد کھلے ہوئے تھے۔ جب وہ گڈریوں کے پڑاؤ کے مقام پر پہنچیں تو سورج نکل چکا تھا۔ غضبناک طوفان سے جد و جہد کی طویل رات گذر چکی تھی اور گڈریے اپنے خیموں کی مرمت کر رہے تھے۔ اور ان کے چاروں طرف تالیاں کھودنے میں مصروف تھے۔

گرو اور بڑیا کو دیکھتے ہی انہوں نے اپنا کام روک دیا اور ان کا پرجوش استقبال کرنے کو بڑھے۔ گرو ٹھٹھک گئی اور تشویشناک آنکھوں سے اکھڑے ہوئے خیموں کو دیکھنے لگی گرو اپنا غالیچا دیکھنے آئی ہے۔ بڑیا نے گڈریوں کو بتلایا "وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ رات کے طوفان کا اس نے کس طرح مقابلہ کیا"

اور گڈریے گرو اور اس کی دادی کو ساتھ لے کر اس جھونپڑی میں گئے جو انہوں نے غالیچا مانگنے کے لیے بنائی تھی۔ رات کا طوفان جھونپڑی کی چھت اور دروازوں

کے کو اڑا اڑا لے گیا تھا اور صبح کے سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں سیدی غالیچے پر پڑ رہی تھیں۔

موسلا دھار بارش میں غالیچا ساری رات بھیگ کر چوڑا ہو گیا تھا۔ اور اس کے دیدا زیب گل بوٹے اب قوس قزح کی طرح چمک دمک رہے تھے۔ موسم بہار کی دھوپ میں غالیچا ہزار ہا بھڑ کیلے رنگوں کی بہار دے رہا تھا لیکن ان بہار دار گل بوٹوں میں ایک رنگ بالکل غائب ہو چکا تھا۔ اس کا نشان تک باقی نہ بچا تھا۔ وہ تھا ماشیا جو گمرو نے اس المناک دن بنا تھا۔ بہار کی بارش نے سیاہ رنگ دھو ڈالا تھا۔

"واہ! واہ! میری بچی! بوڑے گڈریے نے گمرو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ سیاہ رنگ ان کے لیے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے لیے ایسا آفتاب نہیں جو کبھی غروب ہی نہ ہو۔"

اور ایک بار پھر گمرو کی آنکھوں میں بہاروں کی وادی کے پھولوں کا سماں پھرنے لگا۔

شاہوں کے جلال

یہ کیسی ہوا چلی ہوئی ہے ہر شاخ چمن جلی ہوئی ہے
بلبل کی نوا کہ حزن کی لے نغمے میں صدا دکھی ہوئی ہے

گلشن سے خزاں کا دور گذرے کتنے مہ و سال ہو چکے ہیں
کہتے ہیں کہ غیر بک رہے ہے شاہوں کے جلال سو چکے ہیں

شاید کہ یہ بات ٹھیک ہی ہو حالات برعکس کہہ رہے ہیں
جبروتی دست برد اب بھی گل بلبل شاخ رہے ہیں

صلاح الدین محمد

غزل

واصف (بنارسی)

ان کے ملنے سے جو مایوسی سوا ہو جائے گی
یاس کی تسکین دل کا آسرا ہو جائے گی

آرزوئیں دل میں ہم رکھتے تھے کس کو تھی خبر
دلنوازان ادا میری قضا ہو جائے گی

بام پر آئیں گے وہ اک شان استغنا کے ساتھ
جو نظر اٹھے گی محروم صلا ہو جائے گی

وہی مقصد اپنے ہیں جو ہو جائیں کے حاصل ضرور
دل نثار غمزہ داں ان پر فدا ہو جائے گی

ابتدا ہو گی وہی میرے نیاز عشق کی
جو تیرے جور و ستم کی انتہا ہو جائے گی

اک خلش درکار ہے لطف محبت کے لیے
ان کی حسرت میرے دل کا مدعا ہو جائیگی

جانتا ہوں پھر بھی فرقت میں نہیں پاتا قرار
ان سے مل کر دل کی بے چینی سوا ہو جائیگی

یاس کا خوگر ہوا انساں تو مایوسی کہاں
جان بھی اس جان عالم پر فدا ہو جائے گی

جس جگہ جھک جائے گی میری نیاز آگیں جبیں
تیری بزم ناز کی وہ ابتدا ہو جائے گی

جب جفائیں ہوں گی واصف یار کی ہمت شکن
آشکارا خود بخود میری وفا ہو جائے گی

ڈاکٹر میر سیات علی خان

حجاج بن یوسف

(تیرویں قسط)

باب (۱۱) مسلسل

فتوحات

(مسلسل)

تیسرا حملا

وارداتہ کے شہزادے کی ماتحتی میں "دیبی حکمرانوں" نے آزادی کی کوشش شروع کی اور جب ۷۰ھ میں قتیبہ نے اپنا تیسرا حملا ماوراء النہر پر کیا تو وردانا بخارا اور صغد کی متحدا فوجوں نے اسے روکا۔ یہ قول گب یہ ممکن ہے کہ یہ صغد فرغانہ کے ہوں جب کہ بیدانی کا قول ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کیش کے ہوں۔ جس پر حجاج کا مشہور ذو معنی جملا دلالت کرتا ہے۔" ان کس بکش والنصف نسفادر وردان" یعنی کیش کو مغلوب کر نصف کو تباہ کر اور وردان کو بھگادے ان تمام حملوں میں دشمن کی تعداد لکھنے میں عربی مورخوں نے مبالغا کیا ہے چنانچے اس وقت طرخون کی فوج کو دو لاک بتایا ہے اور اس کے سردار کو "کورلغانون"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ تیس سال کے بعد کے ایک واقعے کا ذکر اس نوبت پر کیا گیا ہے کیونکے کورلغانون ۷۰ھ پر تیس سال بعد آتا ہے۔ صحی واقعا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قتیبہ نے ان متحدا افواج سے جنگ نہیں کی بلکے ان کو حیران کرتا رہا "تا کے دیر ہونے سے ان میں تحاد نہ رہے اور آخر میں آکرن گیٹ" یعنی باب الحدید سے ہوتے ہوے اپنی فوج کو ترمذ صاف بچا لے گیا۔ صرف ایک چھوٹی سی لڑائی فوج کے پچھلے حصے سے ہوئی۔ عبدالرحمن بن مسلم کو عقب فوج پر متعین کرنے سے ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے کیونکے قتیبہ ہمیشا اس بھائی کو مشکل مہمات پر ہی مقرر کرتا تھا

چوتھے حملے میں جو ۸۹ھ میں ہوا قتیبہ بیرکش، نسف اور وردان کی متحدا افواج پر غالب نہ آسکا اور طول طویل لڑائیوں کے بعد مرو واپس ہوا اگو قبیلہ علبہ کی بعض وارداتیں ہیں دو فتوحات کا دعوا کیا گیا ہے اس کمزوری پر حجاج نے قتیبہ پر عتاب کیا۔ اور ملک کا لقب طلب کر کے ایک مصرعا بنا کر بھیجا۔ اس دفعا قتیبہ کو کامیابی ہوئی۔ طبری میں بخارہ کے حملوں کے سخت لڑائی کا پورا نقشا کھینچا ہے اس سے تیمیموں کی بہادری ظاہر ہوتی ہے۔ بخارہ والوں پر خراج لگایا گیا۔ اور ایک عربی فوج بخارہ میں چھوڑ دی گئی۔

اس کامیابی کے بعد صلح کے ذریعے ایک اور بھی بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ بخارہ کے واقعے کے بعد صغد نے قتیبہ سے صلح کرنا بہتر سمجھا ان کے بادشاہ طرخون نے خراج پر صلح چاہی۔ قتیبہ راضی ہوگیا اور مرو کو واپسی شروع کر دی۔

۹۱ھ تا ۹۳ھ وادی جیحون میں بی اقتدار کی تنظیم و تکمیل اور صغد کی فتح

۹۱ھ تا ۹۳ھ تک قتیبہ نے بہت بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ کل ملحی ترکستان کو دوبارا فتح کیا ان پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ شومان کش و نسف کو بزور شمشیر لیا۔ خوارزم پر حملا کیا اور پھر سمرقند کو بھی فتح کیا۔ نیز رتبیل کو بھی خراج

دینے پر مجبور کیا حاصل کلام یہ کہ قتیبہ کے چھٹے ساتویں اور آٹھویں اور نویں حملے اس کے بہترین حملے شمار کیے جاتے ہیں۔

بخارا سے واپس ہو کر قتیبہ جب آمل پہنچا تو نیزک نے طخارستان جانے کی اجازت چاہی۔ بخارا کی فتح سے نیزک بھی گھبرا گیا تھا۔ اور تلوار ہی میں اس کو اپنی سلامتی نظر آتی تھی۔ اجازت پاتے ہی رستا کترا کر دوا دوی کے ساتھ وہ شعب خلم میں جو ایک بہت مضبوط قلعہ تھا داخل ہو گیا۔ طخارستان جا کر اپنے بادشاہ چنجویہ کو قید کیا اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ مرو الروذ، طالقان کاریاب، جوزجان کے بادشاہوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اور کابل شاہ سے قرار پایا کہ بصورت شکست وہ نیزک کو پناہ دے گا۔ قتیبہ اس اثنا میں مرو پہنچ گیا تھا۔ اور جنگ کے جاڑے کا موسم شروع ہونے والا تھا اور سارا لشکر اپنے اپنے مستقر کو واپس ہو گیا تھا قتیبہ صرف یہ کہہ سکا کہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن مسلم کو مرو کی بارہ ہزار فوج سے بروقان (بلخ) بھیجدیا تاکہ نیزک کے کسی حملے کا جواب دیا جا سکے۔ اس ایک بہادانہ فعل سے قتیبہ کو بڑی کامیابی ہوئی۔ کل باغی مرعوب ہو گئے اور جب اگلے سال اس نے اپنا چھٹا حملہ کیا تو ایک مقام پر بھی لڑنے کی نوبت نہ آئی۔ باغیوں کو عام معافی دی گئی بجز طالقان کے جہاں مزاحمت کی گئی تھی مرو اسکے بہت سے باغیوں کو قتیبہ نے قتل کیا۔ اور مرو اسکے دیگر یہ مقتول اہل طالقان نہیں تھے بلکہ چور تھے کہ ان کو گرفتار کر کے ان کا قلع قمع کیا گیا۔ اغلباً یہاں کا نظم و نسق درست کر کے اور عربی عاملوں (رزیڈنٹوں) کو زیادہ اختیارات دے کر قتیبہ بلخ سے آگے بڑھا اور عبدالرحمٰن سے بروقان میں جا ملا صغانیان کے روب لمان کی مدد سے نیزک کا مضبوط قلعہ شعب خلم فتح ہو گیا۔ نیزک کر زبھاگ گیا۔ قتیبہ نے اسکا محاصرہ کیا اور بمقام اسکیمشت ٹھہرا۔ سلیم الناصح کے ذریعے نیزک کو امن دے کر بلایا۔ اور حجاج سے اجازت لے کر بہت سوچ بچار اور مشورے کے بعد اس کو معہ سات سو ساتھیوں کے قتل کر دیا گیا۔ بعض مسلمانوں نے اس وعدہ شکنی کو اچھا نہیں سمجھا قتیبہ نے چنجویہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا اور اس کو شام بھیجدیا تاکہ شام میں اس کا وجود مزید بغاوتوں کا مانع ہو۔

اس حملے کے اثرات بہت اہم ہیں نہ صرف زیریں طخارستان پر عربوں کا قبضہ ہو گیا بلکہ بالائی طخارستان میں پہلی دفعہ عربوں نے قدم جمایا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا چنجویہ کو شام بھیجا گیا اس کے نابالغ لڑکے کا نایب شاہ صفاچیاں کو کیا گیا۔

ساتواں حملہ

اوپر کے چھٹے حملے کے بعد بھی قتیبہ کو ساتواں حملہ کرنا پڑا۔ جس کا نتیجہ شومان کشس و لنف کی فتح میں آمد ہوا۔ وجہ یہ ہوئی کہ شاہ شومان نے قتیبہ کے عامل کو نکال دیا اور خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ قتیبہ نے دو ایلچیوں کو جن میں ایک عرب احمد ایک ایرانی تھا بھیجا اور حکم دیا کہ اطاعت کرے۔ شاہ شومان نے ایلچیوں سے ذلت کا برتاؤ کیا۔ ایرانی ایلچی اس کو قبول کر کے واپس ہوا۔ لیکن عرب نے لڑ کر بہادری سے جان دیدی۔ اب قتیبہ نے پوری قوت سے شومان کو فتح کر لیا۔ جس کے بعد باب الحدید ہوتے ہوئے کشس و لنف پر پڑا اور اس کو بھی فتح کر لیا پھر بخارا کی طرف بڑا۔ یہاں بھی عربی فوج اور باشندوں میں نزاعات ہوتے رہتے تھے۔ اور سخت اور مکمل انتظامات کی ضرورت تھی۔ نوجوان شاہ بخارہ کی تاج پوشی کی گئی۔ اسکے مخالفوں کو قتل کیا گیا۔ شہر میں ایک فوجی نوآبادی قایم کی گئی۔ کیونکہ جب تک زیریں طخارستان پر عربوں کی حکومت مستقل نہیں تھی جیحون سے ادھر عربی فوجی نوآبادیاں قایم کرنے کا خیال نہیں ہو سکتا تھا اب جبکہ زیریں طخارستان مستقل طور پر قبضے میں آگیا تھا۔ ایسی نوآبادیاں قایم ہو سکتی

تھیں چنانچہ بخارہ میں نو آبادی بسائی گئی۔

قتیبہ نے فوجی انتظام میں بھی ایک اہم تبدیلی کی اب تک فوج میں سوائے عربوں کے دوسروں کا حصہ بہت کم تھا چنانچہ اس وقت خراسان میں سینتالیس ہزار عربی فوج تھی تو حیان النبطی کے تحت صرف سات ہزار رسالی بھی تھے اب قتیبہ نے پہلی دفعہ بخارہ پر یہ شرط لگائی کہ دیسی فوج عربی فوجوں کے ساتھ مل کر لڑنے دیجائے۔ اس نئے طریقے کا اثر نہایت عمدہ ہوا اور اس کے بعد سے قتیبہ کی فتوحات کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔ قتیبہ کے بخارہ میں انتظام میں مصروف رہنے تک عبدالرحمن نے سمرقند پر بڑھ کر ترخون شاہ صغد سے مقررہ خراج وصول کر کے واپس ہوگیا۔

آلوان حملا

رتبیل جس کے مغلوب کرنے کے لیے حجاج نے جنگی بیڑا دلیس بھیجا تھا۔ اب تک غیر مغلوب تھا اس سال حجاج کے حکم سے قتیبہ نے اس پر حملا کر دیا۔ بقول یعقوبی قتیبہ زابلستان تک پہنچ گیا اور رتبیل کے پائے تخت سے قریب تھا بڑھ گیا تھا۔ رتبیل نے خراج پر صلح کر لی۔ قتیبہ واپس ہوگیا۔

اس اثنا میں سمرقند میں اہم واقعات رونما ہوئے۔ عبدالرحمن بن مسلم کے طرخون سے خراج وصول کر کے لے جانے سے اہل صغد سخت برافروختہ ہوئے اپنے بوڑھے بادشاہ کو معزول کر دیا یا قتل کر دیا۔ یا اس نے خودکشی کر لی۔ اور نیزک طرخ کو بادشاہ بنا دیا۔ قتیبہ کو اس کا بدلا لینا ضروری تھا تیاری شروع کر دی لیکن قبل اس کے کہ وہ سمرقند پر حملا کرتا خوارزم شاہ کی مدد طلب کرنے کی وجہ اس کو خوارزم جانا پڑا۔ خوارزم شاہ بوڑھا ہوگیا تھا۔ چھوٹے بھائی نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔ قتیبہ سے مدد چاہی۔ اہل صغد پر حملے کا ارادا ظاہر کر کے قتیبہ یکایک خوارزم شاہ کے پائے تخت کے متصل ہزار اسپ پر جو جیحون کے اس کنارے تھا آپہنچا۔ بوڑھا بادشاہ اپنے امرا کو اس سال صلح پر راضی کر کے مدینۃ الفیل جو نہر کے اس جانب تھا آیا اور صلح کی۔ قتیبہ نے خامہ جرد کو عبدالرحمن کے ہاتھ سے گرفتار کرایا۔ اور مدینۃ الفیل جا کر خوارزم شاہ سے پائے تخت میں ملا۔ اور شرائط صلح کی تکمیل کے بعد واپس ہوا۔

خوارزم شاہ کی مہم سے واپسی میں مخشر بن مزاحم السلمی کی رائے پر عمل کرنے اور اب تک سمرقند پر حملا کرنے کا قتیبہ نے ارادا کر لیا۔ مرو کا رخ کر کے عبدالرحمن کو یکایک سمرقند کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ اور قتیبہ نے ایک موثر خطبا دیا کہ صغد نے نقض عہد کیا ہے میں چاہتا ہوں کہ خوارزم کے بعد سمرقند کو اسی طرح فتح کروں جس طرح بتونصیر کے بعد بتونصیر مغلوب کیے گئے۔

دس روز کے سفر نے سمرقند پہنچا دیا اور محاصرا شروع ہوا۔ اہل صغد نے ساش اور فرغانہ کے رئیسوں سے مدد چاہی ان لوگوں نے اپنے بہادر ترین اور شریف ترین افراد سے مدد کی۔ لیکن قتیبہ نے کمین میں چند بہادروں کو بٹھا کر ان کو شکست دلا دی۔ اہل صغد اس شکست سے بیدل ہوگئے اور قتیبہ نے جنگ سخت کی۔ اہل صغد نے صلح چاہی۔ شرائط صلح نہایت نرم تھے۔ خراج جس کی مقدار مختلف تواریخ میں مختلف بتائی گئی ہے اور ایک روز کے لیے شہر خالی کر دینا تاکہ قتیبہ داخل ہو کر مسجد بنائے اور نماز ادا کرے۔ قتیبہ نے سمرقند میں داخل ہو کر نکالنا پسند نہ کیا۔ اور سخت انتظام کیا کہ کوئی کافر ہتھیار لگائے ہوئے سمرقند میں نہ آئے۔ قتیبہ کے ایک سال میں خوارزم و سمرقند فتح کرنے پر شاعروں نے بہت سرایا۔ قتیبہ سمرقند میں کافی فوج اور آلات حرب چھوڑ کر اور حفاظت کے تحت احکام دے کر واپس ہوا اس انتظام کی ضرورت تھی۔ سمرقند کی فتح کل صغد کی فتح نہ تھی۔ گو بہت جلد سمرقند کی عربی فوج اور اطراف و جوانب کے شہزادوں اور امرا میں اچھے تعلقات پیدا ہوگئے

۹۴ھ ۔ ۹۶ھ ممالک سیحون پر حملے

غزوۂ الشاش و فرغانہ

سمرقند کی فتح کے بعد عقل تو یہی کہتی ہے کہ قتیبہ نے اپنی توجہ صغد کے زیر کرنے اور شمل رے کے اس پار اپنی گرفت مضبوط کرنے پر کی ہوگی۔ اگر قتیبہ ایسا کرتا تو اس کا انجام بہت اچھا ہوتا لیکن اسی وقت مزید فتوحات کی خواہش بھی جو اوپر کی بھاری فتوحات کی وجہ بہت قوی ہوگئی تھی اس نے اپنی فوج کے دو حصے کیے۔ مفتوحہ ممالک کی ایرانی فوج کو شاش کی فتح کے لیے معمور کیا اور خود فرغانہ کی طرف بڑا یہاں تک کہ خجندہ پاسے تخت فرغانہ پر پہنچا۔ یہاں دو میدان جیتے اور خجندہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر خجندہ آگے سے بڑھ کر سیحون کو عبور کیا۔ اور کاشان پہنچا۔ یہاں قتیبہ کا دوسرا لشکر شاش کو فتح کر کے اور اس کے ایک حصے کو جلا کر آ ملا۔ بلاذری میں یہاں عربی نوآبادیاں بسانے کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ یہ صرف فوجی چوکیاں ہی ہو سکتی ہیں۔

وسط ایشیا کے شہروں کو چین سے بہت گہرا تعلق تھا۔ سیاسی اور تجارتی بھی چین سے اچھے تعلقات رکھتے میں عربوں کا ہر طرح فائدہ تھا۔ بہرحال اس سال طبری میں ایک سفارت کا ذکر ہے کہ چین بھیجی گئی۔ گو عربی سفیر کو نے جھک کر آداب تسلیمات وکورنش بجا لانے سے انکار کیا اس کے باوجود شاہ چین ان کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آیا۔

غزوۂ الشاش ۹۵ھ

اس سال قتیبہ نے سیحون پر اپنے حملے پھر سے شروع کر دیے طبری اور بلاذری کے واقعات ملانے سے پتا چلتا ہے کہ قتیبہ نے اپنا مرکز شاش کو بنایا تھا۔ اور شمال میں اسبیجاب تک پیش قدمی کی۔ قتیبہ کا مقصد کہ اس سڑک پر قبضہ کرے جو وادی ترقان سے ہوتی ہوئی شاش اور سمرقند جاتی ہے یہ راہ تجارتی اہمیت بھی رکھتی تھی۔ لیکن اس وقت قتیبہ کے لیے اس کی سیاسی اہمیت بھی تھی کیونکہ اسی راہ سے وسط ایشیا سے ترک ماوراالنہر پر آ رہے تھے قتیبہ اپنے منصوبوں اور حملوں میں مشغول تھا کہ یکایک حجاج کے وفات کی جاں گداز خبر ملی قتیبہ کو اس کا سخت رنج ہوا۔ اپنے مستقبل کے متعلق بھی اس کو فکر تھی مفتوحاتی ملک کی افواج کو بخارا کشس ونسف وغیرہ کو بھیجکر قتیبہ مرو واپس ہوا ولید نے ایک خط لکھ کر اس کا دل بڑھایا اور اس کے صوبے خراسان کو عراق سے علیحدہ کر دیا لیکن حجاج کی وفات کا اثر خراسان پر اتنا کم نہیں ہوا تھا اس آسانی سے اس کا علاج ہو جاتا۔ قتیبہ کے ساتھی عرب فتوحات کے مال غنیمت کی وجہ سے مالدار ہو گئے تھے آرام چاہتے تھے قبائلی عناد بھی عارضی طور پر دبا ہوا تھا۔ قتیبہ کے سخت برتاؤ کی وجہ سے قیس اور تمیم یہاں تک کہ ایرانیوں کے دل بھی کھنچ گئے تھے حیرت کی جگہ ہے کہ خود قتیبہ کو اس کی خبر نہ تھی۔

کاشغر (چین پر حملہ ۹۶ھ)

طبری نے لکھا ہے کہ قتیبہ نے اس سال کاشغر پر حملہ کیا کہا جب نے اس سے نہایت قابلیت سے انکار کیا ہے کیونکہ طبری کے ہمعصر یا اس سے پہلے کی تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں۔ اس سال حملے کی ابتدا اور قتیبہ کی وفات کے درمیان اتنا وقت نہیں تھا کہ کاشغر تک پیش قدمی کی جاتی اور نیز چینی تاریخوں سے اس کا پتا نہیں چلتا۔ قتیبہ کی شہرت کے مدنظر اگر مورخوں نے فتح کاشغر کا سہرا اسی کے سر باندھا تو تعجب کی بات نہیں۔ یعقوبی کی ایک روایت ہے کہ حجاج نے اعلان کیا تھا کہ چین کی صوبے داری قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم میں سے اس شخص کو دی جائے گی جو پہلے اس کو فتح کرے۔ قتیبہ اس کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ ولید کے انتقال سے نقشہ ہی بدل گیا۔ فوج کا ساتھ دینے میں رغبت نہ دیکھ کر قتیبہ مجنوں سا ہو گیا اور وہ بغاوت کھڑا کر دی جس میں اس کا افسوسناک خاتمہ ہو گیا۔

قتیبہ کی وفات کے بعد عربی اقتدار کا ان نئے ممالک میں زوال کا زمانہ آیا۔ وکیع بن ابی سود کے تحت عربی فوجیں منتشر ہوگئیں۔ مفلد بن یزید بن مہلب صغد کے قریوں پر کتاریاں کر رہا تھا۔ یحییٰ ہراط راج بن عبداللہ کا اکلوتا ملا بری طرح ناکام رہا۔ غرض یہ کہ قتیبہ کا حجاج کی پشت پناہی اور مدد ہی سے ممکن تھا کہ ان ممالک پر قبضہ رکھ سکے قتیبہ اور حجاج کے بعد نہ تو کوئی مدبر تھا نہ کوئی منصوبہ اور نہ کوئی تنظیم۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی پالیسی تو ماوراالنہر کو خالی کر دینے کی تھی آپ کے اس سے متعلق احکام کو بخارا اور سمرقند کے عربوں نے غصے کے ساتھ منظور کر دیا آپ کی وفات سے پہلے ہی صغد باغی ہو چکے تھے۔

غرض قتیبہ کی وفات کے بعد کوئی اس کا قابل جانشین نہ ہوا۔ اور نہ عراق پر اب کوئی حجاج تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے آخری فتوحات دیرپا نہیں تھے مگر بلاشبہ اس نے ان ممالک میں اسلامی ممالک کی بنیاد بڑی مضبوط رکھی اور جب قابل اور قوی مدبر پیدا ہوئے تو ثمارت بھی چن دی گئی قتیبہ کی وسط ایشیا کی فتوحات کا خلاصہ یہ ہے نہایت اچھا دیا ہے اور یہ حجاج کی عظمت کی بھی نہ مٹنے والی نشانی ہے

(۱) ازبرین طخارستان اور صفاقیان عربی سلطنت کا جزو لاینفک بن گئے۔

(۲) طخارستان جو زوال پذیر تھا بطور ایک ماتحت سلطنت کے رہا یہی حال ماالنہر کی دوسری سلطنتوں مثل خجند اور کھادکا تھا لیکن یہاں عربی اقتدار بتدریج کمزور رہتا

(۳) صغدانیہ میں بخارا دائمی طور پر فتح ہو چکا تھا اور یہاں بتدریج عربی نوآبادی بھی بسائی گئی۔ باقی صغد بھی مخالف تھے ان پر قبضہ سمرقند اور کش کی زبردست فوجوں اور دیگر فوجی چوکیوں کے ذریعے رکھا گیا۔

(۴) خوارزم کی فوجی طاقت کچھ بھی نہیں تھی اور دوامی طور پر نوآبادکیا گیا۔

۵ سیحوں پار کے ممالک آزاد تھے۔ مخالف تھے اور نسبتاً قوی تھے۔ ان کو شمال مشرق سے ترک امداد حاصل تھی نیز چین کی مدافعت بھی ہوتی رہتی تھی۔

۶ دشوار نہ گو بیحد مفتوح تھا۔ لیکن عربی فوجوں کو گذرنے سے روکتا نہ تھا۔

۷ دلیسی ریاستیں جو اس وقت موجود تھیں ان کو ہر جگہ بحیثیت مفتوحہ اقوام کے نمائندہ ہونے اور رسول انتظام قایم رکھنے میں معاون ہونے کے باعث برقرار رکھا گیا لیکن مالی و فوجی طاقت اصل میں عربی والی کے ہاتھ میں ہی تھی جو خراسان کے عربی ـــــ ہوتا تھا۔

تضاد

جون کی چلاتی دھوپ میں
ایک دہقان مل چلاتا ہے
اور زردار بدحواسی سے
قصر و ایواں میں پیچ تاب ہے
ان آدم کی زندگی کیا تضاد
اے خدا تجھکو کیسے بھاتا ہے
ڈر ہے مفلس سمجھ نہ لے تجھکو
کہ تو زردار ہی کا داتا ہے
یا خدا ہی نہیں ہے دنیا کا
جھوٹ قصاہے مرگ و عقبیٰ کا

بدرالحسن خنداں

ایک بندر کا خط

ایک انسان کے نام

(طنز)

ایاز عصمی

ڈیر ہائیڈ پیٹر

کل شام کو میرے مکان کی چھت کی منڈیر پر ایک بندر بات میں کاغذ کی ایک پڑیا لیے بیٹھا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پڑیا پھینکی۔ ایک چھلانگ لگائی اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ پڑیا کھلی تو ایک خط نکلا۔ اجوا شاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ (ایک انسان)

برخوردار اسلم! دعائیں!

آج کل بڑی مصیبت میں گھرا ہوا ہوں۔ موسم بدل رہا ہے۔ سردیاں پھر پھر پھڑاتی ہوئی تیز تیز بڑی آ رہی ہیں ابھی سے یہ حال ہے کہ رات بھر ہو ہو کرتے صبح ہو ہو کرتے صبح ہو جاتی ہے۔ تمام رات دانتوں کی کٹا کٹ کے بیچ یہ پروگرام بناتا رہتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی ایک مکان بنا کر سردیوں کی طرف سے برا ہو کے لیے مطمئن ہو جاؤں۔ مگر سورج کے اجالے میں جب اپنے بال بچوں کی اونچی اونچی حویلیاں دیکھتا ہوں تو جی کو یہ سوچ کر بڑا سکون ملتا ہے کہ "کیا ہو گا مکان بنا کر اپنے بچوں کی یہ اتنی ساری بلڈنگیں تو ہیں ہی۔ گذاروں گا کسی نہ کسی میں سردیاں مگر یہ خیال پچھلے دنوں بڑا ہی تلخ تجربہ ثابت ہوا۔ تم جانو ضعیفی نے رفتہ رفتہ کا مریض بنا دیا ہے صحت یوں تو اب بھی ایسی ہے کہ اچھی طرح اچھل کود لیتا ہوں لیکن اندھیرے میں ذرا کچھ کم ہی نظر آتا ہے۔

شام کا جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ میں نے ایک نئی نئی نزلا عمارت کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ کمرہ نہایت عمدگی سے آراستہ تھا ٹھیل کرسی، میز، پلنگ، اسپرنگ دار گدے "قد بندر" آئینے کیا کچھ نہیں تھا اس کمرے میں مگر سب سے زیادہ جو چیز مجھے پسند آئی وہ اس کمرے کی خوشبو تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں دھری ہوئی کمرے کو گرم رکھنے کی چولھے نما مشین فضا کو گرم کیے ہوئے تھی کمرا نہایت عمدہ خوشبو سے بسا ہوا تھا میں نے سوچا یہ کمرا دات بسر کرنے کو بہت مناسب ہو گا۔ اور اندر رینگ گیا۔ ابھی کمرے میں قدم دھرے چند لمحے ہی گذرے تھے کہ ایک برخوردار ایک عورت کی کمر میں ہات ڈالے اندر داخل ہوئے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی گھگی بند گئی۔ لگے چیخنے "عبدل! ابے عبدل کے بچے جلدی دوڑ۔ دیکھ تیرا باپ سالا دھرا ہوا ہے یہاں تو"

"آیا مالک" نیچے سے سہمی ہوئی آواز آئی۔

"میں دم بخود سوچنے لگا۔ کیا میں اس کا کوئی نہ تھا" عبدل نے اوپر آتے ہی پوچھ گچھ شروع کر دی "کون آیا ہے مالک! یہاں تو کوئی نہیں۔ کدھر ہے؟"

"یک یک نہ کر۔ وہ دیکھ" کپکپاتے ہوئے برخوردار نے میری طرف اشارا کیا۔

اوہ واہ بیٹے! ایسے بیٹے ہو جیسے تمہارے باپ کا گھر ہے" عبدل غرایا میں برخوردار کی ساری باتیں سمجھ رہا تھا۔ جواب میں میں نے بھی ایک عدد "خوں" کر دی۔ میرا مطلب تھا تمیز سے بات کرو اپنے بزرگوں سے اس طرح کی باتیں نہیں کرتے" مگر برخوردار عبدل بھی بس یوں ہی سا واقع ہوا تھا۔ میری "خوں" کا مطلب تو خاک کچھ سمجھا نہیں۔ بس پل پڑا۔ بچ پر وہ تو خیر گذری کہ کھڑکی کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ ورنہ عبدل تو جیتے فعل عد" کی نیت کر کے آیا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر باہر نکلا تو عبدل کا مالک اور اس کے ساتھ والی عورت

برآمدے میں کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے جیسے میں ان کا آب وجد" نہ تھا بلکہ کوئی ہوا تھا جس نے وہ رات اسی مکان کی بالائی چھت کی منڈیر پر بیٹھ کر کاٹ دی۔ تمام رات میرے دماغ کی سطح پر کئی خیالات رینگتے رہے۔ آخر جو میں اور ان میں کیا فرق ہے۔ میرا جسم اگر بالوں سے پر تھا تو کیا عیب ہوا میں نے تو ہزار ہا لوگوں کے جسموں پر اون، پشمینے اور فر (FUR) کا لباس دیکھا ہے۔ کیا اون، پشمینا اور فر پہننے والوں سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ انہیں یقین کوئی اور بات ہے اچانک میری نظر اپنی ملتی کپکپاتی ہوئی دم پر پڑ گئی "تھی" یقین یہ دم ہی سارے فساد کی جڑ ہے یہ دم ہی ہے جس نے پرانے رشتے کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔"

"رات تو خیر جوں توں کر کے کٹ ہی گئی۔ سردی کے مارے میرا سارا جسم شل ہو چکا تھا خون تو جیسے رگوں میں منجمد ہو گیا تھا مگر صبح کے سورج کی پہلی کرن نے میرے جسم میں حرارت کا بخش دیا تو میری آنکھ کھل گئی۔ اور پھر شروع ہو گیا وہی روز کا دھندا۔ مگر اس روز میں ملول ملول سا رہا۔ مجھے یقین نہ ہوتا تھا کہ ایک معمولی سی دم اس طرح دکھ پہنچائے گی۔ اگر یہ گمان بھی کبھی کبھی گذرتا تو کب کا دم کٹ کر ٹانوں میں نام لکھا لیتا۔ پچھلی شام کے حادثے کا اثر تمام دن میرے ذہن پر چھایا رہا۔ اس تمام دن میں اپنے بال بچوں کی چلن پھرن مصروفیت اور عادات کا بڑی ہی غائر نظر سے مطالعہ کرتا رہا۔ اور اس مطالعے نے تو سچ مچ میری آنکھیں ہی کھول دیں۔ مجھے تو تعجب ہے کہ تم لوگ ایسے نظام حیات میں زندہ کیوں کر ہو۔ ہر طرف ایک تفریق، نفرت، حقارت اونچا نیچا چھوٹا بڑا کی بڑائی چھل کپٹ کوئی ہے کہ پھٹ جانے کی حد تک پھولا جا رہا ہے اور کسی کی ہڈیاں جھانک رہی ہیں۔ زمین پر بسنے والوں کی یہ تفریق دیکھ کر مجھے تو رونا آگیا۔ اور اس برخوردار یعنی حضرت ڈارون پر تو بڑا ہی غصہ آیا جس نے سب سے پہلے اس پھسلے سپرے رشتے کو جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس بڑی سڑک کے اس پار کوئی ۱۰ بجے رات شام کو اس میں سے بیکڑوں آدمی نکلتے ہیں ان کے آگے پیچھے کچھ سفید پوش برخوردار وں کی موٹریں بھی ہوں تو کرتی انہیں سکون سے چلنے تک نہیں دیتیں۔ وہ تماشا بڑا اچھا لگتا ہے۔ اسی دن بیگم کہہ رہی تھیں کہ موٹروں میں بیٹھے ہوئے اس مل کے مالک اور عالا عہدے دار ہیں اور پیدل چلنے والوں مزدور میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ مل مالک مزدور کیا ہوتے ہیں بھئی اپنی دنیا میں نہ تو کوئی مل ہے مزدور۔ ساری خدائی اپنی ہے جہاں جی میں آئے آؤ اچھلو کودو۔ نہ کسی سے کچھ لینا نہ کسی کو کچھ دینا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ میری بیگم نے تمہاری دنیا کا مجھ سے بہتر طور پر کیا ہے ابھی اسی دن میں نے اس سے یہ تھا کہ تم بچے کو ہر وقت پیٹنے سے چمڑے کیوں رہتی ہو کہنے لگیں "میاں تم ان زمین والوں کو نہیں جانتے یہ اپنے جیسے انسانوں کو ہی تگنی کا ناچ نچاتے رہتے ہیں تو تم تو ان کے زمرے کے باہر کے ہی ٹھہرے۔ اگر انسان کے ہاتھ یہ بچا لگ گیا تو وہ مضروراسے بھی ڈنگ پر نچاتا پھرے گا۔"

وہ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میری سمجھ میں تو یہ بات کہ ہماری تمہاری نفرت کا سبب تو ایک دم بن گئی ہے۔ تمہاری آپس میں یہ تفریق کیا معنی رکھتی ہے۔ میرا تماشا بتاتا ہے کہ تمہارا نظام بالکل "کنڈم" ہے۔ جیسے میری (جو میرے ہلکے پھلکے جسم کے لیے ایک بوجھ بھی بن گئی ہے میری ترقی کی راہ میں سدراہ بھی)

برخوردار میری بات تو تم بھی اس دم "کو سر سے کاٹ ہی ڈالو۔

تمہارا

؟

ملکا میری

ب۔ا

ملکا میری نے حال ہی میں ۸۵ سال کی عمر میں انتقال کیا ہے۔ ملکا میری کو برطانوی عوام کے دلوں میں ایک بے نظیر جگہ حاصل تھی۔ برطانوی باشندے دو پشتوں تک ایک ایسی شخصیت کے اصولوں اور میعاروں کی تقلید کرتے رہے تھے جو ان کی نظروں میں ایک مثالی ملکا تھی۔

میری ۲۶ مئی ۱۸۶۷ء کو کینسنگٹن پیلیس میں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ ڈیوک اور ڈچز آف ٹیک کی بیٹی تھیں ان کی والدہ ڈچز آف ٹیک شاہ جارج سوم کے ساتویں بیٹے ڈیوک اور کیمبرج کی بیٹی تھیں۔

ملکا میری کی منگنی ۱۸۹۳ء میں ڈیوک آف یارک (جارج پنجم) کے ساتھ ہوئی تھی۔ ڈیوک آف یارک ایڈورڈ ہفتم کے زندہ بیٹوں میں سب سے بڑے تھے۔ اسی سال ۶ جولائی کو ان کی شادی ہوگئی۔

ہندستان کا دورا

ملکا میری نے اپنی ازدواجی زندگی کا ابتدائی حصا سینڈرنگم کے قریب یارک کاٹج میں گذارا۔ ان کے چھ بچوں کی پیدائش بھی اسی جگہ ہوئی تھی۔ وہ کئی بار اپنے شوہر کے ساتھ سمندر پار کے دوروں پر گئی تھیں ۱۸۹۹ء میں انہوں نے آئرلینڈ کا اور ۱۹۰۱ء میں تمام دولت مشترکہ کے حمالک کا دورا کیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں وہ ہندستان بھی آئی تھیں شاہ جارج پنجم نومبر ۱۹۰۱ء میں پرنس آف ویلز بنائے گئے تھے اور وہ ۱۹۱۰ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھے۔ ۲۲ جون ۱۹۱۱ء کو شاہ جارج پنجم اور ملکا میری کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔ تاجپوشی کے تعلق بادشاہ اور ملکا دونوں شاہی دورے پر آئرلینڈ ویلز اور اسکاٹ لینڈ گئے اور بعد میں وہ ہندستان بھی آئے تھے۔ دہلی میں انہوں نے شاہی دربار منعقد کیا تھا۔

بادشاہ جارج پنجم کے خطوط اور روزنامچے سے پتا چلتا ہے کہ انہیں اپنے کام میں ملکا میری سے بہت امداد ملتی تھی۔ ان کے بچوں ملکا سارے شاہی خاندان کو اگر کوئی مشورا لینا ہوتا تھا تو وہ سب ہمیشا ملکا میری کی طرف دیکھتے تھے۔

شاہ جارج پنجم اور ملکا میری نے ۱۹۳۵ء میں اپنی سلور جوبلی منائی۔ اس کے ایک ہی سال بعد یعنی جنوری ۱۹۳۶ء میں شاہ جارج پنجم انتقال کر گئے۔

فلاح و بہبود کے کام

ملکا میری نے عمر بھر سماجی کام سے دلچسپی لی عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود۔ مہتیا لوں کے کام اور نرسنگ کے پیشے سے انہیں خاص دلچسپی تھی دونوں بڑی جنگوں میں انہوں نے بہت کام کیا۔ جنگی کوششوں میں انہوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کی۔ اگست ۱۹۱۴ء میں انہوں نے عورتوں کے لیے ایک فنڈ جاری کیا جس کا مقصد ان عورتوں کو جو جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے بے روزگار ہو گئی تھیں۔ کام دلانا تھا۔ اس فنڈ کے ذریعے انہوں نے ہزارہا عورتوں کو اس وقت تک کام مہیا کیا۔ جب تک جنگی کوششوں کے سلسلے میں انہیں کام نہیں مل گیا۔ انہوں نے ایک ورا انجمن کی بھی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد ان لوگوں کو کپڑے مہیا کرنا تھا جنہیں جنگ کی وجہ سے نقصان اٹھانا

پڑا تھا۔ ملکا میری ہسپتالوں۔ گولا بارود کی فیکٹریوں میں بھی جایا کرتی تھیں ۱۹۱۷ء میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ فوجیوں سے ملنے فرانس بھی گئیں۔ دوسری جنگ عظیم میں ملکا کی عمر ۷۰ سال سے بھی زیادہ تھی لیکن انہوں نے اپنی فلاح و بہبود کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

آرٹ سے عشق

ملکا میری کو آرٹ سے بہت پیار تھا۔ وہ باقاعدہ طور پر لندن کی آرٹ نمائشوں کو دیکھنے جایا کرتی تھیں۔ قدیم زمانے کی چیزوں کو جمع کرنے کا انہیں بہت شوق تھا۔ ان کے چینی کے برتنوں اور ۱۸ ویں صدی کے سبز پتھروں کے مجموعے کے متعلق ہر کسی کو علم ہے ۱۹۳۸ء میں انہیں سوسائٹی آف آرٹس کی جانب سے البرٹ میڈل ملا تھا۔

وہ آرائش کے کپڑے بنانے میں بہت مشہور تھیں۔ جنگ کے دوران میں انہوں نے ایک دری بنائی تھی جو انہوں نے برطانیا کے ڈالر کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کے لیے حکومت کو ۱۹۴۹ء میں دیدی تھی۔ اس دری کی نمائش امریکا اور کینیڈا میں کی گئی۔ اور کینیڈا نے اسے خرید لیا تھا۔ ملکا الزبتھ دوم نے جب وہ ۱۹۵۱ء میں کینیڈا کے دورے پر گئی تھیں یہ دری کینیڈا کے حوالے کی تھی۔

ان کے نام جو خریدار بن سکتے ہیں تقریباً ۲ مہینے سے ہم ایک سو سے زیادہ ایسے حضرات کے نام سالانہ بھجوا رہے ہیں جنہیں ہم اس قابل سمجھتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو سالانہ ۳۰ روپے بھی ادا کر سکتے ہیں مگر ہندستانی ادب ان سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے وہ سال بھر علم و ادب اور زبان کی خدمت کر کے ۱۲ نمبر کے مرد و عورت ہیں ان سے صرف ۱۰ روپے کا طالب ہے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس چیز میں بھی کبھی کبھی (بہت کم) آرگن نقصان ہی میں چلایا جاتا ہے مگر یہ نقصان گوارا کیا جا سکتا ہے۔ اگر چند سو خریدار فراہم ہو جائیں تو نقصان بھی دور ہو سکتا ہے اور رسالہ ظاہری اعتبار سے بھی بہتر اور بڑی شکل میں پیش کیا جا سکے

بیہوشیاں

میرا نہیں فسانہ وہ، میری داستاں نہیں
خون وفا کی جا بجا جس میں کہ سرخیاں نہیں
قید قفس سے چھوٹ کر جا کے چمن میں کیا کریں
پہلے جہاں تھا آشیاں اب وہاں آشیاں نہیں
میرا بیان درد دل سنیے میری زبان سے
جس کو سنائے فصاحتو میری وہ داستاں نہیں
اور کوئی گلا تجھے تجھ سے نہیں ہے باغباں
سب کے ہیں آشیاں مگر میرا ہی آشیاں نہیں
دیر ہو سکیدہ ہو یا کعبہ ہو یا کہ بت کدہ
سب میں اسی کے آستاں غیر کے آستاں نہیں
قید تعینات سے کیوں نہ وہ بے نیاز ہو
خانہ خراب عشق کا جبکہ کوئی مکاں نہیں
عیش و نشاط زندگی ساتھ جوانی کے گئی
رونق بزم پھر کہاں رات کا جب سماں نہیں
برق جمال کی چمک طور پہ منحصر نہیں
جلوہ یار بے خبر، جلوہ نما کہاں نہیں

محفل وارثی کی ہوش اور ہی آن بان
ورنہ شاعروں کی دھوم آج کے دن کہاں

یوسیس

یو۔این۔او کی شاندار عمارتیں

یو۔این۔او۔ یا یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن (مجلس اقوام متحدہ) کا صدر مقام امریکا کے بڑے شہر نیویارک میں واقع ہے۔ یو۔این۔او کی ان شاندار عمارتوں پر ایک کروڑ ۴۴ لاکھ ۵۰ ہزار ڈالر خرچ ہوئے ہیں (ایک ڈالر ساڑھے تین روپے کا ہوتا ہے)

یہ عمارت ان تین عمارتوں میں سے آخری ہے جن میں یو۔این۔او کے دفاتر کھولے گئے ہیں۔ یہ اٹھارہ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ عمارتیں نیویارک کے مین ہٹن مرکز میں ایسٹ ریور پر واقع ہیں۔

زمین کا یہ حصہ امریکا کے ایک مخلص دوست فیاض ہستی مسٹر جان ڈی۔ راک فیلر جونیئر نے عطیے کے طور پر دیا تھا اب اس پر ۳۹ منزلوں والی سکریٹریٹ کی عمارت اور اس سے ملے ہوئے مکانات بڑی شان سے کھڑے ہیں۔

اسمبلی کی یہ نئی عمارت اس رقبے میں نہایت کمایاں حرکتوں اور رجاز یہ توجہ مقام پر بنائی گئی ہے۔

آسمان سے باتیں کرنے والی سکریٹریٹ کی عمارت کے مقابلے میں یہ پست مگر بڑی موزوں معلوم ہوتی ہے۔ تینوں عمارتوں کا آپس میں میل ہے۔

بین قومی تعمیرات میں جدید ترین ساز و سامان اندرونی آرائش اور کارآمد ہونے کے لحاظ سے یہ اپنی قسم کی آخری عمارت ہے۔

اسمبلی ہال اور باقی تمام صدر دفتر کا فاصلہ دروازا ان عمارتوں کے شمال کی طرف ہے۔ ان کا بیرونی حصہ شیشے اور سنگ مرمر کے ستونوں کا بنا ہوا ہے۔

مشرقی اور مغربی دیواریں انگریزی چونے کے پتھر سے بنی ہوئی ہیں۔ عمارت کے جنوبی سرے کے سامنے ایک بارغ ہے اور سکریٹریٹ کا چوکور فوارہ ہے۔ اس طرف ایک عظیم کھڑکی بنی ہوئی ہے جو زمین سے لے کر عمارت کی چھت تک پہنچتی ہے۔ اسی جنوبی سرے پر ڈپلومیٹوں کے داخلے کا دروازا ہے۔ جس پر سنگ مرمر کا ایک برج بنایا گیا ہے۔

اسمبلی ہال میں داخل ہونے والے وزیروں کو سات ایسے دروازوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جن پر نکل کی پلیٹنگ لگی ہوئی ہیں۔ یہ دروازے کمنڈ اکی سرکار نے بطور عطیا دیے ہیں۔

ہر دروازے کے باہر کی طرف چار پیتل کے بنائے گئے ہیں جن پر امن۔ انصاف، سچائی اور باہمی چارے کے نشانات بنے ہوئے ہیں۔ داخل ہوتے ہی وزیر اپنے آپ کو ایک وسیع لابی میں پائیں گے۔ جس کی چھت ۵۰ فٹ اونچی ہے جس میں برآمدوں والی صاف ستھری شیشہ لگی ہوئی ہیں۔ اور گرجا گھروں جیسی مدھم روشنی ایک غیر معمولی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ایک بڑی سیڑھی اور لفٹوں کے ذریعے پبلک گیلری اور آڈیٹوریم میں پہنچنے کا انتظام ہے۔ پبلک سیکشن میں جہاں دوستانہ نشستیں ہیں ان میں ۱۲۰۰ اشخاص کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ بائیں جانب نمائندوں کے لیے وسیع جگہ بنائی گئی ہے اور جنرل اسمبلی اور کانفرنس کے بڑے ہالوں کو ملاتی ہے

اسمبلی ہال کا رقبا ۱۶۵ × ۱۶۵ فٹ ہے اور اس کی اونچائی ۷۵ فٹ ہے اس کے واضح طور پر دو حصے کیے گئے ہیں۔ ایک ڈپلومیٹوں کے لیے اور دوسرا تماشائیوں کے لیے۔

ڈبلی گیلریوں کے۔ بیٹھنے کی جگہ دس قطاریں بنائی گئی ہیں جن میں سبز چمڑے سے ڈھکے ہوئے ڈیسک اور نیلی گدیوں والی کرسیاں ہیں۔ ڈبلی گیلریوں کے لیے کافی جگہ ہے اور نئے نئے ممبروں کے لیے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ مشاہدوں، مہمانوں، اخبار نویسوں کی نشستیں ایک تھیٹر کی نشستوں کی طرح پچھلی طرف بتدریج اونچائی میں بنائی گئی ہیں۔

ڈبلی گیلریوں کے لیے کل ملا کر ۵۰۰ مشاہدوں کے لیے ۲۰۰ اور پریس کے لیے ۲۴۴ نشستیں ہیں۔

ڈبلی گیلریوں کے لیے جو جگہ ہے اس میں دیو قامت لکڑی کے پردے بنائے گئے ہیں اور دونوں طرف سنہری کام والی دیواریں جن پر لکڑی کے ٹکڑے جوڑے ہوئے ہیں۔ ہال کی چھت میں جو گنبد ہے اس کی طرف بلند ہوتے ہوئے باجے کی مانند لکڑی کے عمودی ٹکڑے ماہرین تعمیرات نے اس لیے لگائے ہیں تاکہ خوب صورتی میں بھی اضافہ ہو اور سماعتی سہولت بھی حاصل رہے۔ ان کی کمپنیت میں نچلے حصے کے شیشے کی نشست گاہوں کی وجہ سے امتیاز پیدا ہو گیا ہے جہاں پبلک افھور میشن (اطلاعات عام) اور زبانوں کے مرجموں کا عملا بیٹھتا ہے۔

روسٹرم کے پیچھے جہاں صدر بیٹھتا ہے سنہری پٹے لگے ہوئے ہیں۔ جن ممبر ملکوں کے شیلڈ (سرکاری نشان) یو این۔ او کے بہت بڑے شیلڈ کے ارد گرد لگائے گئے ہیں چھت کا گنبد جو باہر سے دکھائی دیتا ہے ڈبلی گیلریوں کی نشستوں کے بیچ اوپر ہے۔ اوپر کا حصہ بلکل خالی رکھا گیا ہے اور نچلے حصے میں سماعتی ٹائیل لگائے گئے ہیں۔

ڈبلی گیلریوں کی نشستوں پر روشنی کے لیے چار دیواروں میں بھاری طاقت کے لیمپ لگائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اسپیکر کے روسٹرم اور پوڈیم پر بھی روشنی لگائی گئی ہے۔

گنبد کے عین مرکز میں ۵ فٹ کی جگہ خالی رکھی گئی ہے۔ جہاں سے قدرتی روشنی اندر آتی ہے ہال کی پچھلی دیواروں پر فرانس کے آرٹسٹ فرنینڈ لیجر نے نقش و نگار بنائے ہیں۔ تصویر کشی کی ہے۔

عمارت کے نچلے حصوں میں کانفرنس کے کمرے سات ریڈیو سٹینڈ ہوا ور ریکارڈ بھرنے کے کمرے اور ایک ماسٹر کنٹرول روم ہے جو ساری کارروائی سارے صدر دفتر میں پہنچا دیتا ہے۔

برطانیا اور کینیڈا کی طرف سے دیے گئے تحفوں اور عطیوں کے علاوہ امیزونی لینڈ کی ریموٹ لکڑی سے حاشیا بندی ڈبلی گیلریوں کی خاص لائی ہیں اور پریذیڈنٹ اور سکریٹری جنرل کے دفتروں میں آسٹریلیا کی لیس لکڑی کا شیڈ بندی کی گئی ہے۔

دوسرے ملکوں سے جو چیزیں خریدی گئی ہیں ان میں ذیل کی چیزیں شامل ہیں۔

اسمبلی ہال کے پچھلی طرف کے پردے بیلجیم سے اسٹیل سے پریس روم کے پردے، بلاک کی شام نشستیں سویڈن سے پوڈیم میں جو سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے وہ اور اسمبلی ہال کے فرشی قالین اٹلی سے خریدے گئے ہیں۔

مضمون لکھنے والوں سے

"ہندستانی ادب" کے بعض پرانے مضمون لکھنے والوں اور شاعروں کے نام رسالا پہلے کی طرح اب بھی پابندی کے ساتھ بھیجا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود ان حضرات نے اس رسالے کی طرف ایک مدت سے توجہ نہیں کی ہے ان حضرات کو ہم نے خطوں کے ذریعے بھی توجہ دلائی ہے مگر آج تک کوئی جواب نہ ملا۔ اس لیے یہ نہیں پتہ چلتا ہے کہ آیا یہ حضرات اپنے اپنے مقام پر موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اس وقت ہم صرف ایسے ہی حضرات سے مخاطب ہیں اور ان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے غیر معمولی طویل سکوت کو توڑتے ہوئے کوئی مضمون یا اپنا کلام بھیجیں یا کہ خط کے ذریعے اپنی خاموشی کی وجہ معلوم کریں اس کے بعد بھی اگر ہمیں کوئی جواب نہ ملے تو مجبوراً ان کے نام رسالا بھیجنا بند کر دیں گے۔

قمرالدین قمر

ریت کی دیوار

وہ کھانستی ہوئی بولی ــــــ "کشور ابھی تک نہیں آیا؟"

گھر میں اندھیرا چور کی طرح دبے پاؤں داخل ہو رہا تھا اور سورج کی سنہری کرنیں جس کی روشنی سے اسے کچھ تسلی مل رہی تھی۔ اب بلکل نایاب ہو چکی تھیں۔ "دیے میں تیل نہیں ماں" اسے خود اس کا احساس تھا آج اندھیرے میں ہی رہنا ہوگا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ابھی کشور آتا ہی ہوگا مطمئن ہو جاتی مگر وہ لوٹا بھی تک نہیں آیا۔

کامنی رسوئی میں بیٹھی ہوئی زیر لب بڑبڑائی۔ "آج بھی اندھیرے ہی میں رہنا ہے" روشنی کی ہلکی سی کرن ٹاٹ کے پردے سے چھن کر دروازے تک آ رہی تھی لیکن اس ایک پتلی سی کرن سے اس کے اندھیرے گھر میں اجالا کیوں کر ہو سکتا ــــ "ماں ..... ہا" کامنی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پردے میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور کسی کے آنے کی آہٹ نے اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا کشور مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

اتنے وقت تک تو باہر نہ رہا کرو بیٹا" "کشور نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ "یہ اندھیرا، اندھیرا کیوں؟" ــــ تیل ختم ہو گیا ہے بیٹا" "اف ..... !" جیسے اس پر بھاری چٹان گر پڑی وہ جھلا اٹھا "مجھی پر سارا دھیکا کا تو ہیں تیل ختم ہو گیا تو میں کیا کروں؟ وہ بغیر کپڑے بدلے مسہری پر لیٹ گیا۔ کامنی کام سے کمرے میں آئی اندھیرے میں اس نے کچھ ٹٹولا اور پھر بولی "کشور بھیا! اندھیرے میں ماں کیسے رہے گی بھلا"

کشور خاموش رہا۔ کامنی کے چہرے کے نقوش اندھیرے میں گہرے ہوتے گئے اس کی ناک کا پانسا اندھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ وہ سمی تھی ڈھاریں مار کر خوب روئے۔ اندھیرے میں دم گھٹا جا رہا تھا۔ پھر پہاڑ سے کی طویل رات وہ کس طرح گذارے گی بوڑھا کھانستے کھانستے دوہری ہو رہی تھی اور یہ کشور ــــ یہ پرواہ ..... اسے کسی کی کچھ فکر نہ تھی۔ صبح سے شام تک بنجے کہاں کہاں مارا پھرتا اور رات کو جب گھر آتا تو اس کا رعب اس طرح گانٹھا کرتا گویا کر ہا دھر" ہا ہی تو ہے اور جگدیو جی کی ران کتنی محنت کر کے ان لوگوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ پرے بلیس میں پرانے کھانے کا ٹھیکہ نہ چھننے کا۔ بس مشین کی طرح دن رات محنت کیے جا رہا تھا چند سردیوں میں ٹھٹھرتا رہا پر اس نے کشور کے لیے ایک گرم کوٹ دھوا بھیجا جسے پہن کر وہ لالہ صاحب کی طرح گھوما کرتا۔

جگدیو نے یہ سوچ کر اس سے کئی بار خلوص سے کہا۔ کالج میں اڈمیشن لے لے" کہ جہاں دس من دھان ایک من اور بھی تا کے اس کی زندگی سدھر سکے۔ مگر اس نے تو میٹرک پاس کر لینے پر یہ سمجھ لیا تھا مزید تعلیم کی اب کوئی ضرورت نہیں اور جو کسی فارم میں ملازمت کی سوچی تو یونیورسٹی نے اس کے سرٹیفکیٹ کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا جو ایسا ویسا یا تھا تب اسے احساس ہوا وہ کتنا غلط سوچا کرتا ہے۔ مگر وقتی طور پر یہ احساس بھی محو ہوتا گیا۔ اب تو صرف یاروں میں گھومنا رہ گیا تھا یہ بھی نہیں خیال کہ ہمیں جوان ہوتے کو آئی ماں بیمار ہے آخر ایک بھائی کہاں تک انسان کا بوجھ اٹھائے پھرے۔ جب کبھی اگر اسے سوچنے کی مہلت ملتی تو یار دوست یہ کہہ کر کہ "مرد سوچا نہیں کرتے یار" ایک بلند قہقہہ لگا دیتے ان کے نظریے میں تو مرد لڑکیوں کے پیچھے مارے مارے پھرا کرتے ہیں اور بس!

وہ اندھیرے میں گنگنا رہا تھا ـــــ نظر لگ گئی ۔ دل دھڑکنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بوڑیا ابھی بھی کھانسے جا رہی تھی ۔ کامنی اس کے سامنے اگلدان کرتی ہوئی بولی "کیوں نہیں مالا ۔ چھوٹے دلوں کے بچے بچیا کے پاس چلی جاتی ہے" اندھیرے میں اس کی گھنی گھنی زلفیں آبشار کی طرح شانے پر جھول رہی تھیں گلنار ہونٹوں پر ایک مردانہ ہنسی اس وقت پڑ گئی جیسے کشور چیخ رہا تھا "جھوٹ" تب اس نے کہا "اسی لیے نہ کہہ رہی تھی بھیا تیل لاؤ"

"ہنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا ۔ "جھوٹ ۔ جھوٹ وہ کہاں ۔ میں تو جھوٹ بول رہا تھا ۔" مگر پیسے کے چند قطرے اس بات کی شہادت دے رہے تھے کہ وہ ڈر گیا ہے لیکن ایسا ڈر اس کے سامنے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا ۔ اس نے کتنی مرتبہ چپکے رات گئے گھر آتا آبشار سا دیکھے تھے ۔ یہ تو ایک اتفاق تھا بس ۔

رات گہری ہوتی گئی ۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور چاندنی کی چھیل میں کامنی کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا ۔ وہ کھاٹ پر لیٹی سوچ رہی تھی ۔ ماں کب تک کھانستی رہے گی ۔ پلکیں کھوں سے جب آنکھیں ہی بند نہ ہو رہی تھیں پھر نیند کیوں کر آتی ۔

کشور نے کوٹ کر نے پر لادا اور دبے پاؤں باہر چلنے لگا مگر کامنی کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ چونک کر بولی

"اتنی رات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے جلدی سے کامنی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔ اور سرگوشی کے لہجے میں بولا "ماں سے کہنا نہیں" وہ اسے جاتا دیکھتی رہی اس کا دل دھڑک اٹھا اور برے برے خیالات چاروں طرف سے منہ پھیلائے بڑھے آ رہے تھے "اتنی رات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے "ہاں بہت رات ہو گئی" بوڑیا اس کی تائید کرتی ہوئی بولی "اب سو رہو

گر اسے نیند نہ آئی ۔ اس کا جوان دل دھڑک رہا تھا اور پلکیں تن گئیں ۔

رات ڈھلتی گئی تارے ٹمٹماتے رہے اور چاند نی ماند پڑنے لگی ۔ بوڑیا بھی کھانستے کھانستے سو گئی تھی مگر اس کی نگاہ دروازے پر ٹکی ہوئی کشور کے آنے کا انتظار کر رہی تھی آخر لمبی لمبی جمائی کے ساتھ اسے نیند آ گئی ۔ گھڑی نے دو بجا اور کشور ڈگمگاتا ہوا گھر میں داخل ہوا ۔ اس وقت اگر وہ جاگتی ہوتی تو اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پیٹ لیتی ـــ بھیا تو شراب بھی پینے لگے ۔ پیسے کی تنگی کی وجہ سے بوڑیا اپنے علاج سے گریز کر رہی تھی اور پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کی ہوئی معمولی سی پونجی بہت ہی حقیر تھی ۔ کامنی کے بیاہ کے لیے وقف کر رکھا تھا اور اب انہیں پیسوں کی وہ شراب پینے لگا رات کی خاموشی میں وہ اب بھی جھنجھلاتی ہوئی آواز سن گنگنا رہا تھا ۔ نظر لگ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور رات بڑی تیزی سے بھاگی جا رہی تھی ۔

دن کے من موہنی سے تو کامنی یا دیہ خیال گہن کی طرح کھائے جا رہا تھا کہ اٹھارہ سال کی عمر ہوئی پر اب تک کامنی کو بیاہ نہ سکی ۔ اقتصادی بد حالی نے جہاں زندگی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا وہاں وہ جسمانی تکلیف سے بھی محفوظ نہ رہ سکی ۔ ایک تناور تھا جوان دن کامنی کے ساتھ بڑھتا رہا ۔ اور انہیں الجھنوں میں وہ اس طرح الجھ گئی تھی کہ کشور کی حرکات کا پتا تو گیا ۔ اندازہ تک نہ لگا سکی ۔ اگر جب کبھی اس کا جی ان الجھنوں سے ہٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا تو کشور کی دوستی اس کی اجازت نہ دیتی کہ کچھ پوچھ گچھ کرے ۔ اس نے بھی اسے چھوڑ دیا تھا کہ آگے چل کر وہ خود ہی سنبھل جائے گا ۔ آج کو اگر کامنی کا ہاتھ پیلا ہو جاتے تو کل وہ خود اس سے علاحدہ ہو جاتے گی ۔ پھر خوب کمائی کرتا پھرے ۔ اور اسی کی یہ تمنا تھی کشور کی آزادی میں حمد و حائل ثابت ہوئی ۔ پہلے تو خیر ذرا بہت گھر کی حالت کا خیال کر لیا کرتا لیکن جب سے اس کا

معاشقہ پتلی سے ہو چلا تھا۔ اسے ان کی کوئی پروا ہی نہ رہی تھی اور جب کل پتلی نے گھنگروؤں کی چھما چھم اور مہتابی میں لپٹی ہوئی مئے اس کو پیش کی تو اس نے ہنس کر اسے قبول کر لیا گو اس سے پہلے اس نے شراب کبھی نہ پی تھی مگر پتلی کی مست کن نگاہوں کے آگے اس کی کچھ پیش نہ چلی۔

صبح کاذب کا وقت تھا۔ ہواؤں میں تھوڑی تھوڑی خنکی تھی۔ کہر کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کامنی نے تھالی میں کچھ تازہ پھول چنے اور سمندر کی طرف چل پڑی۔ وہ روز سمندر جاتی روز دیوتا کی پوجا کرتی اور روز پرارتھنا کرتی۔ لیکن ابھی تک اس کی ایک مراد بھی پوری نہ ہوئی تھی۔ آج بھی اسے خدشہ تھا اندھیرے میں نیند کیوں کر آئے گی۔ پلکوں کا بوجھل پن آنکھوں میں تکلیف دہ ہوتا گیا۔ اور خمار کا غلبہ ابھی تک بدستور تھا مگر وہ کیا کرتی۔ بوڑیا کی کھانسی گو کم ضرور ہو گئی تھی لیکن سانس کی بے ہنگم آواز گھٹی فضا میں اس طرح گونج رہی تھی جیسے کوئی پرند قفس میں پھڑپھڑا رہا ہو۔ وہ ابھی تو پھڑپھڑا رہی تھی اور یہ قفس نہیں تو اور کیا۔ غریبوں کا چھوٹا سا مسکن جہاں بیماری بھری پڑی تھی جہاں آنکھوں کی چمک روز بروز ماند پڑتی جا رہی تھی۔ اور دن بدن اس کی ہنسی کو ہونٹوں سے جیسے کوئی چھین رہا تھا بلکہ اگر وہ قفس میں ہوتی تو صیاد کا رونا رو کر کچھ دیر کے لیے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی تھی۔ یہاں اس مسکن میں اگر کشور کو قصوروار ٹھہراتی تو کس بنا پر اور کسے دنیا چاہتی تھی۔ وہ سچ کہہ رہی تھی سب کچھ اور یہی حسن تو ابھی تک اس کے گوشت پوست کے لوتھڑے میں زندگی کی حرارت بنی تھرک رہی تھی ورنہ دوکھ کی مرچی ہوئی مندر سے جب وہ واپس لوٹ رہی تھی تو نشا ہی اسے خیال آیا کشور رات کہاں گیا تھا۔ اتنی رات گئے پھر کب واپس آیا۔ دیوتا کی پوجا کرتے سے دل کو کچھ سکون میسر آیا تھا۔ مگر جب وہ مادیت کی اس جنتی جاگتی دنیا میں آئی تو جھنجلاہٹ اس کا سارا سکون ریت کی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ دل نے چاہا بڑھ کر دیوتا کا گریبان پکڑ لے اور پوچھے ــــ اور بھگوان

۔۔۔۔۔ ہمیں کیوں پیدا کیا تو نے ۔۔۔۔۔؟"

اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ ہنسی تیر گئی ــــ مٹی کا یہ دیوتا انسانوں کی مرادیں کیا پوری کر سکتا ہے جو کہ خود انسانوں کا محتاج ہو ــــ"

اس کے قدم خود بخود تیز ہونے لگے ــــ رات سے بوڑیا کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور کشور تو ابھی تک بچھونے پر کروٹیں بدل رہا تھا۔

اس نے صحن میں قدم رکھا تو بوڑیا کھانس رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کیچڑ سے لت پت تھیں۔ گاڑھا گاڑھا بلغم پٹ پٹ دیوار پر پھینک رہی تھی۔

اس نے برا سا منھ بنا لیا۔ چہرے پر کراہت کی پتلی سی لکیر ابھر آئی۔ پھر آگے بڑھ کر اگالدان سامنے کرتی ہوئی بولی "اس میں تھوکا کرو ماں!"

"زندگی کے کھیل میں جیتے ہار اور جیت ہوتی ہے پھر یکاندنہ کے چند حقیر ٹکڑے ہیں!" کشور کے ہونٹوں پر ہلکی سی ہنسی رینگ گئی۔

"بولو ــــ ہا ہا بولی بولو ــــ ہا!"

فرش پر تاش کے باون پتے تاج رہے تھے پھٹ پھٹ۔ مہاراج نے پتہ پھینکا۔ کشور نے کاٹا۔ پتلی اس کے پہلو میں بیٹھی سگریٹ کے کسیلے دھوئیں کے ساتھ خدا اس کی زندگی کی کہانیاں سنا رہی تھی اور وہ ایک کم درجے کی عورت کا اس وقت اچھا خاصا نمونہ بن جاتی جبکہ بانیں آنکھ مارتی ہوئی "ہائے راجا" کا فلک شگاف نعرہ بلند کرتی۔

تاش کا آخری پتا اس کے ہاتھ میں تھا ــــ کھڑکی سے شام کی گلابی فضا نمودار ہو رہی تھی۔

جیب میں بار بار اس نے ہاتھ ڈال کر ٹٹولا۔ آخری بازی کے ساتھ کاغذ کے تین رنگین نوٹ بھی ختم ہو چکے تھے، اور پتلی کھسک کر مہاراج کے پہلو میں جا بیٹھی۔

عجلت و اس نے قہقہہ بلند کیا "لگا لے اپنی

ماسوک کی باجی راجا بابا"

کشور نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبائے حقارت آمیز نگاہوں سے پتلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور ان ہی نگاہوں میں بھی بہ کچھ دیر پہلے اس کے لیے پیار تھا۔ ہلکا سا تبسم اور لطیف چاہ لیکن جیسے آج اس کی آنکھوں کی بندی ہوئی پٹی کو کسی نے کھول دیا اور جب وہ گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو اس کے قدم ہارے ہوئے جواری کی طرح بجائے ڈگمگانے کے تیز تر ہوتے گئے۔

دروازے پر قدم رکھتے ہی اسے کامنی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ان آوازوں میں ہم سایوں کی آواز بھی ملی ہوئی تھی۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔

اس کے بال بکھرے تھے اور قدم بڑی تیزی سے بوڑیا کی چارپائی کی طرف بڑھنے لگے لیکن فوراً ہی اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ سسکیوں کی آواز کے پار سے جیسے پتلی کے گھنگرو کی چھم چھم اس کے ذہن میں بجنے لگی۔ اور اسی چھم چھم کو چیرتا ہوا اس کی پچھلی زندگی کا منظر ننگا ہوں کے پردے میں ابھر آیا۔

وہ اسکول کا کمزور طالب علم! دنیا کے سرد و گرم سے نا آشنا۔ دلوں میں نئے نئے ولولے، نیا عزم اور نئے ارادے لیے ترقی کی شاہراہ پر کھیلتا گذر رہا تھا کہ یکایک ایک طوفانی تھپیڑا اس زور سے آیا کہ اس کی چھوٹی سی کشتی اپنا توازن کھو بیٹھی۔ اس میں مقابلے کی سکت نہ تھی وہ ڈگمگاتی ہوئی اسی سمت رواں ہو گئی۔ جدھر تھپیڑے بہائے لیے جا رہے تھے اس وقت اس کی حس سلب ہو چکی تھی اور اس نے اسی کو مقصد حیات سمجھ لیا تھا۔ نہیں بلکہ اسے سمجھایا گیا تھا اور اب اس طوفانی تھپیڑے کی شکل اس کی نگاہوں کے سامنے صاف نمایاں ہو چکی تھی۔ اس نے حقارت بھری ایک نظر اس پر ڈالی۔ اس کے بشرے سے صاف ظاہر تھا۔ تباہی کے اس اندھیرے غاروں کو ہمیشگی کے لیے بند کر دے گا جس میں انسان گر کر اتنا پاتال اور بے مصرف ہو جاتا ہے کہ اپنی ماؤں کو سامنے مرتے اور بہنوں کی مانگ میں سیندور بھی دمق بھی نہ دیکھ سکے۔

اس کا یہ احساس کہ اپنی بربادی کا وہ ذمے دار تھا۔ یا سماج — اب واضح ہو چکا تھا۔

اس نے یہ سوچا — "کاش سماج اندھیرے غاروں میں کر مسکرانے اور دمکتے ہوئے جسم میں جھونک قہقہا لگانے کے گرتے ہوئے کو یہ کہہ کر سہارا دے دیتا — کہ تم مستقبل کے معمار ہو۔ تم قوم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ثابت نہ ہو۔ . . . .

اور اب ریت کی دیوار گر چکی تھی۔ اس کے بدلے میں ایک ایسی پختہ دیوار کھڑی ہو رہی تھی جس میں طوفانی تھپیڑے جنبش نہ پیدا کر سکیں گے — اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکا سا تبسم مچل اٹھا اور روشنی کا ایک ٹکڑا اب بھی اندھیرے میں صاف جھلملا رہا تھا۔

غزل

نصیر کوٹی

گردش دوراں کہاں تک تھی کہاں سمجھا تھا میں
تیرے ہی کوچے کو حد آسماں سمجھا تھا میں

آستیں سے ان کے دامن تک پہنچنا ہے محال
ہائے وہ آنسو جنہیں پیل رواں سمجھا تھا میں

برق نے میرے سیہ خانے کو روشن کر دیا
آج تک جس کو تباہی کا نشاں سمجھا تھا میں

ہیں اسی کے زخم میرے دل میں تا بہ تا بہ تا بہ تا بہ
وہ زباں جس کو زبان بے زباں سمجھا تھا میں

آندھیوں نے دو اڑائے وہ جلائے برق نے
چار تنکے جس کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

زخم دل زخم جگر نے راز افشا کر دیا
آنسوؤں کو درد دل کا رازداں سمجھا تھا میں

ہیں رہا ہے غم کسی کا چارہ ساز دل نصیر
جس کو اب تک کل عدو جسم و جاں سمجھا تھا میں

راز

شہناپرویز

انور میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ مدرسا وسطانیا چادر گھاٹ میں تھا جب میں اس مدرسے میں شریک ہوا اور چند دن بعد وہ میرا گہرا دوست بن گیا۔ مڈل ہائی اسکول میں بھی وہ میرے ساتھ رہا۔ نظام کالج میں بھی ہم نے ایک ہی سے مضامین لیے انور ایک بوڑی عورت کے پاس رہا تھا جسے وہ "نانی" کہا کرتا تھا۔ نانی کے متعلق اس کا قول تھا کہ وہ نوٹوں کو کھلاتی ہے۔ اور تاپ کر پہنا تی ہے وہ بچپن سے بھولا، دل کا سخی، صاف گو اور نڈر تھا۔ میری فاطر سب کچھ لٹا دینا اور اپنی جیب خالی ہونے پر میری جیب پر جھاپا مارنے سے کبھی نہیں چوکتا۔ اپنے استاد کی کوٹھی گھر کی یا پرائے بچوں کے رعب کو وہ کبھی خاطر میں نہ لاتا۔ عموماً اس کی جیب خالی، ہاکر تی اور میرے پاس پیسے رہا کرتے اس لیے وہ پہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ کہتا "دوست جیب کچھ وزن معلوم ہو رہی ہے" اور ہم دونوں جیب ہلکی کرنے کسی قریبی ریسٹورنٹ میں پہنچ جاتے۔ اسے چائے بہت پسند تھی اور سینما کا تو اسے جنون تھا لیکن اس نے سوائے میرے کسی سے سینما دیکھنے یا چائے پلانے کی خواہش نہیں کی۔ اور نہ جانے کیوں اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے مجھے ایک گونا سکون اور ایک جاسکون کا احساس ہوتا۔ میٹرک کے امتحانات قریب آرہے تھے۔ مدرسا بند ہونے والا تھا۔ وہ ایک دن کلاس میں میرے قریب آیا اور کہنے لگا

"یار ہاشمی! آج میں تمہارا دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ بلا زا میں کو برا دا من چل رہی ہے جس میں ہیرا موٹر کم کمپنی (اتنی نانی) ہے کہ تم بچے اونٹ کہنا بھول جاؤ گے۔"

"نہیں آج تم دعوت کھاؤ۔ ہم تو ہیں لیکن سولجر ہیں" میں نے صاف کہہ دیا اور ہم دونوں پیسے بنانے کی اسکیم پر غور غور کر رہے تھے کہ پوسٹ مین ہماری کلاس میں داخل ہوا اور انور کو پوچھنے لگا۔ انور کے نام منی آرڈر آیا تھا انور نے منی آرڈر کوپن دیکھا۔ خستی کی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس نے دستخط کی اور سو روپے حاصل کر لیے۔ پھر اس نے رقم اور کوپن میرے سامنے رکھ دیے کوپن کے الفاظ مجھے یاد ہیں۔

"آپ کے جیب خرچ کے لیے ۱۰۰ مرسل ہیں اس کی اطلاع اپنی نانی کو دینے کی ضرورت نہیں۔ پیسا احتیاط سے خرچ کرو۔ یہ رقم ہر ماہ آپ کو مل جایا کرے گی" اور نیچے چھوٹی سی خوب صورت دستخط۔

"یہ رقم تم اپنے پاس رکھو وقت پر ہم خرچ کریں گے" انور نے کہا "لیکن حاتم کی قبر پر لات مارنے والا یہ ہے کون" میں نے دستخط پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اتنی ہی رقم ایسی ہی دستخط کے ساتھ میری نانی کے پاس آیا کرتی ہے۔ نانی نے کہا ہے کہ وہ ان کا کوئی عزیز ہے"

انور بھی متفکر سا تھا۔

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں" میں نے پہلی مرتبہ دریافت کیا۔

"کوئٹے کے زلزلے میں سب تباہ ہو گئے۔ صرف ہم دو بچے کر یہاں آگئے"

رقم ہر ماہ آنے لگی۔ اور ہم موج منانے لگے اس نے چند سوٹ بھی سلا لیے اور نانی سے کہہ دیا کہ وہ میرے کپڑے پہن رہا ہے۔ بلا تراش خراش کے سوٹ میں وہ کافی خوب صورت اور وجیہ نظر آتا تھا۔

ہمارے کالج میں شریک ہونے کے بعد بھی یہ رقم کالج کے پتے پر آنے لگی فرسٹ ایر تو ہم نے رسٹ ایر منایا!

ابتدا سکندر پر میں ہم تعلیم کی طرف کچھ توجہ کرنا چاہتے تھے لیکن معاشیات اور سیاسیات کا اشتراک اتنا بوجھل تھا کہ بس ہمیشہ خطرا رہتا تھا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ کوئی صاحبہ معاشیات کی لکچرار بن کر آرہی ہیں۔ اور ہمیں تشویش ہونے لگی کہ کون ہونگیں کیسی ہونگیں ——

آخر کار وہ آ ہی گئیں۔

تیکھے نقوش —— انگریز برگمن کے جیسے۔

دبلا پتلا لانبا سا قد اور ہو بہو میری مونٹیسوری کی طرح لیکن چہرا پاکیزہ اور رعب دار تھا جیسے مغلیہ حرم کی شہزادی ہو۔

وہ حاضری کا رجسٹر کھولنے لگیں وہ ایک ایک کا نام پکارتیں اور ہر ایک کو دیکھ کر نام کے مجازی حاضری کا نشان لگا دیتیں انور کا نام جب انہوں نے لیا تو انور غایب تھا پھر میرا نام تھا انہوں نے گھڑی دیکھا ہوں سے مجھے دیکھا اور دوسرا نام پکارا تھوڑی دیر بعد انور چین کرتا یا اور میرے بازو بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کون"

"میری میریا" میں نے کہا۔

"قد تو بلکل اسی کا ہے لیکن چہرے پر کس قدر پاکیزگی ہے" اس نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر کا کیا اندازا ہے" میں نے دریافت کیا۔

"یہی کچ تیس پینتیس کی ہوگی" انور اب بھی اسے دیکھ رہا تھا ——

حاضری ختم ہونے کے بعد انور اٹھ کھڑا ہوا انہوں نے تیز نگاہوں سے انور کو دیکھا۔

"آپ کا نام" آواز میں سختی تھی

"انور سلیم۔ رول نمبر ۱۸۵" انور نے بھی تیزی سے جواب دیا۔

"لیٹ لطیف" انہوں نے آہستہ کہا اور حاضری دیدی نہ جانے کیوں ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

انہوں نے کچھ دینے کے بعد اپنا تعارف کرایا۔ اپنا نام سلیما اور اپنی ٹرگیڈی سنائی۔ اسے سنتا ہی انہوں نے کہا کہ وہ پہلی مرتبا لڑکوں کے کالج میں لکچرار بن کر آئی ہیں۔ اور وہ لڑکوں کی نفسیات سے قطعی ناواقف ہیں انہوں نے وعدا کیا کہ معاشیات میں اور ممکن ہو سکے تو سیاسیات میں بھی وہ ہماری مدد کریں گی۔ انہوں نے خواہش کی کہ ہم انہیں لکچرار سے زیادا اپنی بڑی بہن سمجھیں۔ پھر انہوں نے کلاس کو چھٹی دیدی میں نے دیکھا کہ انور ان کے سامنے سے گذرا تو انہوں نے انور کو نظر بھر کر دیکھا لیکن انور کو اس کا احساس نہ ہو سکا کہ وہ انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر سرخی آئی پھر سرخی غایب ہو گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی اور نہ جانے کیوں پھر ہونٹ خشک ہو گئے۔ سب جا چکے میں بھی باہر نکل رہا تھا۔

"یہ رجسٹر لے جایئے میں لیکے تکلیف نہ ہو" آواز روندھی ہوئی تھی۔ رجسٹر لے کر میں باہر نکل گیا۔ اور پلٹ کر دیکھا تو سفید ساڑی کے آنچل سے آنکھ صاف کر رہی تھیں شاید کچھ تنکا گر گیا ہو یا آنسو خشک ہو گئے ہوں۔

بہت جلد وہ ہم میں ہلو ملو ہو گئیں اس کے وجوہ کچھ تو ان کے تیکھے نقوش ان کا لانبا سا قد اور ان کی معلومات لیکن ساتھ ہی ان کے وسیع اخلاق ملنساری وہ اتنی باوقت تھیں کہ میں نے انہیں کبھی ننگے سر نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ساڑی کے آنچل سے سر ڈھکا ہوتا۔ کبھی انہوں نے نیم آستین بلوز نہیں پہنی کبھی عریاں قسم کے لباس میں انہیں دیکھا کبھی غیر شایستہ مذاق نہیں کیا۔ سب ان کو پسند کرتے تھے سب ان کا ادب کرتے تھے لیکن میں ان کا دلی احترام کرتا تھا ان کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھتا لیکن اگر فیر دلچسپی تھی تو انور سے۔ انور سے انہیں محبت تھی خلوص تھا لیکن انور سے انہوں نے کبھی آنکھ نہیں ملائی۔ لکچر دیتے ہوئے مجھے دیکھتیں یا کسی اور لڑکے کو اور کبھی کبھی ایک چھٹی

سی نگاہ انور پر ڈالتیں۔ انور انہیں برابر تکا کرتا ــــ جانے کیا چیز ان میں ڈھونڈا کرتا لیکن لگاہوں کے تصادم کے ساتھ ہی وہ پریشان ہو جاتیں۔ کبھی تو اپنا لکچر ہی بھول جاتیں اور حوالا یا سلسلا ڈھونڈنے کے لیے اپنے آپ کو گنا ہوں ــــ میں گم کر دیتیں لیکن دن گذرنے کے ساتھ وہ انور کے دل و دماغ پر چھانے لگیں۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ خدمس سلیما بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

ایک دن انہوں نے نوٹس لکھنے کے لیے کہا وہ کہہ رہی تھیں ہم لکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد انور کے فونٹن پن کی سیاہی ختم ہو گئی۔ میں نے اپنا پن اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور ضد پنسل سے لکھنے لگا مس سلیما کی نظر ہم پر پڑ گئی وہ ہماری طرف اطمینان سے آئیں اور میرے قریب کھڑے رہ کر ایک منٹ مجھے غور سے دیکھا اور چپکے سے میرے سامنے اپنا پن رکھ کر واپس چلی گئیں میں نے انہیں دیکھا چہرے پر لپسنے کے قطرے چمک رہے تھے حالانکہ موسم کافی ٹھنڈا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں ٹوٹلس ختم ہونے کے بعد میں نے انہیں ان کا پن واپس کیا لیکن وہ کہنے لگیں۔

"اگر یہ آپ پاس ہی رہے تو کون مضایقہ ہے" اور میں پریشان ہو گیا کہ کیا جواب دوں۔ پورا دو سو روپے کا ــــ پن یوں مفت ہات لگ رہا تھا۔

"رہنے دیجئے! شاید آپ کے دوست کے پن کی سیاہی پھر کبھی ختم ہو جائے" وہ مسکرانے لگیں۔

"آپ انور ہی کو دیدیجئے" میں نے کہا۔

"میری نظر میں آپ اور انور ایک ہی ہیں۔ وہ آگے بڑھ گئیں ــــ

میں نے اس کا ذکر انور سے کیا۔ میرا خیال تھا کہ انور مجھ سے پن چھین لے گا۔ لیکن اس نے مجھے مبارک باد دی اور پن کو دیکھ کر میری جیب میں رکھ دیا۔ وہ آئے دن قنوطی بنتا جا رہا تھا۔

ــــ خامش خامش، اکیلا اکیلا اور اس کی سنجیدگی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی سلیما کا جنون بھی کم ہوتا جا رہا تھا اور وہ مجھ سے بھی کم ملنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی عظیم ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔

ایک دن انور کالج نہ آیا اس کی سیٹ خالی ہی رہی پیریڈ میں نے کسی کو بیٹھنے ہی نہیں دیا۔ مس سلیما کلاس میں آئیں انور کی کرسی خالی دیکھ کر وہ بیٹھ گئیں۔ کمرے کا جائزہ لیا لیکن انور کو نہ پاکر مایوس نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ اس دن کا لکچر بھی پھیکا پھیکا سا رہا۔ نہ وہ شگفتگی تھی اور نہ وہ دلچسپی۔ لکچر ختم ہونے کے بعد سب کے بعد میں نکلا۔ انہوں نے ٹہرنے کا اشارہ کیا میں قریب گیا۔

"آج انور نہیں آئے" لہجہ اداس اداس سا تھا۔

"جی شاید وہ بیمار ہے" میں نے عمداً کہا۔

"بیمار!" چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوئے اور پیشانی پر تردد کی سلوٹیں ــــ

"ایک مہربانی کیجیے۔ آپ ان کے گھر جایئے ہو سکے تو شام میں یا صبح میں ان کی کیفیت دیتے جائیے لیکن انور کو معلوم نہ ہونے پائے" آواز میں التجا تھی۔

"جی اچھا!" ہم دونوں باہر نکلنے لگے۔

"وعدا!" انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ اور میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

میں شام میں سیدھے انور کے پاس گیا معلوم ہوا پیر میں درد ہونے کی وجہ سے کالج نہ آسکا۔ دوسرے دن صبح مس سلیما کے ہاں گیا وہ کالج کے قریب ہی ایک مکان میں اکیلی رہا کرتی تھیں۔ میرے آنے کی اطلاع پاکر وہ بیرونی سے باہر آئیں کتنی اچھی نظر آرہی تھیں وہ۔ سفید شرٹ، سفید شلوار اور سفید اوڑنی گلے میں سفید موتیوں کا ہار۔

"آیئے، آیئے۔ یہاں کون پردانشیں ہے" آنکھیں سوجھی ہوئی سرخ تھیں۔ جیسے رات بھر جاگی ہوئی ہوں

چہرے پر تقدس آب جلال جیسے کوئی نمازی رات میں مراقبے میں بیٹھا ہو چھوٹا سا مکان تھا لیکن سلیقے سے سجا ہوا سرو کے لانبے لانبے درخت ـــــ ہو بہو مس سلیما کے قد کی طرح چنبیلی کی شاداب بیلیں جن پر عشق پیچاں لپٹی ہوئی۔ سرخ سفید گلاب کے پودے ۔ یہ سارے پودے اور درخت انور کو بے حد پسند تھے۔

"یہ آپ کی اپنی پسند ہے" میں نے عشق پیچاں کی خوب صورت سرخی کو غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی ہاں! آپ کو بھی پسند ہے مس سلیما نے شوخیانہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"میری جگہ انور ہوتے تو شاید اسے دیکھ کر زیادہ خوش ہوتے" انور کا نام سنکر وہ چوکیں۔

"اب کیسے ہیں" ہم اندرونی کمرے میں داخل ہوئے جو سنہرے رنگ کے پردوں اور فرنیچر سے آراستہ تھا۔

"سر میں کچھ درد تھا اس لیے کالج نہ آسکے۔ آج آجائیں گے" میں نے جواب دیا۔

"شکر ہے" لہجے میں اطمینان تھا۔ اتنے میں چائے کی ٹرے سامنے آئی اور وہ چائے بنانے لگیں۔

"آپ کو انور اتنے کیوں پسند ہیں" میں نے ان کی دی ہوئی پیالی سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری نگاہوں میں تمام بچے ایک ہیں" لہجے میں غرور اور خدی کا جذبہ تھا۔

اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پیالی میں کونین گھول دی ہو۔ تاہم آپ دونوں کی دوستی اور محبت بہت زیادہ متاثر ہوئی مس سلیما میری طرف بسکٹ بڑھاتے ہوئے کہا تاکہ میں جملے کی تلخی کو محسوس نہ کرسکوں۔ اور میں خاموش بسکٹ کھاتا اور چائے پیتا رہا

"آپ دونوں رشتے دار ہیں" انہوں نے پھر چھیڑا۔

"جی نہیں صرف دوست۔ بھائیوں کی طرح" میں نے بھی روکھا جواب دیا۔

"مجھے بھی اپنا دوست سمجھیے بہن کی طرح۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہاتھ بڑھا دیا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں لوہے سے ہاتھ ملا رہا ہوں ـــــ وہی گرمی، وہی خلوص ـــــ

جب میں نے اجازت طلب کی تو انہوں نے کہا "فرصت ملے تو ادھر پھر آنا"

انور کی زندگی تیزی سے بدل رہی تھی۔ وہ مجھ سے بھی کم ملنے لگا۔ کالج میں حاضری کم ہونے لگی لیکن مس سلیما کے کچھ زور میں اس نے پوری حاضری دی کہیں تو وہ بے چین سا نظر آتا اور کبھی مطمئن جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اسے مل گئی ہو یا پائی ہوئی چیز کھو گئی ہو۔ ایک دن میں اس کے گھر گیا وہ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا میں اس کے قریب بیٹھنے کی بجائے اس کے پیروں کی جگہ اسٹول پر بیٹھ گیا

"ارے بھئی اتنی انکساری مت کرو یہاں آؤ" اس نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"لیکن وعدہ کرو کہ ہو کچھ میں پوچھوں سچ سچ بتا دو گے" میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"میں نے آج تک تم سے کوئی چیز چھپائی ہے" وہ ہنسنے لگا۔

"مس سلیما کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے" میں نے پوچھا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم اس کے متعلق دریافت کرو گے وہ سنبھل کر بیٹھ گیا "مس سلیما سے مجھے کیوں دلچسپی ہو رہی ہے۔ میں خود نا واقف ہوں لیکن ایک غیر مرئی طاقت مجھے اس کے قریب کر رہی ہے ایک یقینی قوت مجھ سے کہتی ہے کہ میری زندگی کا کوئی بڑا راز اس سے وابستہ ہے میں اس سے جتنا دور رہنا چاہتا ہوں تنہائی اس کے قریب محسوس کرتا ہوں لیکن ہاتھی میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اسے دیکھ کر کبھی برا خیال نہیں پیدا ہوا۔ ایسا خیال جیسے کہ ریشہ، زبیدہ، ونی اور اڈیلا کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے انہیں دیکھ کر طبیعت چاہتی ہے کہ انہیں اپنے بانہوں میں جکڑ لوں ان کے بالوں کی سیاہی چرا لوں، ان کے گالوں، لبوں اور بانہوں پر اپنے نقوش چھوڑ دوں، ان کے ہاتھ میں ہاتھ ملائے زندگی گذار دوں انہیں اپنے میں سمیٹ لوں کہ وہ اپنا وجود گھٹتا ہوا محسوس کریں لیکن مس

سلیما کے خیالات کو دیکھ کر ہی اور فیصلے کے خیالات آتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ اس قدموں پر سر رکھ کر ابھی اب کہ کی نیند سو جاؤں وہ مجھے بازوؤں میں پھیلائے اور میں ایک معصوم بچے کی طرح اس کی بانہوں میں پناہ ڈھونڈوں۔ وہ جیسا میرے ساتھ رہے ایک ساتھی کی طرح نہیں بلکہ ابو کے سایہ کی طرح جو دھوپ و برسات سے بچنے کو محفوظ رکھے اس کا بات میرے ہاتھ پر نہیں بلکہ میرے سر پر رہے وہ میری پیٹھ سہلائے میرے الجھے ہوئے بالوں [illegible] رہے جب میں بات کرتا [illegible] تو وہ اپنے آنچل سے میرے [illegible] فرحت بخش لوریاں مجھے میٹھی نیند سلا [illegible] نہیں"۔ وہ مسلسل کہتے کہتے تھک چکا تھا [illegible]

اس کے چند دن بعد مس سلیما نے مجھے وہ انور کو جانے پر بلایا نہ جانے کیوں انور گھر کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر حسرت ہو رہا تھا۔ خوب صورت پودوں اور رنگین پردوں کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"ہاشمی دیکھ رہے ہو میرا اور مس سلیما کا مذاق کرنے کا انداز"

میرے نے کہا "مرنے کو جیئے"۔ لیکن انور خاموش ہو گیا جیسے اسے یہ مذاق برا لگا۔

چند دن بعد انور اچانک بیمار ہو گیا اور اسے دواخانے میں شریک کرایا گیا مس سلیما کی بے چینی اور ان کا اضطراب ناقابل دید تھا لیکن عورت ضبط کا دوسرا نام عورت ہے [illegible] کسی فرد کو یہ محسوس نہ ہو سکا کہ مس سلیما [illegible] پریشان ہیں۔ وہ روز انا دواخانا جاتیں انور کو اپنے ہاتھ سے دوا پلاتیں۔ جب وہ اس کی بالوں میں انگلیوں سے کنگی کرتیں تو نہ جانے انور کیوں اطمینان [illegible] سو جاتا اور ان کو بلکے بلکے سروں میں گانا انور کی [illegible]

ایک رات انور کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے جواب دیدیا۔ رات گذرنے پر ہی وہ اس کی زندگی کے متعلق کچھ [illegible] میں سے اندر گھس گیا جیسے کچھ واقف ہی نہیں۔ وہ تو [illegible] چوکیں اور اپنے آنسوؤں کو ساڑی میں جذب کرتی ہوئی باہر نکلنے لگیں

کہہ سکیں گے۔ میں شام کو اپنے گھر گیا۔ اور رات گئے دواخانا لوٹا۔ ساری فضا پر موت کا سناٹا تھا۔ کبھی کبھی کسی کی چیخ اور کراہ اس سکوت توڑتے ہوئے نکل جاتی۔ اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں اس کے وارڈ کے قریب گیا مجھے اندر کسی کے بالوں کی آواز سنائی دی میں ٹھٹکا اور باہر ہی رک گیا۔ دبی دبی ہچکیوں میں مس سلیما کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مس سلیما کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ انور پر جھکی درد بھرے لہجے میں کچھ کہہ رہی تھیں میں نے ان کی گفتگو پر اپنے کان لگا دیے۔ وہ ایک بات سے انور کے بالوں میں کنگی کر رہی تھیں اور ان کا دوسرا ہاتھ انور کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔ ان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

انور بیٹے مجھے دیکھا ایک مرتبا دیکھ بیٹے کی آنکھ سے دیکھا محبت بھری نظروں سے دیکھ۔ ایک مرتبا کہدے صرف ایک مرتبا پکارا ماں! ایک وقت صرف ایک وقت۔ دیکھ تیری ماں تیرے سامنے کھڑی ہے بچے سے التجا کر رہی ہے۔ ایک وقت ماں کو ماں کہدے۔ بس میری زندگی کے حاصل میری زندگی کا اور مامتا کہہ رہی ہوں کہ میں تیری ماں ہوں مجھے آج تک کے رہا سماج کا ڈر تھا میں تجھے بیٹا نہیں کہہ سکتی تھی تو مجھے ماں نہیں پکار سکتا تھا میں صاف کہتی کہ تو میرا بیٹا ہے تو میرے جسم کا حصہ ہے۔ ستر سال گذر گئے میں نے تجھے جنم دیا لیکن پالا نہیں، پوسا نہیں دیکھا نہیں لیکن میری آنکھیں تجھ ہی پر رہیں۔ میرا خیال تجھ ہی میں رہا میرے سینے کے ٹکڑے واپس عاصی دیکھنے پر مجبور تھی۔ تیری خاطر۔ تیری خاطر اس بدنامی سے بچنے کے لیے جس میں میرا اور تیرا دامن الجھا ہوا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی دلہن اور تو بن باپ کا بیٹا تیرا باپ جانے وہ کہاں ہے۔ لیکن تو تو میرے پاس ہے۔ میری محبت کی یادگار۔ میرے محبوب کی نشانی۔ ایک بار صرف ایک [illegible] ماں کہہ دے۔

[illegible] ہوتی جا رہی تھی صورت حال پر وہ [illegible] سامنے تھی اب مزید خاموش رہنا گویا اس راز کو افشا کرنا تھا جو ستر سال سے ان کے سینے میں دفن تھا

Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN.)
30 JUL 19

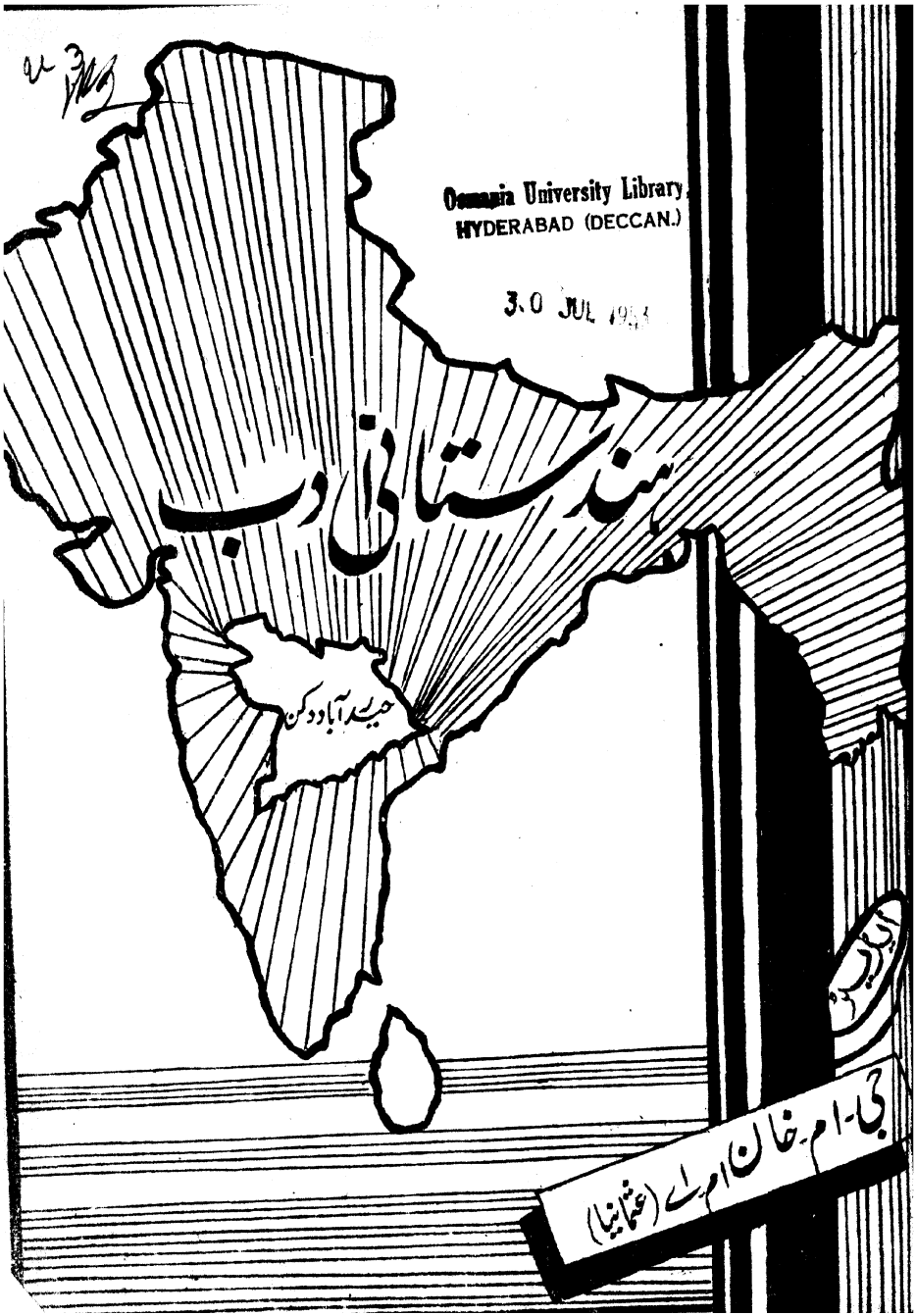

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹ اے۔ اعظم پورہ شرقی۔ پی۔ او جوبلی حیدرآباد دکن ۲

حکومت، پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سکہ ری طور پر خرید جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

قیمت ایک پے پاآنے

جلد (۱۳) نمبر (۹)

امرداد ۱۳۶۲ف جون ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	پیدائشیت	عصمت آرا عصمت	۱۵
حقایق و معارف	افقر موہانی وارثی	۳	قطعات انقلاب	نکہت صدیقی اونادی	۱۸
پیمان وفا	مقتدا فاروقی ریشہ اامیٹھوی	۴	اذاں	ایاز عصمی	۱۸
حجاج بن یوسف	ڈاکٹر میر سیادت علی خان	۵	انسانی جسم کی نشو و نما کے لیے پروٹین	ا۔ ا	۱۹
گورکی دارالعلوم ادب	ولی دین	۹	بنگوچی کے انکی کا راز	ظفر عالمگیر بی۔ اے	۲۱
لائبریری آف کانگریس	یوسیس	۱۱	اجنبی دلیس	قمرالدین قمر	۲۵
قیامت	جوہر عرفانی	۱۳	آذربائیجان یونیورسٹی کی زندگی اور تعلیم	محمد علی	۲۸
سکوین الزبتھ	ب۔ ل	۱۴	شوکیس	ایاز عصمی	۳۰

تبصرے "ا" ۳۲

ہمارے خیالات

ہندی کی حیثیت بھی ایک صوبائی بھاشا کی ہے

حال ہی میں پونا میں ہندستانی بھاشاؤں کی ترقی کی کانفرنس ہوئی۔ پونا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ام۔ آر جیکار نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔ یہ کانفرنس پونا یونیورسٹی کی طرف سے کی گئی تھی۔ ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں، اکاڈیمیوں، علمی ادبی اور ثقافتی اداروں کے نمائندوں نے اس میں شرکت کی تھی۔

اس کانفرنس کے کئی ایک شعبے قرار دیے گئے تھے جن میں سے ایک شعبہ "ہندی ہندستان کی قومی زبان" سے متعلق تھا۔ اس شعبے کی صدارت مشہور ماہر تعلیم اور لسانیات ام۔ وینکٹیش آئینگار نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے کی ابتدا ہی میں آئینگار نے کہا کہ "آئندہ سے ہندی مرکزی یا حکومت کی بھاشا کہلوائی جانی چاہیے۔ ہندی کو قومی بھاشا کا نام دینا ایک بھاری غلطی ہے اس لیے کہ ہندستان کے طول و عرض میں جتنی بھی دوسری بھاشائیں بولی جاتی ہیں وہ بجائے خود اپنی اپنی جگہ قومی بھاشائیں کہلوائی جا سکتی ہیں۔"

آگے چل کر آئینگار نے کہا کہ "ہندی کے بارے میں جہاں اور غلط فہمیاں ہیں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ ہندی کو غلط طریقے پر قومی بھاشا کا جو نام دیدیا گیا ہے اس سے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دوسری بھاشاؤں پر ہندی کو کوئی بڑی فوقیت حاصل ہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے اس لیے کہ ہر صوبائی بھاشا اپنی حد تک وہی اہمیت رکھتی ہے جو مرکز میں ہندی کو حاصل ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ "ہندستان کی جتنی بھی زندہ بھاشائیں قومی بھاشائیں کہلوائی جاتی ہیں اسی طرح ہندی بھی ایک قومی یا دوسرے معنی میں صوبائی بھاشا ہے خصوصاً اس بارے میں جتنا کو بڑا ہی دھوکا ہے۔ لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھا گیا ہے کہ ہندی کی حیثیت ان صوبائی بھاشاؤں سے بہت ہی کچھ بڑی چڑی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قومی مقاد زیادہ تر اسی میں نظر آتا ہے کہ جہاں تک جلد ہو سکے اس غلط فہمی کو عام لوگوں کے دل و دماغ سے دور کر دیا جائے۔"

ہندی کی مقامی حیثیت کو بتاتے ہوئے آئینگار نے بیان کیا کہ "ہر صوبائی بھاشا اپنے اپنے صوبے کی حد تک استعمال ہوگی اور ہندی مرکز اور ان صوبوں میں ربط قایم رکھنے کا ایک ذریعہ بنے گی۔ اس سے زیادہ ہندی کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوگی۔"

آئینگار جیسے ماہر لسانیات کے اس کھلے بیان کی روشنی میں ہندی کی قومی حیثیت کا بھانڈا بری طرح سے پھوٹ گیا۔ اس سے پہلے کئی بار ہم نے اس موضوع پر لکھا تھا۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندی کو زبردستی بھی دوسروں پر لادنے اور ٹھونسنے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔ ہندی کو جبراً طور پر حکومت کی بھاشا بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن کل ہندستان کی قومی بھاشا نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ ہمارے اس اعتراض کی تائید میں ہم نے بعض غیر ہندی دانوں کے بیانات اور اختلافی نوٹ پیش کیے تھے۔ اور انہیں کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ یو۔ پی۔ ام۔ پی۔ ام۔ بی بہار اور راجستان کے سوا ہندستان کا کوئی بھی صوبا ہندی کی قومی بھاشا ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آئینگار کے نام سے ظاہر ہے کہ ان کا تعلق مدراس شریف سے ہوگا مدراس ہو یا آندھرا، مہاراشٹر ہو یا گجرات، پنجاب ہو یا کشمیر۔ بنگال ہو یا اڑیسہ اور آسام۔ ان صوبوں میں سے ایک بھی صوبا ہندی کی قومی حیثیت اور برتری کو دل سے ماننے یا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

آئینگار کے اس ٹونکے کی چوٹ اعلان اور اعتراض کے بعد دیکھیں کہ مرکزی حکومت یا ہندی کے مجنوں پریمی سیٹھ گوبند اس جیسے افراد یا ہندی پرچار سبھائیں کیا کہتی اور کیا کر دکھاتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آئینگار جیسے سمجھدار لوگوں کے سنجیدہ بیانات پر دھیان دیتے ہوئے حکومت اپنے غلط فیصلے پر پھر سے غور کرے گی۔

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

آنا نظر ہے جلوۂ جاناں لیے ہوئے
ہر بت کدہ ہے کعبۂ ایماں لیے ہوئے

چھپتے ہیں خاک کو چۂ جاناں لیے ہوئے
یا کل متاع عالم امکاں لیے ہوئے

قیدیت عشق کا ساماں لیے ہوئے
زنداں سے جا رہا ہوں بزنداں لیے ہوئے

یہ بھی ہے اک تصرف عکس جمال یار
دل ہے ہزار ذرۂ رقصاں لیے ہوئے

لذت سی مل رہی ہے مجھے اضطراب میں
خود درد دل ہے درد کا درماں لیے ہوئے

ہستی کا رنگ بھی ہو مکان حیات میں
لیکن نقوش گور غریباں لیے ہوئے

درد دل شکستہ ذرا اور اضطراب
دنیا سے جاؤں کیوں غم دوراں لیے ہوئے

ذوق مجاز عین حقیقت ہے پھر اگر
راہ طلب ہو جادۂ عرفاں لیے ہوئے

بعد فنا لحد میں اکیلے نہ جائیں گے
جائیں گے تجھکو بھی شب ہجراں لیے ہوئے

جس شاخ گلستاں پہ بنایا تھا آشیاں
بجلی گری وہ شاخ گلستاں لیے ہوئے

دنیا کی طرح ہم نے نہ پایا کہیں سکوں
پہنچے جہاں بھی عمر گریزاں لیے ہوئے

بیٹھے جو بزم میں تو ہمہ شوق و آرزو
اٹھے تو شوق و حسرت واراں لیے ہوئے

اک ہات میں ہیں دامن محشر کی دھجیاں
اک ہات میں ہوں چاک گریباں لیے ہوئے

ہستی کو اپنی جلوۂ جاناں میں کر کے گم
میں پھر رہا ہوں ہستی جاناں لیے ہوئے

کس کو مجال حشر میں جو سامنا کرے
سو حشر ہے نگاہ پشیماں لیے ہوئے

اے ہنسنے والے چاک گریباں کے ہوشیار
تو بھی پھرے نہ چاک گریباں لیے ہوئے

افقر پہنچ ہی جاتا ہوں منزل کے جتنے پاس
ساحل سے موج اٹھتی ہے طوفاں لیے ہوئے

پیمان وفا

مقتدا فاروقی شیدا میٹھوی

نوٹ: شاعر کی یہ رومانی اور جذباتی نظم اکثر ادبی اور علمی اداروں سے مختلف انعامی تمغے حاصل کر چکی ہے جس پر شاعر کو ادارہ جام بھی خلوص دل سے مبارکباد پیش کرتا ہے۔

سلام (مہتمم ادارۂ جام)

ہے ممکن ٹھہر جائیں ساری ہوائیں
ہے ممکن زمیں پر مچے جنگ ہائیں
ہے ممکن شیاطین سر کو جھکائیں
تمہیں ہر ممکن نہیں بھول جائیں
ہے ممکن کہ ٹوٹ جائیں ستارے
ہے ممکن کہ رخ موڑ دیں تیز دھارے
ہے ممکن کہ بن جائیں ولے شرارے
تمہیں ہر ممکن نہیں بھول جائیں
بہت زور پر ہے ہوائے مخالف
ہیں دونوں سے اب اپنے سارے مخالف
"تمہیں کیا" ہیں اپنے پرائے مخالف
تمہیں ہر ممکن نہیں بھول جائیں
ملے گی ہمیں اپنے اشکوں کی قیمت
کہ دیکھیں گے اکدن بہ چشم حقیقت
تمہاری ہتیلی میں مہندی کی رنگت
تمہیں ہر ممکن نہیں بھول جائیں

تری سحر آگیں نگاہوں کی سوگند
تری صندلی گول باہنوں کی سوگند
تری زلف کی شاہراہوں کی سوگند
تمہیں ہر ممکن نہیں بھول جائیں
ہمیں اپنے دل کے چھلنے کی سوگند
حریم محبت کے دینے کی سوگند
"یہ پیماں ہے" رکھے مدینے کی سوگند
تمہیں ہر ممکن نہیں بھول جائیں
تمہیں راستے پر ہے چلنا سنبھل کے
حقیقت بنیں گے ہمارے بھی سپنے
ہمیں گو زمانا چھڑائے گا تم سے
تمہیں ہر ممکن نہیں بھول جائیں

ڈاکٹر سید عبادت علیخان

(چودھویں قسط)

حجاج بن یوسف

باب ۱۲

فتوحات (مسلسل)

۸۶ھ تا ۹۶ھ بارا سال میں بارا حملے کا یادگار دور

(مقالہ نگار نے فتوحات کے جس نقشے کا حوالہ دیا ہے افسوس کے مقالے کے ساتھ ہمیں موصول نہیں ہوا۔ آنے والی سطروں میں مختلف مقامات پر صرف نظری نقشے سے کام لیا گیا ہے۔ ایڈیٹر)

نیچے بیان کی ہوئی فتوحات کا نقشہ تیار کرنا بڑا ہی دشوار کام ثابت ہوا کیونکہ اکثر مصنفوں اور خصوصاً یعقوبی اور بلاذری نے تو ان فتوحات کا ذکر نہایت ہی اختصار سے کیا ہے۔ طبری ابن اثیر نے بعض حملوں میں مقامات کے نام دیے ہیں لیکن تمام حملوں کا ذکر اقدام کے ساتھ طبری ہی نے کیا ہے اور بلاذری نے اگر کہیں کہیں ذکر کیا بھی ہے تو بعض اوقات ہماری موجود اجغرافی معلومات اس کے خلاف پڑتی ہیں اور بعض صورتوں میں قیاس سے بھی ان کی تائید نہیں ہوتی۔ ہم نے موجود اجغرافی معلومات ہی سے استفادہ کیا ہے۔ ان سے مراد وہ معلومات ہیں جو THE LAND OF THE EASTERN CALIPHATE کی لسٹرینج کی باوثوق کتاب میں مذکور ہیں۔ اس کتاب میں مشہور اسلامی جغرافیا نویس اور دوسرے واقعات سے مدد لے کر نقشے دیے گئے ہیں۔ مشہور مقامات جن آمد و رفت کی عوام میں وہ بتلائی گئی ہیں۔ ان ہی نقشوں کو پیش نظر رکھ کر ہم نے اپنا نقشہ بنایا اور قتیبہ کے فتوحات کی راہ بتائی ہے

پہلا حملہ پہلے حملے میں قتیبہ کے مرو سے چل کر وبالراذ اور وہاں سے طالقان جانے کا ذکر ہے۔ طالقان اسے بلخ جانا بھی مذکور ہے لیکن طالقان سے بلخ ایک دو رستے تھے ایک رستا طالقان سے فاریاب اور شوبرقان ہوتا ہوا بلخ جاتا تھا دوسرا طالقان سے میمنہ اور انبر ہوتا ہوا بلخ جاتا تھا ان دونوں مورخوں میں سے کسی مورخ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ قتیبہ نے کون سا رستا اختیار کیا تھا۔ چونکہ فاریاب کا بادشاہ ابھی غیر مفتوح تھا۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ قتیبہ نے دوسرا رستا اختیار کیا ہوگا۔ بلخ سے ترمذ تک ایک ہی رستا تھا ترمذ سے جیحون کو عبور کرنے کے بعد شومان تک پھر دو رستے تھے لیکن چونکہ صغانیان کے بادشاہ نے قتیبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر شومان کے بادشاہ کے خلاف مدد چاہی تھی۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ قتیبہ ترمذ سے دابرنج DABZUHJ ہوتے ہوئے شومان پہنچا ہو۔ یہاں کے بادشاہ غیلشان کے مغلوب فریق کی حیثیت سے صلح کرنے کی غرض سے قتیبہ کے پاس واپس آیا ہو۔ اور اپنے بھائی صالح کو پیچھے چھوڑ رکھا ہو۔ تمام مؤرخوں نے جزیرہ بلاذری اور طبری جیسے بلند پایا مورخ بھی شامل ہیں۔ لکھا ہے کہ صالح نے شومان سے پیش قدمی کر کے فرغانا کے دو ملک کاشان اور شت فتح کیے یہ جغرافیا سے اقتضائی کی انتہا ہے کیونکہ طالقان کاشان اور شت میں اگر سیدھی لکیر کھینچی جائے تو ہزار ۱ میل کا

سافت تھی اور یہ کہ بیچ میں BATAM نامی بڑے بڑے پہاڑ جن حایل تھے نیز ملک کی زرخیزی کی وجہ سے گھنے جنگل بھی رستے میں موجود تھے پس اگر نواح نے یہ سب دیکھ کر، شوار گذار اور سستا اختیار نہ کیا ہو تو پھر وہ شومان سے ہوکر ترمذ یہاں سے سمرقند جھنڈہ اور اشبیکت ہوتا ہوا گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام ممالک سغد اور دوسرے دشمن قبیلوں کے تھے۔

دوسرے یہ کہ چکچ بھی بلا میدان ہزار ہا میل کا تھا اس نواح سے علاما بلاذری جیسے بلند پایا مورخ کے بیان کے باوجود ہم صالح کی فتوحات کو نواح شومان تک محدود کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اس سے بھی اتفاق نہیں کرتے کہ صالح نے فرغانہ تک پیش قدمی کی اور کاشان اور شت کو فتح کیا تھا مشہور مورخ کب کی بھی یہی تحقیق ہے۔

دوسرا حملہ: دوسرے حملے کا رستا طبری نے اس طرح پر قرار دیا ہے کہ قتیبہ مرو سے نکل کر مرو الروذ آیا اور یہاں سے آمل گیا۔ آمل سے چل کر نواح جون کو عبور کیا، وہ آگے بڑھ سکتا کا محاصرہ کیا۔ نقشے میں بھی یہی راہ دکھائی گئی ہے قتیبہ کے بیان میں ایک نقص رہ گیا ہے وہ یہ کہ مرو سے آمل تک سیدھی راہ تھی۔ پھر قتیبہ نے مرو الروذ تک جا کر کیوں غیر ضروری چکر لگایا۔

تیسرا حملہ: نوشکت و اشفہ پر تیسرا حملہ شہ میں کیا گیا نوشکت کے متعلق طبری کی ایک عبارت سے ضمنی طور پر پتا چلتا ہے کہ وہ نواح بخارہ میں تھا۔ یاقوت لکھتا ہے کہ نوشکت بخارہ ہی کا پرانا نام تھا۔ راشفہ کا پتا نقشے سے نہیں چلتا مگر ہو سکتا ہے کہ جو مقام بھی نواح بخارہ ہی میں ہو۔ حملوں کے ذکر میں ہم نے بیان کیا کہ قتیبہ اس سال بخارہ کو فتح نہ کر سکا نہ کش و نسف وغیرا کی متحدا نواج سے جنگ کی بلکہ ان کو چھا چھڑا کر، ویلیہ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں لڑ کر یا بالمدید سے ہوتے ہوئے ترمذ اور وہاں سے بلخ واپس ہو گیا۔ پس اس حملے کا رستا یہ ہوگا۔

مرو۔ آمل۔ ذم۔ نوشکت اور اشفہ (نواح بخارا)

باب الحدید۔ ترمذ۔ بلخ۔ بلخ کے بعد رستے کو نقشے میں دکھلانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پہلے تو رستا صاف تھا اور ملک بھی اپنا تھا۔

چوتھا حملہ: طبری اور ابن اثیر نے لکھا ہے کہ مرو سے نکل کر ذم آیا چونکہ اس سے پہلے تیسرے حملے میں براہ آمل ذم گیا تھا اور یہی شاہراہ تھی۔ اس لیے چاہتا ہے کہ قتیبہ غالباً براہ عامل ذم گیا ہوگا۔ ذم سے جب اس نے جیحون کو عبور کیا تو اہل کش و نسف اور صغد کی متحدا افواج نے روکا کہا جاتا ہے کہ قتیبہ بخارا تک بڑھنے میں کامیاب ہوا۔ رستے کے مقامات کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن چونکہ میدانی علاقہ تھا اس لیے کسی بھی طرف سے گیا ہوگا۔ بہ قول طبری و ابن اثیر بخارہ کے قریب دردان شاہ نے مقابلہ کیا قتیبہ غالب نہ آ سکا اس لیے واپس ہو گیا اور بقول یعقوبی بے جنگ کے صلح کی اور مرو واپس ہوا۔

پانچواں حملہ: اس حملے کے رستے کا کسی بھی کتاب میں ذکر نہیں غالباً اگلے سال ہی کا رستا اختیار کیا۔ سو گا بخارہ اس حملے میں فتح ہوا۔ عام رستے سے واپسی عمل میں آئی۔

چھٹا حملہ: اس حملے میں جو نیزک اور دوسرے باغی ممالک کی فتح کے لیے کیا گیا تھا قتیبہ مرو سے مرو الروذ — طالقان — فاریاب — جوزجان — بلخ گیا۔ ہر جگہ بلا کسی دشواری کے بغاوت فرو ہو گئی۔ پھر بلخ سے توچ کیا اور "شعب فلم" کا معرکہ کیا۔ ابن اسٹریچ نے ایک مقام خلم کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے مشہور و محفوظ قلعا ہونے کا کوئی ذکر نہیں کر چونکہ ادب و سمنجان خلم سے بھی قریب ہیں۔ اور یہ تمام نادر میں مسلم ہے کہ شعب خلم مع ادب و سمنجان کے ملحق رستاق ہی میں تھا۔ اس لحاظ سے خلم کو شعب علم سمجھنے میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی شعب علم کے محفوظ مقام ہونے سے قتیبہ کو اس کی فتح میں دقت پیش آئی لیکن سمنجان و روب کے خان نے بلخ سرفرازی کے وعدوں پر شعب خلم فتح کرا دیا۔ نیزک بچ کر نکل گیا۔ ابن اثیر میں اس کے بچ کر نکل جانے کی جگہ کو فرغانا لکھا ہے اس کے الفاظ میں "تقطع وادی الفرغانا" طبری میں بھی "حتی قطع

وادی الفرغانہ" یعنی فاروی فرغانہ سے بھی آگے جانے کا ذکر ہے لیکن حاشیے میں " OPON " کے الفاظ ہیں جس کے معنی غالب یہ ہیں کہ ایک وسیع علاقہ۔ یہ معنی اصل نسخے میں مجذوب ہیں یا اگر ان الفاظ کو صحیح مانا جائے کہ تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ نیزک نے جیحون کو عبور کیا، اور پھر ہزار ہا میل کی مسافت طے کر کے نامعروف رستوں سے فرغانہ پہنچا۔ لیکن جیسا کہ پہلے حملے کی تحقیق میں بتلایا گیا ہے یہ رستہ دشوار گذار ہے۔ اور مسافت آہنگ ہے۔ اس سے گذرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ نیزک کے فرغانہ جانے کی روایت ماننے میں ایک دشواری اور بھی ہے وہ یہ کہ طبری میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے مال و عیال کو کابل شاہ کے پاس معاہد بھیجا یا تھا۔ اگر کابل شاہ سے مراد کابل کا بادشاہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہی مراد ہے تو کابل جیحوں سے نیچے جانب جنوب ہے پس یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ نیزک نے اپنے مال کو جنوب میں ایک بڑے ہی دور کے ملک میں بھیجا اور خود شمال میں ہزار ہا میل کے غیر معروف رستے سے فرغانہ گیا۔ نیز طبری و ابن اثیر کا بیان ہے کہ نیزک نے کرز کے ایک محفوظ قلعے میں پناہ لی۔ اس مقام کا پتا نہیں چلتا لیکن ان مورخوں نے کرز سے قریب دوسرا جو مقام اسکیمشت بتایا ہے گو اس کا بھی ٹھیک پتا نہیں چلتا۔ لیکن لی اسٹرینج کے مطابق (۳۵۰) سے اس کا ضرور پتا چلتا ہے کہ اسکیمشت کابل کے قریب تھا اور یہ ایک ضلع کا نام تھا۔ اس کو ہم کابل کے قریب اس لیے سمجھتے ہیں کہ مصنف مذکور نے کابل کے بنجارہ (BANJARA) کی چاندی کی کانوں کے بعد اس کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کانوں کے دریائے کابل کے مشرق ماخذوں کے قریب ہونے کا علم ہے۔ پس اس طرح پر اگر اسکیمشت کو کابل کے قریب ایک مقام مانا جائے تو یہ قول طبری کہ نیزک اس سے روفرسخ پر تھا اور یہیں قتیبہ کے بھائی نے نیزک کا محاصرہ کیا تھا۔ پس ہماری اس تحقیق سے نہ دریائے جیحون کو عبور کرنے اور ہزار میل کے غیر معروف رستے کو اختیار کرنے کو تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی دشواری باقی رہتی ہے اور قتیبہ کے پہلے حملے کی کی سرحد صاف ہو جاتی ہے۔

(نقشہ ملاحظہ ہو:۔ مرو۔ مرو الروذ۔ طالقان۔ فاریاب، جوزجان۔ بلخ۔ حلم۔ سمنجان و روب۔ اسکیمشت وکرز (کابل)

ساتواں حملہ: اس حملے کی طبری و ابن اثیر کی مدد سے آسانی کے ساتھ یہ بتائی جا سکتی ہے کہ مرو، بلخ، تخارستان، باب الحدید، کش و نسف و فریاب، بخارا، سمرقند، مرو، بخارا، واپس آنے پر قتیبہ بخارا میں رہا اور اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو سمرقند بھیج کر طرخون سے خراج وصول کرایا جس کا معاہدہ بخارا کی فتح کے وقت ہوا تھا۔

آٹھواں حملہ ۹۲ھ: سجستان پر اس حملے کا ذکر طبری اور ابن اثیر نے نہایت مختصر طور پر فتوحات کے سوا دوسرے فتوحاتوں میں کیا ہے اور صرف اتنا لکھا ہے کہ سجستان پر حملا کیا رتبیل نے صلح چاہی۔ قتیبہ نے مناسب سمجھ کر صلح کی اور واپس ہوا لیکن البقوبی نے اس حملے کو تفصیل سے لکھا ہے۔

حجاج کے حکم سے ۹۲ھ میں قتیبہ نے رتبیل اعظم پر حملا کیا اور زالق تک پہنچ گیا۔ زالق کا پتا کسی نقشے سے نہیں چلتا لیکن لی۔ اسٹرینج نے نقشہ (۳۴۴) پر زالق کو سجستان کے پایہ تخت زرنج سے دو فرسخ پر بتایا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شہر پچھلے زمانے میں تباہ ہو گیا۔ اور اب اس کا نام و نشان بھی نہیں اب سوال یہ ہے کہ وہ زالق تک کس رستے سے گیا ہوگا۔ چونکہ یہ ممالک یعنی ہرات اور اس کے ماتحت کے علاقے جو سجستان کے مشرقی علاقے ہیں یقول بلاذری ۴۱ھ میں فتح ہو گئے تھے قیاس چاہتا ہے کہ قتیبہ نے وہی رستہ اختیار کیا ہوگا جو شاہراہ تھی۔ اسی بنا پر ہم نے آٹھویں حملے کا رستہ یہ قرار دیا ہے:۔

مرو۔ مرو الروذ۔ بلخ شہر۔ ہرات۔ اسفزار ( ) فاراح FARAH کرکویہ زالق۔

نواں حملہ: اس میں خوارزم اور سمرقند جیسے دور دراز اور اہم ممالک ایک وقت میں فتح کیے گئے۔ مرو سے خوارزم تک جانے جیحون کو عبور کرنا نہیں پڑتا۔ قتیبہ مرو سے نکل کر

ہزار اسپ ایا یہاں خوارزم شاہ کے بھائی خام جرو شکست دی اور اس کے بعد خوارزم شاہ سے مدینۃ الفیل میں جو جیحون کے اس جانب تھا۔ ملاقات کی۔

مدینۃ الفیل کا مقام بقول بی اسٹرینج بہت ذیادہ غیر یقینی ہے۔ قتیبہ کی فتح کے وقت اس کا جیحون کے اس جانب ہونا ثابت ہے۔ بعد میں نہ صرف یہ کہ مدینۃ الفیل جس کو فتح قتیبہ کے مفتوحہ کا نام دیا گیا۔ باقی نہ رہا۔ اور اس کی جگہ جرجانیہ نے لی۔ اور اس کے بعد اور کچھ آباد ہوا۔ بلکہ حد دریائے جیحون نے ایسے رستے بدلے ہیں کہ پتا نہیں چلتا کہ ہزار اسپ سے جرجانیہ اور کچھ اتنے بھی دور ہیں جتنے سترویں صدی کے نقشے سے ظاہر ہوتے ہیں یہ جیحون کا جو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری یا سترویں اور چودویں صدی عیسوی میں رستا تھا وہ نقشے میں ظاہر کیا گیا ہے۔

بہر حال ہزار اسپ سے خام جرد کی جگہ گرفتاری کے بعد قتیبہ نے جیحون کو عبور کر کے خوارزم شاہ سے ملاقات کی۔ اور اس کی اطاعت قبول کر کے اس کو بادشاہ چھوڑا۔ اور ہزار اسپ واپس ہوا یہاں محمد بن المزاحم الہلالی کی رائے سے کیاک سمرقند پر حملا کرنے کا ارادا کیا۔ اور جیحون کو عبور کر کے پہلے بخارا پر بخی سے بڑھ کر قتیبہ نے سمرقند کا محاصرا کر لیا۔ نقشے سے یہ مقامات ظاہر ہوں گے۔

دسواں حملا ۹۴ھ۔ قتیبہ مرو سے سمرقند آیا غالبًا براہ آمل و بخارہ آیا یہاں مفتوحاتوں کو اور ایرانیوں کی فوجیں جمع کیں۔ ان کو شاش فتح کر نے جیسا شاش سیحون پر واقع تھا۔ اور خدفرغانہ کے مشہور شہر خجندہ پر حملا کیا اور دو لڑائیاں جیتیں۔ جیسے سے اس کو ترکوں کا وہ لشکر ملا جس کو اس نے شاش کی فتح پر معمور کیا تھا۔ قتیبہ کے اس کے بعد جیش قدمی کی اور فرغانہ کے پائے تخت کاشان کو جو جیحون کے اس پار تھا۔ فتح کیا اور مرو واپس ہوا۔

گیارواں حملا:۔ حجاج نے عراقی سے لشکر بھیجا تھا اس کو اور فتو حاتر کوں کے لشکر کو بے کر شاش تک جو سیحون کے اس پار تھا۔ (پہنچا تھا کہ حجاج بن یوسف کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی۔ قتیبہ سخت رنج کی حالت میں مرو واپس ہوا اگر یہ واقعانہ ہوتا تو معلوم نہیں قتیبہ کہاں تک پیش قدمی کرتا۔

بارواں حملا ۹۶ھ: قتیبہ مرو سے سمرقند آیا اور یہاں سے چین کے ممالک کی فتح کے منصوبے باندھے لیکن افسوس کہ حجاج کی وفات سے اب قتیبہ کی فوج میں وہ ڈسپلن باقی نہیں رہا تھا۔ قبایلی عناد تازا ہونے لگا۔ بہت ہی مفتوحات حاصل ہو چکی تھیں۔ عرب آرام چاہنے لگے مال بہت مل چکا تھا کوشش اور جہاد سے جی سیر ہے غرض یہ کہ حجاج کا دار نہ تھا۔ خلیفا ولید کا انتقال اور سلیمان کی جانشینی سے جو قتیبہ کا کھلم کھلا دشمن تھا۔ فوج کو بے موقع ہات آیا۔ فوج سے قتیبہ کو امید تھی کہ وہ اس کا ساتھ دیگی بالکل برعکس قتیبہ نے زبان نہ رو کی۔ سنگدل سپاہیوں نے اس عظیم الشان اور بے مثال فاتح کا خاتمہ کر دیا کیا یہ پھر حجاج کے پہلے کے زمانے کی روایتوں تازا ہونا نہیں کہا جا سکتا۔ حجاج ہر صورت، با غلطت بے مثال و بے نظیر حجاج کی قدر خلافت اور مسلمانوں کو اب ہوئی ہوگی ــــ

کرنول کے تاجدار
ایک انگریزی دستاویز کا ترجما
جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"
نے نہایت سلیس اور آسان زبان میں کیا ہے
کتابی سائز ۶۴ صفحے ۱۳ کے اسٹامپ بھیجکر نیچے کے پتے
سے منگوایے
سکریٹری انجمن ترقی ہندستانی "۹۹ اے اعظم پورا شرقی۔
حیدرآباد دکن

ولی دین

گورکی دارالعلوم ادب

ماسکو کی ایک قدیم خوب صورت عمارت کے احاطے میں عظیم روسی ادیب الیکزینڈر ہرتزین کی شبیہ ابھری ہوئی ہے گورکی دارالعلوم ادب آج کل اسی عمارت میں ہے۔ ہرتزین یہیں پیدا ہوا تھا۔

اپنے خاص مقاصد اور طلبا کی نوعیت کے بھی اعتبار سے یہ ادارہ انمایاں حیثیت رکھتا ہے یہاں نوخیز سوویت ادیب تربیت پاتے ہیں۔

آج کل کے بہت سے مشہور سوویت ادیب پہلے الحی العلوم ادب کے طلبا تھے۔ طالب علم کو انسان دوستی کا سبق دینے اسے ہر لحاظ سے تعلیم یافتہ مخلص بنانے کے ساتھ ہی یہ ادارہ نوخیز ادیب کو اپنی صلاحیتوں کے نشو و نما دینے میں مدد دیتا ہے اور اس میں کام کرنے کی وہ عادتیں پیدا کرتا ہے جو ایک ادیب کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ عام علمی نصاب کے علاوہ اس ادارے کا ایک شعبہ تخلیقی کام کے لیے بھی مخصوص ہے اس شعبے کی مختلف جماعتوں کو تعلیم دینے کا کام تجربے کار مصنف شاعر، ڈراما نویس اور تنقید نگار انجام دیتے ہیں۔

سوویت یونین کی سولہ وفاقی جمہوریوں سے ہر سال نوآموز ادیب اس ادارے میں تربیت حاصل کرنے آتے ہیں۔ دنیا بھر میں اپنی طرز کے اس واحد تعلیمی ادارے میں آپ کو سوویت دیس میں بسنے والی تمام قوموں کے لوگ ملیں گے مشہور اور معروف ادیبوں کی دائمی یادگار کے طور پر سوویت یونین کے تعلیمی ادارے ان کے نام کے وظیفے جاری کرتے ہیں۔ دارالعلوم ادب بھی انہیں میں شامل ہے۔ نسبت ممتاز طلبا کو کلاسکی ادیبوں گریبی لوف، گریبی ایدوف، پشکن لرمانتوف، گوگول لینکو، گرشتانی قوم کے گویا شار جیسوں

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

"سوویت یونین کا ہیرو" کا اعزازی تمغا حاصل کرنے والا لڑاکا ہوائی جہاز کا ہوا باز جس نے علمی ادارے میں اپنی ادبی صلاحیتوں کو مکمل کر دکھایا ہے۔ جنگ کے دوران میں اس کے لکھے ہوئے مضمون اور خاکے اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوتے رہے اور یہ ایک نوجوان اور ذہین ادیب لکھنو بینیاکا ہے۔ تمام قومیتوں کے ہر طرح کے فنون کے خصوصی ماہر ہیں۔ یہ لوگ اور زندگی کا کافی تجربہ رکھتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ سوویت دیس کی قوموں کی دوستی اور باہمی میل ملاپ کتنا ٹھوس ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ہر قسم کی صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے وسیع ترین امکانات ہیں۔ سوویت دیس میں تخلیقی کوشش کی اتنی توجہ اور پیار کے ساتھ پرورش کیجاتی ہے

تخلیقی کام کے شعبے کی جماعتوں کا یہ دستور ہے کہ ہر سال تربیت کے دوران میں طلبا اپنی تصنیفات پڑھ کر سناتے ہیں اجتماعی تنقید انہیں ترقی اور اصلاح کرنے میں مدد دیتی ہے طلبا کو پیچیدہ ادبی مسایل درپیش ہوتے ہیں۔ یہ ان مطالبات کی صورت میں ان کے سامنے آتے ہیں جو عوام ادیبوں سے کرتے ہیں۔ دارالعلوم ادب سے سند یافتہ ادیب اپنی آیندہ کی سرگرمیوں کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

میرے پاس ڈاک سے اکثر کتابیں رسالے وغیرہ آتے رہتے ہیں کھول کر دیکھتا ہوں تو کل کے اس طالب علم کی پہلی کتاب ملتی ہے۔ جسے میں نے پڑھایا تھا۔ نوجوان ادیب م۔ روسکوف نے اپنی کتاب بھیجی ہے جو دانگارا دان نہر کے متعلق ہے۔ تاتاری ادیب ب۔ یعقوف نے ایک ورتاتاری ادیب صفی بن صابر کی کتاب "چار دریاؤں پر" کا انبار روسی ترجمہ بھیجا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی کتابیں ایوسیف ویک کی تصنیف کی ہوئی ہیں۔ اس نوجوان ادیب نے ابھی سے کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔

ان تمام مصنفوں نے دارالعلوم ادب میں تعلیم پائی ہے اور سب کے سب ادیب بن گئے ہیں۔

جب دارالعلوم کے ہال میں سند کے لیے امتحان دینے والے طلبا اپنی تصنیف پڑھ کر سناتے ہیں تو میں بیٹھا پشکن لرمنتوف لیو ٹالسطائی چیخوف اور گورکی کی تصویروں کو دیکھا کرتا ہوں۔ جو ہال کی دیواروں پر لگی ہوئی ہیں۔ اور سوچتا ہوں کہ سوویت ادیبوں کی نئی پود ان کے عظیم مقصد کی تکمیل کر رہی ہے۔ ہمارے کلاسکی ادب کے بیج سوویت دیس میں پنپے، بڑھے اور اب پھل دے رہے ہیں۔ اور روسی ادیب الیگزینڈر ہر تزین کی بہترین یادگار یہی ہے جو اس کے نام سے موسوم ہے اسی طرح یہ بھی قدرتی بات ہے کہ یہ دارالعلوم گورکی کے نام سے موسوم ہے جنہوں نے بہت سے ادیبوں کی ہرتزین کے اس مکان کے باغ میں جہاں دارالعلوم ادب واقع ہے صدیوں پرانے درخت ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ یہ درخت لاتعداد نوجوانوں کے وہ دور بھی دیکھ چکے ہیں۔ جبکہ زار شاہی روس کی بہت سی قوموں کے لوگ اپنی ماوری زبان میں لکھنا اور کتابیں تصنیف کرنا تو الگ رہا لکھنا پڑھنا تک بھی نہ جانتے ہوں گے کیونکہ ان کی تحریری زبان کا وجود ہی نہ تھا۔

آج سوویت دیس کی تمام قوموں کا اتنا ادیب ہے جو سال ہر سال ترقی کر رہا ہے۔ ہر قوم کے اپنے ادیب ہیں جن میں سے بہتوں نے گورکی دارالعلوم ادب میں تعلیم حاصل کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔

ایک سوویت ادیب کی حیثیت سے مجھے یہ دیکھ کر حقیقی مسرت ہوتی ہے کہ دارالعلوم ادب سوویت دیس میں بسنے والی قوموں کے میل ملاپ کا نمونا ہے۔ ہر قوم کے ادب کی ترقی کا نمونا ہے چاہے وہ قوم کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔

ہندستانی زبان اور ادب کی بہبود ہر ہندستانی پر فرض ہے۔

لائبریری آف کانگریس

یو ایس

امریکا کا بے نظیر اور عظیم کتب خانا

آج سے چند مہینے پہلے نیشنل لائبریری آف کلکتا کا یہ حال آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ آج امریکا کی بے نظیر اور عظیم ترین لائبریری کا حال درج کیا جاتا ہے جو یقیناً دل چسپیوں سے پڑھا جائے گا۔ دنیا میں کتب خانوں کی ضرورت جس قدر آج ہے شاید ہی پہلے کبھی رہی ہوگی آج ہر موضوع پر ریسرچ اور تحقیق ہو رہی ہے اور اس کے لیے کتب خانے نہایت ضروری ہیں۔ ہندستان میں بھی لائبریری تحریک زور پکڑ رہی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ آیندہ کچھ وقت میں ہندستان بھی دنیا کے عظیم ترین کتب خانوں کا مالک ہو سکے گا۔

ایشیا سے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ برس پہلے ہاتی کی قسم کا ایک جانور میاٹوڈن (MIAIVIASTODAN) منتقل ہوا تھا اگر آپ اس کے یا ہیٹی ٹو (HITITO) تہذیب (۱۲۰۰ - ۱۶۰۰ ق - م) یا چنگیز خاں کے حملوں کا بھی حال جاننا چاہتے ہیں تو یہ سب کچھ آپ کو یقینی طور پر امریکا کی لائبریری آف کانگریس میں مل سکتا ہے جو آج دنیا کی سب سے بڑی لائبریریوں (کتب خانوں) میں سے ایک ہے اور جو ہر لحاظ سے بہترین طریقے پر قایم کی گئی ہے۔

آج سے ۱۵۳ برس پہلے جب اسے شروع کیا گیا تھا تو لائبریری میں بہت ہی کم تعداد میں کتابیں پائی جاتی تھیں۔ جن کی تعداد صرف ۳۰۰ تھی۔ اس آغاز کے ساتھ اب اس لائبریری میں نوے لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں ہیں اور لائبریری ہر پہلو سے بڑی وسعت پا گئی ہے۔

ان کے علاوہ اس کتب خانے میں ایک کروڑ ۱۰ لاکھ مسودے ۲۰ لاکھ نقشے، ۵۰ ہزار کے قریب مائیکرو فلموں کی ریلیں اور چھوٹے ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ ۳۰ لاکھ گراموفون ریکارڈ۔ ۲۰ لاکھ فوٹو گراف (تصویریں)، ۷ لاکھ ۵۰ ہزار پمفلٹ، مسودوں کے فوٹو۔ پوسٹر اور دوسری متفرق نوادرات پائی جاتی ہیں۔ اور اب کی ۳۵۰ میل لمبی الماریوں میں یہ سب کچھ ترتیب دیا گیا ہے۔ (یعنی اس لائبریری میں جو الماریاں ہیں اگر ان کو ایک لمبی قطار میں کھڑا کیا جائے تو یہ ڈھائی سو میل لمبی سڑک گھیر لیں گی۔ اس سے لائبریری کی وسعت کا اندازا ہو سکتا ہے)

اس لائبریری کو کتابوں اور مسودوں وغیرہ کا دنیا میں سب سے بڑا خزانا کہا جاتا ہے۔ اس میں ہوائی جہازوں موسیقی اور ہسپانک (HISPANIC) کلچر جیسے مختلف موضوعات اور مضامین پر کتابیں پائی جاتی ہیں۔

یہاں جو مجموعے اور ذخیرے پائے جاتے ہیں وہ معلومات فراہم کرنے کے لحاظ سے ایک اینسائیکلوپیڈیا جیسا درجا رکھتے ہیں اور امریکا کی سیاسیات تاریخ دنیا بھر کی علمی اور ادبی سوسائیٹیوں کی مطبوعات امریکا کی سرکاری دستاویزات (مرکزی حکومت۔ ریاستوں اور میونسپل اداروں کے کاغذات) امریکا اور دوسرے ملکوں کے اخباروں کے قدیم نقشے اور اٹلس سب یہاں موجود ہیں قانون ٹیکنالوجی۔ پولیٹیکل سائنس۔ یہودیوں کے مذہب لٹریچر اور ادب مذہبیوں اور نیچرل سائنس کے متعلق بھی اس عظیم لائبریری میں وسیع کتابی مجموعے پائے جاتے ہیں۔

اعلان آزادی کے مسودات

پچھلے برس ۳۰ اپریل تک اس لائبریری کی جیفرسن

لکھے ہوئے اعلان آزادی اور امریکا کا اصلی آئین رکھنے کا شرف حاصل تھا۔ امریکی کانگریس کی مشترکہ کمیٹی کے حکم کے مطابق یہ اہم دستاویزیں محافظ خانے میں منتقل کی گئیں۔ لیکن جیفرسن کے ہاتھ کا لکھا ہوا اعلان آزادی کا پہلا مسودا ابھی اسی لائبریری میں رکھا گیا ہے۔

اس لائبریری کی تعمیر اور ترقی کے لیے بہت سے مختلف طریقے برتے گئے ہیں۔ ان میں سے نہایت اہم طریقہ کاپی رائٹ کا قانون ہے جس کے مطابق ہر ایک مطبوعہ کتاب گرد پوش فوٹو گراف موسیقی کی مطبوعات کی دو دو کاپیاں اس لائبریری میں بھیجنی پڑتی ہیں۔ امریکی حکومت کی تمام مطبوعات قانون اس لائبریری میں جمع کرنے کی پڑتی ہیں۔ اور امریکا کی اکثر ریاستوں میں بھی یہ قانون موجود ہے۔

یہ لائبریری تجارتی اداروں۔ مزدوروں کی تنظیموں شہری میونسپل اداروں (سابق فوجیوں اور بھائی چارے کی تنظیموں اور مذہبی انجمنوں سے استدعا کے ذریعے ان کا مطبوعہ لٹریچر اور کتابیں وغیرہ حاصل کرتی ہیں۔

باہمی تبادلوں کے ذریعے بھی کتابوں کے مجموعے میں اضافہ کیا جاتا ہے امریکا اور دوسرے ملکوں کے مابین جو معاہدے ہوتے ہیں ان سب کی نقلیں اور دوسری سرکاری مطبوعات کے تبادلے کے ذریعے دوسرے ملکوں کی مطبوعات بھی یہاں جمع کی جاتی ہیں۔ اسمتھ سونین انسٹی ٹیوٹ جو اپنے تبادلے کے پروگرام کے تحت ہزاروں مطبوعات حاصل کرتا ہے ان سب کو اس لائبریری میں داخل کر دیتا ہے۔

ایسے ہی مختلف ذریعوں سے اس لائبریری کو ہر سال ۶ لاکھ مطبوعات وغیرہ ملتی ہیں۔

تاہم لائبریری کے لیے کتابیں وغیرہ خریدنے کا الگ طریقہ بھی نہایت موثر طور پر جاری ہے اس مقصد کے لیے ایک سو مختلف ملکوں میں لائبریری کے ایجنٹ کتابیں جمع کرتے ہیں عطیات کے ذریعے کتابیں جمع کرنے کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔ چنانچہ سائبیریا کے شراب کشید کرنے والے ایک غیر معروف شخص مسٹر جینا ڈی اس یوڈین نے روسی ادب اور کتابوں کا ایک چیدہ اور نادر ذخیرہ تقریباً یہ اپنے نام قیمت پر دیا جسے عطیہ ہی کہا جا سکتا ہے ان کتابوں کی تعداد اسی ہزار تھی اور روسی ادب کا یہ ذخیرہ روس کے باہر کے ملکوں میں سب سے بڑا ہے۔

کانگریس کے ایک قانون کے تحت جو ۱۸۰۰ء میں منظور ہوا تھا اس لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا اور پہلے ایسے کیپٹل (سرکاری دفاتر کی عمارت) میں رکھا گیا تھا۔ لیکن ۱۸۱۴ء میں آگ لگنے سے یہ لائبریری تباہ ہو گئی۔

جیفرسن (ایک امریکی صدر) کی ذاتی شاندار لائبریری حاصل کرنے پر اس لائبریری کی دوبارہ بنیاد رکھی گئی لیکن ۱۸۵۱ء میں دوبارہ آگ لگنے سے یہ بھی خاکستر ہو گئی۔

۱۸۶۵ء میں جب امریکا کی خانہ جنگی ختم ہو گئی تو اس لائبریری میں صرف ۵۰ ہزار کتابیں تھیں بہرحال آج یہ لائبریری دنیا کو دوسب سے بڑی عمارتوں میں رکھی گئی ہے۔

مطالعے کے کمرے

خاص عمارت اور اس سے ملے ہوئے حصے میں مطالعے کے ۱۴ کمرے ہیں۔ ریسرچ کا کام کرنے والوں کے لیے ۲۰۹ میزیں۔ مطالعے کے لیے ۲۲۵ کمرے اور ایک سو الماریاں متواتر استعمال کے لیے ہیں۔

مسز الیزبتھ سپرگ کوجل نے۔ کولج آڈیٹوریم تھیٹر اور ڈراموں وغیرہ کے لیے ہال) ۱۹۲۵ء میں اس لائبریری کو بطور عطیہ دیا۔ اس میں ۵۱۱ اشخاص بیٹھ سکتے ہیں۔

مسز جرٹروڈ کلارک وٹمل نے "وٹمل فیلولین" کے نام سے ایک ہال دیا۔ اس میں تاروں پر بجنے والے ساز مثلاً (ستار، سارنگی۔ وائیولن اور اسی قسم کے دوسرے ساز بھی مسز وٹمل کا عطیہ ہیں۔

بیش قیمت اشیا

اس لائبریری کی نہایت نادر اور بے بہا چیزوں میں سے ایک گوٹنبرگ بائبل (انجیل) ہے یہ پہلی کتاب ہے جو مغربی دنیا میں چھپی تھی۔ (ان نوادرات میں کنفیڈریشن کے اصلی آرٹیکل اور گولس برگ کا خطبا اور دوسری بیسیوں دل چسپ اشیا شامل ہیں۔ اس لائبریری کے ایرکنڈیشنڈ خانوں میں دبڑا لاک نادر اور نایاب مسودے اور نسخے رکھے گئے ہیں۔

قانون اور موسیقی کے شعبے میں دنیا بھر کی لائبریریوں کے مقابلے میں یہاں مکمل ترین مجموعہ ہے۔

ہر قسم کی قانونی کتابوں کا مجموعہ تقریباً ۱۹ لاکھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ان میں تقریباً تمام زبانوں میں ہر قسم کی قانونی معلومات درج ہیں۔ کتابیں قدیم اور جدید زمانے کے قانون سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس لائبریری میں کتابوں کی توبیت اور تنظیم کا اپنا خاص طریقہ ہے۔ درجہ بندی بھی اسی طرح الگ طرح کی ہے اور درجہ بندی کے کارڈ چھاپ کر عوام میں تقسیم کیے جاتے ہیں یہ لائبریری کاپی رائیٹ کے دعوے کی رجسٹریشن بھی کرتی ہے اندھوں کے لیے بھی اس لائبریری میں کتابوں کا انتظام ہے۔ اور اس شعبے پر لائبریری نے ۵ لاکھ ڈالر کی رقم خرچ کی ہے۔

اگر آپ مصنف ہیں

اور

اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیے اس لیے کہ یہی وہ بے باک رسالہ ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ کچھ نہیں کھری کھری سنا دیتا ہے۔ تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنے چاہئیں

قیامت

جوہر عرفانی

تصور کی حسیں شہزادیاں زہر اب بخشیں گی
تخیل کی سنہری وادیاں بھی خاب بخشیں گی
اندھیرے طنز فرمائیں گے صبحوں کے مقدر پر
ہنسے گی بزدلی جی کھول کر بخت سکندر پر
حقیقت اشک سا ہے گی باطل مسکرائیگا
خدا بندے کو اور بندا خدا کو بھول جائیگا
افق سے عرش کی پھوٹے گی پھر نوری کرن جوہر
دلوں کو جو عطا فرمائے گی عرفان کے گوہر
خدی سجدا کرے گی بے خدی کے آستانے پر
خرد آنسو بہائے گی جنوں کے مسکرانے پر
ندامت بخشوا دے گی گناہوں کو خطاؤں کو
جفاؤں پر ترس کھانا ہی پڑتا ہے وفاؤں کو
فضاؤں میں اک ایسی روشنی پھر پھیل جائیگی
کہ جس کو دیکھ کر ساری خدائی جھک کا نمی
ادائے خاص سے اس دم مشیت مسکرائیگی
تو ہستی جبرئیل آشوب نغمہ گنگنائے گی
یہ انساں کی ادا بھا کر رہے گی قلب یزداں کو
ور فردوس اکرنا پڑے گا آج رضواں کو

تجلی کے لیے جو ہر سراپا طور ہو جانا
تجلی کو جو پانا ہے تو خود سے دور ہو جانا

ب۔ ۸

کوئن الزبتھ

برطانیا اور امریکا کے درمیان بحر اقیانوس میں چلنے والے بہت بڑے مسافر جہازوں کے مقابلے میں دوسرے جہاز بہت ہی چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے سامنے تو ہزار ٹن کا جہاز بھی کھلونا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کسی بڑے جہاز کی جسامت اور اس کے ساز و سامان و زیبائش کا صحیح اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس پر سوار ہو کر اس کی سیر کی جائے۔ دنیا کا سب سے بڑا جہاز کوئن الزبتھ (۸۳۶۷۳ ٹن) ۱۰۷۰ فٹ لمبا ہے اور اس کے پہلوؤں پر اس کا نام اونچائی ڈھائی فٹ اونچے حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔

اس کا ساتھی جہاز کوئن میری (۷۳۹۳۱ ٹن) بھی قریب قریب اتنا ہی بھاری لیکن عمر میں اس سے چار سال بڑا ہے۔ دونوں کی پہچان یہ ہے کہ کوئن میری کی تین چمنیاں ہیں اور کوئن الزبتھ کی دو۔ یہ جہاز کیونارڈ لائن (اسکاٹ لینڈ) میں بنے تھے اور جنگ کے دوران فوجیں لے جانے کے کام پر مامور رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں ان کی پھر سے مرمت کی گئی اور وہ مسافر لانے لے جانے لگے۔

جہاز کیا ہیں پانی میں تیرتے ہوئے شہر ہیں ان کے اپنے بجلی گھر اپنے ریڈیو و ٹیلی فون سسٹم کرے گرم رکھنے کا نظام۔ فائر سٹیشن۔ ہسپتال۔ سائیکریاں۔ دکانیں۔ رستوران۔ ناچ گھر۔ پیراکی کے تالاب حتا کہ کھیل کے میدان تک بنے ہیں۔

جب ساتھ سمپسن میں کوئن الزبتھ کو سجایا جا رہا تھا تو ہزاروں کاریگر۔ بجلی کا کام کرنے والے اور ڈزائن تیار کرنے والے مصروف کار تھے۔ برطانیا کی قریب ہر صنعت جہاز میں اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ لائبریری میں چار ہزار سے زائد کتابیں رکھی گئیں۔ ۱۰ میل لمبے تار بچھائے گئے اور ۳۵ ہزار بتیاں لگائی گئیں۔ ۶۰۰ بجلی کے گھڑیاں اور ۸۴ ٹیلیفون لگائے گئے۔

جہاز میں ریڈیو ٹیلی فون کی عجیب و غریب سروس بھی ہوتی ہے جس کی مدد سے مسافر ہر ملک کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔ جس کی ٹیلیفون سروس کا تعلق ہیں الاقوامی ایکسچینج کے ساتھ قائم ہے وہ دوسرے جہازوں پر سوار اپنے دوستوں سے بھی باتیں کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان جہازوں میں ریڈیو ٹیلیفون موجود ہوں۔

پردے اور کرسیوں وغیرہ کے گہرے اور غلاف بنانے میں ہزاروں گز خوب صورت کپڑا استعمال ہوا۔ نائی آرٹسٹوں نے اکڑی دھات، شیشے اور پلاسٹک کی اشیا تیار کر کے زینوں دروازوں۔ دیواروں، اچھتوں اور فرنیچر کو سجایا۔ فرش، فرنیچر اور دیواروں کے لیے دنیا کے مختلف ممالک کی لکڑی استعمال کی گئی۔

بڑے کمرے میں راج ماتا ملکا الزبتھ کی نہایت خوب صورت تصویر آویزاں ہے یاد رہے کہ ۱۹۳۸ء میں جہاز کو پانی میں اتارتے وقت اس کا نام رکھنے کی رسم ملکا الزبتھ ہی نے ادا کی تھی۔

رسوئی میں سب کام بجلی سے ہوتا ہے اور وہاں ہر جگہ فولاد استعمال کیا گیا ہے اس رسوئی میں ۱۵ باورچی کام کرتے ہیں۔

ان جہازوں میں ہر چیز صاف ستھری کیسے رہتی ہے؟ گو جہاز کی روزانہ صفائی کے لیے ملازم موجود ہیں۔ تاہم سالانہ صفائی مرمت کے بغیر ہر چیز کو بلا عیب رکھنا ناممکن ہوگا۔ صفائی کا کام سردیوں میں ہوتا ہے اور ۶ ماہ تک جاری رہتا ہے یہ کام دو ہزار سے زیادہ آدمی انجام دیتے ہیں۔ کوئن میری کی سالانہ صفائی پچھلے دسمبر میں ختم ہوئی اور کوئن الزبتھ کی شروع ہوئی۔

۳۵۰۰ میلوں کے سمندری سفر کا معائنہ اور مرمت کرنی ہوتی ہے جس میں ۵۴۰۰۰ برتن اور ۴۰ ہزار سے زائد سونے چاندی اور دوسری دھاتوں کے برتنوں اور چھری کانٹوں کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے۔ ہر ایک لاکھ میں ہزار کے قریب چادروں، پردوں اور غلافوں کی مرمت اور تبدیلی کا کام اشتہ ہے۔

پرائشچت

عصمت آرا عصمت

ٹن ٹن ٹن ..... گھڑی رات کے تین بجا رہی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ کوتار کی اندھیاری سڑک کو پھوار نے قدرے چمکا دیا تھا۔ میونسپلٹی کی اونگتی ہوئی لالٹین تجہیز و تکفین کا رسالہ یا کسی شاطر چور کی طرح اب تک جاگ رہی تھی۔ وہ ہلکے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا اندھیری گلی میں گھسا۔ گلی کے نکڑ والے نل پر پندرہ بیس گھڑے اوندے پڑے تھے ..... ایک قطار میں نہایت تنظیم کے ساتھ جیسے "نل دیوتا" کے سامنے گھڑے سجدے میں گرے ہوئے ہوں۔

وہ اکثر ان گھڑوں کو اسی طرح قطار اندر قطار اوندا دیکھتا۔ جنہیں صبح سویرے ایک کے بعد ایک ان کو رکھنے والے بھر لے جاتے۔

نل پر سویرے ہی سے ایک ہنگامہ مچا رہتا۔ کبھی کبھی تو لوگ آپس میں پانی حاصل کرنے کے لیے مار پیٹ کر گالی۔ گلوچ کر بیٹھتے۔ چلتے چلاتے اسے شرارت سوجھی اور اس نے سارے گھڑوں میں ایک چھڑ کے ٹکڑے سے سوراخ کر ڈالے۔

اس کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا باپ اب تک انتظار کر رہا تھا۔

"کون ہے؟"

"جی میں ہوں۔"

"کہاں تھے آدھی رات تک؟"

"مشاعرے میں چلا گیا تھا۔" وہ جھوٹ بول گیا۔

"اپنے بستر پر لیٹ کر وہ ہلکے سروں میں اپنے کلب کی نئی ممبر دنیا کے گانے کے بول دہرانے لگا۔ "کیا حسن پایا ہے دنیا نے" اس لئے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دنیا کے تصور سے لپٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح کو ہاکر کی آواز اور سائے پہنچا گیا۔ کیا غلط خبریں پھیلی ہیں یہ کم بخت بھی؟"

اس نے کراس روڈ اپنے سامنے سے ہٹا دیا۔ "اور یہ نئی زندگی تو کم بخت قطعی جھوٹا ہے ـــــ وہ بمبئی کرانیکل پڑھنے لگا باہر ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ اس نے اپنا دھیان اخبار پر سے ہٹایا۔

"بھئیو کیا ہنگامہ ہے باہر؟"

"بابو جی کسی کم بخت نے رات ان غریبوں کے سارے گھڑے پھوڑ دیے ہیں۔"

"ارے!" وہ زیر لب مسکرا اٹھا۔

آٹھ بج رہے تھے۔ نو بجے اسے کارخانا جانا تھا۔ اور پھر دوپہر کا کھانا بھی تو دنیا کے ساتھ ہی ہے فیراسٹوران میں کھانا طے ہوا تھا۔ اس خیال نے گویا اس کی رگوں میں ایک عجیب پھرتی بھر دی۔ اس نے بمبئی کرانیکل کو ہوا میں اچھال دیا اور خدا جلدی سے غسل خانے میں پہنچا غسل سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کیا "ایوننگ ان پیرس" تو گویا آج اس نے لباس پہ انڈیل لیا۔

باہر نکلا۔ تو نل کے پاس بسنتی بیٹھی رو رہی تھی بسنتی اس کے کارخانے میں کام کرنے والی ایک بیوہ اور پاکی لڑکی تھی ـــــ!

"کیا ہوا بسنتی تو کیوں رو رہی ہے؟"

"بابو جی۔ ہمارا گھڑا پھوٹ گیا۔ ماں مارے گی؟"

"کس نے پھوڑ دیا تیرا گھڑا؟" نہ جانے کیوں اسے گھڑے پھوڑنے پر افسوس ہونے لگا۔

"مالم نئی" بسنتی نے سسکیاں بھرنی شروع کر دیں۔

"اچھا چل میں تجھے گھڑے دلوں۔ نہیں مارے گی تیری ماں" وہ بسنتی کا ہاتھ پکڑے سامنے بیسیوں کی جھونپڑیوں کی طرف

چل پڑا جسے اس کے باپ نے اپنے چھوٹے سے کارخانے کے مزدوروں کے واسطے بنوایا تھا۔

"ارے رامو۔ یہ تو تھوتھنا لٹکائے ہوئے کیوں بیٹھا ہے، کیا ہوا ہے تجھے؟"

"بابو گھڑا ....."

"اوہ! تو تیرا گھڑا ابھی پھوٹ گیا؟"

"کسی حرامی نے ....."

"رامو کتنے کا تھا تیرا گھڑا؟" اس نے جلدی سے بات کاٹ دی۔

"پانچ آنے کا"

"ارے تو پانچ آنے کے گھڑے کے لیے اتنا سوگ جیسے تیرا باپ مر گیا ہے؟"

"بابو آپ پانچ آنے کی گوبت ہیں۔ ہم لوگ پانچ پیسوں کو ترستے ہیں ـــــ اب واپس دھو تو گھر جا کر دیکھ لیں گے"

"کل پیسے لیں گے اور آج ہی سے آپاس شروع ہو گئے ہیں۔"

وہ گھڑا یہ سب کچھ سنتا رہا۔ اور اپنے آپ کو کوستا رہا نہ جانے اسے کیا سوجھی جو سب کے گھڑے پھوڑ ڈالے۔

"اچھا اچھا" وہ کہہ کر بسنتی کی اکلوتی تھالی روپا کی جھونپڑی کی طرف بڑھ گیا۔

روپا کا بسنی کے برتن میں تھوڑا سا آٹا لے کر بڑی بسنتی کا انتظار کر رہی تھی کہ بسنتی پانی لے کر آئے تو آٹا گوندھ کر دو چار روٹیاں تھوپ کر چلتی بنے کارخانہ پہنچے۔

پانی لائی "کم بخت" وہ بسنتی کو خالی ہاتھ دیکھ کر چیخی۔

"تمہارا گھڑا پھوٹ گیا ہے روپا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ بسنتی سہمی ہوئی ایک کونے میں کھڑی تھی۔

"بابو جی! یوں کہو میری تقدیر پھوٹ گئی۔"

"ایسی کیا بات ہوئی؟"

"کارخانے سے پیسے کل ملیں گے گھر میں پانی رکھنے کو کوئی دوسرا برتن نہیں کام بھگتوان جانے کیسے چلے گا۔"

اس دفعہ سچ مچ اس کے جی میں آئی خوب چیخ چیخ کر رو دے وہ بغیر کچھ کہے واپس پلٹا۔ اور بسنتی کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

"کم بخت کئی دن پیچھا کہاں دیکھ کر چلا کر ..... گھڑا پھوٹ گیا اب دل ٹھنڈا ہوا نا!" اور نہ جانے کیوں وہ پھر روپا کی جھونپڑی کی طرف پلٹ نہ سکا۔ وہ جھونپڑیوں والے میدان سے نکل کر سیدا کارخانے پہنچا۔ کام ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اکا دکا مزدور آنا شروع ہو گئے تھے آخر مل گیا تھا۔ چپراسی نے میز کی گرد صاف کر کے ہر چیز کو نہایت سلیقے سے لگا دیا تھا۔

اکیلے میں شاید گھڑوں کے تصور نے اسے آ دبوچا۔

کتنی بڑی حماقت کی ہے میں نے بھی" وہ بدبدایا اس اعتراف پر اس کی طبیعت ذرا ہلکی ہوئی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ..... ہلو کون .....

ونیا دیوی؟"

"جی نہیں میں آج نہ آسکوں گا۔ کچھ ضروری کام نکل آیا ہے" غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے نکل گیا تو اسے اپنے جملے کی اہمیت کا احساس ہوا" ونیا خوب صورت اور امیر ونیا اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گی .....

ونیا نے روٹھ کر ٹیلیفون رسیور پٹخ دیا۔ ونیا روٹھ گئی۔ اس کی ایک ذرا سی غلطی ہے۔ مگر ایک ذرا سی غلطی سے روپا رامو اور اس کے کارخانے میں کام کرنے والے بہت سارے مزدوروں کی تقدیر بھی تو روٹھ گئی کس کا روٹھنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے؟" ایک سوال اس کے لاشعور میں جاگا۔ دل نے دھڑک کر کہا "ونیا" انسانیت نے روتی بسورتی بسنتی کو سامنے کھڑا کیا۔ اور اس نے اپنی گردن جھکا لی۔

کارخانا چل رہا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے ہر طرف ایک خاموشی طاری ہے۔ کسی کی موت کی خبر سن کر دلوں پر چھا جانے والی خاموشی ہم جیسے فضا نے دم روک لیا ہو۔ اس نے لگبر اکر گھنٹی بجائی۔

"تپاجی آ گئے؟"

"جی آ گئے"

وہ باپ سے اجازت لے کر سیدا گھر پہنچا۔ رستے میں ٹوٹے ہوئے گھڑوں کے ٹکڑے جنہیں مزدوروں نے بے کار سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ اس کا موہن چڑا رہے تھے جھونپڑیوں کے میدان میں لگے ہوئے درخت اس کے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے۔

وہ گھر میں جانے کے بجائے ان جھونپڑیوں والے میدان میں پہنچا پٹ پٹا کر بسنتی اب اپنے جھونپڑے کے برآمدے میں گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ وہ دور سے کھڑا دیکھتا رہا۔ ایک گڈے کا کان پکڑ بسنتی پوچھ رہی تھی۔ کیوں کم بخت تو نے ہمارے گھڑے کیوں پھوڑ دیئے ہم غریبوں پر بھی ذرا دیا نہ آئی۔ دیکھ مان نے مجھے کتنا پیٹا ہے"۔ اس نے اپنی نیلی نیلی پیٹھ اس گڈے کو دکھانی شروع کی "گھڑا ٹوٹ گیا سومان نے مارے گسّہ کے آج کچھ کھانے کو بھی نہیں دیا"

اس کے جی میں آئی اپنا سر پیٹ لے۔

بسنتی" اس نے نرم آواز سے پکارا۔

بسنتی ہڑبڑا کر پلٹی۔

"کیا کھایا ہے ری آج تو نے؟"

"ماں نے روٹی بنائی تھی۔ اور بھجیا"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے خود بسنتی سے کچھ سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہاں سے اٹھ کر سیدا گھر پہنچا تھیلو کو لے کر سیدا بازار گیا بہت سارے گھڑے گاڑی پر لدوا کر لوٹا۔ رستے میں بسنتی کے لیے کچھ پوری اور مٹھائیاں بھی لیں۔ رستے سے ہی گھڑوں سے لدی ہوئی گاڑی اور پوری مٹھائیوں کو مقدمے حوالے کر کے خدیہ اکار نہ نے پہنچا۔

وینا کا ٹیلیفون آیا تھا: اگر وہ دن کو آسکا تو رات شاید وہ نزدیک چھر مسکرا اٹھا۔

بیش سلامت ہے کہ انشاء اللہ بچے دھاگے میں چلے آئیں گے مگر بہت وہ گنگنانے لگا"

اپنے باپ کا "پرم کشپت" کہہ کر وہ بہت مسرور تھا۔

دوسرے دن تنخواہ بٹنے لگی تو ایک مزدور آگے بڑھ کر بولا بابو جی کل کے گھڑوں کے دام ہماری تنخواہ سے کاٹ لیں"۔

"بھئی اس کی کیا ضرورت ہے وہ تو میں نے اپنی طرف سے انعام دیا تھا تم سمجھوں کو۔

مگر بابو جی! جب ہم نے انعام کا کوئی کام نہیں کیا تو انعام کیوں لیں۔ نہیں، نہیں یہ انعام کیسے ہوا۔ یہ تو خیرات ہوئی محنت کرنے والے خیرات نہیں لیتے۔"

"پگلو یہ خیرات نہیں!"

"اگر خیرات نہیں تو انعام بھی نہیں"

"ہاں! یہ انعام بھی نہیں اور خیرات بھی نہیں۔۔۔۔۔ یہ پرم کشپت ہے!"

وہ پرم کشپت" سارے مزدور اس کا موہن دیکھنے لگے

"ہاں!۔۔۔ میں نے ہی تمہارے گھڑے پھوڑ ڈالے تھے"

اس کی آواز نرم تھی۔ اس نے اپنا موہن اپنے نیفر کے پیچھے چھپا لیا۔ مزدور ایک دوسرے کا موہن تکنے لگے قدرے شرمندا کچھ ڈرے ڈرے رہے۔ پھر کے ہنگامے میں جبکہ آرکیسٹرا کی مدھر سروں میں وینا کے کھنکتے ہوئے سر تھے تخلیل ہو رہے تھے۔

اس نے آج کے واقعے کا ذکر وینا سے چھیڑا۔

وینا نے برا سا موہن بنا لیا۔ جیسے اس کے موہن میں کونین پڑ گئی ہو۔۔۔۔۔!

میں سمجھا تھا "کراس روڈس" اور نئی زندگی" زندگی کی تصویر کا جو رخ دکھاتے ہیں۔ وہ ان کی اپنی تخلیق ہیں گر۔

"تو آپ ان اخباروں کو بھی پڑتے ہیں"۔ وینا نے درمیان میں ہی اسے ٹوک دیا۔

"کبھی کبھی۔ کیوں کیا ہرج ہے"

پھر وینا خاموش رہی۔ آرکیسٹرا کے ہلکے ہلکے سر لئے پھر کے ہنگامے میں گم ہوتے رہے، اور نہ جانے کیوں۔ وینا اپنی ہر حرکت سے اکتاہٹ کا اظہار کرتی رہی۔

گرمی محبت سے بھرپور ملاقات کا اختتام نہایت ہی سرد ہوا۔ بڑا ہی پھیکا جیسے وہ دونوں راہ میں چلتے چلتے تھک گئے ہوں ـــــ اور بس

"اچھا اجازت" دنیا نے مصنوعی تبسم ہونٹوں پر بکھیر کر کہا۔ جیسے ایک ملنسار اور کہنہ مشق دکاندار سودا نہ لینے والے خریدار کو مسکراتے ہوئے رخصت کرتا ہے۔

"بس اتنی سی؟"

"جی بہت ہو چکا" اور دونوں جدا ہو گئے۔

اس نے بھی سوچنا شروع کیا۔ دنیا ٹھیک ہی کہتی ہے

"بہت ہو چکا"

بیرہ نے بل لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تیس روپے"

"تیس روپے میں وہ ایک دل بھی خوش نہ کر سکا۔ مگر صرف گیارہ روپے میں کل ہی کئی دلوں کو مسرور و شاداں دیکھ چکا تھا۔

وہ بقیہ پیسے لوٹا تو اسے بقیہ میں دنیا کے ساتھ محبت بھرے لمحات گذارنے سے زیادہ اپنے پر تشنج کی خستی تھی۔

قطعات انقلاب

(نکہت صدیقی (اورنگ آبادی))

ضرورت ہے کہ اے ہندوستاں والو چمن بدلو
خدا نے آپ کو بدلو زباں بدلو سخن بدلو
فساد و شر میں جو گذرا زمانا اس سے کچھ سیکھو
یہ فرقے واریت چھوڑو تعصب کا چلن بدلو
عزیز و اقربا چھوٹے مکاں و پاسباں بدلا
ہوا آزاد تو ہندوستاں کا ہر جواں بدلا
حسیؔ کا نام لے کر ہر طرف غم کی گھٹا چھائی
بہا آنے سے اے نکہت چمن کیا کل جہاں بدلا

اذاں

عباس علی

سن! موذن کی صدا!
وقت کی اس کالی گھٹا کا سینا
چیر کر آئی چلی جاتی ہے
اور مدھر راگ کی آغوش میں یہ تلخ پیام
دور سے وقت کا ناقوس سناتا ہے تجھے!
ہاتھ پہ ہات دھرے سوچتے رہنے والے
مصلحت اور مشیت کی پناہیں لے کر
آج میدان عمل سے تو گریزاں جو رہا
یاد رکھ!
خون!
غریبوں کا خون!
تجھ کو مجبور کرے گا اک دن
کہ اپنے تئیں خدکو تو قاتل سمجھے
اب بھی ہے وقت کہ اٹھ!
بڑھ! اور لپک!!
کہ ترے عزم و عمل کی ٹھوکر
ایک ہی وار میں ڈھا کر رکھ دے
ان آہنی دیواروں کو
وہ قفس جن سے ہوے ہوں تعمیر
"جن میں مجبوس ہوں عوام کے سکھ"

انسانی جسم کی نشوونما کیلئے پروٹین کی اہمیت

۱-۱

پچھلے کچھ عرصے کے دوران میں سائنسی تحقیق کے ذریعے مختلف کھانے پینے کی چیزوں کی غذائیت کے بارے میں جدید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اب یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ صحت برقرار رکھنے کے لیے موزوں قسم کی خوراک کے استعمال کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ غذائیت کے سائنسی اصول صحت مند اور پرمسرت زندگی اور توانا جسم کی کنجی ہیں۔

جسم کی تندرستی کے لیے ہماری غذا میں مناسب مقدار میں پروٹین کا شامل ہونا لازمی ہے۔ پٹھوں کی نشوونما اور ان کی کھوئی ہوئی قوت کی بحالی کا انحصار خوراک میں پروٹین کی موجودگی پر ہے۔ اس کے علاوہ پروٹین ہمارے جسم میں بیماری سے محفوظ رہنے کی قوت پیدا کرتے ہیں۔ اور انسانی جسم میں حرکت قایم رکھنے کا عمل زیادہ تر خوراک کے اسی جز کا مرہون منت ہے۔ بچوں کو تندرست رکھنے اور مضبوط بنانے کے لیے انہیں ایسی غذا دی جانی چاہیے جس میں پروٹین کی مناسب مقدار موجود ہے۔

ہندستان میں ایسی غذاؤں کی کمی ہے جن میں پروٹین کی کافی مقدار موجود ہو۔ گوشت، مچھلی، انڈا اور دودھ سے تیار کی ہوئی چیزیں پروٹین حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ یہ چیزیں جہاں کافی مقدار میں موجود ہوں وہاں بھی ان کی گرانی ان کے عام استعمال کے رستے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کی پچاس فی صد سے زیادہ آبادی سبزی کھانے والوں کی ہے جو گوشت اور انڈا وغیرہ استعمال نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے ہمارے ملک میں اس مسئلے کو اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ خوش قسمتی سے اس مشکل کا کسی حد تک حل تلاش کر لیا گیا ہے۔ کھمبیوں کی طرح زمین پر ایک "پودا" پیدا ہوتا ہے جسے خمیر کا پودا کہا جاتا ہے۔ یہ پودا نہایت ہی چھوٹا ہوتا ہے اور اسے کافی بڑی مقدار میں اگایا جا سکتا ہے۔ اس نباتات سے پروٹین اور حیاتین (ب، بڑا) مقدار میں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس دریافت کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ پروٹین حاصل کرنے کا یہ ایک سستا ذریعہ ہے۔ سائنسدانوں نے تجربوں سے ثابت کیا ہے کہ خمیر کی فی ایکڑ پیداوار دوسری غذاؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ خمیر کی مقبولیت اور اس کے استعمال میں اضافے سے نہ صرف زیادہ خوراک پیدا کرنے کے سلسلے میں زمین پر دباؤ کم کیا جا سکتا ہے بلکہ اس طریقے سے ہم بہتر قسم کی غذا بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر شخص اس سبزی مایل کی مادے سے واقف ہوگا جو باسی روٹی یا رات بھر پڑے رہنے والے بھیگے ہوئے جوتوں پر جمع ہو جاتا ہے۔ یہ مادہ ایک قسم کی نباتات ہے جو کھمبیوں کی طرح اپنے آپ پھولے پڑتا ہے۔ خمیر کا پودا بھی اسی قسم کی نباتات سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسی چیزوں پر خمیر بافراط پیدا ہوتا ہے جن میں شکر کا جز موجود ہو۔ شکر یا گڑ کے شیرے کی تیاری میں جس مادے کو بے کار سمجھ کر ضایع کر دیا جاتا ہے وہ بلا خرچ خمیر پیدا کرنے کا ایک مثالی ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے اس وقت جبکہ ہندستان کے زیادہ سے زیادہ حصوں میں نشہ بندی کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے۔ شراب کے تمام کارخانوں میں اس تخمیر کے ذریعے خمیر پیدا کرنے کا کام شروع کیا جا سکتا ہے۔

خمیر کی کئی قسمیں ہیں۔ خاص قسم کا خمیر خاص مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

غذائی خمیر کا تعلق اس کی خاص اقسام سے ہے۔ ان کی بو الگ الگ ہے۔ بعض اقسام کے خمیر میں پروٹین کی مقدار بیس یا دو بائی جاتی ہے اور بعض میں حیاتین (ب) کی۔ غذائی خمیر کے

استعمال کے کئی طریقے ہیں۔ خمیر کا ایک بڑا چمچا پانی میں ملا کر پیا جا سکتا ہے یا اسے زیادہ استعمال میں آنے والی اور زیادہ مضبوط قسم کی دوسری غذاؤں سے ملایا جا سکتا ہے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ خمیر کا ذائقہ معلوم کر لیا جائے اور پھر اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ اسے کس غذا کے ساتھ تسلی بخش طریقے سے ملانا ممکن ہے ٹماٹر یا دوسرے پھلوں کے رس میں اسے آسانی سے ملایا جا سکتا ہے۔ چھ اونس کے گلاس کے لیے خمیر کا ایک بڑا چمچا کافی ہوگا اور اس طرح یہ بہتر خوشبو بھی دے سکتا ہے۔ کھانا پکانے میں کچ کی مقدار میں جو خمیر استعمال کیا جاتا ہے وہ شوربا، گوشت، دالوں، اور سبزیوں وغیرہ میں کھٹائی نہیں دیتا۔ روٹی پسٹری اور کیک مٹھائیوں میں بھی اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر یہ ٹماٹر، پیاز، گرم مسالے اور خاص کر پودینا اور دوسری بوٹیاں خمیر کی بو کو جذب کر لیتی ہیں غذائی خمیر کی ارزانی اور اس کی پیداوار کے سہل طریقے کے پیش نظر اسے مختلف اداروں و اسکولوں میں طالب علموں کی خوراک میں شامل کرنے اور گھروں میں اس کے عام استعمال کے امکانی فائدے واضح ہیں۔ آخر کار خمیر کا عام استعمال موجودہ اندرونی مسئلے کو حل کرنے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

افریقا میں نیا فنی کالج

جنوبی روڈیشیا میں نیا تسایم کے مقام پر ایک افریقی فنی کالج کھولنے کا منصوبا آج کل زیر غور ہے یہ منصوبا مرکزی افریقا کے اس یونیورسٹی کالج سے علاوا ہوگا جس کے قیام کے متعلق بحث ہو چکی ہے جنوبی روڈیشیا کے گاؤں کے کھیتوں وران کے پیروؤں کی جو نمایندا ٹینگ پچھلے مہینے ہوئی تھی اس میں اس منصوبے کی بڑے زور شور سے حمایت کی گئی نئی اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ اہل افریقا جا بجا کتابیں رکھنے کا روباری طور طریقوں فارموں کی نظم و نسق، انجن تعمیر و فیرا کی تربیت مہیا کی جائے اسکیم پر چھ ہزار پونڈ کے خرچ کا اندازا

اینٹی بائیوٹک دوائیوں سے فصلوں میں اضافا

ایک سائینداں کا بیان

ایک امریکی سائینداں نے اندازا لگایا ہے کہ اینٹی بائیوٹک دوائیوں کے استعمال سے کھیتی باڑی کا سارا نقشا بدل جائے گا۔ فصلیں دگنی ہو جائیں گی۔ اور دنیا میں اناج کی قلت کا مسلا حل ہونے میں مدد ملے گی

امریکا کی انڈسٹریل کیمیکل کمپنی کے ڈاکٹر پریسلوڈ نے کہا کہ اینٹی بائیوٹک دوائیاں جو زمین اور دوسرے مادوں میں مائیکرو آرگنیزم پیدا ہونے سے بنتی ہیں۔ ان کی دو اہم تاثیریں ہیں ایک تو یہ کہ تھوڑی مقدار میں یہ زمین میں ڈالنے سے پودوں کی نشو و نما میں مدد ملتی ہے۔ دوسرے پودوں کی بیماریوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

ڈاکٹر پریسلوڈ نے کہا کہ زمین کے ایک گرام میں لاکھوں مائیکرو آرگنیزم ہوتے ہیں جو پلاشبا ایسی اینٹی بائیوٹک دوائیاں تیار کرتے رہتے ہیں جن کا ابھی پتا نہیں لگا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کو یقین ہے کہ ان اینٹی بائیوٹک دوائیوں کو زمین سے الگ کرنے کے بعد تھوڑی سی لاگت پر تیار کیا جا سکتا ہے جب ہم ایسا کر سکیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جیسے کسانوں کے لیے انکھوں انکھ زمین جیسا ہوگی ہے کیونکہ ہمیں ایک برس میں دو دو فصلیں مل سکینگی پودے زیادہ صحت مند ہوں گے فصلوں کی بیماریوں کا انسداد ہوگا اور ایک ایکڑ زمین کا اضافا کیے بغیر فصلوں کی پیداوار دگنی ہو جائے گی۔

اس دور کے استعمال سے خصوصاً مشرقی ملکوں اور ہندستان کو بہت ہی فایدا پہنچے گا۔ ہندستان ایک بر عظیم ہے۔ یہاں کی ۳۶ کروڑ آبادی کے لیے ملک کی پیداوار نہایت ہی ناکافی ہے جیسا کہ مشہور نما ور کا استعمال ہندستانی کاشت میں ہونے لگے گا تو یہاں کی زراعت میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوگا اور اس ملک کی موجودا پیداوار دگنی کے لگ بھگ ہو جائے گی نتیجہ یہ ملک غذائی اعتبار سے کسی بیرونی ملک کا محتاج نہیں رہے گا۔

نگوچی کے افکار

ظفر عالمگیر بی اے

یان نگوچی معروف جاپانی شاعر ہے جو ۱۸۷۵ء میں ٹوکیو میں پیدا ہوا۔ اس نے نگویا کے انگلش اسکول میں ابتدائی تعلیم پائی۔ بعد میں ٹوکیو ہائی اسکول میں شرکت کی۔ اور ٹوکیو یونیورسٹی سے تکمیل کی۔ غربت اس کی زندگی سے چمٹی رہی دوران تعلیم اس کو بدھیوں کے آئینی طبقے کے مرکزی عبادت خانے سے مدد ملتی رہی اس شاعر نے مشرقی ممالک کے علاوہ مغربی ممالک کی بھی سیر کی چین میں اس کے ہم مذہب باشندے آباد ہیں۔ ہندستان اس کے بدھ مت کا جنم بھوم ہے۔ امریکا میں بھی اس کے کئی ایک دوست تھے ۱۸۹۹ء میں جب وہ امریکا گیا تو افلاس اور غربت نے اس کا برا حال کر رکھا تھا۔ وہاں وہ سان فرانسسکو میں رہا۔ کئی ادبی فن کاروں سے اس کی دوستی ہوگئی۔ عرصے تک وہ جوکین ملر کے ہاں مقیم رہا۔ ۱۹۰۱ء میں وہ انگلستان چلا گیا۔ جہاں وہ مارکینو کے ساتھ رہنے لگا۔ مارکینو ایک جاپانی مصور تھا۔ انگلستان میں نگوچی کی قیام گاہ اس کی غربت کی شاہد رہی۔ وہ لندن کی برٹن روڈ پر رہا کرتا۔ اس قیام کے دوران میں اس نے اپنی ایک مختصر سی کتاب "مشرقی سمندر سے" شائع کی تھی۔ اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں جاپانی شاعری پر چند لکچر بھی دیے۔ اور ۱۹۰۳ء میں پھر سے وہ امریکا چلا گیا۔ اور سان فرانسسکو کی بجائے ایب نیو یارک پہنچا۔ کوئی دو سال بعد وہ جاپان لوٹا۔ پھر وہ چین آیا اور کوئی سال بھر وہاں رہا۔

اس کی تصانیف "مشرقی سمندر سے" کے علاوہ اور بھی کئی ایک ہیں۔ اور نظم کے علاوہ نثر میں بھی ہیں ۱۸۹۹ء میں "دیکھے اور ان دیکھے شائع کی۔ ۱۹۰۰ء میں "وادی کی آواز" شائع ہوئی۔ اس وقت نگوچی کی عمر ۲۳ سال تھی۔ ۱۹۰۲ء میں "مشرقی سمندر سے" شائع کی۔ جبکہ وہ انگلستان میں تھا اوپر کی وہ کتابیں اس نے امریکا میں شائع کیں۔ ۱۹۰۳ء میں اس نے "کتاب گرما کا بادل" شائع کی۔ یہ کتاب ٹوکیو کو واپسی کے بعد شائع ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں جاپانی لڑکی کی امریکی ڈائری شائع ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں "جاپانی آرٹ کی روح" ۱۹۲۲ء میں "کورن" اور ۱۹۲۴ء میں جاپانی کی نمائندہ نظمیں" شائع ہوئیں ——— "لاتری مورتی" "سیوا کا رقص" "کانی یوگا" "ہندستانی رقاص" "بنگالی عورت" اس کی مشہور نظمیں ہیں اس کے کلام کا انداز نیچے کے ترجمے سے ہو سکتا ہے جو راست شاعر کی نظموں سے کیا گیا ہے۔

بنگالی عورت

میں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا
میں نے تجھے بارہا دیکھا ہے۔
تم اب مجھے دکھائی نہیں دیتی ہو لیکن،
میرے حافظے کے افق پر
ایک جگمگاتا ہوا ستارا چھوڑ گئی ہو ——!
آہ تیری ابرو پر وہ سرخ ننھا سا نشان!!
زنگین ساڑی میں ملبوس۔
جس پر زری کا کام کیا ہوا تھا۔ !
میں نے تجھے کرسی پر آرام کرتے ہوئے دیکھا۔
ایک سانپ محبت بھرے خواب میں!!
میں نے تجھے مسکراتے دیکھا ——— مسکراتے
اور کھلے ہوئے کنول کے پھول کی پتیاں
اپنے کھلے ہوئے لبوں سے برساتے دیکھا
اور تیرا انگلیوں سا غرالتجا لیے کانپ رہا تھا !!
میں نے تیری باہوں کو لہراتے اور تھمتے دیکھا
جیسے کہر جیسی سفید یا مچھلی کا جوڑا جذبات کی تلاش میں!!

میں نے تجھے پہلی بار دیکھا
میں نے تجھے اکثر دیکھا ہے
تو جا چکی ہے لیکن اپنی نیلی جوتیوں کی بو میرے حافظے میں چھوڑ گئی ——
اور وہ نیلا رنگ جو گہری خلیج بنگالی سے لیا گیا تھا!!
تو جا چکی ہے لیکن تیرے سرخ رنگ ہوئے نئے نئے تلوے
آہ! وہ سرخی جو غروب آفتاب نے تجھے عطا کی تھی ——!!

زخمی ہونٹ

زرد صبح کی روشنی دریچے کے آئینے سے گذر کر کمرے میں رقص کرتی ہے۔
اور اس کے جسم پر پڑتی ہے!
ایک مسکراتی ہوئی چیز ——
جو اطمینان اور سکون سے اکتا گئی ہے!!
اب —— سرخ بادامی رنگ کے سمندری سیپ جو میرے بوسوں سے زخمی ہو گئے ہیں (میں ظالم تھا) لیکن اور کیا ہو سکتا تھا!
پیتل میں ڈھالا ہوا سیپ ——
دو پکے ہوئے سیب جو گر نے کو ہوں ——!
گردن اور دو رانیں ——
اشوک کی لاٹ کے ٹوٹے ہوئے حصے!!
ایک تشلیث حسن کی نیاز میں! ——
کھلے دریچے میں وہ آئینہ اور سنگ ردان لیے کھڑی ہے
اجنٹا کے غار سے بھاگی ہوئی ایک لیشو دھرا ——!
اس کے گول کہر جیسے سفید کاندے رات کے لباس (شب خوابی کے) کی قید و بند سے آزاد ہیں لیکن ستاروں کو لیے جھومتی رات اس کے گھنگھریالے بالوں میں ابھی لہرا رہی ہے!
وہ میرے جڑی ہوئی انگوٹھے پھنسی ہوئی انگلی سے ان کو چھیڑ رہی ہے۔
تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ ——

جھنجھلاتے ہوئے آفتاب نے اس کے بالوں کو کنگھی سے سنوارا
کس طرح گلاب کی شکل میں تتلیاں اس کے سینے پر سنڈلائی ہیں
اے خدا! کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں!!
اے شیطانو! تمام فریب اور دھوکے نکل جاؤ
اور نکل جاؤ!
اجنٹا کے غار سے آئی ہوئی لیشو دھرا کی مانند میرے محبوب کے لب کہاں؟
میرے محبوب کی گردن استوک کے ستون کا ایک حصہ کہاں!
میں دریچے کے پاس ایک گلاب دیکھتا ہوں۔
گلاب!
جو سکوت میں اپنی پتیاں جھاڑ دیتا ہے
سکوت میں!
گلاب کی پتیاں گرتی ہیں۔
ایک —— دو —— تین —— پانچ ——!!

کالی دیوی

بکری کو قبول کر اے کالی!
یہ تیری بارگاہ میں ایک ناچیز ہدیہ ہے
تباہی پر روانا ہوتے ہوئے اے کالی!
اس کا بہتا ہوا لہو چوس لے
ہم تیرے آگے سجدا ریز ہوتے ہیں
تیری شکل کتنی خوف ناک ہے کالی
تیرا چہرا سرخ سرخ ہے اے کالی
تیری آنکھیں نصف شب کے تین ستارے ہیں
اے کالی تیری چار باہیں
تڑپتے ہوئے ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی ہیں
ہم تیرے آگے سجدا ریز ہیں
ہم تباہی سے ڈرتے ہیں اور نہ بربادی سے

ہم تیری تباہی کو قبول کرتے ہیں۔
قدرت کا عظیم ترین قانون یہ
نکلنا ہوا دن زندگی کی سخت آزمائش سے گذرتے
ہوئے اس قانون سے دوچار ہوتا ہے
بھاگ جا پاگل ہو جا اے کالی
آسمان کو سیاہ کر دے اے کالی
اور دنیا کو تباہ کر دے
تمام شیاطین کو قتل کر دے
اور ان کی ہڈیوں سے ایک پہاڑ تعمیر کر!!
ہمارا یہ ناچیز تحفہ — یہ بکری قبول کر اے کالی
ہم دوزانو ہو کر بیٹھتے اور تجھے سجدا کرتے ہیں
ہم دن کی خبر رکھتے ہیں جب تیرا چہرا نرم پڑ جاتا ہے
اپنی باہوں میں محبت لیے ہوئے۔ آنکھوں میں سکون لیے ہوئے
تو ہمیں سینے سے لگائے گی اور پیار کرے گی
تب تیرے بالوں سے گنگا کا گنگناتا ہوا پانی بہہ نکلے گا۔
اور ہمارے لیے نہانے کا سامان کریگا
لیکن آج صرف تباہی ہی تباہی ہے کالی
اوہ! تباہی کی جے کہو، بربادی کے گیت گاؤ
ہم تیرے آگے سجدا ریز ہوتے ہیں اے کالی!

ایک نظم

"ستم آخری میری ہیں۔ اور صرف میری" وہ کہتا ہے۔
"تمہاری روح کا چراغ بجھ جانے دو میں تمہارا جسم
اپنے ہاتھوں میں لیتا ہوں۔ ——
میرے اختیار کو آخری اور مکمل۔ ہنے دو
مایل یہ کرم ہو۔ اپنے سینے کو میرے سینے پر رکھدے
اپنے آپ کو میری تباہی کی باہوں میں سپرد کر دے
میں دیوانا ہوں" ——
"اگر تم چاہتے ہو تو مجھے اپنے بوسوں سے ہلاک کر دو"
وہ جواب دیتی ہے
"یا اپنی کلائیوں سے ——"
اپنی طاقت کو تمہارے ہتھیار دو
اپنے آپ کو تمہاری زندگی میں گم کر دینا
اوف کتنی مسرت ہے!!
کیا دونوں زندگیاں مل جلی ہیں!
چاہے گوشت پوست ہو۔ چاہے ہڈیوں کا ڈھانچا!
ایک مکمل وحدت!!
"موت کا مزا چکھنے مجھے نذر کر دو!"
وہ کہتا ہے "موت صرف تمہاری نہیں۔
اس لیے کہ میں بھی مرتا ہوں جب میں تمہیں ہلاک کروں
میں فاتح بھی ہوں اور مفتوح بھی"
"تمہاری قسمت میری قسمت ہے"
"لیکن ایک لمحے کے لیے میرے محبوب" وہ کہتی ہے۔
"مجھے تمہاری حرارت محسوس کرنے دو جو میری ہڈیوں
کے ذریعے جسم میں دوڑ جاتی ہے"
میرے جسم کو تمہارے جسم سے متاثر ہونے دو
مجھے حرکت دو تاکہ میں اٹھ کر تمہارے قدموں پر
آ رہوں"
وہ کہتا ہے۔ "اس "تم اور میں" کو چھوڑو ہمیں ایک
ہو جانا چاہیے۔
ایک بے وضع شکل۔ ایک سرار، بھیانک "ہا" ایک "ہو" لا
ایک مقدس "ملاپ"
جہاں ابتدا جسم لیتی اور سو خیق ہے
مجھے اس کا حاصل دیکھنے دو تاکہ ایک شیطان حاصل ہو
یا فرشتہ!
اس حالت کو لوٹ جسکے مرد ہوتے نہ عورت
اس زمانے کو پلٹ جا جب کہ دنیا نہ بنی تھی
اور وہاں ہم انتظار کریں

یہاں تک کہ خدا ہم کو جگائے ۔"

زندگی

"زندگی" پیدائش اور محبت کے سوا کچھ اور نہیں۔
اور تجھے مسرت کی قیمت چکانا ہے اور درد سے ادا کرنا پڑتی ہے۔"

تیری مورتی

محبت کی بنا پر تو، عزیز ترین اور حسین ترین اشیا کو تباہ کر دیتا ہے۔ تاکے ثابت کر سکے کہ تیری قدرت مکمل ہے تو تباہ کرتا ہے۔
تیری تباہی کی شمشیر اتنی بے رحم کبھی نہیں ہوئی جتنی وہ نظر آتی ہے۔
تخلیق عظیم کام ہے
تباہی عظیم تر کام ہے
کیوں کہ خاک سے نئے نئے عجوبے پروان چڑھتے ہیں
تخلیق کے اولین لطف دوہرانے کی مسرت تیری ہے
موت کو شکل دینے کی مسرت تیری ہے۔!
تباہ کرنے کا حق تخلیق کرنے والے ہی کا حق ہے۔
ان اشیا پر آخری فیصلے کا حق جن کی اس نے تخلیق کی ۔۔!!

گھریلو معاشیات کی عالمی کانگرس ایڈنبرا میں ۲ تا ۸ اگست لگا الزنجہ کے زیر سایا گھریلو معاشیات کی جو آٹویں بین قومی کانگرس بلائی جا رہی ہے اس میں ۳۵ ممالک کے نمایندے شامل ہوں گے کل ۱۱۰۰ ڈیلیگیٹوں میں سے ۵۰، ۴ یورپ کے، ۴۰ امریکا کے اور ۴۰ کامن ویلتھ ممالک کے ہوں گے۔ کئی حکومتیں ورپا پائے روم سرکاری وفد بھیج رہے ہیں کانگرس کا اجلاس ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہوگا اور سات مختلف ممالک کی ایک نمایندہ پینل دو مقالے پیش کریں گے جن کی اساس پر کانگرس میں آزاد مباحثہ ہوگا

دیو پیکر عمارت

روس کے پایۂ تخت ماسکو میں "کراسنیئے ورونا" چوک کے مقابل سفید پتھر کی ایک عالی شان خوب صورت عمارت ہے جار سو بہتر (۴۷۲) فٹ کی بلندی پر سونے کا ایک چمکتا ستارا عمارت کی چوٹی پر لگا ہوا ہے یہ ستارا بہت دور سے دکھائی دے جاتا ہے کیونکہ یہ عمارت اس محلے کے سب سے بلند مقام پر واقع ہے۔
اس دیو پیکر عمارت کے رہایشی حصے میں ۲۰۷۲ مکان ہیں۔ جن کے فرش کا مجموعی رقبا باہزار مربع میٹر کے قریب ہے عمارت کی بلند ترین منزل میں اور ساد دوے کولتسو کے مقابل پہلوؤں میں دفتر کے ۳۲ کمرے ہیں۔ یہ دفتر وزارت ریلوے کے مختلف محکموں کے ہیں۔ یہیں ایک کانفرنس ہال بھی ہے جس میں ساڑھے تین سو نشستیں ہیں۔
یہ عمارت کھڑی کرنے کے لیے معماروں کو دس ہزار ٹن فولادی ڈھانچے جوڑنے پڑے۔ دو کروڑ چالیس لاکھ اینٹیں چننی پڑیں، ۵۵ ہزار مربع میٹر لکڑی کا فرش لگانا پڑا اور دیواروں پر پچاس ہزار میٹر سفید پتھر سنگ مرمر اور سنگ سیاہ لگانا پڑا۔

ماسکو کے طلبا کا جلسا

ابھی حال ہی میں ماسکو کے کالجوں کے طلبا پروفیسروں اور استادوں کا ایک جلسا ہوا جس میں سویت راجدھانی کے عالا تعلیمی اداروں کے طلبا کے ان سائنسی مقالوں پر تبصرا کیا گیا جو انھوں نے ۵۳-۱۹۵۲ء کے تعلیمی سال کے دوران میں پیش کیے تھے۔ اس سلسلے میں نظامی کمیٹی کے صدر نے ایک رپورٹ پڑھی۔
ماسکو میں تقریباً ۳۵ ہزار طلبا سائنسی تحقیق میں لگے ہوے ہیں اٹھائی ہزار مقالے ۔ یعنی پچھلے سال سے تقریباً پانسو سے زیادا طلبا کی کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔ اور زیر بحث آئے۔ ۶۰۰ بہترین سائنسی تصانیف تبصرے کے لیے پیش کی گئیں اور دو سو سے زیادا قابل سند تسلیم کی گئیں۔

اجنبی دیس

قمرالدین قیصر

سردیوں کی دوپہر اور پھیکے مٹیالے نیلے آسمان پر دمکتے سورج کے کرنوں کی چبھن سے اکتا کر رشید اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پیپل کی چھدری چھدری چھاؤں میں پیپل کے تنے پر منڈھے ہوئے چبوترے پر جا بیٹھا۔ چبوترا پکے صاف اور پیپل پر بسیرا کرنے والے پرندوں کے چھڑکاؤ سے لوتا ہوا تھا۔

اس کا چھوٹا سا گھر اور اس کے آگے ٹاٹ کے دروازا نما پردے کو حرکت ہوئی۔ اور اس کا چھوٹا بیٹا روڑا دوڑا آکر اس سے لپٹ گیا۔ اور بولا "ابا اماں کہتی تھی تم ڈھاکا جا رہے ہو میں بھی چلوں گا۔ تمہارے ساتھ بولو۔ لے چلو گے نا مجھے۔ اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ اس وقت تم سب کو چھوڑ کر چلے گئے تھے بولو نا ابا۔ اماں اور منی سا جو کو نہیں چھوڑ دینا ہاں ۔۔۔۔"

اور کھویا کھویا مسکرا رشید جو نہ جانے کیا سوچ رہا تھا چونک پڑا ۔۔۔ "نہیں بیٹا اب ہم ڈھاکا نہیں جائیں گے"

"ابا اماں تو کہتی تھی ابا۔ چلو پوچھ لو"۔

"ہمیں بیٹے ویسے ہی بولتی تھی تمہاری اماں"

اور جیسے اس کے ذہن میں یہ خیال تڑپ اٹھا کہ پردیس میں اس نے کیا پایا تھا ۔۔۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی رشید ڈھاکا چلا آیا تھا اس سے پہلے وہ سلہٹ میں رہتا تھا۔ یوں تو وہ رہنے والا کشمیر کا تھا جو اس کے نانکے قدآور فراخ ماتھے اور اس کی سرخ سرخ رنگت سے ظاہر تھا لیکن اس کی منی منی فیونی آنکھیں اس کے تجسس اور اپنی پچھلی زندگی کی کسک پر غلاف سا ڈالے رہتیں

ندی کے کنارے جہاں چھوٹے چھوٹے لانچ اور نئی نئی بادبان والی ڈولتی کشتیاں آکر رکتی ہیں اور گھاٹ سے شہر کو ملانے والی ایک پتلی سی سڑک بل کھاتی ندی کی مدھم سروں میں گنگنانے والی لہروں کو چھوتی ہوئی اسٹیشن اور مسجد اور مغل چائنیز کے تاریخی اور پرانے مقبروں سے چھپتی گم ہو جاتی ہے اور اسی پتلی سڑک کے کنارے تقریباً آدھے شہر کا میلا پاس کی نکی بین بھینکا جاتا ہے اور اس سے لگے ہوئے چند رہائشی مکان جن کے نچلے حصے چھوٹے پریس والے۔ بک بائینڈرز مختلف آفسوں کے کلرک تھے۔ اور اسی بورڈنگ نما عمارت کے صدر دروازے کے قریب پریس کے مقابل ایک چھوٹی سی ڈرائی کلیننگ اور واشنگ کمپنی تھی۔ جس کا مالک رشید تھا۔

اس سے رشید بڑی دل چسپ شخصیت کا ہر دل عزیز آدمی مشہور تھا۔ وہ اپنے نام سے زیادہ بھائی جان مشہور تھا۔ اسے ہر کسی کو بھائی جان کہنے کا خبط تھا۔ اور ہر چھوٹا بڑا اسے بھائی جان کہتا۔ جب وہ بھائی جان بولتا تو بڑا ہی مطلبی خدغرض مکار اور چھٹا چار سو بیس لگتا۔ اور اس ایک لفظ کی مدد سے اچھے بہت سے کام مفت کروا لیا کرتا۔ اصل میں جب وہ شروع شروع میں ڈھاکا آیا ہوا تھا تو اسے محسوس ہوا کہ بنگلا زبان کے بغیر گذارا مشکل ہے لیکن اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ قائد اعظم کے تاریخی قول کے برابر سارے پاکستان کی زبان اردو ہوگی" آج نہیں کل ان سب کو اردو سیکھنی ہوگی اور تب تک وہ سب کو بھائی جان جیسے پیارے لفظ سے پکارے گا اور ان سے بنگلا سیکھنے کی بجائے خدسب کو اردو سکھائے گا۔

جب وہ سلہٹ سے آیا تھا تو اس کے ساتھ اس کی آسامی بیوی اور اس کی بڑی لڑکی دو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی ساتھ تھے اور "وار" کے زمانے میں کمایا ہوا تھوڑا بہت بچا ہوا روپیا تھا اس کی خوش فہمی بہت جلد ہی دور ہوگئی کہ پاکستان میں جینا آسان نہیں۔ جبکہ اس کا مرغوب سگریٹ کیپسٹن آٹھ آنے تھا اور اسے مجبوراً گھٹیا سگریٹ پینا پڑا۔ اسے نوکری کی تلاش نہیں

اس لیے کہ وہ نوکری کو ان کی سب سے بڑی توہین اور ذلالت سمجھتا تھا۔ وہ کہا کرتا "ارے بھائی جان آدمی، آدمی کا غلام کیوں رہے اور اب جبکہ ہمیں آزادی مل گئی ہے اس لیے اس نے اپنا پھیلا لانڈری کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی ڈرائی واشنگ کمپنی صرف اونی کپڑوں کو صاف کرتی تھی۔ سوتی کپڑوں کو دھونا اس کی اتنی محنت سے استری کرنا اور اس کی اجرت میں چند آنے کی حقیر سی رقم قبول کرنا رشید ہتک سمجھتا تھا۔ پھر اونی کپڑے بھلا گرمیوں میں کب زیادہ استعمال ہوتے ہیں پر بڑے افسر تو گرمیوں میں بھی ٹراپیکل کپڑے پہنا کرتے ہیں۔

لانڈری کا مالک، دھوبی، استری کرنے والا اور سب ہی کچھ رشید تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ سوٹ مل ہی جاتا لیکن گھر کا خرچ آمدنی سے نکلتا تھا۔ اس کی بیوی نے ایک کے بعد ایک زیور رہن رکھنے کے لیے دیدیے بھلا پردیس میں کون کسی کو قرض دیتا لیتا ہے اور وہ بھی ایک اجنبی کو۔

جب ہاتھ تنگ ہونے لگا تو رشید نے سوچا بیوی اور بچوں کو پڑوس کے ہوٹل والے پولش کے یہاں رکھ دے۔

پولش بڑا شریف آدمی تھا اور اس کے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رشید کا ننھا سا خاندان میں رہنے لگا۔ اس کی نازک سی بیوی پولش کے گھر کا سارا اوپری کام کرتی اور بڑی لڑکی سولہ سترہ افراد کا کھانا پکاتی۔ لیکن اس کی اپنی خواہش کہ اس کا ننھا سا گھر ہوگا۔ اس کی اپنی چہیتی بیوی چھوٹا سا خاندان زور شور سے چلتی ہوئی لانڈری بھی ہوگی۔ کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

جب پاکستان کا قیام ہونے والا تھا تو اس نے اپنے روپے پیسے سے کر خدا رفیع ندیم جی جان ایک کر دیا تھا۔ سارے سلہٹ میں اپنے ساڑھو بھائی کے ساتھ گھومتا پھرا تھا لغرے لگائے تھے۔ پرزور کنوسنگ کی تھی اور جوں ہی آزادی ملی تھی۔ ڈھاکا چلا آیا تھا۔ اس کا خیال تھا ڈھاکا سلہٹ سے ہزار درجے بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ ڈھاکا مشرقی پاکستان کا دارالسلطنت ہے وہاں گورنر چیف منسٹر اور بڑے بڑے عالا افسر رہتے ہیں پھر ڈھاکا کا مرکز بھی تو ہے۔ پہلے سال تو اس نے یہ سوچ کر صبر کیا تھا کہ اگلے سال مہنگائی کم ہوگی۔ اناج سستا ملے گا۔ اور بحالی ہوگی۔ لیکن مہنگائی تو اور پر بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں کے بیوپاریوں نے طے کر لیا تھا کہ جب تک ہندستان سے کھلے بندوں تجارت جاری نہیں ہوتی اس وقت تک پنے ہی لوگوں سے نفع وصول کیا جائے۔

جب رشید نے دیکھا کہ بہار، یو پی، سی پی اور پنجاب سے آئے ہوئے کھاتے پیتے خستہ حال مہاجرین دکانیں دھڑا دھڑ الاٹ کروا رہے ہیں۔ اور مکانوں کا کوالیزیشن ہو رہا ہے تو اس نے بھی بڑی دوڑ دھوپ کی تھی لیکن اس کے پاس جیب گرم نہیں تھی۔ قیمتی سوٹوں کو دھونے کے باوجود اس کا اپنے پہننے کے لیے کوئی خاص لباس نہ تھا۔ اور نہ عالا عہدے داروں کو شاندار ہوٹلوں میں دعوت دینے کی ہمت ہی تھی اور نہ کوئی ٹوٹا پھوٹا مکان ہی ملا۔

جب کبھی بنک کے کبیر دوست سے اس کی ملاقات ہوتی تو وہ کہا کرتا ــــ "بھائی جان اندھیر نگری چوپٹ راجا" بس ہو چکا کلیان بھائی لوگوں کا۔ بھائی جان تم تو میری بات مانتے نہیں۔ تم تو خزانچی ہو ہی۔ روز لاکھوں کے نوٹ گنا کرتے ہو۔ پرمہتیں تو مہینے میں مل تین سو روپے ہی ملتے ہیں آؤ نہ سالے کو خدا نوٹ بنائیں اور تم ملا دیا کرنا۔ کیا خیال ہے ــــ" وہ عجیب مسخری سنجیدگی سے کہا کرتا ــــ

آخر تنگ آکر جب وہ بیوی بچوں کو سلہٹ سسرال بھیجنے لگا تو اسی دن وہ کتنا افسردہ تھا۔ بڑا جبر کر کے بچوں کو گاڑی میں چڑھا رہا تھا کہ پولش کا دوست اسے بولا "بھائی جان پولش بڑا غمزدہ معلوم ہوتا ہے"

"کیوں کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

وہ مسکرا کر بولا "ارے بھائی۔ بھابی جو جا رہی ہیں۔ افسوس کیوں نہیں ہوگا" ظالم نے عجیب معنی خیز لگاہوں سے گھور کر رشید رشید نے چھری گھونپ دی۔ لمحے بھر کے لیے رشید تلملا کر رہ گیا۔

بیوی بچوں کے جانے کے بعد رشید میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ اور بھی کھل اٹھا ہر گھڑی چھٹیاں کسا کرتا دن بھر میں چار پانچ رہ پے آجاتے اور دوپہر اور شام کو چار چار آنے کی افیون کی گولی نگل جاتا۔

لیکن پڑوسیوں میں چہ میگوئیاں ہوتیں کہ رشید میں بری علت ہے چہ میگوئیاں شکایتوں میں تبدیل ہوگئیں۔ اور اس کے متعلق قصا گھڑا جانے لگا کہ وہ ہندستان کا ایجنٹ ہے۔ جاسوس ہے اور باوجود وہ "پاسبان" افیون کھانے والی پابندی سے رہ نہ پڑا کرتا تھا لیکن لوگ اسے کامریڈ یا اور نہ جانے کیا کیا کہا کرتے۔ آخر اس نے جب پڑا اور سنا کہ پاکستان کے روپوں کی قیمت بڑھ گئی ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ہر شخص کے آگے بڑے مدبرانہ انداز میں وہ بولا کرتا "بھائی جان غلام محمد بھی واقعی اقتصادیات کا جادوگر ہے آج ساری دنیا دنگ ہے اب دیکھتے جاؤ کیا کیا وارے نیارے ہوتے ہیں ارے بچو اب دو آنا فی نان نہیں بیچ سکو گے ارے او ارے او سگریٹ والے بھائی جان اب دس آنے پاکٹ کیپٹن نہیں بیچ سکو گے ورنہ میری طرح کھوپڑی گنجی ہو جائیگی اور چلے چلے اس نے خوب صورت لقمہ بیانی شروع کر دی تھی وہ اپنے بچوں کو واپس بلائے گا۔ اب لڑکی بھی تو شادی کے قابل ہو گئی ہے اس کا بھی کہیں ٹھکانا ہونا چاہیے۔ پھر کیوں نہ وہ اپنے بڑے لڑکے کو بلائے بجائے اس کے کہ وہ پڑھ لکھ کر کلرک بن جائے اسے اپنے ساتھ رکھے گا۔ اچھا ہو نہار بچا ہے کم سے کم اس کی آنتی نہ تو کرے گا کہ بنگلوں سے آرڈر ہی لے آئے گا۔ اور پھر جب دکان چل جائے گی تو ایک نوکر بھی رکھ لے گا۔

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ اور کوئی بہتر صورت نظر نہ آئی نہ ہی کیپٹن سگریٹ کی قیمت گھٹی اور نہ ہی چاول سستا ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نہ وہ اپنی بیوی کو بلا سکا اور نہ بڑے لڑکے کو ہی تو وہ مارے غصے کے لال بھبکا ہو گیا۔ اور سارے سرکاری لوگوں کو گن گن کے گالیاں دینے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ افیون کی وجہ سے وہ ٹھکانے سے کچھ سوچ نہیں سکتا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ اب کبھی اس زہریلی چیز کو ہاتھ میں نہ لگائے گا۔ پہلے روز اپنا بچا پیا جا کر گنگا میں پھینک دے تو کم از کم اس کی بیوی جوان لڑکی کا انتظام کر دے گی

برطانوی یونیورسٹیوں میں کامن ویلتھ کے طلبا

برطانوی یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کالجوں میں درسی سال ۵۲-۱۹۵۱ء کے دوران گوپورا وقت پڑھنے والے طلبا کی تعداد پچھلے سال کی نسبت کم رہی تاہم کامن ویلتھ سے آئے ہوئے طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ سال ۵۲-۱۹۵۱ء میں طلبا کی کل تعداد ۸۵۴۳۵ رہی جبکہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۸۵۳۱۴ تھی ان امداد و شماسے ۱۸۵۶ طلبا کی کمی واضح ہو جاتی ہے۔

ان ۸۵۴۳۵ طلبا میں سے ۶۶۴۰۹ طالب علم اپنی پہلی ڈگری حاصل کرنے کی کوشش میں تھے ۱۵۵۰۵ اپنے پہلے ڈپلوما کے لیے تیاری کر رہے تھے اور ۱۵۴۴ طالب علم ریسرچ وغیرہ کر رہے تھے پارٹ ٹائم طلبا کی تعداد ۱۷۰۵۸ تھی یعنی پچھلے سال کی نسبت ۱۰۰۰ زیادہ ان میں سے ۱۸۸۲ پہلی ڈگری، ۱۸۲۵ پہلے ڈپلوما کی تیاریوں میں مصروف تھے اور ۴۹۵۴ طلبا ریسرچ کر رہے تھے

۵۲-۱۹۵۱ء کے دوران پورا وقت پڑھنے والے ۲۹۲۱ طلبا اور ۱۶۳۶ پارٹ ٹائم طلبا کامن ویلتھ سے آئے ہوئے تھے جبکہ اس سے پچھلے سال ان کی تعداد ترتیب وار ۲۷۰۱، ۱۳۲۵ اور ۱۲۲۸ تھی۔ اسی عرصے میں غیر ممالک کے ہمہ وقتی طلبا کی تعداد ۱۳۰۳۹ اور پارٹ ٹائم طلبا کی تعداد ۱۳۲۵ رہی۔

ہمہ وقتی طلبا میں سے مردوں کی تعداد ۷۰۰۱۶ اور عورتوں کی ۱۹۴۸۸ تھی۔

آذربائیجان یونیورسٹی کی زندگی اور تعلیم

محمد علی

باکو میں ہمیں نے آذربائیجان ریاستی یونیورسٹی کے ریکٹر جعفر بن غازی سے درخواست کی کہ مجھے ان نوجوانوں کے متعلق کچھ بتائیے جو یونیورسٹی میں پڑھتے اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

"خود طلبا ہی سے کیوں نہ پوچھ لیا جائے" انہوں نے کہا اور کسی ایسے طالب علم کو دفتر میں آنے کے لیے کہلوایا جس کا اس وقت کوئی لکچر نہ ہو۔ تھوڑی ہی دیر بعد سانولے رنگ کا ایک نوجوان دفتر میں داخل ہوا۔

ہمارا تعارف علم حیاتیات کے سال سوم کے ایک طالب علم داداش بن رحیم سے کرایا گیا۔ دوسرے بہت سے طلبا کی طرح وہ بھی ایک کسان کا بیٹا ہے اس کے والد ایران کی سرحد پر واقع لیریک نامی ایک پہاڑی ضلع کے گاؤں سیف میں رہتے ہیں۔ اور وہیں ایک نجاتی فارم میں کام کرتے ہیں۔

داداش نے مجھے بتایا کہ اپنے گاؤں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے اور پھر ایک ٹیکنیکل اسکول میں کاشتکاری کا علم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنی زندگی سائنس کے لیے وقف کر سکیں۔ وہ علم حیوان کی خصوصی مہارت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ریکٹر نے بتایا کہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو کسی خاص علم کی مہارت حاصل کرنے کے لیے اپنی پسند کا مضمون چننے کے بڑے موقع ہیں وہ چاہیں تو علم نباتات علم طبیعیات کے ماہر بھی بن سکتے ہیں۔ یا اگر چاہیں تو فلالوجی، تاریخ داں جغرافیہ داں ریاضیات داں وغیرہ بھی بن سکتے ہیں۔ کوئی ایک سو کے قریب مختلف علوم اور فنون کی اس یونیورسٹی میں تربیت دی جاتی ہے۔

آذربائیجان یونیورسٹی کے طلبا اپنی پسند کے برابر روسی زبان کے لکچروں یا آذربائیجانی زبان کے لکچروں میں شرکت کر سکتے ہیں ان کے لیے جدید ترین آلات سے آراستہ پچاس کمرے بنائے گئے ہیں۔ آذربائیجان کی دوسری سب سے بڑی لائبریری میں درس و تدریس کی کتابیں اور دوسری بہت سی سہولتیں مہیا ہیں۔ اور یہ سب بالکل مفت اور بلا معاوضہ یونیورسٹی کی ان تمام سہولتوں کا مقصد یہ ہے کہ جب تک طلبا وہاں رہیں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر سکیں۔

داداش بن رحیم نے یہ بھی کہا کہ پچھلی گرمیوں میں وہ اپنے پروفیسر کے ساتھ ایک ٹولی بنا کر گئے اور مختلف اقسام کی جڑی بوٹیاں نیز پرند اور جانور جمع کر کے لائے جنہیں انہوں نے تیار کر کے اپنے عجائب گھر میں رکھ دیا۔

ریکٹر نے مزید بتایا کہ تمام طلبا اسی طرح ٹولیاں بنا کر مہینوں پر جاتے ہیں، اور علمی تحقیق کے اداروں، فیکٹریوں اور دوسرے اداروں میں عملی تربیت حاصل کرنے کے اوقات مقرر ہیں۔ پچھلی چھٹیوں میں جغرافیا کے طلبا نے سوویت یونین کے یورپی خطے کا دورہ کیا۔ ان کا یہ دورہ کوئی چھ ہزار کلو میٹر کا تھا۔ انہوں نے ملک کے مختلف قدرتی خطوں کا مطالعہ کیا۔ اس دورے کے اخراجات یونیورسٹی نے برداشت کیے کسی مہم پر سے واپسی کے بعد یا عملی کام کے وقت مقررہ کے بعد ہر طالب علم اپنے سائنسی مشاہدات کی رپورٹ لکھتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ اس کا جو کام دیا گیا تھا اسے اس نے کس طرح پورا کیا۔

اس گفتگو سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑی جماعتوں کے دوسرے سیکڑوں طلبا کی طرح داداش بن رحیم بھی طلبا کی سائنسی سوسائٹی کا ممبر ہے یہ سوسائٹی کئی علمی حلقوں پر مشتمل ہے علمی حلقوں کا ہر رکن اپنے آئندہ امیدان عمل سے متعلق کسی ایک

موضوع کا انتخاب کر لیتا ہے اور اس کے برابر کام کرتا ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ داداش نے علم حیوانات سے متعلق جنگلی جانوروں اور نقصان پہنچانے والے کیڑوں کے متعلق اپنے مشاہدات اور تحقیق کی رو سے اپنی پیش کی جو آذربائیجان میں پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے استاد اس سوسائٹی کی امداد اور رہنمائی کرتے ہیں اور یونیورسٹی کی تجربہ گاہیں اور سامان اس کے لیے مہیا ہیں۔ تحقیق کے نتیجوں کا سوں پر انعام دیا جاتا ہے۔ اور یونیورسٹی کا پریس تحقیق کے مقالے شایع کرتا ہے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں سوویت حالا تعلیمی مدارس اپنے طلبا کو نہ صرف تعلیم کی بہترین سہولتیں بلکہ کارآمد مطالعے کے لیے مادی لوازمات بھی فراہم کرتے ہیں۔ معمول کے برابر ترقی کرنے والے تمام طلبا کو حکومت نقد وظیفے دیتی ہے۔ جو طلبا زیادہ ترقی دکھاتے اور امتیاز حاصل کرتے ہیں انہیں اوسط سے ۲۵ فی صد زیادہ وظیفہ ملتا ہے جن کا علمی پیشہ خاص طور پہ عالا ہوتا ہے ان کو آٹھ سو روبل ماہانہ تک وظیفہ ملتا ہے۔

"اور آپ رہتے کہاں ہیں؟" میں نے داداش سے پوچھا جواب میں انہوں نے مجھے طلبا کے اقامت خانے میں آنے کی دعوت دی۔ یہ یونیورسٹی سے کچھ دور ایک عالیشان چار منزلا عمارت ہے۔ یہاں پانچ سو تیس نوجوان لڑکے اور لڑکیاں رہتے ہیں۔ داداش بن رحیم ایک پرکشش اور ہوادار کمرے میں ایک اور طالب علم کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کمرے میں دو پلنگ، ایک کپڑوں کی الماری، پینے کا ڈیسک اور کرسیاں ہیں۔ خود اقامت خانے میں کھانے کے کمرے اور کھیس کے جوتوں والا ایک باورچی خانہ ان طلبا کے لیے موجود ہے جو اپنا کھانا خود تیار کرنا چاہتے ہوں۔ ایک دھوبی گھر نوارے دار نلکوں کے غسل خانے مطالعہ کے کمرے اور تفریحی مشاغل کے کمرے ہیں۔ غرضیکہ بستر چادریں وغیرہ بجلی کی مشینی گرمائی پہنچانے وغیرہ کی خدمات یونیورسٹی کی جانب سے مہیا کی جاتی ہیں اور اس کا خرچہ ایک طالب علم کے لیے پندرہ روبل ماہانہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ داداش بن رحیم کو جو وظیفہ ملتا ہے اس کی یہ رقم کوئی چار فیصد کے برابر ہے۔ ایک اور بھی آسانی بڑا اقامت خانہ اسی یونیورسٹی کا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ شہر کے باہر سے آئے ہوئے ایک ہزار سے زیادہ طلبا کو رہنے کے لیے مکانات وغیرہ کا انتظام یونیورسٹی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالی یا اقتصادی حالات سوویت نوجوانوں کی تعلیم کی راہ میں کسی طرح بھی حایل نہیں ہو سکتے۔

آذربائیجان یونیورسٹی کے طلبا اپنے فرصت کے اوقات صحت مند آرام اور تفریح میں گذارتے ہیں۔ پچھلے سال بہت سے طالب علم نے اپنی گرمیوں کی چھٹیاں مزدور سبھا کے خرچے پر آرام گاہ یا سینیٹوریم میں گذاریں۔

مزدور سبھا فی کمیٹی کے زیر انتظام طلبا کے کلب گھروں میں تہذیبی سرگرمیوں کی خوب چہل پہل رہتی ہے۔ کلب میں گانے والے طلبا کا جتھا، موسیقی اور رقص کے گروپ اور شوقیہ ڈرامے کھیلنے والوں کے دو گروپ ہیں۔ آج کل ایک آرکیسٹر تعلیم کیا جا رہا ہے۔ "بیکڑوں طلبا" لوکا "اسپورٹس سوسائٹی کے ممبر ہیں۔ ساحل پہ والی بال کے کھلاڑیوں کشتی لڑنے والے پہلوانوں، مکابازوں، دوڑ بھاگ کے کھیلوں میں حصہ لینے والوں تیراکوں فٹ بال کے کھلاڑیوں کے گروپ ہیں۔ مزدور سبھا اور یونیورسٹی کی طرف سے موسیقی کے ساز اور کھیلوں کا سامان مفت دیا جاتا ہے۔

ہر روز شام کو یونیورسٹی کے کلب گھر میں خوب چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے۔ ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔ ناچ اور سرود کی محفلیں ہوتی ہیں اور فلم بھی دکھائے جاتے ہیں۔

اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے تو کرپا کر کے چندہ منی آرڈر کر دیجیے ورنہ وی۔ پی کی شکل میں جرمانہ زیادہ بیٹھے گا۔

شوکیس

ایاز عصمی

شوکیس کو کامیاب دکانداری میں ایک اہم مقام حاصل ہے کسی بھی بازار کے اس سرے سے اس سرے تک چلے جائیے آپ کو دکانوں اور لنگانوں سے زیادہ شوکیس نظر آئیں گے جنہوں نے پیٹیوں میں آنکھوں کو چندھیا دینے والی اشیا کو دبا رکھا ہوگا اور آپ غیر ارادی طور پر تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی یہ ضرور سوچنے لگیں گے۔ کاش میری جیب بھی وزنی ہوتی۔ آپ کے حلق سے ایک دبی دبی سی آہ نکل کر شوکیس سے سجا ہوا بازار کے ہنگاموں میں تحلیل ہو جائے گی آپ کی نگاہیں ایک مبہم سا ملال لیے کر رہ جائیں گی۔ اور آپ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی جیب میں پڑے ہوئے ان چند سکوں کو ٹٹولنے لگ جائیں گے جو اتنے ناکافی ہوں گے کہ ان کے بنانے میں ان شوکیسوں سے جھانکتی ہوئی کوئی چیز بھی نہ خرید سکیں گے آپ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے یا اگر آپ زیادہ جذباتی ہیں تو موجودہ مقام یا اپنی قسمت پر لعنت بھیجنے والے کو کوستے ہوئے رینگ جائیں گے۔

شوکیس ایک ایسی دعوت نظارہ ہے جو آپ کے دل میں خواہش کی چنگاری کو ہلکے ہلکے ہوا دیتی رہتی ہے اور جب یہ چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھتی ہے تو آپ "نیک و بد" کی سرحدوں کو پھلانگ کر شوکیس کا سنہرا چیز کو اس کے اندر دبی ہوئی اپنی پسندیدہ چیز حاصل کر لیتے ہیں۔

آپ کے دل کی بات بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں مگر اپنا تو یہ حال ہے کہ مجھے یہ سوچ کر ہی ان شوکیسوں سے نفرت سی ہونے لگتی ہے کہ ان خدغرضوں نے صرف اپنا وقار حسن سجاوٹ اور جگمگاہٹ برقرار رکھنے کے لیے لاتعداد نازک اور خوب صورت چیزوں کو اپنے سینوں میں جکڑ رکھا ہے انھیں قید کر رکھا ہے۔ معاف کیجیے گا میں ذرا جذباتی واقع ہوا ہوں۔ اور میں اکثر جذبات کی رو میں بہہ کر ان شوکیسوں میں محبوس کسی چیز کو خرید لیتا۔ اگرچہ ان میں اکثر چیزیں میرے کام کی نہیں ہوتیں۔ مگر ان کے حصول کے پیچھے میں سارے ماہ کی گاڑھے پسینے کی کمائی بہا دیتا بھی دریغ نہیں کرتا۔

بھلا آپ ہی بتائیے "الاسٹک" کیا، جو اس دن میں نے پورے نو روپے گیارہ آنے ۶ پائی میں مشہور ہوزری مرچنٹس میسرس چھینگا مل کرپلا رام کے دکان سے خریدا تھا میرے کس کام کی تھی۔ جی ۔ ابھی تک گنوارا ۔ ۔ ۔

چاندنی کی شکل میں چمپا یا جاتا ہے۔ اور پھلے روٹیاں اپنی اصلی شکل میں چلی جاتی تھیں۔ اور اسی لیے عادی چور بھی چوری سے توبہ کر لینے کے بعد بھی ہیرا پھیری سے باز نہ آ سکتا تھا کیونکہ زندگی تو نام ہی ہے ضروریات زندگی کے لیے ہیرا پھیری کرنے کا ہیرا پھیری کے ذکر پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی۔ جو کہیں میں میں نے نانی اماں یا شاید دادی جان سے سنی تھی کہ کسی ملک میں ایک عادی چور تھا جو چوری کے مال سے بہت امیر کبیر ہو گیا مگر اس نے چوری کی عادت نہیں چھوڑی۔ دوسروں کے گھروں میں چوری کرنے میں اب بے عزتی کا احتمال تھا۔ وہ ہر رات گھر سے نکل پڑتا اور رات گئے اپنے ہی گھر میں چوری کر ڈالتا۔ اور چوری کے پیسے سے خوب خوب عیش کرتا۔

کہتے ہیں کہ کامیاب زہر پلانے والے سو دکھانے والے اور طرح طرح سے چوری کی تلقین کرنے والے اسی چور کی نسل سے ہیں۔

واسطہ علم یا الصواب! دیکھیے نا بات انگیا سے چلکر کہاں چمک گئی ہاں تو ان کے پر بھی ختم نہیں ہوئے تو اکثر ارٹ پٹانگ چیزیں خرید لیتا ہوں۔ کبھی جاپانی ہوا کبھی کچ تو کبھی کچ۔ اور کبھی کبھی تو میں اپنی پوری پوری تنخواہ خرچ کر کے بھی شوکیسوں میں محسوس کوئی چیز حاصل کر لیتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں وہ مجاہد ہوں جس نے اپنا سب کچھ کھو کر کسی مجبور کو قید سخت سے آزادی دلادی ہو۔ میری جیب خالی ہو چکی ہوتی ہے مگر سینہ گرا ہوا ہوتا ہے اور سر فخر سے دو بالشت میں اپنی خریدی ہوئی چیز کا پیکٹ اپنے سینے سے لگائے ہوئے اس طرح اکڑا ہوا نکلتا ہوں جیسے میں چھینگا مل کی دکان سیٹریوں پر سے نہیں بلکہ اس کی لاش کو روندتا ہوا گذر رہا ہوں۔

ان شوکیسوں کا نظارا مجھے کئی طرح کے احساسات کے جال میں لپیٹ لیتا ہے۔

(۱) میں جب کسی شوکیس والی دوکان کے سامنے سے گذرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی بازار حسن سے گذر رہا ہوں۔ جہاں کچے گھروں کے "سکھوں" کے مدفن ہوں جن پر جگمگاتے ہوئے قمقموں نے ماحول کو اپنی زبان سے تو کچھ نہیں کہتا سا اور پھر یہ شوکیس بھی تو کسی سے کچھ نہیں مانگتے بس خوشنما جیب کتروں کی طرح راہگیروں کی جیبکاٹ لینے رہتے ہیں اور یہ بھی کبھی کبھار صرف راہزنوں کو ہی آتا ہے یوں نیچے سجاوٹوں کو بھی رہتے ہیں مگر ان کی چھین راتوں کو دیکھ کر ڈٹ جانا بس یقینی سا ہو جاتا ہے۔

کی فضا کو قدرے جگمگا کر اس کے بھیانک پن کو قدرے کم کر دیا ہو۔

(۲) یا میں کسی ایسے رئیس پر دے کو دیکھ رہا ہوں جس کے پیچھے بے شمار گھر دں کے سکھ، بھوک، مفلسوں کی سسک کنواریوں کے جان کنی تبسم اجالوں کے ارمان، بوڑھوں کی دیرینہ تمنائیں، بیوہ بوں کے تقدیسی ہاؤں کی حسرتیں اور بھوکوں کی نیلی پیلی چیخیں اور ہچکیوں کی اساس سے لدی ہوئی اگا ہیں ان شوکیسوں کا کا طواف تو کر سکتی ہیں مگر گھروں کی میلی متعفن اور گھٹی گھٹی فضا ان شوکیسوں کی نمائش تشنیع کی بوچھاڑ سے کراہنے کی اجازت نہیں پاتی یہاں خاصہ خاصا کئی سوال پیدا ہو سکتے ہیں ان میں ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ضرورت ہے کہ شوکیسوں میں سجائی ہوئی سجاوٹی قیمتوں والی چیزیں ہی خریدی جائیں کیوں نہ معمولی خرید کر کام چلا لیا جائے تو شاید عام انسانوں کی طرح کیونکہ میرا خاندان میرا کنبہ میری بیوی جو اپنے دل کا کانٹا اچھی چیز حاصل کرنے کو کسی کا جی نہیں چاہتا یا ویسی صورت میں کہ اس کے سہم سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیں اور دلوں میں اس کے حصول کا طوفان اٹھنے آسے کون بھلا آدمی کل کی سوچ سکتا ہے۔

تجھ کو کم کر دیا جلووں کی فراوانی نے۔ سیستم دیکھ کر م نے تیرے لوٹا کیا

(۳) کبھی کبھی تو مجھے یہ شوکیس دو۔ باہر دلال الفرنگ کہتے ہیں۔ جو مہینا کا بھرم دے کر نئے بگڑوں کو نا تجربہ کاری کے دام میں پھنسا دیتے ہیں۔

(۴) یا اس خوانچہ والے کی صورت نظر میں گھوم جاتی ہے جو شاید ہوکے چوراہے پر خوانچہ سجائے نہایت میٹھے لہجے میں آواز لگا رہا ہے۔ "تازہ ہے تازہ" جہاں نہایت نہایت عمدہ اور ماہر فن دلال یا شیریں سخن خوانچہ والے کی چکنی چپڑی میں پھنسکر دو کاندار کے آگے اپنی جیب الٹ دیتا ہے ایک طرف خید کے کھنکھنا اٹھتے ہیں۔ دوسری طرف کے دبے لرزہ کر گل ہو جاتے ہیں قیمتی چیزیں بیکار گاہکوں کی مسکراہٹیں کہ اس خیال سے گھٹ جاتی ہیں کہ یہی پیسے کئی وقتوں کی روٹی کے لیے کافی ہو سکتے تھے۔

کبھی تو یہ شوکیس مجھے اس حریص ملاکی طرح دکھائی دیتے ہیں جسے اس سے بھی بھوک نہیں ہوتی کہ مرد اور خرچ میں گیا یا جنت میں اسے تو بس اپنے ملوے مانڈے کی فکر ہوتی ہے جو نیت تو نماز کی کر کے کھڑا ہو جاتا ہے مگر خیالات اس کے کسی مینہ دار کی دولت یا کسی بیوقوف کی جیب کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔

(۶) اور کبھی ان شوکیسوں کو دیکھ کر مجھے اپنے گاؤں کا وہ اندھا فقیر یاد آ جاتا ہے جو شہر کے بڑے چوراہوں پر خاش ہاتھ پھیلائے مجسم سوال بنا کھڑا رہتا ہے

تبصرے

چاند سائز ۱۷×۲۷/۸ جم ۵۰ صفحے لکھائی چھپائی بہتر ٹائیٹل آرٹ پیپر رنگین ایک پرچہ ۲ چند سالانہ ۲۴ روپے ۱ ملنے کا پتا حنیف بک ڈپو محمد علی روڈ۔ ناگپور۔

بچوں کے اس ماہوار رسالے کا چھٹا نمبر ہمارے سامنے ہے خوشی کی بات ہے کہ یہ رسالہ ہر مہینہ بلا بندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ آشا ہے کہ اس کے چلانے والے وقت کی پابندی کا خاص لحاظ رکھیں گے۔

ہندستان میں بچوں کے رسالوں کی بڑی مدتک کمی ہے حالانکہ تناسبی اعتبار سے بچوں ہی کی تعداد زیادہ ہے بنگلہ، گجراتی اور مراٹھی سے بچوں کے دو چار رسالوں کا نکلنا ان لاکھوں ہی پڑھنے لکھنے والے نوٹوں کی ضرورت کا لحاظ کرتے ناکافی ہے پولیس ایکشن سے پہلے اور بعد حیدرآباد میں بھی اس قسم کی کوششیں کی گئیں مگر آخر کار سبھوں ہی کو ناکامی کی صورت دیکھنی پڑی۔ اس لحاظ سے ناگپور جیسے اندھیارے خطے سے "چاند" کا طلوع ہونا اس کے کام کرنے والوں کی ہمت اور بلند حوصلگی کا ثبوت ہے۔ ہماری یہ دلی تمنا ہے کہ یہ "چاند" اپنی مقصد کا تجرباتی چاند نہیں۔ بلکہ آسمان صحافت پر ہمیشہ چمکنے والا چاند ثابت ہو۔

"چاند" میں مضامین بھی ہیں اور نقلیں بھی۔ ان کی ترتیب میں بچوں کے مذاق اور میلان کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

بچوں کی نفسیات کی نباضی بہت ہی کٹھن کام ہے کنڈرگارٹن کا طریق تعلیم اسی نفسیاتی مطالعے کا اہم نتیجہ ہے۔ ایسی کو نپل باغ بلکے بھلکے کاموں اور دل چسپ مشغلوں کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کھیلوں کے ذریعے تعلیم کا طریقہ بچوں کو بہت زیادہ بھاتا ہے اسی طرح ہماری رائے میں بچوں کے رسالے کو پورے کا پورا مصور کرنا چاہیے۔ بلکہ ہر مضمون کا ہر پیراگراف مصور رہے تو اور بھی زیادہ اچھا ہوگا۔ اس سے دہرا مقصد پورا ہوگا۔ اور پڑھے لکھے بچوں میں رسالے پڑھنے کا شوق بڑھ جائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ اپنی گونا گوں آبیاری ہو رہی ہے۔ آخر میں ہم چاند کے حلقہ گویندگان (اسٹاف) کو ان کی اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں۔ "ا"

گوں دل چسپیوں کے سبب سالا بچوں میں بہت زیادہ مقبول ہوگا جب مانگ بڑھے گی تو اس کے قدم بھی جم جائیں گے۔

ایڈیٹوریل نوٹس کی زبان اور بھی زیادہ نرم سادہ، سلیس اور سیدھی سادی ہونی چاہیے۔ ایسا محسوس ہو کہ میٹھے بولوں میں نصیحتوں سے باتیں ہو رہی ہیں اور اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے کہ غلط مشدد استعمال نہ ہوں ورنہ اطمینان ہی غلط ہو جائے گی۔ چنانچہ مئی ۵۵ء کے ایڈیٹوریل نوٹس میں "کہانی کار" لکھا گیا ہے حالانکہ اس کا صحیح استعمال کہانی نگار یا کہانی نویس ہے۔ کار کا استعمال، اداکار ہدایت کار، حسن کار، چترکار اور فن کار کے ساتھ صحیح ہو سکتا ہے۔ بچے کیا جانیں۔ رسالے میں جو کچھ بھی دیکھا اور پڑھا وہی یاد کر لیا آگے چل کر وہ غلط بھی کہانی نویس یا نگار کے معنی میں کہانی کار استعمال کرنے لگیں گے چونکہ رسالے بجائے خود مودب ہوا کرتے ہیں اس لیے پہلے غلط ان کا با ادب اور با معنی ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔

جون کے پرچے میں بھی اسی قسم کی چند اور فروگذاشتیں موجود ہیں مثلاً ایڈیٹوریل نوٹس کے سلسلے میں صفحہ ۱، پر لکھا ہے "چاند میں جن بچوں کے مضامین شایع نہ ہوں انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ مضامین بدخط تھے اور دفتر والوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا ہے" ردی کی ٹوکری میں ڈالنا بے کار کر دینے کے معنی میں ضرور آتا ہے لیکن اس میں تحقیر کا پہلو ہوا کرتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا جو اس کی بجائے رد کر دیے جاتے یا بے کار کر دیے جاتے یا اسی مفہوم کی دوسری عبارتیں میں ایک غلطی فراسٹریشن ٹریک کی بجائے فرسٹیشن ٹریک اور دوسری گونڈی گنبد جبالپور کی بجائے گول کنڈا بیجاپور ہے مضمون "ایک رات میں لمبی داڑھی" کا نتیجہ "مطلب شعر فی بطن شاعر" کے مصداق ہو کر رہ گیا ہے۔ اختر برہان پور کے تمام خط کی زبان "میں اب تک کنڈو کے وہ کیفیتیں لمحات نہیں بھلا سکا جو تمہاری معیت میں بیتے تھے۔ کاش کہ وہ جاودانی ہوتے" بچوں کے پرچے کو شوخ نہیں دیتی۔ غلط تصویریں عموماً بے تکی اور بھونڈی ہوا کرتی ہیں۔ اگر مناسب نہ ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن شکلوں میں بے معنی سی بھی ہو جاتی ہیں، اس لیے ان میں جان بھرنے کی طرف خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے بہر حال ان چند فروگذاشتوں کو چھوڑ کر "چاند" اپنی خوبیوں کا

Ql 3
Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN)

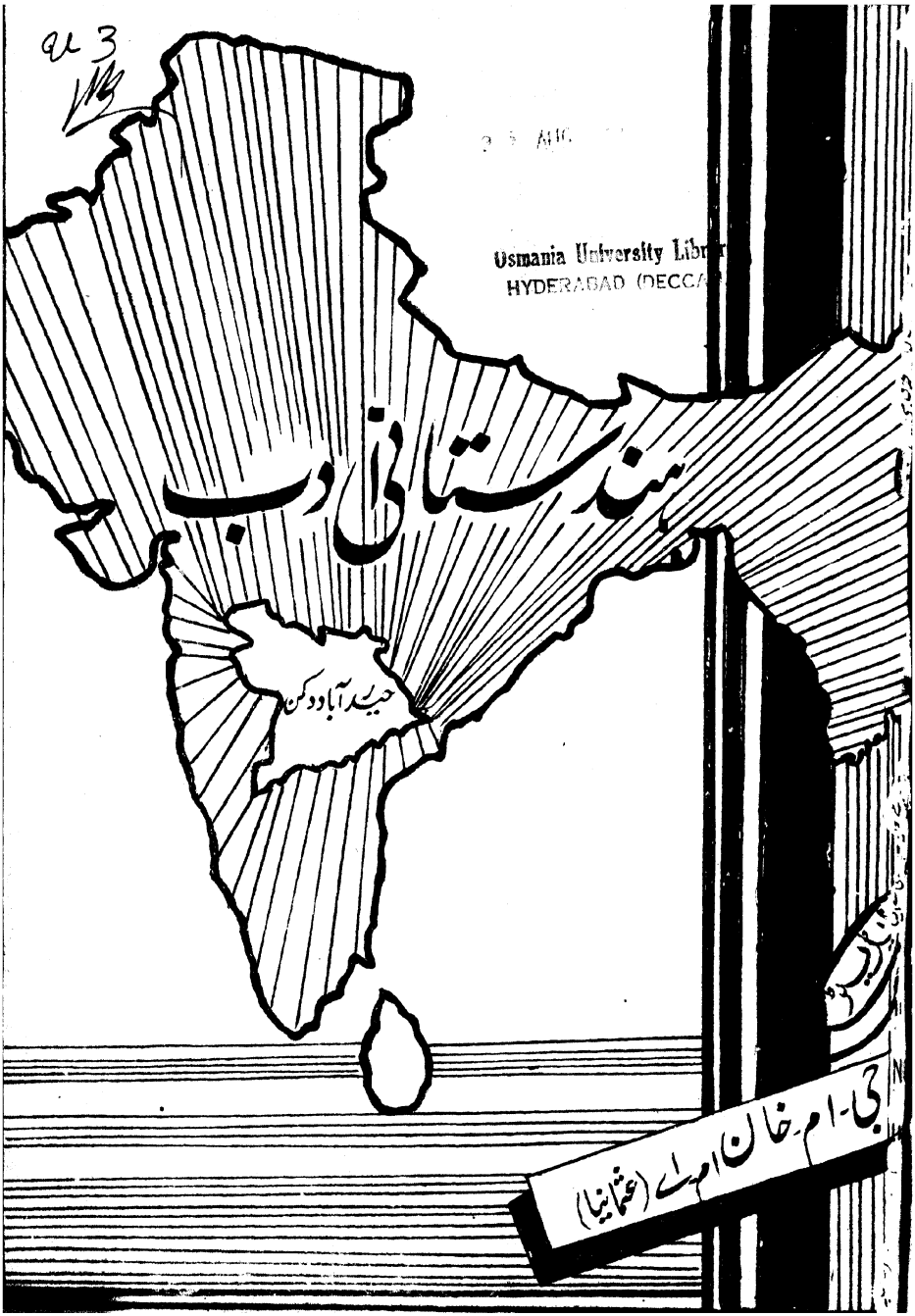

جی۔ ام۔ خان ایم اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹ اے۔ اعظم پورہ شرقی۔ پی۔ او۔ جوبلی۔ حیدرآباد دکن ۲

حکومت، پنجاب، میسور، اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)

چندہ سالانا چھ روپے — قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

جلد (۱۳) — نمبر (۱۰)

شہریور ۱۳۶۲ ف — جولائی ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر ۲	امریکی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم صحت کے لیے ٹیلی ویژن کا استعمال	یو سیس ۱۶
حقایق و معارف	افقر موہانی وارثی ۳		
جنگ کون چاہتا ہے	ادیب سہیل ۴	آدمی میں خدائی قوت	ا۔ ا ۱۸
حجاج بن یوسف	ڈاکٹر پیر سیادت علی خان ۵	لیکیلا پتھر	قمرالدین قمر ۱۹
کنارے کنارے	اطہر شیر صبائی ۷	سورج کی حرارت سے کام کرنیوالا چولہا	ا۔ ا ۲۳
ایک سوویت ناول نگار	زرینہ کیدرنیا ۸	گونگی	اقبال رشید (عادل آبادی) ۲۵
برطانیا میں پریس کی آزادی	ب۔ ا ۱۰	طلبا کا شہر	د۔ ا ۳۰
ایک دریا ایک جوہڑ	ایاز عصمی ۱۲	لندن میں ہندستانی طلبا کا اپنا گھر	ب۔ ا ۳۲

ہمارے خیالات

ذرا یہ مذاق تو ملاحظہ ہو ــــ!

"سرو جنک سمپارک وبھاگ میں ہمے پتر بھوگ آؤ"

یہ کوئی قصہ، کہانی یا افسانے کی کتاب نہیں بلکہ ایک سچی خبر کا خلاصہ ہے جو ۱۷ر جولائی ۵۳ء کے روزنامہ انگریزی خبار "فری پریس جرنل (بمبئی) میں چھپی ہے۔ لکھا ہے کہ ــــ

"اتر پردیش کی طرح راجستھان میں بھی ہندی کو سنسکرت آمیز بنانے کا جنون بعض خاص حلقوں اور خصوصاً سرکاری عہدے داروں کے سر پر اس طرح سے سوار ہو گیا ہے۔ ان کی ہر کوشش یہ ہوا کرتی ہے کہ ہندی بھاشا کو کٹھن سے کٹھن بنایا جائے۔ لکھنے پڑھنے اور سرکاری مراسلت کے علاوہ بعض کم عقل قسم کے عہدے دار سنسکرت آمیز ہندی میں بولا بھی کرتے ہیں جب کبھی وہ ایسی بھاشا بولتے ہیں تو صاف طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض تصنع اور بناوٹ کا نتیجہ ہے دوسرے یہ کہ بات کرتے وقت گویا ان کا دم گھٹا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مصنوعی شد اک اٹک کر ادا ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی باتیں سننے کے لیے جیتاں اور ایک تماشا بن جاتی ہیں۔"

اسی خبر میں آگے چل کر یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ــــ

"جودھپور میں سکریٹریٹ کا ایک عہدے دار خاص طور پر اس کا خیال رکھتا ہے۔ اس کا مطلب سمجھنے کے لیے مترجم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اہلکار اور چپراسی تو اس کے اجلاس پر جانے کھبراتے ہیں خصوصاً پینٹی کا چپراسی جب کبھی اس کے سامنے جاتا ہے تو ہم کو رہ جاتا ہے کہ نہ معلوم اب کی دفعہ ایٹم بم برسے یا ہائیڈروجن بم یا اس سے بھی زیادہ طاقت ور کوئی بلا نازل ہو۔"

فری پریس جرنل کے خاص نمائندے نے آگے چل کر بیان کیا ہے کہ ــــ

"ان ذات شریف، نادان اور بدنفس عہدے دار کا ایک تازہ ترین کارنامہ یہ ہے کہ ایک روز حسب معمول گھنٹی بجا کر اس نے پینٹی کے چپراسی کو بلوایا۔ چپراسی غریب کو حاضر ہوئے بغیر چارہ نہ تھا چنانچہ وہ ہانپتے کانپتے ہانپتا ہوا دھیرے کے سامنے جا کھڑا ہوا مگر ابھی بھاشا "ہندستانی" ترقی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ کانپ رہا تھا اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے جیسے ہی ہماشے کی اس پر نظر پڑی تو دریافت کیا۔ تمہیں جاڑا بخار تو نہیں ہے چپراسی نے بات جوڑتے ہوئے عرض کیا جی نہیں۔ پھر تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو مجھ سے عہدے دار نے ڈانٹ کر کہا کیا میں کوئی بھوت ہوں؟ نہیں حضور! میں اس لیے ڈر رہا ہوں کہ سرکار کے منھ سے اب کی بار نہ معلوم کیسا ڈراونا اور بھیانک بھوت نکلے۔ کیا کہتے ہو۔ عہدے دار نے غصے سے کہا۔ بھوت اور میرے منھ سے۔ جی ہاں غریب پرور! وہ آپ اتنے موٹے موٹے شبد بولتے ہیں تا اس گنوار کی سمجھ میں نہیں آتے تو پھر کیا کیا جائے ایسی حضور! کہ ذرا آسان ہندی میں بولا جائے تاکہ میں سمجھ سکوں۔ کیا کہتے عہدے دار کہیں کے تم ہمیں سبق سکھانے آئے ہو۔ جبردار! آئندہ اجو کبھی بھی ایسے شور کی جرات کی۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کو سن کر چپراسی لوٹ ہی رہا تھا کہ عہدے دار نے کہا۔ کہاں جاتے ہو ادھر آؤ۔ ہاں سنو! **"سرو جنک سمپارک وبھاگ میں ہمے پتر بھوگ آؤ"**

اخباری نمائندے کا کہنا ہے کہ چلے کے منتے ہی چپراسی سر پٹ لوٹا اس پر عہدے دار نے جھنجھلا کر کہا "کہاں جاتے ہو؟" اس پر چپراسی نے پلٹ کر جواب دیا حضور ذرا صبر تو کیجیے۔ اس کے سمجھنے کے لیے سبٹ گو وند داس اور شری ٹنڈن جی کو بلائے لاتا ہوں" اور اجلاس سے باہر چلتا بنا۔

دیکھی آپ نے ہندی کے اندھے پجاریوں کی دماغی کیفیت! حالانکہ وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ مراسلہ بلیک لیبل آفیسر کے آؤ۔ اس جملے کو ایک چپراسی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ نہ معلوم تعصب کا یہ جراثیم کہاں سے کہاں نکل جائے۔ انسان عقل کے اندھوں کی معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم کی متعصبانہ حرکتوں سے بھاشا کو بجائے فائدے کے نقصان ہی اٹھانا پڑتا ہے اس لیے بھاشا کی بھلائی کی خاطر وہ لوگ جو اپنی ان تنگ نظریوں سے باز آئیں تو مکمل ہے ہی بھلائی اور بہتری کی کوئی صورت نکل آئے ہمیں آشا ہے کہ ان مخالفتوں کے باوجود

حقایق و معارف

افقؔ موہانی

کب درد کو جینے کا سہارا نہیں سمجھے
ناوک کو ترے جان تمنا نہیں سمجھے

کعبہ نہیں سمجھے کہ کلیسا نہیں سمجھے
ہم سنگ در یار کو کیا کیا نہیں سمجھے

دنیا کو باندازۂ دنیا نہیں سمجھے
ہم اپنی تمنا کو تمنا نہیں سمجھے

کیوں ترک وفا کی ہو بھلا ان سے شکایت
وعدے کو جو اپنے کبھی وعدا نہیں سمجھے

غایب کی تمنا نہیں حاضر پہ نظر ہے
ہم آج کے ہوتے غم فردا نہیں سمجھے

برباد نشیمن ہوا گلشن ہوا تاراج
اے برق مگر ہم تیرا منشا نہیں سمجھے

دیکھا کیے بے پردۂ ہر رنگ میں ان کو
ہم پردۂ ہستی کو بھی پردا نہیں سمجھے

ساحل پہ نظر آئے جو طوفان سے بچ کر
ہم اس کو کبھی اپنا سفینا نہیں سمجھے

ہم کہہ گئے دو لفظوں میں روداد محبت
کیا جانے وہ سمجھے بھی اسے یا نہیں سمجھے

دنیا میں قیامت ہیں ترے درد کے ہوتے
جس جاگے ہم اپنے کو تنہا نہیں سمجھے

نظروں میں نہاں جلوا ہے جلوے میں نظر گم
اے ذوق نظر ہم یہ تماشا نہیں سمجھے

بیتابیٔ دل کو مری دیکھا تو کیے وہ
تھا راز جو کچھ درد نہاں کا نہیں سمجھے

دیکھا کیے ہم رنگ مجازی میں حقیقت
دنیا کے تماشے کو تماشا نہیں سمجھے

ہم دیکھیں گے جلوے کو ترے پھر سے نظر آ
موسیٰ جو تجھے برق تجلا نہیں سمجھے

اب اس سے زیادا بھلا کیا اور سمجھتے
دنیا کو ہم افقؔ کبھی دنیا نہیں سمجھے

جنگ کون چاہتا ہے؟

(یہ اس وقت کی بات ہے جب کوریا میں امن کی پہلے پہل گفتگو شروع ہوئی)

منظوم رپورتاژ

ادیب سہیل

افراد ــ سیٹ جی
سیٹ جی کا ہمسفر

منظر ــ (سانتا بارجنکشن پہ گاڑی رکی اور اخبار والے نے دی یہ صدا
"ہیرلڈ پاسبان، ہندآزاد اور مارننگ نیوز اسٹیٹس من، پیپر کا"
ایک ڈبے میں بیٹھے ہوئے سیٹ جی نے کے اخبار سرخی کو پڑھنے لگے
ہو کے خبروں سے کچھ وہ پریشان سے اپنے اک ہم سفر سے مخاطب ہے)

سیٹ ــ بابو جی کیا یہ سچ ہے کہ ہو جائے گی ختم "بدھ" کو ریا کی بہت جلد ہی؟

ہمسفر ــ جلد وہ دن بھی آئے کہ رخ گیتی پہ کھل اٹھے تازہ گلوں کی جبین
جلد وہ دن بھی آئے کہ آباد ہو جائے اجڑا ہوا کوریا کا چمن
جلد وہ دن بھی آئے کہ گائیں یہاں امن کے گیت دریا و کوہ و دمن
جلد وہ دن بھی آئے کہ چہرے کے پھولوں کے افسردہ ہونٹوں پہ آئے کرن

وقفہ

امن ہی کی جھلکتی ہوئی آرسی میں سجاتی ہے زلفوں کو یہ زندگی
امن ہی کے اجالے میں منزل تلک پاؤں اپنے بڑھاتی ہے یہ زندگی
امن ہی سے ہے سارے جہاں کا بھلا امن ہی سے ہے مرا تمہارا بھلا
جنگ لاتی ہے ساتھ اپنے خونی فضا۔ جنگ ہے ایک کالی بھیانک بلا
جنگ آتی ہے اپنے پروں پہ لیے گیس بارود گولے ہموں کی جہاں
جنگ ہے بھوک افلاس و فحط و وبا جنگ ہے نالہ و شور و آہ و فغاں
جنگ ہے عارض گل کی افسردگی جنگ ہے زرد اجڑی گلستاں کا پیام
جنگ ہے داغ بادل کے لیتے لہو اور زہر آلود ہے ایک جام
جنگ دھلی کی روتی ہوئی سچ ہے جنگ سکوں کی گھنگھور بدلیا ہے
جنگ جھولے سے اٹھتی ہوئی چیخ ہے جنگ گھٹ کی بہو لی سی ہے

سیٹ ــ بابو جی لیکن اپنا تو اس امن سے کاروباری طریقے پہ نقصان ہے
سچ تو یہ ہے کہ یہ جنگ کا سلسلا یہ "برائس" کی اور لابھ کی جان ہے
دیکھیے نا یہی، امن کے واسطے گفتگو کی ہوئی ادھر ابتدا
اور ادھر من میں پندرہ پیسے اک اک جو ٹ سٹاک میں پڑ سی گئی کا دگنا
کوریا میں اگر امن کے واسطے گفتگو ان کی "ایس میں طے پا گئی
پاٹ میں صرف نقصان ہو جائے گا تیس روپوں کا فی من ہے بابو جی

وقفہ

کیا ہی اچھا ہو یہ جنگ کا سلسلا یہ دنوں اور بھی یوں ہی جاری رہے

ڈاکٹر میسیادت علیخان

حجاج بن یوسف

(پندرویں قسط)

باب (۱۳)

فتوحات سند

وسط ایشیا کی فتح حجاج کا بھی اتنا ہی عظیم الشان کارنامہ ہے جتنا قتیبہ بن مسلم کا۔ بلکہ اگر سچ پوچھیے تو حجاج کا حصہ اس میں بڑا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ حجاج ہی تھا جس نے کشت وخون اور ہلاکتی سے بچا کر عراق کو پر امن کر دیا۔ کوفہ اور بصرہ کی جھاڑیوں کی حالت درست کر دی۔ عراق کے خزانے کو معمور کر دیا۔ غرض عراقین کو وسط ایشیا کی فتوحات کی ابتدا کرنے کے قابل بنا دیا اور پھر خراسان کو جو اس وقت سخت قبائلی اختلافات میں مبتلا تھا سنبھالا۔ اور قتیبہ بن مسلم جیسے موزوں شخص کا انتخاب کر کے فتوحات وسط ایشیا کے احکام دیے۔ اور جزو تا کل امور پر نگرانی رکھی یہاں تک کہ قتیبہ کی ازواج کو یقین آ گیا تھا کہ قتیبہ کے پیچھے حجاج کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اور حجاج کی وہ بزرگی اور قابلیت عظمت اور عزت ان لوگوں کے دلوں میں تھی کہ یہ لوگ بلکل ہی فرمانبردار اور مطیع ہو گئے۔ جس کام پر لگایا لگ گئے۔ غرض یہ کہ فتوحات وسط ایشیا اتفاق سے دیکھا جائے تو بہت بڑی حد تک حجاج ہی کے کارنامے ہیں ان کو وضاحت سے لکھنا اس لیے ضروری تھا۔ نیز ان کی تفصیل اس لیے بھی ضروری تھی کہ آج تک کسی انگریزی، ہندستانی، فارسی یا عربی کے مصنف نے تواریخ کے مختلف اور متضاد بیانات سے صحیح واقعات کو مسلسل اور مربوط طریقے پر بیان نہیں کیے تھے۔ اور نہ اب تک کسی سے سوا کسی مورخ نے بھی اس تشریح وبسط کے ساتھ صحیح واقعات پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا کی تھی۔ لیکن اس خصوص میں صرف ایک مورخ گب کا استثنا ہے جس سے ہماری مراد اس کی مشہور کتاب "عربی فتوحات وسط ایشیا" ہے۔ مگر ہم نے اس کتاب سے کوئی استفادہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے اپنی تحقیقات کے دوران ہمیں گب کی کتاب کا علم بھی نہ تھا۔ یہ یاد رہے کہ ہم نے راست عربی تاریخوں سے جو مواد فراہم کیا ہے وہ اس تفصیل کے ساتھ گب کی اس تاریخ میں بھی موجود نہیں۔ ہمارے اس دعوے کی تصدیق تو ہمارے گائیڈ پروفیسر جمیل الرحمان نے ندوی کی تھی اور اپنا مقالا ختم کرنے کے بعد ہم نے گب کی کتاب کا مطالعا کیا تو اپنے پیش کیے ہوئے مواد کو گب کی تحقیق سے کچھ کم نہ پایا۔ اس لحاظ سے ہماری تحقیق اور چھان بین کو پروفیسر گب کی تاریخ سے دور کا بھی واسطا نہیں یہ وضاحت محض اس لیے کرنی پڑی کہ بعض شکلوں میں گب سے ہماری تحقیق لڑ گئی ہے۔ پڑھنے والوں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ ہم نے اپنے مقالے کی تیاری میں گب کی مشہور کتاب سے استفادا کیا ہے مختصر یہ کہ فتوحات وسط ایشیا کو تفصیل سے اس لیے لکھا گیا ہے کہ یہ حجاج کے زریں کارنامے ہیں اور ان کو آج تک کسی نے اجاگر نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس فتوحات سند کی حالت ایسی نہیں ہے ایلیٹ کی تاریخ ہند۔ تحفۃ الکرام اور چچ نامہ میں کافی تحقیقات کے ساتھ سند کے حالات موجود ہیں۔ بلاذری طبری اور ابن اثیر میں بھی مختصرا اختصار کے ساتھ یہ حالات پائے جاتے ہیں۔ ہندستانی میں ہاشمی نے نہایت حسن وخوبی سے تاریخ ہند جلد دوم میں اس کو بیان کر دیا ہے۔ اس وجہ

سے ہمارے لیے ضروری نہیں کہ فتح سندھ کے واقعات کو تفصیل سے لکھیں۔ البتہ حجاج کی ثابت جوان فتوحات میں بھی نمایاں تھا اس کو ضرور واضح کیا جائے گا۔ افسوس کہ مورخ ہاشمی بھی حجاج کو "خونخوار" کہنے سے باز نہ رہے۔ صرف انہیں پر ہی کیا منحصر ہے یہ فاش غلطی تو ہر ایک مورخ ہی نے کی ہے۔ سندھ کے حملے کا سبب بہ قول ہاشمی علافی قبیلے کے عربوں کا ایک یا دو والیان مکران کو قتل کرنا تھا اور ان لوگوں نے سندھ میں راجا داہر کے پاس پناہ لی تھی۔ حجاج بن یوسف نے محمد بن ہارون کو والی مکران بنا کر بھیجا اور ان قاتلوں کی گرفتاری کا حکم بھی دیا تھا چنانچہ محمد بن ہارون پانچ سال تک ان کا تعاقب کرتا رہا۔ دوسرا سبب وہ مشہور واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی چند کشتیاں دیبل کے قریب بحری قزاقوں نے لوٹ لی تھیں غرض خلافت کے مفرور باغیوں کو پناہ دینے اور عربی قزاقوں کی سرکوبی کی ضرورت کی وجہ حجاج بن یوسف کو سندھ پر حملے کا حکم دیا۔ عبداللہ بن نبہان اور بدیل بجلی کے دو حملے ناکام ہوئے اس میں مسلمانوں کا بھاری نقصان ہوا۔ اس کے بعد سندھ کو فتح کرنے کے بارے میں حجاج کا ارادہ اور بھی زیادہ مستقل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے قسم کھائی کہ اس ہزیمت کا سخت انتقام لیے بغیر نہ رہے گا۔ جب والی سیستان (جنکہ ابادسندکا قدیم نام) کو حجاج کے اس عزم کی اطلاع ہوئی تو عربی فوج کی بڑی چڑھائی کی قوت کے ڈر سے اس نے صلح کا پیش کش کیا۔ جب اس کی اطلاع حجاج کو دی گئی تو حجاج نے صلح کو قبول کرتے ہوئے ایلچی کو جتلا دیا تھا کہ اگر مسلمان قیدیوں کو بھی سالم نہ چھوڑ دیا گیا تو والی سندھ سے کہدینا کہ سرحد چین تک کسی بھی غیر مسلم کو امان دی جائے گی۔

اس واقعے کے فوراً بعد حجاج نے مشہور زمانہ نوجوان محمد بن قاسم کو چھ ہزار فوج دے کر بھیجا۔ اس لشکر کی تیاری پر ہم نے اوپر تفصیل سے لکھا ہے کہ کثیر رقم صرف ہوئی تھی اور وہ ساز وسامان سے آنا آراستہ تھا کہ حجاج نے سوئی سے اونٹ تک ساتھ کر دیا تھا۔ دیبل کا سختی کے ساتھ محاصرہ کیا گیا۔ اور بہ قول ابن اثیر دیبل کی فتح حجاج کی ایک تدبیر سے سہل ہو گئی۔ شہر کی "مقدس پول" میں ایک "مقدس جھنڈا" تھا۔ اہل شہر کو فتح کی طرف سے مستغنی کر رکھا تھا۔ حجاج کے حکم سے "جبّ عروس" نامی منجنیق نے پتھر سے اس کو گرا دیا تو فتح آسان ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ دیبل میں تین روز کشت وخون کا بازار گرم رہا۔ چچ نامہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن بعض اور مقیس بے وقعت ہیں۔ ابن اثیر نے یعنی قتل عام کا ذکر کیا ہے۔ ہاشمی لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ پچھلی قزاقی اور لڑائیوں کا غصہ سمجھیے یا اتنے دن تک محاصرے کی جھنجلاہٹ۔ لیکن واضح ہو کہ طبری میں اس قتل عام کا ذکر نہیں ہے۔ بہرحال اتنا تو مسلم ہے کہ دیبل کے سوا کسی اور جگہ قتل عام نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم جہاں بھی گیا ہر باقی اور امن کا پیام ساتھ لیتا گیا۔

محمد بن قاسم کی وسعت فتوحات کے متعلق ہم ہاشمی کی رائے سے متفق ہیں کہ مشرق میں دیالپور اور شمال میں دریائے جہلم تک وہ تمام علاقے جو ان دنوں سلطنت سندھ میں داخل تھے اور اب حکومت پاکستان کا جز ہیں فتح کر لیے گئے تھے جنوب اور مشرق کی طرف بھی موجودہ ریاست جھالاوار اور راجپوتانے کا کچھ شمالی حصہ محمد بن قاسم کے قبضے میں آ گیا تھا کیونکہ اس بارے میں تمام قدیم چچ نامے کے سوا یہ نظر آتے ہیں کہ راجا داہر کی قلمرو کے حدود یہی تھے۔

ابن اثیر نے محمد بن قاسم کی فتوحات کا جو رستا بھی بتلایا ہے وہ یہ ہے:-

مکران — قندابیل — ارماس — دیبل — نیرون (حال حیدرآباد سندھ) نہر مہران (جہاں راجا داہر سے سخت لڑائی ہوئی) شہر راور کی فتح — برہمن آباد — ساوندری سے صلح — بسمد — الور — الیکہ نہر بیاس کو عبور کیا اور ملتان فتح کر لیا۔

محمد بن قاسم کی بہادری اور تدبر کی تعریف اس مضمون میں ہمارا کام نہیں اس کا حق تو ہاشمی نے خوب ادا کیا ہے۔ عبدالملک

کی تعریف خان کریمر نے کی ہے کہ قابل بادشاہوں میں یہ وصف ہوتا ہے کہ موزوں اشخاص کو ڈھونڈ کر کام لیتے ہیں چنانچہ حجاج کو یا نا عبدالملک کا کارنامہ بتایا ہے اسی طرح قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم کو یا نا حجاج بن یوسف کا صحیح کارنامہ تھا۔ ان دونوں قابل فخر فاتحوں اور حکمرانوں پر خود حجاج کو بھی ناز تھا اسی لیے تو اس نے اعلان کیا تھا کہ ان دو میں سے جو بھی چین کو پہلے فتح کرے وہی چین کا وائسرائے ہوگا۔ قتیبہ تو چین سے بہت قریب تھا۔ اس کا چین فتح کرنا جیحون اور سیحوں کی فتوحات کے بعد بعید ہی نہیں تھا۔ لیکن محمد بن قاسم کے متعلق بھی ایلیٹ کو اعتراف ہے کہ حجاج کے حکم کی تعمیل میں ممالک ہند کو فتح کرتے ہوئے چین تک اس کا پہنچ جانا کوئی ناممکن بات نہ تھی۔ افسوس کہ حجاج کی بے وقت موت نے چین کو فتح سے مسلمانوں کو محروم رکھا۔ کیونکہ حجاج بن یوسف کی موت قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم کی بھی موت ثابت ہوئی۔ اس پر ہم جتنا افسوس کریں کم ہے۔ لیکن ذرا حجاج کی اس عظمت اور صولت کو تو دیکھیے۔ کہ صرف وسط ایشیا میں اس کی فتوحات ۷۰ - ۷۰ طول البلد اور ۳۵ - ۴۵ عرض البلد یعنی بلا مبالغہ لاکھوں میل پر مشتمل تھیں اس کے باوجود اس کا حوصلہ اتنا بلند تھا کہ کل چین کی فتح کی سوچ رہا تھا۔ اور ایسے قابل فاتحوں کو اس مہم پر لگا یا تھا جن کے متعلق ایک ایلیٹ یا گبن ہی کو نہیں بلکہ سارے عالم کو اعتراف ہوگا کہ وہ چین کو ضرور فتح کر کے چھوڑتا۔ برا ونگ کا قول ہے کہ آدمی کو اس سے دہ جانچنا چاہیے جو تھوڑا بہت کہ اس نے واقعی کیا ہے۔ بلکہ اس کی صحیح قدر و منزلت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب اس کے تمام منصوبوں ہم پیش نظر رکھیں۔ برا ونگ نے ان تمام منصوبوں یا خیالات کے ممکن یا ناممکن ہونے سے بحث نہیں کی ہے۔ ہمارے خیال میں اگر منصوبے باوجود نہایت بلند یا ہوائی کے ممکن الحصول ہوں تو ناممکن الحصول خام خیالوں پر ترجیح پانے کے قابل ہیں۔ پس اسی سے حجاج کی عظمت اور برتری کا اندازا ہو سکتا ہے۔

کنارے کنارے

اظہر شیر صبا
بی اے (آنرز)

وہ پر کیف لمحے ہمارے تمہارے
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں رنگیں اشارے
یہ آنسو کے قطرے جگر کے شرارے
ہمارے لیے ہیں یہی چاند تارے
نہ دامن بچا اے نگاہ تصور
کہ میں جی رہا ہوں ترے ہی سہارے
سفر بحر ہستی کا دشوار مانا
چلا جاؤں گا میں کنارے کنارے
دیا تھا کبھی تم نے پیغام الفت
ہیں آنکھوں میں اب تک وہ دل کش نظارے
وہ خوش عیش لمحے وہ رنگیں جوانی
بہائے گئے سب محبت کے دھارے
تصور سے ہوں بے نیاز تجلی
مبارک ہوں تم کو یہ جلوے تمہارے
کہاں جانے دل کا سفینا رکے گا
بہت تیز رو ہیں جوانی کے دھارے
میں گم گشتہ راہ ہمرہ وفا ہوں
مجھے اب نہ للہ کوئی پکارے
صبا بہہ رہے ہیں جو آنکھوں سے آنسو
محبت میں ہیں یہ پیامی ہمارے

ایک سوویت ناول نگار

زرینہ کیدارینا

فیودور گلاڈکوف ۱۳ جون ۱۸۸۳ء کو ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔

استادوں کے مدرسے میں تربیت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے پہلے تو سائبیریا کے ایک اسکول میں اور پھر کویان کے اسکول میں پڑھایا۔ انہوں نے کم عمری ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا افسانہ "روشنی کی جانب" ایک صوبائی اخبار "علاقے کویان" میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ جبکہ ان کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔

۱۹۰۲ء میں نوجوان ادیب نے اپنا افسانہ "مچھیرے" میکسم گورکی کے پاس ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ گورکی نے جواب دیا۔ "تم کو ضرور لکھتے رہنا چاہیے۔ زندگی کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت تمہیں موجود ہے اور تم کو عوام سے محبت ہے۔" گلاڈکوف کی مانیف پر گورکی کا بڑا زبردست اثر تھا۔

نوجوانی ہی میں گلاڈکوف نے اپنی زندگی انقلابی تحریک سے وابستہ کر لی تھی۔ پی ٹسک میں مزدوروں کی ہڑتال کے پرچار اور اس کی تنظیم میں حصہ لینے والوں میں وہ بھی تھے۔ انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے زارشاہی حکومت نے انہیں ارکوٹسک میں قید کر دیا تھا اور پھر ۱۹۰۹ء میں انہیں ورخویانسک کے علاقے میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ جلاوطنی کی مدت ختم ہو جانے کے بعد انہوں نے نووسی بسک میں رہائش اختیار کر لی۔ اور وہیں نووسی بسک سنٹ فیکٹری کے مزدوروں کے ساتھ اپنی انقلابی سرگرمیوں کا براہ راست تعلق قایم کر لیا۔ نووسی بسک میں وہ ۱۹۱۷ء تک رہے۔

۱۹۲۵ء میں گلاڈکوف کا سنایا نو "رسالے برلان کا ناول سمنٹ" شائع ہوا جو جلد ہی بڑا مقبول ہو گیا۔ اس ناول میں مزدور طبقہ کا نمایاں طور پر زندگی کا مختار اور زندگی کی نئی قدروں کا معمار نظر آتا ہے۔

انقلاب کے ابتدائی زمانے ہی سے گلاڈکوف کا موضوع آزاد انسان کی پرجوش تخلیقی محنت ہے۔ وہ محنت جو انسان کو نئی زندگی کا مختار اور معمار بناتی ہے جو قدرت کو اور سماج کو اپنی مرضی اور خواہش کا مطیع بناتی ہے۔ ناول "سمنٹ" ہی میں آزاد محنت کے جوہر کی گورکی جیسی سمجھ بوجھ کا رفرما نظر آتی ہے۔ اسی لیے زبان اور طرز بیان کی خامیوں کی طرف اشارا کرنے کے بعد گورکی نے اس ناول کے متعلق گلاڈکوف کو لکھا تھا۔ "میری رائے میں تمہاری کتاب بہت اہم ہے۔ بہت اچھی ہے۔ انقلاب کے بعد کا یہ پہلا ناول ہے جس میں ہمارے زمانے کے انتہائی اہم موضوع ـــــ محنت پر حقیقی معنوں میں بحث کی ہے اور روشنی ڈالی ہے۔"

۱۹۲۸ء میں گلاڈکوف نے سوویت مزدور طبقے کے متعلق ایک نیا ناول "قوت" لکھنا شروع کیا۔ اس میں انہوں نے دکھایا ہے کہ ٹکنیک پر کمال حاصل کرنے میں کتنی زبردست ترقی ہے اور عوام میں نئے تعلقات کس طرح پیدا ہو گئے ہیں۔ اس ناول میں منظم اور معلم کی حیثیت سے کمیونسٹ پارٹی کو مرکزی مقام حاصل ہے۔

ایک ادیب کی حیثیت سے گلاڈکوف کی ترقی کا سہرا گورکی برسوں تک برابر سر باندھا کرتے رہے اور ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں انہیں بتایا "ہمارے نوجوانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان سے پچھلی نسل کے لوگوں نے کونسا رستا طے کیا ہے۔ انہوں نے کس طرح جدوجہد کی ہے تاکہ ان کے بچے اور پوتے ایک پرمسرت زندگی بسر کر سکیں ان کو دکھانا چاہیے کہ انسان نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرنے میں وہ کیسا مستقل مزاج اور نڈر تھا اور آزادی کی منزل تک پہنچنے کے لیے اس کو کیسی کیسی دشوار راہوں سے گذرنا پڑا تھا۔"

یہی وہ پر اثر الفاظ تھے جنہوں نے گلاڈکوف کو خدا دشت سوانح "بچپن کی" "ایک کہانی اور" "آزاد لوگ" لکھنے کی ڈھارس

بندائی۔ یہ دونوں ناولی ترتیب وار ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئے۔ ان ناولوں کے واقعات کا عینی شاہد ایک کسان لڑکا فیدیا ہے۔ ان میں گلاد کوف کے بچپن اور لڑکپن کا قصہ ہے۔ ان کا یہ زمانہ زندگی کی تلخ جد وجہد میں گذرا ہے۔

"بچپن کی ایک کہانی" میں والگا کے ساحل پر ایک گاؤں کی زندگی کی ہیبتناک تصویر نظر آتی ہے اس گاؤں میں پرانے عقیدے کے عیسائیوں کی آبادی ہے جہاں کسانوں کو غلام بنا کر رکھنے کے پیچھے اثرات ابھی تک باقی ہیں لیکن گاؤں کے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کے استبداد کا نیا بوجھ بھی لدنے لگتا ہے مرکزی کردار کسان کے ایک بڑے کنبے کے افراد میں۔ اس کنبے کے بزرگ دادا ہیں۔ (وہ ایک عقلمند آدمی ہیں وہ ماہی گیری کرتے ہیں۔ اور اخلاقیات کے ماہر ہیں۔) اور پوتا فیدیا خاندان کا سب سے چھوٹا رکن۔

"بچپن" کی ایک کہانی "میں ایک اقتباس ہے کہ محنت کش عوام اور محنت کشوں پر ظلم کرنے والوں کے درمیان کس طرح جد وجہد شروع ہوتی ہے اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ روسی محنت کشوں کا کردار گلاد کوف نے نہایت واضح طور پر پیش کیا۔ یہ کردار سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ مطلق العنانی کی بظاہر لامتناہی تاریکی میں بھی اپنے ہوشمند حواس بیدار رکھتے ہیں۔ وسیع نظری اور گرم جوشی کے ساتھ انسانیت کے رشتے برقرار رکھتے ہیں کام اور تعمیری محنت سے محبت مند محبت رکھتے ہیں۔

"آزاد لوگ" پہلے ناول "بچپن" کی ایک کہانی "ہی کا سلسلہ ہے صرف فرق اتنا ہے کہ منظر گاؤں سے شہر میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں فیدیا کے کنبے والے روزگار کی تلاش میں جاتے ہیں۔

ماہی گیری کرنے والے مزدوروں اور مالکوں کے درمیان طبقاتی جد وجہد "آزاد لوگ" کا نفس مضمون ہے مصنف کی تیز نگاہیں بارکوں، کشتیوں، گوداموں، ماہی گیری کے جہازوں اور مالکوں کے گھروں تک کی چیرے آتی ہیں۔ پڑنے والے کی نظر میں ماہی گیری کے کاروبار کے مالکوں اور ان کے ملازموں کے مزدوروں پر ظلم کے اندوہناک مناظر گھوم جاتے ہیں۔۔۔

مزدوروں پر ہر طرح سے مظالم کیے جاتے ہیں ان کو ذلیل کیا جاتا ہے دن میں انہیں ستر ستر گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ کھانے کو کبھی پیٹ بھر نہیں ملتا۔ اور ہر روز طرح طرح کے جرمانے ہوتے رہتے ہیں۔ گلاد کوف نے دکھایا ہے کہ اس انسانیت سوز لوٹ کھسوٹ سے مزدوروں میں کس طرح ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ دکھایا ہے کہ ظالم سوداگروں۔ بلیاخین، پستو بایف وغیرہ سے ان کی نفرت کس طرح بڑھتی ہے۔ اور آخر انتہائی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔

مزدوروں کو جدوجہد کے لیے منظم کرنے والے مرد اور عورتیں پیاسکو ویا۔ گریگوری، خارمنتون۔ روسیوں کی بہترین سیرت کے مالک ہے۔ گلاد کوف نے دکھایا ہے کہ وہ کیسے بہترین کارگذار مزدور ہیں۔ وہ ایسے مزدور ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے "جب وہ کسی کام کو ہاتھ لگاتے ہیں تو نئے پھوٹ نکلتے ہیں" گلاد کوف کہتے ہیں وہ گھمنڈی نہیں تھے۔ وہ کبھی یہ نہ سوچتے تھے کہ دوسروں کے مقابلے میں وہ خدا بہتر یا زیادہ عقلمند ہیں" وہ دوسروں پر حکم نہیں چلاتے تھے۔ ملکے باقیوں کی طرح ہی رہتے تھے۔ عوام گھل مل کر رہتے تھے" لوگ ان کا احترام کرتے تھے ان کو تجربہ کار اور ماہی گیری کے تمام کاموں سے بخوبی واقف سمجھتے تھے۔ اور انہیں محنت کش عوام کے مفادات کا صحیح محافظ پاتے تھے۔

گلاد کوف کی تحریر میں انوکھی چاشنی ہے۔ ہر کردار کے کارناموں اور زندگی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ فاری روسی زبان کی سلاست خوب صورتی سے بطلہای متاثر ہوتا ہے۔

جب وطنی کی جنگ عظیم کے دوران میں گلاد کوف نے جرنلسٹ کی حیثیت سے فاشزم کے خلاف جد وجہد میں سرگرم عملی حصہ لیا اور اپنی آزادی اور اپنے وطن کی خدمتگاری کے لیے سوویت عوام کی جدوجہد کے بارے میں بہت سے افسانے تصنیف کیے۔

سوویت حکومت نے فیودور گلاد کوف کی خدمات کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں گلاد کوف کو لینن تمغا اور محنت کے سرخ پرچم کا تمغا دیا گیا ہے اور انتالیس انعام درجے دوم اور درجے اول بھی دیے گئے ہیں۔

برطانیا میں پریس کی آزادی

ج-ا

ان دنوں اخبارات کے مالکوں اور اخبار نویسوں کی تنظیمیں پریس کے جنرل کونسل کے آئین کے مسودے پر غور کر رہی ہیں۔ یہ کونسل پہلی جولائی کو معرض وجود میں آجائے گی۔ اور اس کا ایک اہم کام جرنلسٹوں کی تعلیم و تربیت اور ملازمت سے متعلق اسکیموں کو ترقی دینا ہوگا لیکن اس کا سب سے بڑا کام برطانوی اخبارات کی آزادی کو برقرار اور ان کے معیار کو بلند رکھنا ہوگا۔

حال ہی میں برطانوی صحافیوں نے یہ طے کیا تھا کہ جب کوئی نوجوان مرد یا خاتون جرنلزم کی تربیت لینا شروع کرے تو سب سے پہلے اسے یہ بتایا جائے کہ پریس کی آزادی کے معنی کیا ہیں۔ پریس کی آزادی برطانیا کی قومی عظمتوں میں سے ایک ہے۔ اس آزادی کی بدولت اخبارات ملک کے جمہوری نظم و نسق کے چلانے میں ایک اہم اور قیمتی پارٹ ادا کرنے کے قابل ہیں۔ ایک آزاد پارلیمنٹ کی طرح آزاد پریس عوام کی آزادی کو برقرار رکھتا ہے۔

لیکن پریس کی آزادی کا مطلب کیا ہے؟ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ آزادی صرف اخبارات کے لیے ہی مخصوص نہیں۔ پریس کی آزادی کا مطلب ہے کہ کتابوں کی اشاعت اخبارات کی اشاعت اور اس قسم کی دوسری چھاپی ہوئی چیزوں پر کوئی پابندی یا سنسر شپ عاید نہ کی جائے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی مصنف یا ایڈیٹر عوام کے مفاد کا خیال رکھے بغیر جو چاہے لکھ سکتا ہے۔ ہر اخبار کو قانون کی حدود کے اندر رہنا پڑتا ہے اگر کوئی اخبار کسی شریف شخص کی پگڑی اچھالتا ہے تو اسے معاوضہ دینا پڑتا ہے اگر وہ کوئی باغیانہ یا فحش چیز چھاپتا ہے یا وہ عدالت کی توہین کرتا ہے تو اسے سزا مل سکتی ہے لیکن ہر اخبار کا یہ حق ہے کہ وہ کسی سبب کا علم بردار بن کر اس کے بارے میں کھلم کھلا اور آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

اس آزادی اور طاقت کے سہارے اخبارات قوم کے نام پر حکومت اور پارلیمنٹ پر کڑی نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دے سکتے ہیں کہ فلاں محکمے سیاست داں سے عہدا چھین لیا جائے اگر کسی عام شہری کے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے تو وہ حکومت پر دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ اس ناانصافی کی اصلاح کی جائے۔

شروع میں تدریجی طور پر حکومت نے پریس پر پابندیاں لگائی تھیں لندن میں پہلا باقاعدہ اخبار اس وقت شروع ہوا تھا جب برطانوی شاعر جان ملٹن ابھی چھوٹا تھا بعد میں اس نے پریس کی آزادی کے حق میں ایک پرجوش مضمون لکھا تھا۔ مگر پارلیمنٹ نے سنسر شپ کے طریقے کو ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۶۹۵ء میں جب ملٹن کو اپنی قبر میں سوئے ہوئے اکیس سال ہو چکے تھے تو برطانوی پارلیمنٹ نے پریس ایکٹ کو ختم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد سے اس قانون کی پھر کبھی بھی تجدید نہیں کی گئی۔

برطانیا میں جنگ کے دوران میں بھی جبر یا سنسر شپ کے طریقے کا استعمال نہیں کیا گیا۔ کیونکہ جنگ کے زمانے میں برطانوی پریس کی وطن دوستی اہم فوجی رازوں کی بہترین اور قابل اعتماد محافظ تھی۔

۱۶۹۵ء کے فیصلے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ برطانوی حکومت پر سے ہر قسم کی پابندی ختم کر دی گئی تھی۔ انہیں کئی سال تک خاص ٹیکس جنہیں "علم پر ٹیکس" کہا جاتا ہے ادا کرنا پڑے تھے۔

ان میں سے ایک ٹیکس اشتہارات پر تھا۔

پریس کی جانب پارلی منٹ کی دبی ہوئی دشمنی اکثر بھڑک اٹھتی تھی۔ پارلی منٹ کو خطرا تھا کہ کہیں اخبارات اپنا رسوخ بڑھا کر ایک دن اس کے رقیب بن جائیں۔ اس نے یہ اعتراض بھی اٹھایا تھا کہ اخبارات پارلی منٹ میں دی گئی تقاریر کو کیوں چھاپتے ہیں۔ اس زمانے اور موجودہ زمانے میں کتنا فرق ہے آج کل تو پارلیمنٹ کا ہر رکن یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کی تقریر کو اخبارات میں جگہ ملے۔ پارلی منٹ کے ایک رکن نے اخبارات پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "ہمارے ہفتہ وار اخبارات میں جو مواد شایع ہوتا ہے لوگ پارلی منٹ کے پاس کیے قوانین کی بہ نسبت اس کی زیادا قدر کرتے ہیں اور ان اخبارات میں جن خیالوں اور جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ان کی ملک کے بڑے سے بڑے سیاست داں کی رائے سے بھی زیادا قدر ہوتی ہے۔"

اس سے ہمیں یہ نہ فرض کر لینا چاہیے کہ پارلیمنٹ بہت زیادا تنگ نظر واقع ہوئی تھی۔ بعد کا سارا قصور اسی کا تھا۔ بعض اخبارات اپنے تبصروں اور اظہار رائے میں بے حد بے پروا اور غیر ذمے دار واقع ہوئے تھے اور بعض رشوتیں لیتے تھے۔ لیکن متعدد اخبارات مجاہدوں کی طرح عوام کی آزادی کی خاطر لڑتے تھے انہوں نے ملک کو سیاسی طور پر "بالغ" بنانے میں مدد دی ہم آج اپنے ان پیشرو جرنلسٹوں کو بھلا نہیں سکتے جنہوں نے پریس کی آزادی کی جدوجہد میں جیل خانے کی گندگی میں رہنا پسند کیا اور طرح طرح صعوبتیں جھیلیں۔

علم پر ٹیکس سب سے پہلے ملکا این کے دور حکومت میں لگایا گیا تھا جو ملکا وکٹوریا کے زمانے تک جاری رہا۔ سب سے پہلے تو ۱۸۱۲ء اپریل ۱۸۵۳ء کو اشتہارات کا ٹیکس اڑا دیا گیا تھا۔ اور کاغذ پر جو ٹیکس لگا یا ہوا تھا وہ ۱۸۶۱ء میں منسوخ ہوا تھا۔

جوں جوں تعلیم کی اشاعت ہوتی گئی چھاپا خانہ اور رسل ورسایل کے ذریعے بہتر ہوتے گئے تو برطانوی پریس کی طاقت میں بھی اضافا ہوتا گیا ۱۸۶۱ء میں ابراہیم لنکن نے کہا تھا کہ "لندن ٹائمز دنیا کی عظیم طاقتوں میں سے ایک ہے۔"

آج کوئی بھی انگریز جو صبح کے وقت اپنے اخبار کا مطالعا کرتا ہے یہ نہیں خیال کرتا کہ اس کا اخبار محض ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ جس سے اسے تازا خبریں ملتی ہیں۔

اس کے لیے تو اس کا اخبار ایک زندا شخصیت ہے۔ ایک دوست ہے اس کی آزادی کا مجاہ ہے وہ، اس کے اداریوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔

کیا ہم یہ سمجھیں کہ پریس کے خلاف تمام شکایتیں دور ہو گئی ہیں اور کہ ہر اخبار قومی معاملات میں اپنی ذمے داری کو صحیح طور پر سمجھتا ہے مجھے اس قسم کا دعوا تو نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تمام ملک میں لوگوں کا شوق یا رغبت ایک جیسی نہیں۔ اس لیے بعض اخبارات جرایم جنسی باتوں اور اس قسم کی دوسری گھٹیا باتوں کا ناجایز فایدا اٹھانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ ضرور کہوں گا کہ ملک میں کئی قسم کے اخبارات ہیں اور عوام اپنی پسند کے برابر اپنے اخبار کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اخبارات لوگوں کے سامنے ہر قسم کے حقایق رکھتے ہیں۔ وہ خود ان پر غور و فکر کر سکتے ہیں آزاد پریس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کسی اچھی یا بری بات کے متعلق فیصلا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ پریس کی آزادی اکثر ان لوگوں کو چبھتی ہے جو اس کی نکتا چینی کا نشانا بنتے ہیں لیکن ایک بیورو کریٹک حکومت کے نام پر آزاد رائے کا گلا گھونٹنے کے مقابلے میں عوام کے لیے پریس کی آزادی بہت زیادا اہمیت رکھتی ہے۔

سورج کی تصاویر اتارنے کا منصوبا برطانوی سائنسدانوں نے بالشاک کا ایک بہت بڑا غبارا تیار کر لیا ہے یہ غبارا ایک کرے اور دو رہیں بہت ۲۰ ہزار فٹ کی بلندی پر جا پہنچے گا اور وہاں سے سورج کی بے نظیر تصویریں لی جائیں گی۔ یہ غبارا کام ماہ ستمبر میں ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ روشنی کے اس حلقے کی کسی تصاویر لی جائیں جو گرہن کے وقت سورج کے گرد دکھائی دیتا ہے۔

ایک دریا ایک جوہر

ط ایاز عصمی

بس فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ سکنڈ کلاس کے مسافر سیٹ کے لیے آپس میں جھگڑ رہے تھے انتہا فرسٹ کلاس کی گدی دار سیٹوں میں کچھ سکون تھا اور یہاں کے مسافر اس طرح اطمینان سے اونگھ رہے تھے گویا ان گدیوں کی لچک کبھی ختم نہ ہوگی۔ بس یوں ہی بھاگتی رہے گی۔ کھلی ہوا کے پرکیف تھپیڑے دماغوں کو ہمیشہ یوں ہی تازگی بخشتے رہیں گے۔ میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ سائنسی دنیا بھی انسانوں کے بیمار لاشعور علاج سے قاصر ہے۔ انسان کا یہ عروج بھی اب "حدود" کے اندھیرے گھڑے میں پڑا سسک رہا ہے۔

ہر موڑ پر چار ذہن انسان کی بنائی ہوئی حدیں، امیری۔ غریبی چھوٹائی بڑائی۔ قہقہے سسکیاں، فرسٹ کلاس، سکنڈ کلاس انسانوں کے تعاقب میں لگی ہوئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دم گاتا ہوا مسافر لڑک کر مجھ پر گرا۔ قیصر کے ہونٹوں پر ایک خنداں آلود مسکراہٹ بھری اور ہونٹوں کے عقب میں کھو گئی۔ جیسے بند کا تالا ایک کھٹکے پر آنکھ کھول دے اور پھر فوراً بند کر دے۔

"آؤ کچھ باتیں کریں"

"تم ہی کچھ چھیڑو" میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"شاہ بابا کو تو تم جانتے ہی ہوگے"

"نام تو سنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ شاید تم مولانا شاہ معین الدین کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہو"

"ہاں، ان کے متعلق ان کے معتقدین میں مشہور تھا کہ پیچھے ہوئے بزرگ ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ ظاہر کچھ بھی نہ تھا۔ مگر گھر کی در و دیوار، فرنیچر، کرسیوں، میزوں، پوشش۔ غرض کہ ہر چیز امارت ٹپکتی تھی اور معتقدین اپنے اندھیرے اور سیلے ہوئے کمروں میں ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھر کر دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیتے "صاحب خدا کی دین" جسے چاہے عنایت دے۔ پھر ان کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ جنہیں ذات باری تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گاؤں بھر میں "مولانا شاہ بابا" کے نام سے پکارے جاتے تھے صمدان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ مگر کتنا فرق تھا دونوں کی عادات، خیالات اور اصول میں" ——— کہتے کہتے قیصر رک گیا۔ بس اس وقت ایک جوہڑ کے پل پر سے گذر رہی تھی۔ قیصر نے اشارہ کیا "شاہ بابا" اسے "جوہڑ" کہا کرتے اس کے ذکر پر براسا موہ بنا لیا کرتے صمد اپنے باپ کے بخشے ہوئے اس خطاب پر مسکرا اٹھتا۔ ایک عجیب تبسم اس کے جوان ہونٹوں پر پھیل جاتا۔ گویا کہہ رہا ہو "بابا صدیوں پرانی لکیر پیٹ رہے ہیں"

وہ دن بھر گاؤں کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی تصویریں بناتا اپنے کیمرے سے گاؤں کے کسانوں کی تصویریں لیتا۔ بچوں کو چمکارتا پچکارتا انہیں گڑ کی جلیبیاں اور ٹھاٹھی کی گولیاں دیتا "شاہ زادے کے ہات کا تبرک بچے مزے لے لے کر اٹھا جاتے اور گڑ کا شیرا ان کے نیلے پیلے کپڑوں کو اور بھی گھناؤنا کر دیتا۔ دھرتی کے ان ننھے منے راجاؤں کی بھڑ میں وہ پھولا نہیں سماتا ——— کبھی کبھی وہ اپنے ہاتھوں کے کینوس پر تیار ہوئے رنگ برنگ کے مناظر پر کسی کسان کی تصویر ٹانک پڑی دیر تک گھورتا رہتا کبھی مجھ سے پوچھتا "قیصر! میرے تخیل میں پلی ہوئی یہ جنت کبھی سچ مچ کی جنت بن بھی سکے گی یا نہیں" ——— مگر تمہارے بابا تو دوسری دنیا کی جنت کے حصول کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اور تم اس دنیا میں جنت بنانے کے خواب دیکھ رہے ہو" میں اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ اور اس کا چہرا بھی ایک ایسی مسکراہٹ میں کھو جاتا جس میں ادا سی کے ساتھ ساتھ طنز کا جذبا بھی تلملاتا ہوتا ——

"بابا! وہ کہتا" بابا کی جنت تو بس چند سکوں کی کھنکھناہٹ

اور چند نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ کی اوٹ میں چھپی ہوئی ہے۔۔۔ چند چاندی کے چھنوں میں جنت کا سودا ہو جاتا ہے۔۔۔ مجھے تو اس ماحول سے بھی نفرت ہے جس میں خرگوش صفت بھولے کسانوں کا سچا کچا خون بھی نچوڑ لیا جاتا ہے۔ اور اس دن سے تو سچ مچ اس ماحول میں ایک گھٹن سی محسوس کرنے لگا ہوں۔" صمد کہے جا رہا تھا اور میں حیران "شاہ زادے کا موہنڈ نکے جا رہا تھا۔ صمد بغیر رکے ہوئے کہے جا رہا تھا۔

"دینو دروازے پر اداس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ کر اس طرح ٹھہر گئے تھے جیسے منجمد ہو گئے ہوں۔

"کیا بات ہے دینو؟"

"شاہزادے حضور،" دینو نے اپنی نم آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "رفیق سخت بیمار ہے۔ شاہ بابا سے دعا کرانے آیا تھا۔" دینو کے چہرے پر اپنے نسل کے مستقبل کی تاریکی کا خوف اداسی کی دبیز چادر پھیلائے ہوئے تھا۔

"دعا کر دی بابا نے؟"

انہوں نے کہا۔ پانچ روپے کی نذر چڑھا دے تیرا بچا اچھا ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے نہ جانے کیوں دینو نے اپنا موہنڈ پھیر لیا۔ مگر میں نے بھانپ لیا۔ اسے بابا کے جواب سے تکلیف ہوئی تھی۔

"پھر چڑھا دی نذر تم نے؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔۔۔

"شاہزادے حضور، رفیق آپ پر قربان۔۔۔ رفیق میرا اکلوتا لڑکا ہے۔۔۔ میرے اندھیرے گھر کا واحد چراغ۔۔۔ مگر ہم غریب اپنے پیاروں کی زندگیاں بھی پانچ روپے میں نہیں خرید سکتے۔۔۔ کتنی سستی ہیں ہماری زندگیاں۔۔۔ پانچ روپے۔۔۔ صرف پانچ۔۔۔ مگر میرے پاس تو پانچ چھوٹی کوڑیاں بھی نہیں۔۔۔"

کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور میں نے جیب سے پانچ کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔۔۔ دینو نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ تھام لیے۔ اس کی شکر گذار آنکھیں یہ کہہ رہی تھیں۔ "شاہزادے تمہارے یہ روپے۔۔۔ میرے خاندان کے "اجالے" کی زندگی خرید رہے ہیں۔۔۔ یعنی تم مجھے خرید رہے ہو۔۔۔" پر نہ جانے کیوں میں ان شکر گذار آنکھوں کی بھی تاب نہ لا سکا اور باہر نکل آیا۔۔۔"

قیصر سگریٹ سلگانے کے لیے رکا۔ شاہ بابا کی موہنڈ لگی لوکر انی کلایو جو صمد کو دینو کو روپے دیتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے شاہ بابا کے کان میں یہ بات پھونک دی۔

"جوہڑ۔۔۔" شاہ بابا کی سوا بالشت کی داڑھی صرف ہل کر رہ گئی۔

دوسرے دن دینو کا چراغ گل ہو گیا۔ اس کا مستقبل اندھیرا ہو گیا۔ "نذر بھی کام نہ آئی" دینو کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ اور شاہ بابا نے کہلوا بھیجا۔ "دینو کے پیسے میں یقین کھوٹ تھی۔ ضرور وہ پیسے اس کی حلال کی کمائی کے نہ تھے ورنہ دعا کیوں مستجاب ہوتی۔ میں کوئی شک نہیں"۔۔۔ اس انکشاف نے دینو کو دنگ کر دیا۔ بھولے دینو نے سوچا "شاہ بابا در اصل پہنچے ہوئے ہیں۔ شاہزادے نے تو روپے چھپا کر دے تھے۔۔۔۔ مگر شاید شاہ بابا کو فرشتوں نے بتا دیا" اس واقعے کی خبر آناً فاناً سارے گاؤں میں پھیل گئی، جنہیں کچھ شک تھا۔ انہوں نے دینو سے تصدیق کر لی، اور پھر تو شاہ بابا بزرگ اولیوں میں شمار ہونے لگے۔

بس اسٹینڈ پر پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں اتر پڑے۔۔۔۔ قیصر گھر جانا چاہتا تھا مگر کہانی کو فوج پر پہنچ کر ادھوری رہ جانا۔۔۔ یہ بڑا گوارا نہ ہوا۔ یکسوئی سے بیٹھ کر باتیں کرنے کی جگہ نہ تھی۔ بس اسٹینڈ کے سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ جس میں چاروں طرف پرانے کپڑوں۔ پان بیڑی۔ گھگنی اور چارٹ کی دکانیں تھیں۔ کچھ تو دوستے چڑیوں کی بیٹ سے لتھڑی ہوئی بنچوں پر بیٹھے کاروباری باتیں کر رہے تھے۔ دو خوش پوش جوان ایک اسکول گرل کے پیچھے لگے ہوئے تھے کنکھیوں سے چاٹ کے جھوٹے پتے چاٹ رہے تھے۔

ہم بس اسٹینڈ کے پاس ہی ایک کھٹیا سے چائے خانے میں

گھس گئے۔ جہاں بھیڑ بھاڑ قدرے کم تھی۔
اور قیصر نے پھر کہانی چھیڑ دی۔

اس واقعے کے بعد صمد اس ماحول سے دور دور ہی رہتا۔ دن دن بھر گاؤں میں تصویریں بناتا۔ اور رات رات گئے تک دریا کنارے بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا کرتا۔

ایک حسین شام ۔ ۔ ۔ ۔ پرندا پنے اپنے بسیروں کو لوٹ رہے تھے۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ درختوں پر سنجیدگی چھا رہی تھی۔ صمد مسکراتا ہوا میرے پاس آیا۔ قیصر سونھ میٹھا کما تو ایک خوشخبری سناؤں ۔ ۔ ۔ ۔ میں شادی کر رہا ہوں۔"

اجی واہ یہ الٹی ریت کہ شادی تم کرو، اور سونھ میٹھا میں کراؤں" مگر تم شادی کر رہے ہو، یا تمہاری شادی کی جا رہی ہے؟ میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

میں خود کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دیکھو میری ہونے والی بیوی کی تصویر۔" اس نے جیب سے ایک سرنگی تصویر جس میں اس نے خود رنگ بھرا تھا نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

" ارے!" میرا سونھ حیرت سے کھل گیا۔ یہ تو علی بخش کی بیٹی ناجی معلوم ہوتی ہے۔"

" ہاں، ہاں وہی تو ہے۔" صمد نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "مگر اسے تو برص کی بیماری ہے۔"

جب ہی تو شادی کر رہا ہوں اس سے اور پھر ہمارے سماج کے سارے کے سارے جسم پر برص ہی نہیں گھناؤنے کوڑھ کے داغ ہیں۔ جب ہم انہیں برداشت کیے ہوئے ہیں تو غریب ناجی بچی ایسی بری تو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

" مگر تمہیں اور بھی لڑکیاں تو مل سکتی ہیں" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

مجھے تو لڑکیاں مل جائیں گی۔ پر اسے کوئی لڑکا نہیں مل رہا۔ پچھلے مہینے ملاکے نکلے لڑکے نے بھی جواب بھجوا دیا تھا۔ اور میرے جی میں آئی بڑھ کر صمد کے پاؤں پر اپنا سر رکھوں۔ اس کے قدموں تلے کی خاک کو سر پر رکھ لوں۔

"قیصر! صمد رقت آمیز اور ندے ہوئے گلے سے بولا۔ تم تو مجھ سے نفرت نہیں کرنے لگو گے؟"

صمد ۔ ۔ ۔ پگلے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ۔ ۔ مگر شاہ بابا؟"

" بابا کے اصول سے میرا اصول ملا ہی کب ہے جو آج ملے گا!" صمد اس دن مجھے شاہ بابا کے پاس لے گیا۔

" بابا میں شادی کر رہا ہوں۔ علی بخش بیٹی ناجی سے" صمد نے اس طرح بے جھجک سب کچھ کہہ دیا۔ جسے وہ بچپن میں کئی چیز کی طرف اشارا کر کے کہہ دیا کرتا تھا۔ "میں یہ لوں گا۔"

" صمد! شاہ بابا لڑکے کیا اسی لیے تمہیں پڑھایا لکھایا تھا کہ آج اس طرح تمہارے گندے ہاتھ میری پگڑی تک پہنچنے کی جرات کریں۔ باپ دادا کی عزت و آبرو کو تم متعصب کیچر میں لتھیڑنے کے منصوبے بناؤ۔"

" بابا میں کوئی ایسی حرکت تو نہیں کر رہا ہوں جس سے بزرگوں کی آبرو کو بٹا لگے۔"

تم علی بخش کی بیٹی۔ جس کے جسم پر قدرت کی پھٹکار برس رہی ہے شادی کر رہے ہو۔ کیا یہ ہماری توہین نہیں۔ تم ایک مکروہ کیڑے کو میری پگڑی پر رکھنا چاہتے ہو۔ اس مقدس پگڑی پر جو اس خاندان کے بڑے بڑے خدا رسیدہ بزرگوں کے سر کا تاج ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذلیل ۔ ۔ ۔ ۔"

" بابا" صمد کی آواز میں ایک اٹل عزم تھا" مانتا ہوں اس گھر میں اب تک تقدیس پاکیزگی کا دریا بہہ رہا ہے۔ بقول آپ کے ناجی ایک گندی نالی بھی ہو تو اس کے آملنے سے سارا کا سارا دریا تو ناپاک نہیں ہو جائے گا۔"

" بکو مت" شاہ بابا لاجواب ہو رہے تھے۔

" بابا زندگی صرف دکھاوے کا ہی نام نہیں ۔ ۔ ۔ علی کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ دریا کا کام گندگیوں سے احتراز کرنا نہیں بلکہ انہیں اپنے دامن میں سمیٹ کر دور سمندر میں ڈبو دینا ہے۔ یہ علی سبق شاید دریا بھول رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" قیصر شاہ بابا صمد کی بات کاٹ کر چیخے۔ اسے میرے سامنے سے لیجاؤ"

اور اس شام نہایت سادگی کے ساتھ صمد نے ناجی کو اپنا لیا
عقد ہوئے تھوڑی دیر گذری تھی کہ شاہ بابا کی آواز آئی "
" صمد! صمد باپ کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بڑھ کر
شاہ بابا کا استقبال کیا۔ "عقد ہو گیا؟" شاہ بابا نے مجھ سے بڑی
آہستگی سے پوچھا۔ میں نے جواب میں صرف گردن جھکا لی۔ "تم نے
اپنے دوست کو اس ذلیل کن حرکت سے باز رکھنے کی کوشش نہیں
کی؟" میں لب بھینچے چپ رہا۔ اور شاہ بابا کھڑے سوچتے رہے شاید
یہ کہ "جب سب کچھ ہو ہی گیا تو کیوں چیخ چلا کر اپنی کرکری کرائی
شکست مان لینے میں ہی عافیت تھی۔" اور شاہ بابا صمد کے سامنے
آئے تو جیسے شاہ بابا اور اب کے شاہ بابا میں زمین و آسمان کا
فرق تھا۔ دریا نے جو ہٹر کے سامنے گردن جھکا لی تھی "صمد" شاہ
بابا کی آنکھوں میں شکست خوردہ سپاہی کے آنسو تیر رہے تھے۔
باپ کی جھکی ہوئی گردن دیکھ کر صمد بولا۔ بابا میں نے کوئی بھول
تو نہیں کی؟" شاہ بابا خاموش تھے اور صمد کہے جا رہا تھا ——
آپ کا پرانی خاندانی روایات کا سونہ زور دریا اتنی تیزی
سے بہہ رہا تھا کہ اسے یہ پروا بھی نہ تھی کہ اس کی لپیٹ میں ایک
غریب کا جھونپڑا بھی آ چکا ہے ..... اور یہ تو ل آپ کے
ایک سست رفتار جوہٹر نے کل کے لیے ایک عملی مثال کھڑے
کر دی ہے۔ میرا خیال تھا یہ بیاہ ہمارے اصولوں کا محاذ ہوگا۔
مگر ....." اور اس نے سند کے نیچے سے ایک ریوالور نکالا
"اور اسی خیال سے میں آپ کا ریوالور بھی ساتھ لے آیا تھا"
تو تم اپنے اصولوں کی خاطر مجھے مار ڈالتے؟" شاہ بابا
نے صمد کی بات کاٹ کر چلایا۔

"نہیں بابا" صمد نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "میں اس ناجی
کو ضرور مار ڈالتا جسے میرے علاوہ شاید کوئی شوہر نہ مل سکتا تھا
اور پھر شاید میں بھی اپنے اصول پر قربان ہو جاتا ..." صمد
کہتے کہتے رک گیا اور شاہ بابا کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے
ان کے جھریوں کے جال میں گھرے ہوئے چہرے پر سے پھسلتے
ہوئے ان کی داڑھی سے الجھ کر رہ گئے۔ کون جانے یہ ندامت کے
آنسو تھے یا غم شکست کے ——— کہتے کہتے قیصر نے گھڑی دیکھی
"اف! بڑی دیر ہو گئی۔ بھئی معاف کرنا۔ پھر کبھی" قیصر چلا
گیا اور میں وہیں بیٹھا کہانی کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچتا
رہا ——— کئی ہفتوں کے بعد قیصر پھر ملا۔
تھوڑی دیر تک دھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں ..... .
چائے پی رہے تھے۔ قیصر نے اجازت مانگی "اماں بیٹھو جلدی کیا ہے"
نہیں بھئی مسز صمد ہسپتال میں ہیں انہیں دیکھنے جانا ہے۔ صمد میں
میرا منتظر ہوگا ——— "خیر تو ہے؟"

ہاں مسز صمد اس گندے سماج کو پاک کرنے والے ایک مجاہد
کا اضافہ فرمانے والی ہیں۔ قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا ——
مبارک ہو ——— "پھر ہم بھی چلو نا"

ہم دونوں ہسپتال پہنچے۔ صمد بڑی بے چینی سے ادھر ادھر
ٹہل رہا تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ ہی رہے تھے کہ اندر سے ننھے
مجاہد نے اپنے آمد کی خبر دی۔ مبارک ہو صمد" قیصر نے کہا۔ اور
ہما سا تعارف بھی کرا دیا۔ صمد لپک کر وارڈ میں ہو لیا۔ نرس روکتی
ہی رہی مگر وہ تیز رو طوفان کی طرح بڑھ گیا۔ جیسے تنکے چینی سی
نہ روک سکتی تھی۔ چند منٹ کے بعد اس نے ہم دونوں بھی اندر
بلا لیا۔ ہسپتال کے پلنگ پر ناجی لیٹی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی اندازہ
لگا لیا کہ یہ ناجی ہی ہو گی۔ قیصر نے ناجی سے بھی میرا تعارف
کرانے کے بعد آہستہ سے مجھے بتایا کہ اس کے جسم کے داغ علاج
معالجے سے بڑی سرعت کے ساتھ ہلکے پڑتے جا رہے ہیں۔ ناجی
صورت شکل کے اعتبار سے اگر ہزار میں نہیں تو سو میں یکتا ضرور تھی۔
ناجی پلنگ پر لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک وقار جھوم رہا تھا
ننھے بچے کو اپنے سینے کے قریب لٹائے وہ اس دیوی کی طرح
نظر آ رہی تھی جس نے اپنی کوکھ سے صرف ایک بچے کو نہیں کائنات
پر چھا جانے والی رحمتوں کو جنم دیا ہو ..... اور نہ جانے
کیوں اس کے وقار کے آگے میرا سر جھک گیا ——— ؟

ہندستانی زبان اور ادب کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے

امریکی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پھیلانے کیلیے ٹیلی ویژن کا استعمال

۔ لوسیس

ریڈیو کے بعد ٹیلی ویژن نے دنیا بھر میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا ہے ان چیزوں کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے نوع انسانی کی قسمت کم سے کم وقت میں چمک سکتی ہے تعلیم کو فروغ مل سکتا ہے۔ سائنس اور صنعت و حرفت غرض زندگی کے ہر شعبے کو ترقی کی شاہراہ پر لایا جا سکتا ہے۔ امریکا میں ٹیلی ویژن کے ذریعے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم دی جا رہی ہے ہندستان میں بھی ایسا ہو سکتا ہے لیکن اس میں ابھی کچھ اور وقت درکار ہوگا۔

اس بات کی بڑھتی ہوئی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ بچوں اور بڑوں کو تعلیم یا خبانے میں ٹیلی ویژن نہایت زبردست ذریعہ ثابت ہوگا۔ محتاط ماہرین تعلیم کو یقین ہے کہ اس کی ٹھوس افادیت محسوس ہونی شروع ہو گئی ہے۔ امریکا کے ٹیلی ویژن اسٹیشن تعلیمی اداروں کے تعاون سے باقاعدہ پروگرام پیش کرتے ہیں اور ۸۰ اسٹیشنوں کا معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی قسم کا بصری تعلیمی پروگرام پیش کرتا ہے۔

آج امریکا میں ٹیلی ویژن کے ۲۰۰ اسٹیشن ہیں اور لوگوں کے پاس ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹیلی ویژن ریڈیو ہیں۔ اس طرح اندازا لگایا گیا ہے کہ امریکا کی کل آبادی کا دو تہائی حصہ ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے مستفید ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو یقین ہے کہ نئے نئے اسٹیشنوں کے کھلنے سے ۹۹ فی صد آبادی ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھا کرے گی۔

اسکولوں میں ٹیلی ویژن

ایک سو سے زاید اسکولوں اور ۶۰ کالجوں اور یونیورسٹیوں نے بڑی کامیابی سے ٹیلی ویژن پر تعلیمی پروگرام چلائے ہیں۔

امریکا کے فیڈرل کمیونیکیشنز کمیشن نے غیر تجارتی تعلیمی ٹیلی ویژن کے لیے خاص ذریعوں کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ اسی محکمے سے ٹیلی ویژن اسٹیشن قایم کرنے کی اجازت لینی پڑتی ہے۔

اوہیو اسٹیٹ کالج کا اپنا ٹیلی ویژن اسٹیشن ہے یہ اسٹیشن روزانہ ۱۴ گھنٹے کام کرتا ہے۔ تجارتی ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کے بہترین تعلیمی اور کلچرل پروگرام نشر کرتا ہے۔ اور اس علاقے کے اسکولوں کے لیے روزانہ تعلیمی درسی پروگرام جاری رکھتا ہے۔

بہت سے اسکول "محدود دایرے" کا ٹیلی ویژن استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے کلاس کے کمرے میں پر ایک کیبل تار کے ذریعے ٹیلی ویژن کا پروگرام دکھائی دیتا ہے اور اس کے لیے کوئی لائسنس لینے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

کارنیل یونیورسٹی نے تجربا کیا ہے کہ ٹیلی ویژن کے ذریعے لیبارٹری میں جو تجربے کیے جاتے ہیں وہ طلبا کو بڑی صفائی سے دکھائے جا سکتے ہیں۔ اور طلبا کی زیادہ بڑی تعداد فایدہ اٹھا سکتی ہے۔

کنساس یونیورسٹی کے میڈیکل اسکول نے بھی محدود دایرے کے ٹیلی ویژن کو طبی تعلیم کے لیے بہت مفید پایا ہے۔ نیوجرسی میں ٹیچروں کی تربیت کے ایک اسٹیٹ کالج میں بھی محدود دایرے کا ٹیلی ویژن (۹) نو تماشا گاہوں کے کمروں میں لگایا گیا ہے۔

ٹیلی ویژن ہر عمر کے لوگوں کی تعلیم کے لیے بہت اچھے موقعے پیدا کر رہا ہے۔

جان ہاپکنز یونیورسٹی سائنس ریویو ایک ہفتہ وار پروگرام ملک بھر کے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں سے دکھایا جاتا ہے اور بڑے

عرصے سے یہ بات ثابت کر رہا ہے کہ عام پبلک تک سائنس اور ٹیکنی معلومات کس طرح آسانی سے پہنچائی جا سکتی ہیں۔

فورڈ فاؤنڈیشن کی طرف سے بالغوں کے تعلیمی فنڈ کو ۵ لاکھ ڈالر کی رقم دی گئی ہے تاکہ تعلیمی اغراض کے لیے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کی تعمیر میں مدد مل سکے۔

بالغوں کی تعلیم کے لیے جو فنڈ قایم کیا گیا ہے وہ ایک آزاد تنظیم ہے۔ اور شکاگو میں ۱۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم ٹیلی ویژن اسٹیشن بنانے کے لیے وقف کی ہے۔

سارے پبلک سکولوں میں ٹیلی ویژن کا استعمال ہونے لگا ہے۔ فلاڈلفیا کے ایک سب سے بڑے شہر فلاڈلفیا کے اسکولوں میں ۱۹۴۷ء سے ٹیلی ویژن کا سلسلا جاری ہے۔

چند ٹیچروں کا ایک عملا تین ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کے ساتھ تعین کیا گیا۔ جو ۱۴ اسکولوں کے لیے ٹیلی ویژن کے ذریعے پروگرام نشر کرتا ہے اور ہزاروں طلبا اپنی جماعتوں میں بیٹھے بیٹھے ٹیلی ویژن کے ذریعے درس پاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن تعلیم کے لیے کس طرح مفید ہو سکتی ہے اس کی ایک ور ڈرامائی مثال پیش کی جاتی ہے۔ بالٹی مور کے شہر میں جب تین دن کے لیے مجبوراً اسکول بند کرنے پڑے تو ٹیلی ویژن کے ذریعے ان کو گھروں میں بیٹھے بیٹھے تعلیم دی گئی۔ یہ پروگرام طالب علموں اور بالغوں دونوں ہی کو بہت پسند آیے۔ ایک سو اگر پبلی جماعت کے حساب کے سوالات کا حل دکھاتے وقت اتنی دل چسپی پیدا ہوئی کہ وہ کام پر جانے کے بدلے مگر پر سوالوں کے کچھ نتیجے سمجھنے کے لیے بیٹھا رہا۔ کیونکہ جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ سوال اس نے نہیں سیکھے تھے۔

ٹیلی ویژن ریڈیو کی مرمت کرنے والا ایک مستری ان پروگراموں سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ ایک روز پورے ۴ گھنٹے تک بگڑے ہوئے ریڈیو اسٹیشنوں کی مرمت کرتا رہا تاکہ بچے زیادہ تعداد میں پروگرام دیکھ سکیں۔

غرض کہ ٹیلی ویژن اسکولوں کے طلبا اور بالغوں کو تعلیم دینے بہتر شعور پیدا کرنے اور اپنے اور دوسرے ملکوں کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے میں بڑی مدد دے رہا ہے۔

بڑاپے میں مادی تحفظ کی سوویت یونین میں کیا صورتیں ہیں؟

سوویت باشندوں کے اخراجات بڑاپے میں ریاست برداشت کرتی ہے۔ سوویت قانون کے مطابق ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے پر ۲۵ سال کی خدمت والے مزدور مرد کو عمر بھر کی پنشن ملتی ہے عورتوں کو یہ پنشن ۵۵ برس کی عمر میں بیس برس کی خدمت کے بعد ملتی ہے۔ بعض پیشوں کے مزدوروں کو خاص طور پر معدنی کانوں اور لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو یہ پنشن پچاس برس کی عمر ہی میں مل جاتی ہیں۔

بڑاپے کی پنشن اس صورت میں بھی برابر دی جاتی ہیں۔ جبکہ پنشن پانے والا مزدور پوری طرح صحت مند اور کام کرنے کے لایق ہو یہ پنشن پانے والے افراد اگر چاہیں تو ملازمت پر قایم رہ سکتے ہیں اور ان کو پوری پنشن برابر ملتی رہتی ہے۔

کانکنوں، لوہے اور فولاد کے مزدوروں ماہرین ارضیات اور دوسرے کئی کام انجام دینے والے پیشہ وروں اور ملازموں کو نسبتاً زیادہ پنشن ملتی ہے۔

پنچایتی فارم بورڈ پنچایتی کاشتکاروں کی امداد کے لیے خاص فنڈ منعقد رکھتے ہیں جو زرعی گروہ بندی کے قاعدوں کی شرایط کے مطابق ہوتا ہے

ا-۱

آلو میں غذائی قوت

صحت کے لیے متوازن خوراک کی اہمیت محتاج بیان نہیں کھانے پینے کی مختلف چیزیں ہمارے جسم کو غذائیت کے مختلف اجزا مہیا کرتی ہیں۔ اس مضمون میں آلو کی غذائیت اور اس غذائیت سے پورا فائدہ اٹھانے نیز اس کے استعمال کا بھی طریقہ بیان کیا گیا ہے

کہنے کو تو آلو ایک معمولی سی ترکاری ہے لیکن غذائیت کے لحاظ سے اس میں نشاستے کی کافی مقدار کے علاوہ کئی ضروری وٹامن اور معدنی اجزا بھی موجود ہیں۔ اگر آلو کو ٹھیک طرح سے پکایا جائے تو درمیانی سائیز کا ایک آلو ہمارے جسم کو حرارت کی ۱۱۱ کالریاں، ۲½ اچھی پائی کے کیلشیم کے برابر کیلشیم گندم کی روٹی کے ایک موٹے ٹکڑے کے فاسفورس کے برابر فاسفورس گوشت کی ایک ٹام پلیٹ کے فولاد کے برابر، فولاد، گوشت کے کٹورے کے ایک پیالے کے وٹامن بی کے برابر وٹامن بی اور ایک چھوٹے سنگترے کے وٹامن سی کے برابر وٹامن سی مہیا کر سکتا ہے۔

آلوؤں کی غذائیت سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں خاص ڈھنگ سے پکانے کی ضرورت ہے۔ آلوؤں کو اتنی دیر تو ضرور آنچ دی جائے جس سے ان میں موجود نشاستا پھوٹ پڑے لیکن اتنی نہیں کہ ان کی غذائیت ہی ضایع ہو جائے۔ اگر آلوؤں کو چھلکے سمیت ابالا جائے تو ان میں وٹامن سی اور غذائیت کے دوسرے اجزا بیشتر طور پر موجود رہتے ہیں۔ کاٹ کر ابالنے کی صورت میں آلوؤں کی غذائیت ۳۰ فی صدی کم ہو جاتی ہے۔

جس پانی میں آلوؤں کو ابالا جائے اسے بھی استعمال میں لانا چاہیے کیونکہ غذائیت کے کچھ ضروری اجزا اس پانی میں حل ہو جاتے ہیں آلوؤں کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈالنا چاہیے۔ اور پانی کی مقدار بشکل اتنی ہونی چاہیے کہ اس میں آلو بیٹھ جائیں۔

آنچ کے دوران آلوؤں میں ہرگز نمک نہیں ملانا چاہیے۔ ابلے ہوئے آلوؤں کو رات بھر رکھنے سے ان میں سے غذائیت کا وہ جزو زایل ہو جاتا ہے جو انسانی جسم کو بیماری سے محفوظ رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ بھاپ سے پکائے ہوئے آلوؤں کی غذائیت میں فرق نہیں آتا لیکن اس کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ انہیں ضرورت سے زیادہ آنچ نہ دی جائے۔ بہتر طریقہ یہی ہے کہ کھانے سے تھوڑا وقت پیشتر آلوؤں کا بھرتا بنا لیا جائے جبکے پہلے انہیں چھلکا اتارے بغیر ابالا گیا ہو۔

آلوؤں کو چھلکے سمیت پکانے کی نسبت انہیں ابال کر استعمال کرنا زیادہ مفید ہے۔ ابلے ہوئے آلوؤں کو تلنے سے ان کے بیشتر وٹامن سی اور وٹامن بی ۱ الف ضایع ہو جاتے ہیں۔ البتا چھلکے آلوؤں کو تلنے سے ان کا ۶۰ فی صدی وٹامن سی تو محفوظ رہتا ہے۔ لیکن وٹامن بی ۱ الف بہت حد تک ضایع ہو جاتا ہے۔

جمیع ہیڈ ماسٹر صاحبان فوری توجہ کریں

ڈاکٹر راجندر ناتھ ٹیگور کے ایک طویل افسانے کا ترجمہ نہایت ہی سلیس اور سادہ زبان میں کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام "دعا" ہے۔ محکمہ تعلیمات حیدرآباد نے تمام مدرسوں کی لائبریریوں اور انعامی کتب کے سلسلے میں اس کتاب کی خریدی کی سفارش کی ہے اس لیے جمیع ہیڈ مسٹرس اور ہیڈ ماسٹر صاحبان سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ فوراً اپنا آرڈر بک کرا دیں ورنہ کتاب ختم ہونے پر افسوس کرنا پڑے گا۔ قیمت کتاب عہ۴ علاوہ محصول ڈاک۔ "منیجر ہندستانی ادب"

۹۹۔ اے اعظم لوکر اشرقی۔ پی او۔ جوبلی۔ حیدرآباد دکن

لچکیلا پتھر

(ایک کہانی) ——— قمرالدین قمر

یہ ایک دکان تھی۔

یہاں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ چولہے پر کڑاہی چڑھی ہوئی تھی۔ کڑاہی میں شکر کا شیرا ابال کھا رہا تھا۔ اور اس میں سیدے کی جلیبیاں تیر رہی تھیں۔ دہکتی ہوئی آگ کے شعلے لپکتے پھر کوئلوں کے بجھنے کی مدھم مدھم آوازیں ابھرتیں۔ حلوائی دوسری خالی کڑاہی کھرچتا اور کھرچن نکال کر دکان کے سامنے پھینک دیتا جہاں کئی کتے کھڑے دم ہلا رہے ہوتے۔ ایک بھوری بلی پاس ہی کونے میں دبکی اپنی شنگرفی آنکھیں نکالے غرا رہی ہوتی اور اس کے منے منے پلے اپنی مہین آواز میں میاؤں میاؤں کرتے۔

تھوڑے چند قدم پر راک اور کوڑوں کا چھوٹا سا ذخیرہ تھا جہاں دیہاتی بچے میلے کچیلے چیتھڑوں میں لپٹے لپٹائے کوڑے اور راک کو کرید کرید کر میلے ہوئے کوئلے بٹور کر اپنی اپنی ٹوکریوں میں رکھ لیتے ——— حلوائی بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس کی تنی ہوئی بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے پر قدرے ڈراؤنی معلوم ہوتیں وہ ہر روز صبح غسل کرنے سے پہلے اپنی مونچھوں میں آدھ چھٹانک بھر گھی لگا کر مروڑتا رہتا۔ اس کے جسم پر ایک دھڑی ہوئی فتوی تھی جس کے بٹن سینے پر سے کھلے ہوتے اور سینے کے گھنے بالوں کا جنگل لہراتا ہوتا۔ دھوتی تخنے سے اوپر ہوتی جس پر تیل میدے اور مختلف اقسام کے داغ دھبے ہوتے وہ میدے کی جلیبیاں کڑاہی میں ڈالتے ہوئے حسب معمول کھنکار لیتا اور جھوک کو پھینکتے وقت اس کے ہاتھ کی نہاد کی انگلی لاشعوری طور پر مونچھوں پر چڑھتی پھر وہ اپنی ایک چھوٹی ہوئی آنکھ کو میچ کر دوسری اکلوتی آنکھ کو کسی قدر گھما کر سامنے تنولن کی دکان کی طرف دیکھتا جس پر ایک بوسیدہ پردا پڑا ہوا تھا اور پردے کے پیچھے سے چوڑیوں کی تھرکی جھنکاریں بیک وقت کئی بار فضا میں گونج اٹھتیں جب کوئی گاہک اس کی دکان پر آتا تو اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دیتی "کیا لوگے جی! ——— پان ——— بیڑی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

چوڑیوں کی جھنکاریں دیر تک فضا میں ہچکولے کھاتی رہتیں۔ حلوائی کی نگاہیں گاہک کے ساتھ اس کی دکان پر آ پہنچ جاتیں۔ وہ گوری گوری کلائیوں میں کاسنی رنگ کی چوڑیوں کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ ران کے گوشت کو چٹکیانے لگتا "رام۔ رام۔ سیتا رام" منتا کلہ جو جلیبی لینے آیا تھا حلوائی کی ان حرکتوں کو [illegible] لینا بھول جاتا اور ٹکٹکی باندھے رام نام جپنے لگتا۔ پھر جب حلوائی کی نگاہ اس پر پڑتی تو وہ بوکھلا کر کہتا "کیوں بے ——— چل بھاگ یہاں سے ———" کلہ وہ قدم پیچھے ہٹ جاتا۔ پھر دفعتہً اسے جلیبیاں یاد آ جاتیں۔ وہ کہتا "پہلوان چاچا۔ ہمیں جلیبی چاہئی"

"ہنہ ——— جلیبی چاہئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چل پیسے نکال" کوئلے برابر چیخ رہے تھے اور کڑاہی میں تیل کھول رہا تھا۔ پہلوان اپنی گردن میں لٹکی ہوئی تعویذ کی گرہ کو سرکاتے ہوئے بولا ———

"سن بے کلو۔ راجو اکی موسی کیا کرے ہے بتا تو بھلا"

کلو جلیبی لے کر رک جاتا۔ اور پہلوان کی طرف دیکھ کر کہتا "ریجو ڈاک گھر پال چاچا کی چھٹی دیکھنے گیا ہے اس کا چھوٹا بھائی گڑھی جھیلی کے لیے جمین (زمین) پر پاؤں رگڑ رہا ہے۔ اوکی انکل نانی چریکا (چرخا) کات رہے ہے (اور منی دودھ کے لیے مچل رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" "ابے تو تو ساری رام کہانی بک گیا پر تو جو میں مطلب کی پوچھوں وہ بھی نکال سالے۔ کلو ڈرتے ہوئے لہجے میں بولا "موسی پاؤں پھٹک رہی ہے۔"

"ہنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مونچھوں کو اینٹھنے لگتا "ہش ۔ ۔ ہش ۔ ۔ ۔ ادے سالا دھوکا کا۔

سالے کتے کو ذرا پرے جگا دے۔ دیکھ بھگوان کسم (قسم) اکس ٹھاٹ سے کڑائی چاٹ رہا ہے۔ جان پڑت ہے۔ سالے کے باوا کا حج ہے کھسم (قسم) سادھو کا کا اپنی کبڑی لاٹھی اٹھا کر کتے کی پچھلی ٹانگ پر جوڑ تیتا جہاں پہلے سے ایک گہرا زخم رس رہا تھا۔ کتا جھونکتا ہوا ٹانگ سے لنگڑاتا بھاگ کھڑا ہوتا۔ سادھو کا کا ستیا رام ستیا رام کی صدا بکھیرتے ہوئے گلی کی طرف مڑ جاتا۔

تنولن کی دکان سے چیخنے چلانے کی آواز آتی۔ منی ہمک ہمک کر روتی چوڑیاں آپس میں ٹکراتیں۔ پھر دفعتہً گاہک کی آواز سے تھوڑی دیر کے لیے واویلے کا سیلاب بند ہو جاتا۔ چیخ و پکار کی آندھیاں تھم جاتیں۔ اور گہری سکوت کے درمیان وہ کہتی۔

"دیا سلائی ختم ہو گئی۔" پھر سوپ میں چاول پھٹکتے ہوئے پکارتی "اری رجوا ہے رجو کدھر مر گیا رے" رجو دوڑا ہوا آتا۔ اس کی سانس پھول رہی ہوتی۔ وہ ہانپتے ہوئے بھینی بھینی آواز میں پوچھتا۔ "کاہے رہے؟"

"دیکھ بھینس کے چارا ڈال دے۔ اور لکشمی کی بوا سے کہہ ایک پاؤ ماش کی دال دیدے۔ بابا کا منی آٹ (منی آرڈر) آنے پر سب پیسے چکتی۔ (دے) دیں گے۔ دیکھ جرا (ذرا) جلدی کریو ——" پھر وہ آپ ہی آپ کچ بڑ بڑاتی —— دکان کی سب چیزیں ختم ہو گئی تھیں۔ اور ابھی تک نہ ہی چٹھی آئی تھی اور نہ روپے۔ کس طرح وہ اپنے بلکتے ہوئے کنبے کی پرورش کر سکے گی۔۔۔۔۔۔ انہیں الجھنوں میں وہ دیر تک کھوئی رہتی۔

بھینس ایک کھونٹی سے بندی ڈکار رہی تھی۔ تھوڑی دور پر مٹی اور گوبر کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مکھیوں کے غول کے ساتھ چند برساتی چھچھوندریں کرتے ہوئے اڑتے رہے۔ کھٹال کی دیوار پر اپلے تھوپے چڑے تھے اور برساتی امرود کے درخت کے نیچے ایک بڑا سا کھنڈر تھا جس برسات کا گندہ پانی۔ پچالی گوبر اور امرود کے پتے پڑے ہوئے تھے بھینس چیخ رہی تھی اس کی پیٹھ پر ایک کوا بیٹھا ہوا اپنے پنجوں میں مرغی کا چوزہ لیے چونچ مار مار کر کھا رہا تھا۔ چوزا خون میں لت پت چوں چوں کر رہا تھا۔ اور نیچے مرغی پر پھیلائے گردن تانے کڑ کڑا رہی تھی —— کٹ کٹ کٹاس۔۔۔۔ کٹ کٹ کٹاس۔

رجو بھینس کی ناند میں چارا ڈال کر پھیلا نکیں بھرتا ہوا لکشمی کی کی بوا کی طرف چل پڑا۔ بھینس زور زور سے ناند میں سینگ مارنے لگی دھوپ کی ہلکی ہلکی کرنیں جنگلی امرود کے درخت پر پڑ رہی تھیں۔

موسی اس الجھن میں کھوئی سوچ رہی تھی —— برسات بھی آ گئی۔ کنواریاں جھولا ڈالیں گی۔ اور اندھے بھکاری کی سبزی کی آواز فضاؤں میں ملگوتی لہنے بکھیر دے گی —— اور وہ۔۔۔۔ وہ اسی طرح بیٹھی نیر بہاتی رہے گی۔ دو سال گذر گئے۔ دو بہاریں بیت گئیں۔ دو برساتیں اپنی چھم چھم چھاچھم بوندیوں سے ٹھٹھتی ہوئی چلی گئیں مگر وہ نہ آیا۔ وہ لام پر زندگی اور موت کے گہوارے میں جھولتا رہا۔ اسے ان کی یاد میں ستاتی ہوں گی۔ گاؤں کی پر کیف فضا کی یاد کچوکے بن کر دل میں کھبتی ہوں گی۔ پھر وہ کیوں گیا۔۔۔۔۔ اور منی کی طرف اس کی سہمی ہوئی نگاہیں جا کر رک گئیں۔ وہ دودھ کے لیے مچلتی ہوئی روتی ہوئی فرش پر سو گئی تھی۔ قریب ہی رجو کا چھوٹا بھائی اوندھا پڑا سسک رہا تھا۔ مگر کڑ کڑا کی بھیلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ ان کی حالتیں دیکھ کر کڑھتا تھا۔ اسے ان کی چیخیں تیز بجلی کی کڑک کی طرح کانوں کے پردے میں چھنچناتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ تب وہ لام پر چلا گیا کہ وہاں سے ہر مہینے سبز رنگ کے نوٹ منی آرڈر کر کے گھٹی گھٹی فضاؤں میں زندگی کے نغمے میں ایک جادو بھر دیگا۔ ان کی ہمدمی کی داستان خطوط میں پڑھ کر مسرت سے جھوم اٹھے گا —— مگر آج مہینے کی کئی تاریخ ہو گئی تھی۔ مگر نہ اس کی کوئی چٹھی آئی تھی اور نہ منی آرڈر —— وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ "گھر کا ناوج ختم ہو گیا۔ منی کی جانگیا پھٹ گئی۔ لڑکوں کے بدن کے کپڑے چیتھڑے ہو گئے۔ دکان کا مال ختم ہو گیا گاہک واپس جانے لگے۔ میری دھوتی بھی ہر جگہ سے پھٹ گئی۔ چوڑیاں ٹوٹ گئیں —— یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے رام!

پھرا سے یاد آیا۔ اس کے سوامی نے کہا تھا۔ تو ورہی ہے۔ تو نراس نہ ہو پگلی۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ بہت جلد۔۔۔۔ اس وقت میرا صندوق پچاروپوں سے بھرا ہوگا اور میری خاکی وردی کے سینے پر تمغا لگا ہوگا۔ حولدار بن کر آؤں گا نمبردار جی سلام کرے گا۔ پھر ہمارے دن سکھ اور شانتی کے ہوں گے۔ ہمارے بچوں کے کپڑے اجلے اجلے ہوں گے۔ میں ان کے لیے کھلونے لاؤں گا۔ لکڑی کا گھوڑا۔ یا جا۔۔۔۔ اور تیرے لیے۔۔۔۔" ماضی کے جزیرے میں وہ دیر تک خیالوں کی کشتی چلاتی رہی۔

دور آسمان کی وسعتوں پر جہاز اڑا جا رہا تھا جس کی سیٹی فضا میں پھیل گئی تھی۔ جسے دیکھنے کے لیے دیہاتی بچے اپنی اپنی جھونپڑیوں سے نکل کر سر اٹھائے کھلی فضا کو سونگتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک بوڑا کسان دالان میں چارپائی بچھائے حقا گڑگڑا رہا تھا۔ مولوی صاحب گھر سے نکل کر مسجد کی طرف لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔۔۔۔۔ پہلوان حلوائی کا چولھا بجھ چکا تھا۔ مٹھائیاں کھانچے سے ڈھلکی ہوئی بھنیں اور ایک دھیڑ عمر کا فوجی ٹول پر بیٹھا حلوا پوری کھا رہا تھا۔

فوجی دیکھنے میں اچھا خاصا تھا۔ بدن بھی بھاری بھرکم تھے چہرے پر رعب داب کے علاوہ سرخی بھی تھی۔ اس کے چہرے کے نقش و نگار بتاتے تھے وہ دنیا کے مختلف گوشوں کو چھان آیا ہے۔ اور زمانے کی سرد و گرم سے خدک واقف ہے۔

پہلوان حسبِ عادت شہادت کی انگلی سے مونچھ کے بالوں کو اینٹھتے ہوئے بولا۔

"کہاں سے آرہے ہو جی۔۔۔۔۔"

"جنگ ختم ہوگئی کیا؟۔۔۔۔" سپاہی نے ایک یار اس کی طرف دیکھا۔ اور پوری کا نوالا موٹھ میں ٹھونس کر چبانے لگا جب وہ پوری کھا چکا تو اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر صاف کیا۔ دیر تک فضا کی سوندی سوندی خوشبو کو سونگتا رہا۔ دوبارہ پھر جب پہلوان نے پوچھا تو وہ قدرے ناک بھوں چڑھا کر بولا

"ختم تو ہوگئی۔ مگر ایک جنگ ابھی باقی ہے۔"

"وہ کیوں؟" پہلوان کا موٹھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اس لیے کہ بنگال بھوک کی آگ میں تپ رہا ہے اور ہندستان کا چور بازار جاگ اٹھا ہے۔ تم میری باتوں کو نہیں سمجھو گے۔۔۔۔" بات تو ٹھیک کہتے ہو۔ بھلا میں ان باتوں کو کیا سمجھوں۔" اور اپنی عادت سے مجبور ہو کر واحد آنکھ کو مٹکا کر بولا۔" اپنے نمبردار تو عورت کی باتیں کرتے ہیں جی۔ اس کی کومل کومل گوری گوری کلائیوں کی مدھ بھری آنکھوں کی ہائے رام" پہلوان بیڑی کا گہرا لگا دھواں اڑاتے ہوئے ٹھہرا۔

سپاہی نے بھویں سکیڑ لیں۔ اور اس کی طرف وحشت کی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"تم حکم کے غلام ہو۔ تم ایک ایسے ٹٹو ہو جو سرپٹ ایک ہری سی پگڈنڈی پر بھاگا جا رہا۔ اور اگر کبھی موقع ملتا ہے تو ادھر ادھر اس لیے نہیں دیکھتا کہ تمہارا اس نمبردار کے ہات میں ہونا ہے۔ اور نمبردار کی کرخت آواز تم پر تازیانے کی طرح پڑتی ہے۔ تم اس ناسور کو بیسنے پر رستا ہوا چھوڑ دیتے ہو کہ یہ مالک کا دیا ہوا ہے بھگوان کی یہی اچھا ہے۔ بے وقوف انسان تم صرف عورت کو جانتے ہو۔ عورت کو عورت کی کومل گوری گوری کلائیوں کو۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ سپاہی کا قہقہہ ارتعاش بن کر فضا میں گونجنے لگا۔ گونجتا رہا۔

پہلوان اس کی طرف ہونک کی طرح دیکھتا رہا۔ پھر المونیم کے گلاس میں پانی بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔" لو پانی پیو۔ تم پیاسے ہو" سپاہی نے گلاس لے کر پانی کو زمین پر انڈیل دیا۔ اور پیر پٹکتا ہوا چلا گیا۔۔۔۔ وہ دیر تک جاتے ہوئے سپاہی کو دیکھتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ عجیب آدمی ہے۔ معلوم ہوتا ہے سر پھرا ہے۔

کھیتی کے سلسلے کھیتوں پر بگلے اڑے جا رہے تھے کسان بیل کی جوڑی لیے سورج نکلنے سے پہلے اپنے اپنے کھیتوں کی طرف چل پڑتے۔ چرواہے مویشیوں کو ہنکارتے

پھر کچھ دیر بعد سورج پورب اور سے نکلتا کر جھانکنے لگتا اور اس کی شوخ کرنیں چاروں طرف پھیل کر ایک جال سا بن دیتیں۔ دیکھتے دیکھتے کنویں پر بھیڑ لگ جاتی۔ عورتیں ٹھیلا اور گاگر لیے اٹھائے چلی آتیں۔ بوڑھے جوان مسواک چباتے ہاتھ میں لوٹا لیے گھر سے کنویں کی طرف چل پڑتے اور دیکھتے دیکھتے وہاں میلا سا ڈھیلا سا لگ جاتا۔

آج صبح ہی صبح ایک ٹانگا ٹک ٹک کرتا گرد و غبار اڑاتا چلا آرہا تھا۔ ٹانگہ جب گاؤں میں داخل ہوا تو لڑکے چیختے چلاتے ہوئے ٹانگے کے استقبال کے لیے دوڑ پڑے اور ٹانگے کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ کئی ایک لڑکے ارے خوشی کے چیخنے لگے "پال چاچا۔ پال چاچا۔۔۔۔۔۔" اور دوسرے لڑکے ان کا ساتھ دینے لگے کہ بھلا یہ پال چاچا کے لیے ہو سکتا۔ پال چاچا تو ایک خوبصورت دیہاتی جوان تھا۔ اس کی متوالی آنکھیں تھیں۔ اس کی متوالی ناک تھی گندمی رنگ اور خمدار بال تھے۔ پھر یہ پال۔ چاچا کیسے ہو سکتا ہے جسکے اس کی آنکھیں بے نور تھی سر کے بال بڑے بڑے اور الجھے ہوئے تھے ناک کے پاس ایک گہرا زخم تھا۔ داہنا پاؤں ٹخنے سے نیچے تک کٹا ہوا۔ اور پنڈلی میں بے سا کھمی تھی۔ رنگ زردی مایل اور آنکھوں کے حلقے سیاہ پڑ گئے تھے۔

پھر جب موسی پال کی آمد کی خبر سن کر گھر سے نکلی تو اس کا چہرا بشاش تھا اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اور ہونٹ سرخ ہو گئے تھے جسم کا رواں رواں ایک بے پایاں مسرت سے کانپ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی بہ تھوڑا سا رستا جلد ختم ہو جائے اور جلد سے جلد وہ اپنے سوامی کے سینے سے چمٹ کر اس کے شانے پر سر نہوڑا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔۔۔۔ ناتھ تم آگئے میں کب سے راہ تک رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اور اس کا ناتھ اس کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہے گا "پگلی تو پھر رونے لگی۔ اب تو میں آگیا۔ حولدار ین کر اری دیکھ یہ تمغا میرے سینے پر لٹکا رہے ہیں اور میں تیرے لیے نئی نئی ساڑیاں لایا ہوں"۔

اور موسی بے تحاشا بھاگی جا رہی تھی اپنے ناتھ سے ملنے کے لیے بھاگی جا رہی تھی۔ دفعتہً وہ ٹانگے کے پاس جا کر رک گئی جیسے اس کے قدم کانپنے لگے۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔۔۔۔ آنکھوں کی خشیاں یک لخت درد اور تکلیف کی لہروں ڈوب گئیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ٹانگے پر بیٹھا ہوا جو اس کا ناتھ ہے۔ اس کا سوامی اس کا اپنا پال۔۔۔۔ اس کے لرزشیں بڑھتی گئیں۔ درد اور تکلیف کی سوئیاں رگ رگ میں سرائیت کر گئی جس کی انتہا تکلیفوں نے آنکھوں میں آنسو کی ندیاں سمو دی۔ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ گر گئے۔ وہ ایک مجسمے کی طرح کھڑی دیر تک سے دیکھتی رہی وہ حولدار تھا نہ اس کے سینے پر تمغا آویزاں تھا۔ اور نہ اس پر اس کی مخصوص پیاری سی مسکراہٹ۔۔۔۔ بلکہ اس کے چہرے خطوط بگڑ چکے تھے۔ ٹانگ بیساکھی کی محتاج ہو گئی تھی۔

وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ بلکل جامد و ساکت۔ پتھر کے مجسمے کی طرح۔ وہ دوڑ کر اس کے سینے سے چمٹی اور نہ اس نے اس کے سر پر سہرا کر آنسو بہائے۔ بلکل وہ واپس جانے لگی۔ واپس اپنے گھر کی طرف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پہلوان حلوائی یہ منظر دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اسے آج ہر گوری گوری لڑکیاں اور بھی اچھی معلوم ہوئیں۔ وہ اپنی کے مطابق موچھوں کے بال اینٹھنے لگا کہ دوسرے لمحے مکھ مڑی اور بھاگتی ہوئی اپنے پال اپنے بدصورت پال سے کہ ہندستانی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

پہلوان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

پال بیساکھی کا سہارا لیے موسی کے شانہ بشانہ اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

اگر آپ مصنف ہیں

اور

اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیں اس لیے کہ یہی وہ بے باک رسالہ ہے جو اپنے اور غیروں کا لحاظ بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے۔

سورج کی حرارت سے کام کرنے والے چولھے

قدرت نے ہندستان کو سورج کی کرنوں کی ایک قوت عطا کی ہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ قریب قریب پورے سال قایم اور برقرار رہتی ہے۔ اگر سورج کی ان کرنوں کو کام میں لانے کے طریقے دریافت کر لیے جائیں تو یہ کرنیں ایک اہم قدرتی دولت ثابت ہو سکتی ہیں۔ ایک گھنٹے میں ایک ایکڑ رقبے زمین کو جس قدر سورج کی حرارت پہنچتی ہے وہ تقریباً دس من پتھر کے کوئلے کے برابر ہوتی ہے۔ ایک چھوٹی سی ریاست مثلاً جودھپور جو ہندستان کے رقبے کا تیسواں حصہ ہے اسے سورج کی اتنی قوت پہنچتی ہے جتنی قوت آج کل تمام دنیا میں صرف ہوتی ہے۔

تاہم سورج کی قوت کو استعمال میں لانے کا مسلہ بہت ہی پیچیدہ ہے کیونکہ بڑے بڑے رقبوں میں سے سورج کی حرارت کو جمع کرنا بہت گراں بھی ہے۔ بہرحال پچھلے تین سال سے ہندستان کی نیشنل فزیکل لیبارٹری اپنے ڈایرکٹر ایس۔ ایس۔ بھٹناگر اور کے۔ ایس۔ کرشنن کی زیر ہدایت سورج کی قوت کو کام میں لانے کے متعلق تحقیقات کرتی رہی ہے۔ تجربات کے نگران اسسٹنٹ ڈایرکٹر ڈاکٹر ام۔ ال گھاٹی نے اپنے دوستوں کی مدد سے ایک ترکیب دریافت کی ہے جو "سولر کوکر" (آفتابی چولھا) کے نام سے مشہور ہے اور صرف سورج کی طاقت سے ہی کھانا پکانے کے کام آ سکتا ہے۔

سولر کوکر (آفتابی چولھا)

آفتابی چولھے کی ساخت بہت ہی سادہ ہے۔ اس میں صاف مناسب صنع قطع کا ایک عکس انداز ایک موزوں چوکی پر نصب کیا ہے اور اسے حرارت کے برابر ٹھیک ٹھاک بھی کیا جا سکتا ہے۔ عکس انداز سورج کی کرنیں حاصل کرتا ہے اور انہیں راست اس برتن کی طرف منتقل کر دیتا ہے جس میں کھانا پکتا ہے۔ دیہات کا کوئی بھی برتن خوراک کو پکانے میں کام آ سکتا ہے۔ صرف اتنی سی بات درکار ہے کہ برتن کے پیندے کو کالا کر دیا جائے کیونکہ کالا کی ہوئی سطح سورج کی حرارت کو زیادہ خوبی سے جذب کرتی ہے۔

اوپر بیان کیے کوکر میں دس پندرہ منٹ میں ایک پونڈ پانی ابلنے لگتا ہے لیکن مدت سورج کی کرنوں پر منحصر ہے۔ بہت سی ترکاریاں بیس سے تیس منٹ میں پک سکتی ہیں۔ اس سولر کوکر کو جاڑے اور گرمی کے موسموں میں صبح سے شام تک استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ کوکر صبح شام اور دوپہر کو قریب قریب یکساں کام دیتا ہے۔ اور جاڑے کے موسم میں بھی گرمی ہی جیسا کام دیتا ہے تاہم چولھے کی کارکردگی پر بادلوں کا چھاتا ہوا کے جھکڑ گرد و غبار اور دھوئیں کا بڑا اثر پڑتا ہے کیونکہ ان چیزوں کی موجودگی ماحول کی صفائی اور سورج کی چمک کو کم کر دیتی ہے ان حالات میں کھانا پکانے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔

اگرچہ اس چولھے میں ہر قسم کے برتن استعمال ہو سکتے ہیں لیکن اس کی کارکردگی میں ایک دبا دو والے چولھے کے استعمال سے یا ایسے برتن کے استعمال سے جس کا ڈھکنا سخت ہو۔ اور بخارات کو باہر نہ نکلنے دے اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔

خوراک پکانے کی ایک ترکیب کے اعتبار سے "سولر کوکر" میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ جو کھانا پکانے کے دوسرے طریقوں میں میسر نہیں ہیں۔ اس کوکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ایندھن کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کوئلہ بھی اور بجلی کے اخراجات سے نجات ملتی ہے۔ شروع میں یکمشت رقم کا خرچ ضرور بیٹھتا ہے جو چند مہینوں کے اندر ہی ایندھن کی بچت کے ذریعے برابر ہو جاتا ہے اس کے سوا یہ نہایت صاف اور پاکیزہ طریقہ

اس میں نہ دھوئیں ہی کی دقت اور نہ راکھ کی مصیبت کوئلے سے بات ہی کالے ہوتے ہیں۔ اور نہ لکڑی ہی ہاتوں کو زخمی کرتی ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی اس کو کر" کی یہ ہے کہ اس کا استعمال نہایت ہی محفوظ ہے۔ اس میں نہ آگ کا شعلا نہ آگ لگ جانے کا خوف نہ بجلی کی کرنٹ مارنے کا ڈر اور نہ گیس کی مانند خطرات ہوتے ہیں۔ اس پر طرا یہ کہ کھانا پکانے کا یہ ایسا طریقہ ہے جس سے کھانا جلتا بھی نہیں۔ اس میں بجلی کے ذریعے کھانا پکانے کی طرح نہ بجلی کے تار کی ضرورت ہے اور پلگ درکار ہے گیس سے خوراک پکانے کے لیے پائپ اور دوسرے سامان کی ضرورت پڑتی ہے لیکن اس کو کر" میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

انسان جو چیز بھی استعمال کرتا ہے اس میں کچھ خوبیوں کے ساتھ خرابیاں بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ سورج کی حرارت سے کھانا پکانے کا طریقہ سستا، صاف اور محفوظ ہے لیکن ابھی اس میں ایک خرابی بھی ہے یعنی یہ کہ اس سے رات کے وقت کھانا نہیں پکایا جا سکتا۔ اور نہ ابر آلود اور خراب موسم میں یہ کوکر قابل استعمال ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ ساتھ پکانے کے لیے کوئی متبادل ذریعے بھی موجود ہونے چاہئیں۔

تاہم اس خرابی کو بہت سی خوبیوں کی بدولت نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔

اس چولھے کو استعمال کرنے کے لیے وسیع صحن یا برآمدے کی ضرورت ہوتی ہے چولھے کے لیے صرف تھوڑی سی جگہ درکار ہے تاہم سورج کی کرنیں جذب کرنے کے لیے اسے چھوٹے سے برآمدے میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ ضرورت کے وقت کوکر کو بہت آسانی سے منتقل بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ مکمل نمائندہ اور دوسرا سازوسامان کا کل وزن ۱۵ سیر ہے۔ اس کوکر کی قیمت اسی روپے کے لگ بھگ ہے ابھی تو اس کا رواج صرف شہر بمبئی تک محدود ہے

جن حضرات کے نام ہم نے چندے کے بل روانہ کیے ہیں ان سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنا چندا جلد ہی منی آرڈر کر دیں۔ وی پی بھیجنے میں خرچ زیادہ بیٹھتا ہے اس لیے ہم نے وی۔پی کا طریقہ چھوڑ دیا ہے۔

شمال مغربی چین میں آرٹ اور کلچر کی ترقی

س۔ سلطانوف نے چین سے ایک خط لکھا ہے جو "ازدستیہ" عنوان سے شایع ہوا ہے "آنکھوں کو نور دل کو سرور بخشنے والا" شمال چین میں لینے والی بہت سی قوموں کے کلچر اور آرٹ کی بے ترقی کا ذکر کرتے ہوئے سلطانوف لکھتے ہیں کہ صوبے شن میں تعلیم عام کے سلسلے میں خاص طور پر زبردست کامیابیاں ہوئیں۔ وہاں ابتدائی اسکولوں میں طلبا کی تعداد اس سال لاکھ بتیس ہزار تک پہنچ چکی ہے یعنی کومن تانگ کی پرانی کے زمانے سے تقریباً دوگنی۔ ابتدائی اسکولوں کے طلبا میں ۵۰ فی صوبی گورنمنٹ فی صدی کرنا ختنائی اور بیس فی صدی چینی اور دو قوموں کے بچے۔ اسکولوں اور ان پڑھ ختم کرنے والے مرکز و متواتر بڑھ رہی ہے لیکن اب بھی وہ تعلیم کے خواہش مند تمام مطمئن کرنے کے لیے ناکافی ہیں جیسا کہ "کو آنگ منگ جیہ پاؤ" کے اخبار نے اطلاع دی تھی کہ آج کل سنکیانگ کے ہر پانچ بچوں سے ایک تعلیم حاصل کر رہا ہے یہ صرف اس صوبے کی تاریخ میں چین میں ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ شمال مغربی چین کے دو صوبوں میں بھی تعلیم عام کی پیش رفت کم نہیں ہوئی۔ شمال مغ کے محنت کش عوام کے لیے بہت سے مخصوص فنی اور عالا تعلیم بھی قایم کیے گئے ہیں۔ مختلف قوموں کے بیگڑوں طلبا سنکیانگ اکیڈیمی میں داخل ہیں۔ اس اکیڈیمی، اس کی شاخوں اور مدرسوں سے اس سال سات سو عالا تعلیم یافتہ ماہرین تربیت کے ماہروں کی تربیت کا ایک اور اہم مرکز شہر لنسیاں میں واقع سرکاری یونیورسٹی ہے چینی گیمونسٹ پارٹی اور عوامی حکومت کوشش یہ ہے کہ قومی اقلیتوں کے کلچر اور آرٹ کو ہر صورت دی جائے۔ انہیں پرمسرت اور محفوظ زندگی کی تعمیر کرنے دی جائے ——

گونگی

اجمل سدید (عادل آبادی)

آج جب میں دندناتے ہوئے قدموں دفتر سے باہر نکلا مجھے معلوم ہو رہا تھا فضاؤں میں جیسے کسی نے نشا گھول دیا ہو۔ عنبر جیسا کی حسین رعنائیاں سی فضاؤں میں تیر رہی تھیں۔ بادل آلیس میں سرگوشیاں سی کر رہے تھے۔ سرسراتی ہوئی خنک ترنم ریز ہوا جیسے کہہ رہی تھی "پینے کے دن میں پلانے کے دن ہیں" اور پھر ایکا ایک تصور میں پیمانے چھلکنے لگے۔ لال لال پیمانے ——— قلوپطرا کی حسین گردن کے سے حسین پیمانے اور پھر لال لال شراب مجھے بے پیتے ہی نشا سا چڑھ گیا اور چاہے نہ چاہے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے جیسے میری ہڈیوں میں کسی نے نشیلی سیال بھر دیا ہو ——— پانچ فٹ دس انچ کے قد میں کچھ اضافا سا محسوس کرنے لگا۔ چھتیس انچ کے سینے میں کچھ اور وسعت آگئی۔ ہاتھوں میں تیزی آگئی تھی۔ آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ لبوں پر بلاوجہ ہی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اور میں مسکراتا گنگناتا ریلوے کی پٹریوں سے ایک شریر لڑکے کی طرح اچھلتا کودتا گندی بڑی ہوئی نالیوں کو پھلانگتا ہوا سڑک پر آگیا ——— اپارا وے کے ہوٹل کے پاس قدم کچھ اور ہو گئے۔ اور پھر مجھ میں کچھ اتانیت سی آگئی۔ اپنے آپ کو کچھ قابل فخر سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اور جب اسٹیٹ بنک منچر پال کے قریب پہنچ گیا تو ایکا ایک میری گردن غیر شعوری طور پر بائیں جانب گھوم گئی۔ پنڈت ہنر وا اور مہاتما گاندھی جی کے مجسمے نظر آئے اور میں دل ہی دل میں روز کی طرح عقیدت کا ایک سلام پھینک مارا۔ پنڈت ہنر وا کو سنجیدہ ہو گئے۔ مہاتما جی کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ مہاتما جی جیسے پیار سے بول رہے تھے۔

"بیٹا آج بہت خوش نظر آرہے ہو ——— ؟"

"ہاں باپو جی" میں مسکراتے ہوئے گنگنانے کے انداز میں بولا ——— "آج تنخواہ ملی ہے پورے ساٹھ روپے سکہ عثمانیا" پھر سینا کچھ اور تن گیا قدم میں کچھ اور اضافا ہو گیا۔

"و صرف ساٹھ روپے"! ؟

مہاتما جی نے جیسے تھپڑ مار دیا تھا میرے موہنڈ پر ——— مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پرا قدا ایک دم گھٹ گھٹا کر ٹائی پٹ مین گیا ہے۔ سینا بھیچ کر قریب آگیا ہے۔ آنتیں سیال کے بجائے پیروں میں یخ لسنا سیسا ڈال دیا گیا ہے ——— مسکراہٹ کی جگہ میرے چہرے پر خلا آگیا۔ جی میں آیا تڑاق پڑاق کھری کھری سنانی شروع کر دوں جذبات کا ایک ریلا سا ابل کر حلق تک آگیا۔ مگر میں زبردستی تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"باپو ——— ! تو پھر کیا لاک روپے ملیں گے۔ مجھے ——— صبح سے شام تک دفتر کی فائیلیں کھنگالنے کے بعد او وکیا ملیں گے آپ کے ہندستان میں ہر کلرک کی تنخواہ مجموعی طور پر صرف ساٹھ روپے ہے۔ سمجھے مہاتما جی ——— آپ !"

مہاتما جی۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر سمجھ چکے تھے کہ "نونڈا" زہر اگلنے والا ہے اور پھر جب میں نے زہر اگل دیا تو ان کے چہرے پر اچانک پدرانا شفقت سی آگئی۔ میرے ان تلخ الفاظ کو ان سنی کرتے ہوئے بولے ———

"بیٹا! بچ بولو۔ پر گڑنے سے فائیدا ——— " اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے "ہاں ٹھیک تو کہہ رہے ہو تم ……"

ایکا ایک مہاتما خاموش ہو گئے۔ سارا جسم پتھر کا ہو گیا بھگوت گیتا اسی طرح سینے سے لگ گئی۔ اور مہاتما اٹینشن (ATTENTION) ہو گئے۔ میں حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ ایکا ایک مہاتما جی بولتے بولتے چپ کیوں ہو گئے ——— اور پھر مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی میرے ہاتھ کو بڑے ہی پیار سے سہلا رہا ہے اور پھر ایکا ایک آواز آئی ——— "ہی ہی ہی ہی ہی ——— !"

اور میں جیسے سے اچھل سا گیا۔ اس "ہی ہی" کی آواز سے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک گونگی جوان بھکارن چہرے پر مسکراہٹ لیے آنکھیں مٹکا مٹکا کر جیسے پوچھ رہی تھی "کیوں بھول گئے بابو ——" ایک ابال سا سینے سے نکل کر حلق تک آ گیا۔ ایک جھرجھری سی آئی۔ ایک جنبش ہوئی اور میں نے جھٹکا دے کر اپنا نام چھڑا لیا۔ ایک ذرا جی بھر کے ہمالہ کو دیکھا اور پھر گونگی جوان بھکارن کو دیکھتا ہوا تیز تیز قدموں دوڑتا ہوا احمد کے ٹھیلے کے پاس رک گیا۔

مجھے وحشت سی ہو رہی تھی۔ اس بھکارن سے —— گونجر پال کی فضاؤں میں میری یہ وحشت بے معنی سی ہے مگر نہ جانے کیوں۔ جب بھی اس سے سامنا ہو جاتا ہے فوراً ہی اپنے آپ میں کچھ کمزوری سی محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اور جلد سے جلد اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں پیسا یا اکنی تھما کر کسی طرف کھسک جاتا ہوں۔

خدا میری سمجھ میں نہیں آتا اس بدصورت بدہیئت گونگی سے مجھے خوف کیوں ہوتا ہے۔ جیسے مجھے اس کے بکھرے ہوئے خشک بالوں سے نفرت نہیں ہے۔ اس کی پھٹی ہوئی چولی سے جھانکتی ہوئی جوان چھاتیوں سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ کولھوں تک عریاں رانوں سے آج تک میری حیوانیت نہیں جاگی۔ اس کی مسکتی ہوئی آنکھوں جوان ہونٹوں نے آج تک میرے دل میں کسی قسم کی گدگدی نہیں کی —— میں نے ہمیشہ اسے ایک بھکارن کی طرح دیکھا ہے۔ جب بھی وہ میرے سامنے آتی میں اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتا ہوں۔ وہ مسکراتی اچھلتی کودتی ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑ نے لگتی ہے۔ آج بھی میں اسے کچھ دیدیتا مگر —— مگر نہ جانے کیوں میں کچھ بھی نہ دے سکا۔ اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ کچھ کہہ رہے تھے اور پھر شام کا بھیانک سناٹا۔ پنڈت نہرو اور گاندھی جی کے مجسمے —— اور میں وہاں سے بھاگ آیا۔

میں نے سب سے پہلے اسے گونجر پال کے بس اسٹینڈ پر دیکھا۔ جب میں ایک آر۔ ٹی۔ ڈی کی ایک دقیانوسی بس سے اتر کر احمد کے ٹھیلے کے پاس سگریٹ لینے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا اور یہ بھکارن نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی اور ایکا ایک میرا کوٹ کھینچتی ہوئی ہاتھ پھیلائے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "ہی ہی ہی ہی" اور آنکھیں مسکاتی ہوئی ہاتھ نچاتی ہوئی جیسے پوچھ رہی تھی —— بابو ایک پیسا —— ہی ہی ہی ہی"

اس کی اس بے تکلفی پر جب میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ سہم گئی جیسے کہہ رہی تھی "محض ایک پیسے کے لیے کیوں گھور رہے ہو بابو —— لو میں اپنے آپ چلی جاتی ہوں" اس کا چہرا لٹک گیا۔ اور وہ سہمی ہوئی خوف زدا نظروں سے دیکھتی ہوئی دوسرے سخی داتاؤں کے پاس چلی گئی ——

گونجر پال کے ایک گاندھی ٹوپی کھدر پوش نے زور کی چیخ ماری!

"پاکٹ پلیز —— پولیس" !!! اور پھر بھکارن کو دیکھ کر ان کا چہرا تمتما اٹھا۔ ایکا ایک ہات فضا میں لہرایا اور پھر تڑاخ سے چانٹا لگا۔ انہوں نے ہما کا اصول سمجھا دیا۔

مٹھو رام بجوں جنرل مرچنٹ گونجر پال ایکا ایک چلانے لگے —— "ارے کوئی بچاؤ —— کوئی بچاؤ ——" اور پھر اپنی تھلکتی ہوئی توند کو سنبالتے ہوئے سہمی ہوئی نظروں سے بھکارن کو دیکھتے ہوئے "ٹور کی بچی! بھاگ شالی یہاں سے —— پیسا مانگتی ہے چھنال —— اور پھر مٹھو رام بجوں جنرل مرچنٹ گونجر پال نے بھکارن کو بڑی سخاوت سے موٹی موٹی گالیاں دے ڈالیں۔ مگر بلاک مارکٹ کی کمائی کا ایک پیسا بھی گھر سے نہ نکل سکا۔

ایک دھرماتما قسم کے پنڈت جی عینک کو درست کرتے ہوئے کھنکار کر بولے۔

"سالی پر جوانی کیا آنے لگی ہے ——"

اور پھر کوک شاستر، پریم شاستر، گرہ شاستر کے سارے اوراق فر فر سنانے لگے۔ جنسیات پر ایک لکچر دے ڈالا۔ میری اسٹولیس ہیولاک ایلس، فرائڈ کے سارے نظریات کھینچ کر بس اسٹانڈ کی فضاؤں میں تیرنے لگے۔ مختلف نظروں سے بس میں ایک جوان

لڑکی کو دیکھ کر مسکرائے۔ اور پھر تناوے بنر کی بیڑی کے دو چار کش کھینچ کر داد طلب نظروں سے مسافروں کی طرف دیکھنے لگے۔

اور پھر میں نچر بال کی سڑکوں پر اسے روز ہی دیکھنے لگا۔ یہیں احمد کے ٹھیلے کے پاس۔ کر وڑ گری کے مہوے کے نیچے۔ یا پھر ساڑھے نو بجے اسٹیشن پر کسی نہ کسی مسافر سے پیسے مانگتی ہوئی نظر آتی۔ جھڑکیاں کھاتی ہوئی نظر آتی۔ کوئی طمانچا لگا دیتا کوئی گالیاں دیدیتا۔ موٹی موٹی گالیاں ماں بہن کی گالیاں، بھکارن کی کنواری جوانی کی گالیاں — اس لیے کہ وہ گونگی ہے وہ گالیوں کا جواب نہیں دے سکتی۔ وہ شکایت نہیں کر سکتی۔ وہ صرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ سکتی ہے بعض بعض دفعہ اس کے ہونٹ کپکپانے لگتے۔ تھرتھرانے لگتے۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ آنکھوں میں ہزاروں سوال تڑپنے لگتے۔ ایک ہوک سی دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر حلق تک آجاتی۔ اور پھر وہ زبردستی اس ابھرتی ہوئی ہوک کو نگلنے پر مجبور ہو جاتی —

دھرماتما کی زبان میں واقعی اس پر اب جوانی آنے لگی تھی وہی جوانی جو ہر جاندار پر ایک طوفان بن کر آتی ہے جہاں پہنچ کر آدمی بہکنے لگتا ہے ایک نجان سا نشا جسم کے رگ و ریشے میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ آنکھیں بدمست ہو جاتی ہیں۔ بات بہکنے لگتے ہیں ہونٹوں پر بلاوجہ بھی مسکراہٹ آجاتی ہے۔ صبح بھر میں گدگدیاں سی اٹھنے لگتی ہیں۔ اور آدمی جوانی کے اس مدمست نشے نہ جانے کیا کیا کر بیٹھتا ہے۔

گونگی کے جسم میں بھی گدگدیاں سی اٹھ رہی تھیں انجان سی گدگدیاں — ایسی گدگدیاں جس میں ایک کیف ہوتا ہے اب وہ آنی پیسے کے لئے سے پیسے نہیں مانگتی تھی ملکے نظریں نیچے جھکائے بات پھیلائے چپ چاپ کھڑی ہو جاتی۔ جب کبھی کوئی جوان قسم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا تو وہ کانپ اٹھتی اسے ایک زور کی جنبش سی ہوتی۔ ایک سنسنی سی سارے جسم میں دوڑنے لگتی۔ گال انگارے سے ابلنے لگتے۔ شرم و حیا سے سکڑی ہوئی وہ گٹھری سی بن جاتی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کر وڑ گری کے مہوے کے نیچے کھڑی ہوئی گھنٹوں سوچنے لگتی۔

ایک رات — یہی کوئی دس بج رہے تھے اور میں آئرن فیکٹری کے کوارٹروں سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ کالی سنسان رات قدم قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ بادلوں کی گرج بجلی کی تیز چمک کہہ رہی تھی کہ زور کا بارش ہونے والا ہے۔ اور مجھے جلدی تھی کہ سگریٹ لے کر جلد سے جلد اپنے کوارٹر چلا جاؤں وہ جیب میں سگریٹ لے کر واپس آرہا تھا ایکایک بادل زور سے گرجا اور میں ایکا ایک اچھل کر کسی سے ٹکرا گیا۔

"ہی ہی ہی، ہی ہی ہی" بھکارن کی ہنسی کی آواز آئی اور میں سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بجلی زور سے چمکی اور میں کانپ کر رہ گیا۔ میرے سامنے وہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کا بات پھیلا ہوا تھا۔ وہی بکھرے ہوئے بال عریاں ٹانگیں۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اور پھر میرا ہات ایکایک جیب کی طرف اٹھ گیا اور میں نے پورے چھ آنے اس کے ہات میں پکڑا دیئے اور قریب قریب بھاگتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔

اف! اس کی آنکھیں — اس کی آنکھوں میں ایک مسکراتا ہوا سوال مچل رہا تھا۔ قہقہے لگاتا ہوا سوال — بجلی کے کوندے کی طرح لپکتا ہوا سوال شعلا بداماں سوال — مسکراہٹ "کچھ" کہہ رہی تھی۔ جوانی مسکرا جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ چھوٹی موٹی سی انگارے نکلتی ہوئی جوانی کے لیے مجھے ایک دعوت دے رہی تھی۔ خطرناک دعوت — ایکایک جسم میں ایک کانپتی ہوئی لہر اٹھی۔ اور پھر رات کے دو بجے تک برابر اس کی آنکھیں میرے تصور میں تیرتی رہیں۔

اور پھر صبح ساڑھے نو بجے جب میں دفتر کے ارادے سے نکلا ایکایک وہ احمد کے ٹھیلے کے پاس آگئی۔ اور مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہی رات والی آنکھیں وہی رات والے سکراتے ہوئے لب مگر ان رات والی آنکھوں میں اب دعوت نہ تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ رات کی طرح شوخی اوچھلتا نہیں

تھی ہلکے ایک خامش اداسی ہوا ان آنکھوں سے چھلک چھلک کر برس رہی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو ——

"یا بلو تم رات میں بھاگ کیوں گئے۔ بھٹکا۔ ان سمجھ کر میرے ہاتھوں میں آپ نے چھ آنے تھما دیے۔ مگر میری آنکھوں کو تم نے نہیں دیکھا۔ کیا میری یہ آنکھیں آپ سے پیسوں کی طلب گار تھیں غلط سمجھا مجھے آپ نے —— بس ۔۔ اپنا" سمجھ کر آپ کو دعوت دی تھی مگر بابو آپ تو بھاگ گئے۔

محض آپ کے لیے ٹرین آنے تک آپ کا رستا دیکھتی رہتی ہوں۔ اور مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے آپ کے آجانے سے —— لنبٹ دوسروں کے آپ کا برتاؤ بھی تو سچ سے اچھا رہتا ہے۔ ایک پیسے کے لیے اوروں نے مجھے جھڑکیاں دیں۔ تو آپ نے بعض دفعہ دو دو پیسے دیے۔ کسی دن اکنی تھما دی۔ دوسروں نے مجھے گالیاں دیں۔ مگر آپ کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا پیسے نہ رہنے پر آپ نے کبھی بات سے "نہیں" کا اشارا کر دیا۔ یا پھر احمد سے سودا لا لے کر میری پھیلی ہوئی ہتھیلی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیا۔ دوسروں نے مجھے گالیاں دیں۔ مگر آپ نے کبھی دھتکارا تک نہیں۔ دوسروں نے مجھے طمانچے لگائے للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھا جانے والی نظروں سے دیکھا مگر آپ کی نگاہیں نیچے جھکی رہیں۔ اب آپ ہی بتائیے میں آپ کے اس برتاؤ کو کیا سمجھوں۔ میں آپ کو اپنا کتنا ہمدرد سمجھتی ہوں۔ اگر اس قسم کی میں نے دعوت دی تو کیا برا کیا تھا۔ اور اس دعوت کے سب سے زیادہ مستحق دستکار نے والے تھے۔ یا آپ —— بولو یا بولو مجھے جواب دو —— آپ خامش کیوں ہو گئے ——"

بھینچی ہوئی مٹھی کھول کر اس نے چھ آنے میرے آگے ڈالے اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی ہوئی اسٹیشن کی طرف چلی گئی۔ مجھے اپنا سر چکراتا سا محسوس ہونے لگا۔ احمد ٹھیلے والا چھٹی چھٹی آنکھوں سے ایک چوڑی دوکانیوں کو دیکھتے ہوئے بولا ——

"کیا بات ہے نثار صاحب"؟

جمیل نے گھورتے ہوئے طنز کیا "خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"

ظفر نے میرے مجرد ہونے پر شکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا —— "نثار کیا معاملا ہے بھئی یہ"

اور میں پیشانی سے پسینا صاف کرتا ہوا دنیا بھر کی خفت کا پہاڑ سر پر اٹھائے ہوئے دفتر کے لیے وہاں سے کھسک گیا ——

ایک مہینے تک حیدرآباد سکندرآباد کے دفتر چھانتا ہوا رشوتیں دیتا ہوا پھر منچریال آگیا۔ دوستوں سے ملتا ہوا الٹے سیدھے سلام اڑاتا ہوا احمد کے ٹھیلے کے پاس سگریٹ کے لیے ٹھہر گیا۔ مجھے دیکھتے ہی احمد کے شیخی بات پان بناتے بناتے رک گئے۔ وہ تعجب سے بولا

"کب کے نثار صاحب"؟

"ابھی ابھی ٹرین سے ——"

"نثار صاحب" وہ رکتے رکتے بولا "کیا بات تھی وہ جو بھکارن اس دن چھ آنے آپ کے سامنے ڈال کر چلتی بنی"

"ایک معما ہے سمجھنے سمجھانے کا" بھکارن کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک جھرجھری سی آئی۔ میں بولا ——

"اچھا ایک پیکٹ سگریٹ دیدو ——"

"مگر نثار صاحب!" احمد سگریٹ دیتے ہوئے بولا ——

"بڑا ظلم ہوا بے چاری کے ساتھ"

"کیوں —— کیا ظلم ہوا اس کے ساتھ ——" میں حیرت و تجسس کے ملے جلے جذبات سے بولا ——

"کل رات کو ایچ۔ ایس۔ آر پی کے جالوٹن نے ..... بے چاری کی چیخیں اٹھ رہی تھیں"

"چیخیں اٹھ رہی تھیں بھکارن کی —— میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"ہاں دردناک چیخیں —— شام میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے نیچے کھڑی تھی نہ جانے کس حرامزادے کی نظر پڑ گئی اور پھر رات میں چیخیں اٹھنے لگیں"

"تو پھر ایچ۔ ایس۔ آر پی والوں سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوئی"

"باز پرس" احمد نے جیسے طنز کیا۔ جج پر "نثار صاحب! باز پرس اور وہ بھی ایک بھکارن کے لیے باز پرس —— ابھی صاحب آج کے

ہندستان یورپ زبان والی عصمتوں پر دن دھاڑے ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ تو کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ بھلا وہاں ایک گونگی بھکارن کے لیے کون باز پرس کرے گا۔ یہ جمہوریت ہے۔ نثار صاحب جمہوریت ہندستان کی جمہوریت ——" اور پھر احمد کے ہاتھ مشین کی طرح چلنے لگے۔ ایکایک اس کی نگاہیں غیر شعوری طور پر اوپر اٹھ گئیں۔ اور احمد چیختے ہوئے بولا۔

"وہ دیکھیے نثار صاحب گونگی بھکارن ۔ بے چاری کس حالت کو پہنچ گئی ہے۔"

مجھے ایک زوردار سی جنبش ہوئی اور جسم کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ وہ گنگناتے ہوئے گھسٹتے ہوئے پیروں سے میری طرف آ رہی تھی۔ خشک بکھرے ہوئے بال۔ دھجیاں اڑاتی ہوئی چولی پیچھے اڑاتی ہوئی ساڑھی کسی حقیقت کو آشکار کر رہی تھی۔ ایک گھناؤنی حقیقت کو ۔ کپکپاتے ہوئے لب تھراتی ہوئی لبریز آنکھیں جسم کا رواں رواں خاموش چیخیں اگل رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں جیسے ہزاروں بے بس سوال دم توڑ رہے ہیں اس کی آنکھوں میں ۔ دنیا بھر کی کراہیں ان جھلملاتے آنسوؤں میں سمو دی گئی تھیں۔ جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی" بابو یہ تمہاری بستی ہے۔ زبان رکھنے والوں کی بستی۔ جہاں شاید ہر گونگی عورت کا یہی حال ہوتا ہے"

"بابو! تیا و بابو مجھے کیا کر دیا گیا ہے۔ اور میں کیا ہو کر رہ گئی ہوں" اس کے لب تھرتھرائے۔ اٹھی ہوئی جھلملاتی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ اور وہ بیڑے بھینگے قدم ڈالتی ہوئی سڑک سے نیچے اتر کر ہوے کے درخت کے نیچے کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

احمد نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ مجھے ایک زوردار جنبش ہوئی جیسے منجمد خون ایک جھٹکے سے پھر سے رگوں میں چل پڑا ہو۔ میں نے سگریٹ کے جلتے ہوئے آخری حصے کو نفرت سے دیکھا جس سے انگلیوں میں جلن سی ہو رہی تھی۔ اور پھر بوٹ سے رگڑ کر اسے بجھا کر ہاتھوں میں ہلاتا ہوا کوارٹر کی طرف چل پڑا۔

مضامین اور نظمیں وغیرہ گوکر کے صاف خط میں لکھا کیجیے۔

تاریخی عجایب گھر کی ستر ویں سالگرہ

آج سے ستر برس پہلے روس کے ترقی پسند سائنس دانوں کی کوششوں سے ماسکو میں سرکاری تاریخی عجایب گھر قایم کیا گیا تھا۔ یہ عجایب گھر ایک اہم مائینی اوار ا بن گیا۔ آج اس کے ۴۰ ہال ہیں جن میں ہزارہا چیزیں ہیں جو قدیم زمانے سے انیسویں صدی کے اختتام سے بیس برس پہلے تک کی تاریخ کی خصوصیات بخوبی واضح کرتی ہیں۔

روسی قوم کی اصلی تہذیب کی نمایندگی کرنے والے نوادرات اس عجایب گھر میں جمع ہیں۔ ان میں بہت سے قدیمی قلمی نسخے پرانی چھپی ہوئی کتابیں چینی بلور کی بنی ہوئی بہت سی چیزیں بیش قیمت کپڑے اور دیدہ زیب کشیدہ کاری کے نمونے بھی شامل ہیں۔ بہت سی نایاب چیزیں ایسی بھی ہیں جو ممتاز روسی موجدوں اور ان کی ایجادات کا حال بتاتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ انہوں نے بہت سی دیگر قوموں کے سائنسدانوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اس طرح روسی قوم کا نام روشن کیا تھا۔

عجایب گھر کی بیش قیمت چیزیں ملک کے ماضی اور جانباز سورماؤں کا حال بھی بتاتی ہیں۔ اس عجایب گھر میں تیس لاکھ سے زیادہ مختلف نوادرات جمع ہیں۔ بہت سی جگہ میں فن عمارت کے نمونے جمع ہیں جو روس میں رہنے والی قوموں اور قبیلوں کی تاریخ بتاتے ہیں۔ ماسکو والوں میں یہ عجایب گھر بڑا مقبول ہے ہر سال دس لاکھ سے زیادہ لوگ اس کو دیکھتے ہیں۔

طلبا کا شہر

۱ - و

سوئٹر دلووسک کے ایک محلے کا نام "طلبا کا شہر" پڑ گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ بہت ساری بڑی عمارتوں والا یہ ایک محلہ ہے ایک مکمل شہر۔ عمارتوں میں طلبا کے اقامت خانے پروفیسروں اور استادوں کے مکانات، دکانیں اور تہذیبی اور خدمات عامہ کے مرکز اور خدیو رال پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کی عمارتیں شامل ہیں۔

نوجوانوں کے اس شہر میں چہل پہل بڑے سویرے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ پو پھٹتے ہی کمروں کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں اور صبح کی تازہ خنک ہوا کمروں میں سما جاتی ہے۔ نوجوان آدمی تگڑے بدن دوڑتے ہوئے صدر دروازے کی محرابوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ ہنسی مذاق اور خوش گپیاں کرتے ہوئے مٹھیاں بھر بھر برف اپنے اپنے بدن پر ملتے ہیں۔ یہ برف رات کو گری تھی اور اب پورا علاقا سفید چکنے قالین سے ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سکی پر پھسلنے والوں کی ایک قطار قریب ہی واقع جنگل کی سمت دوڑتی نظر آتی ہے۔ یہ لوگ صبح تھوڑی دیر دوڑنے کو نکلتے ہیں اور تھوڑی ہی دیر بعد نوجوان مرد اور عورتیں انسٹی ٹیوٹ جانے روانا ہونے لگتی ہیں۔ یہاں پہ شور، سیلاب چھوٹی چھوٹی دھاروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ جو پڑھائی کے کمروں، مطالعا خانوں اور معمل خانوں میں بہہ جاتی ہیں۔

یورال پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں گیارہ ہزار طلبا ہیں یہ لوگ دھاتیں صاف کرنے کے ماہر بجلی کے انجنیر، معمار منصوبا بندی کے ماہر اور نقشا نویس بننے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

یہ لوگ اس مبارک دن کے خواب دیکھ رہے ہیں جبکے وہ فولاد تیار کر رہے ہوں گے۔ نئی مشینیں ایجاد کر رہے ہوں گے۔ شہر بسا رہے ہوں گے کارخانے اور فیکٹریاں تعمیر کر رہے ہوں گے بجلی گھر چلا رہے ہوں گے۔ پوری سوویت قوم کے ساتھ مل کر کمیونزم کی تعمیر کر رہے ہوں گے اور ان کے خوابوں کا پورا ہونا یقینی ہے۔

پچھلے سال اس علمی ادارے کے گیارہ شعبوں میں تین ہزار سے زیادہ طلبا کو داخلہ دیا گیا۔ ان لوگوں کے لیے کہ جو اپنی ملازمت چھوڑے بغیر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ایک علمی شعبا ہے اور سویر دلووسک اور نژنی تاگل میں رات کی پڑھائی کے شعبے بھی ہیں۔

صرف ایک ہی علاقائی عالا تعلیمی ادارے میں گیارہ ہزار طلبا یہ ذات خود بہت بڑی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت یہ جان کر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ انقلاب سے پہلے کا یہ ترین بنگ یس جو کہ سویر دلووسک کا پرانا نام ہے۔ کوئی ایک بھی عالا تعلیمی مدرسہ نہ تھا آج شہر میں عالا تعلیم کے تیرا مدرسے ہیں ان کے علاوہ ٹیکنیکل تعلیم کے ۳۶ ثانوی اسکول اور ہیں۔

ہم جس علمی ادارے کا ذکر کر رہے ہیں وہ ۱۹۲۵ء میں قایم ہوا تھا۔ یہاں کے ہزارہا طلبا آج کل صنعت کے نہایت مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ کارگاہوں اور پورے کے پورے کارخانوں کے تنظیم ہیں یہ اعلی تحقیق کے فرایض انجام دے رہے ہیں۔ ان میں کافی تعداد ایسوں کی بھی ہے جنہوں نے استالن انعام حاصل کیے۔ جو پروفیسر بن گئے جنہوں نے ٹکنیکل سائنس میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔

اس علمی ادارے میں ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ مطالعا کرنے اور دور رس نظریاتی علم حاصل کرنے کے ساتھ پورا اور ٹھیک ٹھیک علمی تجربا بھی حاصل ہوتا رہے۔ طلبا کے لیے ہر طرح کی تجربا گاہیں پورے ساز و سامان سے آراستا کارگاہیں اور لائبریریاں موجود ہیں۔ آٹھ سو سے زیادا عالم اور فاضل

استاد اس علمی ادارے میں تعلیم دیتے ہیں۔ طلبا مشہور سائنسدانوں کے لیکچر سنتے ہیں جن میں بہت سے اسی علمی ادارے کے سند یافتہ ہیں۔ دن کی تعلیم ختم ہوگئی ہے اور اب پھر بازاروں میں رونق ہوگئی ہے۔ یہ شہر خود بھی متواتر تبدیل ہو رہا ہے۔ نئے مکانات اور تعلیم کے لیے عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ سڑکوں کی مرمت ہو رہی ہے ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک پانچ منزلا عمارت بنائی گئی ہے اس میں طلبا کے لیے رہائشی کمرے ہیں۔

اقامت خانے کی ہر منزل میں طلبا کے کمروں کے علاوہ خاص مطالعہ خانے اور تفریحی حال ہیں۔ جہاں شام کے وقت نوجوان موسیقی رقص وغیرہ سے لطف اندوز ہونے جمع ہوا کرتے ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے ریستوران اور ایسے کمرے بھی ہیں جہاں استریاں، استری کرنے کی میزیں کپڑے صاف کرنے کے برش وغیرہ رہتے ہیں۔ یا درچی خانے بھی ہیں۔ جہاں طلبا اگر چاہیں تو اپنا ناشتا اور کھانا وغیرہ تیار کر سکتے ہیں۔ خوراکوں کے شوقینوں کے لیے تاریک کمرے بھی ہیں۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ سوویت یونین میں معمول کے مطابق ترقی کرنے والے تمام طلبا کو ماہانا وظیفے ملتے ہیں۔ طلبا کے اقامت خانوں میں قیام کے اخراجات ان وظیفوں کا تین سے پانچ فیصدی حصے ہوتے ہیں۔

شام کے وقت یورال کے طلبا ہر جگہ نظر آتے ہیں علمی ادارے کی مرکزی لائبریری میں جس میں دس لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں محفل موسیقی کے ہال میں اوپیروں کی یونین کے دفتر میں یا کسی آرٹ کی نمائش میں۔

بہت سے طلبا عوامی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیتے ہیں۔ مثلاً بلی زاوتیا۔ چیرتی شوا کیروف ضلع سوویت کی ممبر منتخب ہوئی ہیں۔ شہر میں جہاں کہیں تعمیر ہو رہی ہے وہاں وہ اکثر معائنے کو جاتی رہتی ہیں۔ یہ خیال سب سے پہلے انہیں کو ہوا تھا کہ تعمیراتی شعبے کے طلبا اور سائنسی کارکنوں کو سوویدلوفسک کے معماروں کے ساتھ فنی تعلق قایم رکھنا چاہیے۔

عالا جماعتوں کے طلبا کی ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ وہ سائنسی تحقیق کا کام کریں۔ طلبا کی سائنسی سوسائیٹی کے دو ہزار سے زیادہ طلبا اور طالبات ممبر ہیں۔

طلبا کے لیے کئی کلب گھرنے ہوئے ہیں۔ ان میں علمی ادارے کا کلب، کھیلوں اور موٹر رانی کے کلب بھی شامل ہیں۔ ہر کلب میں طرح طرح کے مشاغل ہیں۔ مل جل کر گانے والوں کے حلقے کے ممبروں کی تعداد چھ سو تک پہنچتی ہے۔ بہت سے نوجوان موسیقی سے بڑا لگاؤ رکھتے ہیں۔ طلبا کے متعدد آرکسٹرا بینڈ اور دیہاتی باجوں کا آرکسٹرا اکثر محفل سرود منعقد کرتے رہتے ہیں شوقینوں کی ڈرامائی کمپنی کے پیش کیے ہوئے کھیل بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے شہر کے تھیٹر میں ان کا تازہ ترین ڈراما "برف پگلتی ہے" دکھایا گیا تھا۔

تجربا کار استاد اور آرٹسٹ کلب کی سرگرمیوں کی رہبری کے فرایض انجام دیتے ہیں۔ رہبری کی قطعاً کوئی فیس نہیں ہوتی بھاگ دوڑ اور میدانی کھیل طلبا میں بہت مقبول ہیں۔ تقریباً دو ہزار سات سو طلبا کھیلوں کے کلب کے بے شمار حلقوں کی سرگرمیوں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے ہیں۔ یورال پولی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ کی ٹیموں نے اکثر سوویت یونین کے تمام عالا اداروں کی ٹیموں کے مقابلوں میں اول انعامات حاصل کیے۔ یہ مقابلے نوکا اسپورٹس سوسائیٹی منعقد کرتی ہے۔

یورال کے طلبا خوب محنت سے اور اچھی طرح پڑھتے ہیں اور زندگی کی نعمتوں سے لطف اٹھانا اور اپنے فرصت کے اوقات بہترین طریقے سے گذارنا بھی خوب جانتے ہیں۔

کرنول کے تاجدار ——— ایک انگریزی دستاویز کا ترجمہ
جی۔ ایم۔ خان۔ ایم۔ اے ——— عثمانیا ——— ایڈیٹر "ہندستانی ادب" نے نہایت سلیس و آسان زبان میں کیا ہے۔ کتابی سائز، ۱۰۰ صفحے، ۱۲ آنے کے اسٹامپ بھیجکر نیچے کے پتے سے منگوایئے۔
سکریٹری انجمن ترقی ہندستانی ۱۹۹ اے اعظم پورہ شرقی حیدرآباد دکن

لندن میں ہندستانی طلبا کا نیا گھر

ب۔ا

لندن کے ایک مشہور محلے فٹزراے اسکوئر میں ہندستانی طلبا کے لیے ایک نیا ہوسٹل تیار ہوگیا ہے اس ہوسٹل کی تعمیر اور آرائش پر ایک لاکھ پچیس ہزار پونڈ کی رقم صرف ہوئی ہے۔ یہ پانچ منزلہ عمارت نہایت خوب صورت ہے جو بالکل اصولوں اور طریقوں پر بنائی گئی ہے۔

نئی عمارت کے لیے فنڈ

نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۹۵۰ء میں رکھا گیا تھا۔ یہ عمارت فٹزراے اسکوئیر میں جہاں ۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۰ء برنارڈ شا رہا کرتے تھے واقع ہے۔ اس ہوسٹل میں ہندستانی طلبا عارضی طور پر قیام کرسکتے ہیں اور بعد میں وہ کوئی مستقل جگہ تلاش کرسکتے ہیں نئے طلبا کو اس ہوسٹل میں ہر قسم کا اصلاح مشورا دیا جاتا ہے ہوسٹل کی عمارت کے لیے اب تک ۱۲۴۴۹۴ پونڈ رقم جمع ہوئی تھی یو ایف ام۔ سی۔ اے اور ہندستان کے اداروں اور بعض افراد نے ۲۱۷۳۶ پونڈ رقم بطور چندا دی تھی۔ برطانوی فرموں اور افراد نے ۱۵۷۸۵ پونڈ اور حکومت ہندستان اور ریاستی حکومتوں نے کل ۴۳۰۰۰ پونڈ رقم عمارت کے لیے دی تھی نئی عمارت میں ۵۶ طلبا قیام کرسکتے ہیں۔ ہر طالب علم کو رہائش کے لیے ایک علیحدہ کمرا دیا جاتا ہے جس میں جدید قسم کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ مہاتما گاندھی اسمبلی ہال کے علاوہ اس عمارت میں کھانے کا ایک بہت بڑا ہال بنایا گیا ہے۔ ایک آرام کرنے کا کمرا۔ ایک ٹیلی ویژن اور بحث و مباحثے کا کمرا اور کھیلوں کا کمرا بھی بنایا گیا ہے۔

عبادت اور پوجا پاٹ کے لیے ایک علیحدہ کمرا بنایا گیا ہے۔ سب سے اوپر کی منزل پر مہمانوں کے لیے بھی ایک کمرا تعمیر کیا گیا ہے

پہلا ہوسٹل

نئی عمارت لندن میں ہندستانی طلبا کی یونین کے کام کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یہ ادارا والی ام۔ سی۔ اے کی انڈین نیشنل کونسل نے ۱۹۳۰ء میں قایم کیا تھا۔ یونین کا پہلا مرکز بکنگھم شائر میں "شیکسپیر ہٹ" نام کی ایک عمارت میں واقع تھا۔ جب پہلی جنگ عظیم میں والی ام۔ سی۔ اے نے فوج کی فلاح و بہبود کے مرکز کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں ہندستانی والی ام۔ سی۔ اے نے گوور اسٹریٹ میں ہندستانی اور برطانوی دوستوں کی مدد اور والی ام۔ سی۔ اے کی انگلش کونسل کے اشتراک عمل سے ایک عمارت خریدلی تھی۔ جہاں ہندستانی طلبا کے لیے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ اس عمارت میں ہندستانی طلبا کلچرل سماجی اور تفریحی سرگرمیوں میں پوری طرح حصا لیتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس عمارت کا ایک بڑا حصا بمباری کی نذر ہوگیا تھا۔ یونین نے بچی کچی عمارت میں جنگ کے دوران بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں ۱۹۴۵ء میں جب ہندستانی طلبا بڑی تعداد میں برطانیا آنے لگے تو اس عمارت کی مرمت کرائی گئی اور یونین نے پھر سے اپنی سرگرمیاں شروع کردیں۔ لندن یونیورسٹی کے اشتراک عمل سے ہندستانی طلبا کی رہائش اور کلب کے لیے عارضی طور پر ایک جگہ مل گئی تھی۔

جنگ کے ختم سے پہلے ہی نئے ہوسٹل کی تعمیر کا پروگرام بنا لیا گیا تھا۔ انڈین والی ام۔ سی۔ اے کونسل کے صدر راجا جہانگیر کی رہنمائی میں ہندستان اور برطانیا میں فنڈ کے لیے اپیل کی گئی۔

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے اعظم پورہ شرقی۔پی۔او۔جوبلی۔حیدرآباد دکن

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کیلیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان، ام۔اے (عثمانیا)

جلد (۱۳) نمبر (۱۱)

چندا سالانا چھ روپے

مہر ۱۳۶۲ف

قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

اگست ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	دکھا دل		
حقایق و معارف	افقر موہانی وارثی	۳	برطانوی اسکولوں میں غلموں کے متعلق تعلیم		
تاریک سحر	اطہر شہر صبائی۔اے (آنرز)	۴	جسم انسانی کی نشوونما کے لیے تیندکی اہمیت		
درس عمل	صفی احمد (بہاری)	۵	جسمانی نظام کو دوبارہ زندہ کرنے کے تجربے		
امیدیں	آزاد (مظفرپوری)	۶	انتخاب		
حجاج بن یوسف	ڈاکٹر میر سیادت علی خان	۷	ٹیلی فون کا موجد		
غزل	حمید عثمانی (بلیح آبادی)	۱۵	بچوں کا جھولا		
نیشنل لائبریری آف انڈیا	ڈی۔ال۔دت	۱۶	تبصرے		
صبا نقوی		۱۸			
ڈ۔جیرو		۲۰			
ا۔ا		۲۲			
ت۔د		۲۴			
شہباز پرویز		۲۵			
یوسیس		۲۸			
یوسیس		۳۰			
" "		۳۲			

ہمارے خیالات

ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن یو۔پی، ام۔پی، بمبئی، مدراس، بہار، اڑیسا، بنگال، آسام اور سپیشو وغیرہ دھیان دیں!

آج ہمیں سخت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کے بیان کرنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے کہ اوپر بیان کیے ہوئے صوبوں نے بھاشا کے بارے میں نہایت ہی تنگ نظر یا اغتنا کر رکھا ہے۔

آج سے چند سال پہلے ہم نے "ہندستانی ادب" کو تعلیمی اداروں میں منظور کروانے کی مہم شروع کی تھی۔ چنانچہ ہماری مسلسل کوششوں اور بار بار توجہ دلانے کے سبب حیدرآباد کے علاوہ پنجاب، میسور اور بھوپال کی حکومتوں نے اپنے اپنے تعلیمی اداروں کے لیے اس رسالے کو منظور کر لیا۔ باقی دوسری حکومتوں کو وقفے وقفے سے ہم توجہ دلاتے رہے۔ قاعدے کے برابر رسالہ ہر ڈائرکٹر کے نام پابندی کے ساتھ بھجوایا جاتا رہا۔ جب ہمارا اصرار بڑھ گیا تو بعض ڈائرکٹروں نے ہم سے پچھلے تین تین رسالے طلب کیے چونکہ ہمارے ہاں پرانے رسالے موجود نہ تھے اس لیے ہم نے لکھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آئندہ تین مہینوں کے رسالے بھجوا دیے جائیں گے چنانچہ ہماری یہ شرط منظور کر لی گئی۔ اور ہم نے وعدے کے برابر ہر ایک کے نام تین تین رسالے اکٹھے بھجوا دیے۔ ان رسالوں کے پہنچنے کی رسیدیں بھی ہمیں موصول ہو چکیں۔ اس لیے ہم پچھلے بیٹھے رہے کہ ماہروں کے فیصلے کے بعد ہاں یا نا۔ جواب مل ہی جائے گا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے جبکہ ہمیں کافی سے زیادہ انتظار کر چکی ہم نے انہیں پھر سے توجہ دلائی۔ ایک بار دو بار تین بار لکھے لیکن جانے کیا کوئی بھی ایک ڈائرکٹر کو ہم نے لکھا کہ رسالے کی منظوری کے سلسلے میں ہمیں کوئی جواب ملنا چاہیے لیکن افسوس کی نتیجہ پھر بھی گونگا ہی رہا۔ جبکہ آج ہم نے کھلے طور پر ظلم اٹھایا ہے تاکہ یہ معاملہ سبھا کی نظر میں بھی آسکے۔

دنیا جانتی ہے کہ "ہندستانی ادب" دیس بھاشا کے سلسلے میں بین بین پالیسی کا علمبردار رہا ہے اور یہ وہی پالیسی ہے جو گاندھی جی مرحوم کی پالیسی یہ کہ دیس بھاشا "ہندستانی" ہو اور یہ ناگری اور فارسی دونوں لکھاوٹ میں لکھی جائے۔ ہم فارسی لکھاوٹ کے ساتھ ساتھ ناگری لکھاوٹ کے حامی ہیں لیکن اس ادارے کی مالی مجبوریاں بھی ایسی کوئی جرأت کی اجازت نہیں دیتیں جب کبھی ہمارے مالی حالات بہتر ہو جائیں گے آپ "نیا ہند" کی طرح "ہندستانی" کو بھی دونوں لکھاوٹوں میں چھپتا پائیں گے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر وہ رسالہ جو ناگری لکھاوٹ میں چھپے بلکل ہی نظر انداز کر دیا جائے۔ علم و ادب اور زبان کے بارے میں ایسی تنگ نظری کی ضرور تنگ نظری کا دوسرا نام متعصب ہے اور تعصب نہایت ہی بری چیز ہے بلکہ ایسے آدمیوں کا کام ہے جنہیں آشا ہے کہ ہندستان کے تمام ڈائرکٹران پبلک انسٹرکشن اس طرف خاص طور پر دھیان دیں گے۔

یہ یاد رہے کہ ہماری یہ اپیل صرف "ہندستانی ادب" ہی کے لیے نہیں ہے دوسرے تمام رسالوں کی بھی وکالت کرتے ہیں ایسے جتنے بھی رسالے صاحبان کی تنگ نظری کا شکار بنے ہوئے ہیں ان سب کے مسئلے پر پھر سے غور کر اور ادب نواز ڈائرکٹروں کا کام ہے۔ ڈائرکٹران کے علاوہ ہم ہر صوبے اسٹیٹ کے معتمد اور وزیر تعلیم سے بھی خاص طور پر درخواست ایسے سایل ہیں وہ بھی دل چسپی لیا کریں ہو سکتا ہے کہ بعض ڈائرکٹر اپنے غلا کے تحت ایک اچھے اور مبیعای رسالے کی سفارش اور منظوری دینے سے بھی گریز کر کسی ایسے مسئلے کی طرف معتمد یا وزیر تعلیم خود دھیان دیں تو حق اور انصا کا خون ہونے سے بچ رہے گا۔ ورنہ ظلم کے آرے مسلسل چلتے رہیں

آخر میں ہم مرکزی حکومت ہندستان کے معتمد تعلیمات اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد سے

علم و ادب و دیس بھاشا کے نام پر زور اپیل کریں گے

کہ وہ ایک گشتی کے ذریعے تمام صوبوں اور اسٹیٹس کے ڈائرکٹران پبلک انسٹرکشن کو اس خصوص میں پوری توجہ دلائیں کہ آئندہ سے تنگ نظر تعصب کی پالیسی کو دور کرتے ہوئے سب زبانوں کے ساتھ یکساں سا برتاؤ اور سلوک کیا جائے اسی لیے کہ علمی ادبی اور لسانی دنیا میں عدم مساوات کا سلو

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

نہ قاتل نہ خنجر نہ پیکاں رہے گا
مرا خون ناحق نمایاں رہے گا

تصور میں دیدار جاناں رہے گا
مرے دل بہلنے کا ساماں رہے گا

چراغ لحد زیر داماں رہے گا
ترا ہاں ترا روئے تاباں رہے گا

عبث ہے تجھے چارہ اگر فکر درماں
مرا درد خندہ بن کے درماں رہے گا

نہیں خوف تاریکی قبر ہم کو
کہ پیش نظر روئے جاناں رہے گا

جو تسکین دل دو گے تسکین ہوگی
پریشاں کرو گے پریشاں رہے گا

مچلتی رہے رخ پہ وہ زلف کافر
مسلمان جو ہے مسلماں رہے گا

کہیں دل سے نکلا نہ ہوائے ستمگر
مرے دل کے ہمراہ پیکاں رہے گا

سلامت اگر ہے ترا آستانا
سلامت مرا دین و ایماں رہے گا

بنائے گا وحشی ہزاروں گریباں
اگر ایک تار گریباں رہے گا

یہ کیا کہہ دیا تم نے ہنس ہنس کے دل سے
مرا دل مرا دشمن جاں رہے گا

قیامت میں ہوگا قیامت کا منظر
مرا ہات ان کا گریباں رہے گا

سمٹ آئے گی اس طرف ساری دنیا
وہ جس سمت آشوب دوراں رہے گا

اگر منتشر ہو گی خاک نشیمن
مرا آشیاں کل گلستاں رہے گا

مجھے ڈوب جانے دو پھر دیکھ لینا
نہ دریا نہ ساحل نہ طوفاں رہے گا

نہ دنیا میں ہوگی سحر حشر تک اب
ترا نام اے شام ہجراں رہے گا

رہیں گے سر گور افقر وہ جب تک
تزلزل میں گور غریباں رہے گا

تاریک سحر

اطہر شیر صبا بی۔ اے (آنرز)

(۱)

میں نے سمجھا تھا شب تاب پہ گذرے گی ندیم
صبح امید نئی شان سے پیدا ہو گی
میں نے سمجھا تھا کہ کچھ غم کا مداوا ہو گا
بطن گیتی سے نئی صبح ہویدا ہو گی

(۲)

یہ بھی سمجھا تھا کہ دن اپنے سہانے ہونگے
پورے لیکن نہ ہوئے کوئی بھی سپنے میرے
اور تاریکی میں یوں نور سحر لپٹا رہا
صبح کاذب کا افق میں ہو دھندلکا جیسے

(۳)

ہچکیاں لے کے ہوئی شمع تمنا خاموش
کبھی روشن نہ ہوئے دل میں امیدوں کے کنول
کون کہتا ہے کہ روشن ہوا کاشانہ میرا
افق زیست پہ چھائے رہے کالے بادل

(۴)

دیکھتا ہوں کہ وہی گردش دوراں ہے ابھی
اور اس دور میں انسان کی قسمت ہے وہی
یوں تو کہنے کو یہ جمہور کی دنیا ہے مگر
قہر کا دل ہے وہی جبر کی فطرت ہے وہی

(۵)

زندگی ایک نئے موڑ پہ پہنچی ہے مگر
عہد ماضی کی طرح پھر بھی ہے انساں مجبور
آج تک زخم پہ مرہم نہ کسی نے رکھا
بن گئے کتنے ہی بہتے ہوئے پھوٹے ناسور

(۶)

کون کہتا ہے ہوا غم کا مداوا اپنے
طوق گردن میں ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں
زندگی بن گئی اک غم کی کہانی اے دوست
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں

درسِ عمل

صفی احمد (بہاری)

عوض گل کے گلستاں میں ہے کانٹوں پر بہار اب تک
وطن ہے بیگناہوں کے لہو سے لالہ زار اب تک
یہاں انسانیت ہے بربریت کا شکار اب تک
کہ فرقہ پروری کی اُف بھڑکتی ہے وہ نار اب تک
قدم آگے بڑھائے جا ابھی تو دور منزل ہے

ابھی ہے شوق خوں ریزی، ابھی وحشت کا سامان ہے
ابھی انسان کی صورت میں بھی گرگ تیز دنداں ہے
وطن اب بھی درندوں کا بھیانک کچ بیاباں ہے
فضائے ہند پر چھایا ہوا اب بھی تو شیطاں ہے
قدم آگے بڑھائے جا ابھی تو دور منزل ہے

اگرچہ جگمگاتی ہے یہاں اب شمع آزادی
یوں کہنے کو تمنا ہمدلیوں کے دل کی بر آئی
مگر سچ پوچھیے دل کی امیدیں کب ہوئیں پوری
کہ اب بھی سرزمین ہند پر چھائی ہے تاریکی
قدم آگے بڑھائے جا ابھی تو دور منزل ہے

کہاں طرز کہن بدلا زمانے کی روش بدلی
کہاں نادار کی سوئی ہوئی تقدیر جاگ اٹھی
کہاں کمزور کے پیروں کی زنجیر ستم ٹوٹی
نگار شوق بیچ دے کر بھلا کب سامنے آئی
قدم آگے بڑھائے جا ابھی تو دور منزل ہے

ابھی تو خون کے قطرے پسینوں میں ٹپکتے ہیں
ہزاروں کی جبیں پر یاس کے فتنے دمکتے ہیں
گھٹے سینوں میں ارمان حزیں اب تک سسکتے ہیں
ابھی لاکھوں لگا رآرزو کی راہ تکتے ہیں
قدم آگے بڑھائے جا ابھی تو دور منزل ہے

تو قندیل عمل سے ذرا ذرا جگمگا تا جا
گل امید تو فیض قدم سے لہلہا تا جا
تو میر کارواں ہے کارواں کو رہ دکھا تا جا
دلوں کو گرم کرتا جا پیام نو سناتا جا
قدم آگے بڑھائے جا ابھی تو دور منزل ہے

تجھے فرقہ پرستی کی ہر اک بنیاد ڈھانا ہے
تجھے سرشار الفت آج ہر اک کو بنانا ہے
تجھے اقوام عالم کو پیام نو سنانا ہے
تجھے ابر بہاراں بن کے اس دنیا پہ چھانا ہے
قدم آگے بڑھائے جا ابھی تو دور منزل ہے

سسکتی ہستیوں میں زندگی پھر سے جگانا ہے
بھٹکتے تا فلوں کو راہ پر پھر سے لگانا ہے
قوانین جہاں کی مطلبی دنیا مٹانا ہے
نئے انداز سے پھر محفل ہستی سجانا ہے
قدم آگے بڑھائے جا ابھی تو دور منزل ہے

یوں ہی کمزور پر ظالم کی چیرہ دستیاں کب تک
یوں ہی ڈھاتا رہے گا ظلم یہ ظالم جہاں کب تک
نہ بدلے گا نہ بدلے گا یہ دور آسماں کب تک
رہے گی نارسا مظلوم کی آہ و فغاں کب تک۔
بڑھائے جا قدم پیہم نہ فکر دوری منزل
یہی امروز فردا النظر آجائے گا ساحل

امیدیں!

آزاد (مظفرپوری)

جرات انگیز زمانے کی یہ تبدیلی ہے!

اب نہ دیکھا کرو ماضی کے بھیانک سپنے
اب نہ ماحول میں سرمائے کے شعلے ہونگے

افق یاس سے امید کا سورج ابھرا
جو جھلس دیتے تھے مزدور کی کٹیاؤں کو

کھول کر آنکھ ذرا حال کے آئینے میں
اپنی چنگاری سے جو ان کو جلاتی تھیں کبھی

دیکھو مستقبل زریں کا دمکتا چہرا
دکھ غریبوں کا رلائیگا اب ان آنکھوں کو

رنگ و بو عیش و طرب اور مجاہد کیلیے
اب نہ ماحول کی تاریک خلاؤں میں کہیں

عزم جس کا ہے حقیقت کا حسیں تر پیکر
چھپ سکے گی کوئی ایام کی کالی ناگن

رنگ خلد داری کا اور لوے خدی ہوئیں
کھوج میں اس کے اب فلاس کا طاؤس جمیل

کیا کرے گا وہ "یہ مٹی کا کھلونا" لے کر
جھانکتا پھرتا ہے اس دور کا "ہر سندرین"

خواب غفلت میں پڑا سوتا تھا جو مدت سے
اب نیا طرز زمانے کو بدل ڈالے گا!

آج وہ ضیغم مشرق بھی ہوا ہے بیدار
اب لبوں پر نہ زمانے کی شکایت ہوگی!

جس کی ہر سانس زمانے کو ہے سرمایہ امن
پھول برساتی ہوئی آئیگی آزاد بہار!

وقت کی آہ و بکا سن کے ہوا ہے بیتاب
اب تو ہر غم سے ہم آغوش مسرت ہوگی

جرات انگیز زمانے کی یہ تبدیلی ہے!

(سولہویں قسط)

ڈاکٹر میر سیادت علی خان

حجاج بن یوسف

چوتھا حصا

باب (۱۴)

حجاج اپنی داخلی اور خارجی پالیسی کی روشنی میں

(ممالک جن میں حجاج کی پالیسی کارفرما تھی)

تجزیا :- (الف) داخلی (ب) خارجی

(الف) داخلی پالیسی کے اجزا :- (۱) پہلا مسلا امن اور شاہی کا۔ اس مسلے کے اجزا (الف) عربوں سے تعلقات (ب) محکومین سے تعلقات (۲) نظم ونسق (۳) عدل گستری (۴) اشتراکی فرائض (۵) بڑے بڑے اصلاحات (۶) موالی یعنی مفتوحین سے تعلقات (۷) حجاج کے اصول حکمرانی (ب) خارجا پالیسی۔ (۱) طخارستان (۲) سجستان (۳) چین۔ (۴) سند (۵) ماوراالنہر (۶) فاشتانا پالیسی کا جواز۔

حجاج کی داخلی پالیسی

حجاج کی بیس بائیس سالا حکمرانی عرب اور عراق کا بیان ہوچکا۔ اب اس کی پالیسی پر غور فرمایئے۔ ظاہر ہے کہ حجاج کی پالیسی کا دایرہ عمل بہت وسیع تھا۔ کل عرب پر حجاج نے اپنی پالیسی کا جو گہرا نقش چھوڑا تھا اس کا بیان ولایت حجاز میں گذر چکا۔ دوسرے ممالک جو اس کی پالیسی سے مستفید ہوئے وہ کل مشرق یعنی عراق عرب، ایران، خراسان طخارستان، کران اور ماوراالنہر تھے۔

حجاج کی پالیسی سے ان دو عنوانوں پر بحث کی جاے گی۔

(الف) داخلی پالیسی۔ (ب) خارجی پالیسی۔

(۱) داخلی پالیسی میں پہلا جز "قیام امن" ہے جو ہر مہذب حکومت کے اولین فرایض میں سے ہے۔ حجاج کے امن و امان قایم کرنے کے شاندار کارنامے پر ہم نے اپنی پوری قوت کے ساتھ پچھلے صفحوں میں کافی بحث کی ہے۔ اس لیے یہاں صرف اختصار کے ساتھ چند سطروں میں اس کی طرف اشارا کافی ہے۔ قیام امن کے لیے حجاج کو زیاد اور ان کو فہ اور بصرہ کے بدویوں۔ خوارج شیعی اور قبایلی عناد سے نبٹنا پڑا اور یہ کہ موالیوں و مفتوحین کی بغاوتوں کو فرو کرتے ہوے حجاج نے کوفہ اور بصرہ میں چھاؤنیوں کے عربوں کو ڈسپلن سکھا دیا۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے "عراقی جیسے دشمن امن و امان لیے ڈسپلن اور یکدل اشخاص کو حجاج کی تربیت نے کل وسط ایشیا کا فاتح بنا دیا۔ . . . . . ان عراقیوں کو جو چالیس سال سے بزدل، لٹیرے، غدار اور مفسد جیسے مکروہ ناموں سے یاد کیے جاتے تھے۔

خوارج جیسے بے باک مسلمانوں کو حجاج نے مجبوراً زور شمشیر دبا دیا۔ اسی طرح حضرت علی نے نہروان میں ان کا تقریباً خاتمہ کر دیا تھا۔ شیعی لاعلاج تھے کیونکہ حجاج کے عہد میں انہوں نے کوئی کھلی بغاوت نہیں کی۔ اور نہ اپنی خفیا دشمنی چھوڑی۔ . . قبایلی عناد کو حجاج نے تدبر کے ساتھ دبا رکھا۔ یہ اس کی قوت

سے زاید ثابت ہوا کہ قبائلی عناد کو ایک دم بھولا دیتا۔ حجاج گو مضری اور قیسی تھا لیکن اس نے ازدیوں اور کلبیوں کو بھی اسی آنکھ سے دیکھا جس سے اپنے ہم قبیلا اشخاص کو دیکھتا تھا۔ کلبیوں میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز خاندان اس وقت مہلب کا تھا۔ یزید بن مہلب کی خراسان سے برطرفی کو مورخین نے قبائلی عناد کی وجہ لکھا ہے لیکن ہم نے ثابت کیا ہے کہ یہ یزید کی ناقابلیت کی وجہ تھی۔ غرض یہ اس کی کچ کم تعریف نہیں ہے کہ اس کے عہد میں کل "مشرق" میں تباہ کن قبائلی لڑائیاں موقوف رہیں اور ازدی تمیمی اور قیسی قبایل دوش بدوش فتوحات حاصل کرتے رہے۔ ایرانی اس وقت اتنے قوی نہیں تھے کہ کھلم کھلا باغی ہو جاتے۔ البتہ وہ عرب باغیوں کے ساتھ کھلی بغاوت کرتے تھے۔ جیسے سطرف بن مغیرہ کی بغاوت یا ابن اشعث کی بغاوت کا ساتھ دیا یا یہ کہ خفیہ امداد دیتے رہتے تھے۔ اس لیے مثل عرب باغیوں کے ان کے ساتھ برتاؤ کیا گیا۔ فیروز بن حصین ایک مولی کے ساتھ حجاج کی سختی کا ذکر طبری اور اثیر نے کیا ہے لیکن ملحوظ رہے کہ اس نے کھلی بغاوت کی تھی۔ حجاج کے پیام امن سے قایدا اٹھا کر نہ ہی رہے گیا تھا اور نہ واپس عراق آیا تھا بلکہ دوبار یزید بن مہلب سے خراسان میں جنگ کی تھی۔ پھر بھی اس امر کو ہرگز فرد دش نہ کرنا چاہیے کہ حجاج نے فیروز کی جایداد جبراً نہیں لی۔ جو بغاوت کی وجہ سے کم سے کم آج کل کے قانون کی رو سے وہ لے سکتا تھا بلکہ جبر کے ذریعے خدیفہ فیروز کی رضامندی سے لینا چاہتا تھا۔ باغی کی جایداد کا بھی حجاج کو اتنا لحاظ تھا حجاج کی حکمرانی میں ذاتی جایداد محفوظ تھی۔ اس کے حق کی مدت کی جاتی تھی۔

غرض حجاج داخلی پالیسی کے اہم جز یعنی عام امن کے قایم کرنے میں نمایاں طور پر کامیاب ہوا تھا۔ وہ "امن و امان" کا پیمبر تھا۔ خدا ایک بہت بڑا فقیہ ہونے کی وجہ سے وہ "قانون اور امن" کی اطاعت کرتا اور کرانا چاہتا تھا۔ یہ قول مسعودی اور امام ابن حجر العسقلانی "خلیفہ یعنی حکمران اور اولی الامر کی اطاعت" پر اس کو جزم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "خلیفہ حکم ایک گھاٹی ہے، چلنے والا اور کوئی شخص دوسری گھاٹی سے چلے تو اس کا خون مجھ پر حلال ہے" لیکن ملحوظ رہے کہ گو امن و امان کی پابندی سختی سے کراتا تھا اور ضرورت ہو تو خون بھی نہ کرتے چوکتا تھا۔ جیسے بصرہ میں مہلب کی فوج کے ایک سپاہی نے بیماری کا عذر تراشتے ہوئے سر حد پر جانے سے انکار کیا تو حجاج نے اس کو بلا تامل قتل کرا دیا لیکن اس سے یہ نتیجا نکالنا غلط ہوگا کہ وہ ہر وقت ہر کس و ناکس کے خون پر تل جاتا تھا۔ بلکہ جہاں ڈسپلن اور فوجی نظم کا سوال پیدا ہوتا تو اس سخت سزا سے وہ ہرگز دریغ نہ کرتا ہم نے فوجی بغاوتوں میں اس کے طرز عمل کو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے کہ حجاج کی طرف ظلم اور کشت و خون کا انتساب بھی بڑا ظلم ہے۔

(۲) نظم و نسق: عمال حجاج سے بے حد ڈرتے تھے۔ معترف بن مغیرہ عامل مدائن نے جب خوارج سے گفتگو کی تو اس کو یقین ہو گیا تھا کہ حجاج کو اس کی خبر ہو جائے گی۔ اس کے ایک بھلائی چاہنے والے کا جملا تھا "خبر بھی ہو جائے گی۔ اور حجاج تمہاری خبر بھی لے گا چاہے تم آسمان میں کیوں نہ جا چھپیں" مسعودی نے عبید بن ابی المخارق عامل طلوجہ کے حجاج سے ڈرنے کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حمزہ بن مغیرہ نے جب مالی اور جنایا سے اپنے بھائی مطرف کو مدد دی تو اس کو کامل یقین تھا کہ حجاج کو خبر ہو جائے گی۔ حبیب بن مہلب نے ابن طلوعہ کو قید سے چھوٹنے جب اپنے بھائی یزید ابن مہلب سے کہا تو یزید نے جواب دیا تھا کہ "یہ حجاج کا معاملا ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی" ان تمام مثالوں سے حجاج کا عاملوں کو جو ڈر تھا اور حجاج کی باخبری اور حسن انتظام سے جتنے وہ خایف تھے صاف ظاہر ہے بالا دست حکمرانوں کا ایسا ہی ڈر نظم و نسق کی ہر ممکن درستی کا ضامن ہوتا ہے اس کے علاوہ اطرت بن مغیرہ اور اس کے دونوں قابل بھائی۔ مہلب ابن ابی صفرہ قتیبہ بن مسلم۔ محمد بن قاسم بہ جیسے بے مثال جنرل اور حکمرانوں کے موجود نے حجاج کے عالا نظم و نسق اور انتظامات سلطنت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ ایسے قابل اور

فرض شناس عہدے داروں کا وجود حجاج کی بیدار مغزی اور حسن انتخاب کا بین ثبوت ہے۔

۳۔ عدل گستری | یہ تو عربی حکومت کا قاعدہ ہی تھا کہ مفتوحین کے مابین نزاعات کے تصفیے کو ان کے پنچوں اور دوسرے ان ہی کے مقررہ طریقوں پر طے ہونے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ البتہ عربوں اور مسلمانوں کے حقوق کے تصفیے کے لیے قاضی مقرر کیے جاتے تھے حجاج کے وقت ایک صدر قاضی کوفہ کا اور ایک بصرہ کا ہوتا تھا۔ حجاج نے مشہور اور مانے ہوئے قاضیوں کو ان عالا عہدوں پر مقرر کر کے پھر سے ایک دفعا اپنی قابلیت کا ثبوت دیا تھا۔ مثلاً قاضی شریح جو کوفہ میں بہت مشہور تھے ان کو مجتہد بھی کہا گیا ہے۔ ۷۹ھ میں قاضی شریح مستعفی ہوئے تو مشہور فقیہ ابو موسیٰ اشعری کے بیٹے ابا بردہ کو اپنی جگہ کے لیے پیش کیا۔ حجاج نے قبول کر لیا بصرہ کی قضاءت پر موسیٰ بن انس اور عبد الرحمٰن بن اذینہ جیسے مشہور فقیہ مقرر تھے حجاج کو امام ابو محمد العقلانی نے خد فقیہ لکھا ہے۔

۴۔ اشتراکی فرایض | موجودہ زمانے میں تمام مہذب حکومتیں اشتراکی فرایض (SOCIALISTIC FUNCTIONS) کو حکومت کے حلقہ عمل میں داخل سمجھتی ہیں، یعنی "انفرادیت" پر زیادہ سے زیادہ اعمل آج کل متروک ہے ہوا تو صرف "اشتراکیت" یا "کمیونزم" کی چل رہی ہے انتہائی شکلیں چاہے مفروہوں لیکن یہ مسلم ہے کہ ہر حکومت کو اشتراکی فرایض انجام دینے چاہئیں۔ اور شہریوں کو ان کے پیشوں اور کسب معاش میں یا اس کے قابل بنانے میں مدد دینی چاہیے۔ حجاج کی حکومت نے اس کام کو اپنے ذمے لیا تھا۔ حجاج نے تجارت میں مدد کی۔ ایک سکا وضع کیا۔ اوزان اور پیمانوں میں قابل یادگار اصلاحیں کیں۔ چین سے تجارتی معاہدے کیے۔ سندھ کے قزاقوں نے مسلمان تاجروں کو لوٹا تو سندھ سے جنگ کی حجاج نے صنعت و حرفت کی بھی قدر کی اور لشکروں کی تیاری میں گھوڑے منگوانے اچھے اچھے اسلحہ چن چن کر خریدنے سے ظاہر ہے۔ زراعت کے لیے گراں قدر تقاوی دیں جن کی مقدار بیس لاکھ درہم یا آج کل اسی لاکھ روپے کے برابر ہے۔

۵۔ بھاری اصلاحات | مثلاً مالیات عراق کی درستی فوجی انتظام تشکیک زر غیر عربی عنصر کو دفاتر سے علیحدہ کرنا اور عربی کو سرکاری زبان قرار دینا نیز محکمہ برید کو ترقی دینا غرض حجاج کی ان تمام نہایت ہی اہم اصلاحات کا ہم نے "واقعات" کے بیان میں تفصیل سے ذکر کر دیا ہے۔ اس لیے اس نوعیت پر ان مسایل کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

۶۔ موالی یا مفتوحین سے تعلقات | حجاج چونکہ "کل مشرق" کا حکمران تھا۔ مفتوحین خصوص موالین سے اس کی پالیسی کا ذکر ضروری ہے۔

مفتوحین میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے وہ موالی کہلاتے تھے۔ تو مسلموں کو موالی اس لیے کہتے ہیں کہ عربی قوم قبایلی بنیاد پر قایم تھی۔ اہل قبیلا کے سوا اگر کوئی غیر شخص قبیلے میں شریک ہوتا تو اس کو حلیف یا موالی کہتے تھے۔ جب عربی فتوحات ہوئیں تو نو مسلموں کو عربی قبایلی نظام کے طریقے پر ترکیب پانے میں فاتحوں نے سہولت بہم پہنچائی اور اکثر نو مسلم موالی بن گئے۔ یعنی کسی ایک بڑے عربی قبیلے کے ساتھ ان کے تعلقات قایم ہو گئے اور وہ اس قبیلے کے نام سے موسوم ہونے لگے۔

حجاج کی حکومت خلافت کے دوسرے ممالک کی حکومتوں کے مسلمانوں سے اراضی پر "عشر" اور غیر مسلموں سے "خراج" وصول کرتی تھی۔ عشر خراج سے بہت کم ہوتا تھا۔ گویا مسلمانوں اور غیر مسلموں میں مساوات نہیں تھی۔ لیکن یہ صحی نہیں کیونکہ اگر مسلمانوں سے "ٹیکس" وصول کیا جاتا تھا۔ ایک زکوٰۃ ہی کو لیجیے جو نہ صرف روپے پیسے پر لی جاتی تھی۔ بلکہ مویشی تک پر بھی غرض ٹیکس کی صنف مسلموں اور غیر مسلموں میں مساوات ضرور کہی جا سکتی ہے۔ البتہ دوسری شکل کہ نو مسلموں سے "خراج" وصول کیا جاتا تھا۔ یہ ضرور قابل غور ہے مسلمانوں سے اراضی پر

عشر لیا جاتا تھا اور غیر مسلموں سے اراضی پر خراج لیا جاتا تھا۔ جو عشر سے زاید ہوتا تھا۔ یہ یقیناً ناسازگار تھی مگر اس کا خیال رہے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ ناسازگار ناگزیر تھی۔ کیونکہ سب صاحبِ مین مسلمان ہوتے جارہے تھے۔ اگر خراج سب سے نہ لیا جاتا تو خزانے کا خدا ہی حافظ تھا۔ نیز اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس ناسازگار سے موالی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا کیونکہ سلمانوں کی یہ نسبت ان کے پاس ۹۰ فی صدی اراضی تھی۔ خراج ناسازگار نہ تھا۔ ایران اور دوسرے ممالک کے باشندے "عہد عاد" سے خراج دیتے آرہے تھے اس لیے ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

خراج منصفانہ تھا کیونکہ یہ حضرت فاروق اعظم کا مقرر کیا ہوا تھا اور آپ نے نہایت متدین "بندوبست" کرنے والوں کے ذریعے اس کا تعین کروایا تھا۔ سالہا سال کے گشت و خون اور فصلوں کی خرابی کی وجہ سے اگر اس خراج کا ادا کرنا بھی رعایا پر کسی قدر بار گذر رہا تھا تو حجاج کی حکومت نے اس میں سہولتیں پیدا کرنے میں کوئی کمی نہ کی۔ یعنی ۲۰ لاکھ درہم یعنی تقریباً ۸۰ لاکھ روپے کی بھاری رقم بطور تقاوی صرف عراق میں تقسیم کی۔ "نہر نیل" و "زبی" کو درست کروایا۔ گاؤکشی ممنوع قرار دی۔ نیز زرعی ترقی کے لیے اور بھی سودمند تدابیر اختیار کیں۔

جرجی زیدان نے بنی امیہ کے عاملوں کی رشوت ستانی کے بھیانک قصے لکھے ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ حجاج اور عبدالملک کے وقت عمال اس عیب سے بہت بڑی حد تک پاک تھے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ ایک عامل کے (والی ہونے کے بعد سے) ایک دفعہ کچھ ہدیہ قبول کرنے کی اطلاع عبدالملک کو ملی تو اس کو بلوا کر پوچھا اس نے کہا "امیرالمومنین! آپ کے شہر آباد میں خزانے معمور ہیں اور رعایا بہترین خوش حالی میں ہے"۔ عبدالملک نے کہا "سوال کا جواب دے کیا موالی ہونے کے بعد سے آج تک تو نے کوئی ہدیہ قبول کیا؟" کہا "ہاں"۔ اس پر اس کو فوراً ہی معزول کر دیا۔ لیکن حجاج بھی اس خصوص میں خلیفہ سے کم نہیں تھا۔

عرب فاتحوں مسلم اور غیر مسلم مفتوحین میں فوجی اور معاشری نامساوات موجود تھی۔ خصوصاً موالی اس کو بہت محسوس کرتے تھے وہ مسلمان تھے اور صاحب علم و فضل مسلمان تھے لیکن نہ معاشرت میں ان کو مساوات دی گئی اور نہ فوجی خدمات ادا کرنے کے بعد بھی فوج میں مساوات کا درجہ حاصل ہو سکا۔ حجاج کی گورنمنٹ کا صرف یہی ایک فعل اس عام کلیہ کا استثنا بھی ہے یعنی فقط نومسلم کی فوجوں میں سات ہزار موالی مرجھان السطیر کی ماتحتی میں تھے جن کو مال غنیمت اور فوجی اعانتوں میں عربوں سے مساوات کے درجے پر رکھا گیا تھا لیکن عام طور پر معاشری اور فوجی نامساوات کے درجے پر رکھا گیا تھا لیکن عام طور پر معاشری اور فوجی نامساوات یہاں بھی تھی۔ حجاج نے اگر اس کی ابتدا نہ کی تھی تو اس بدعت کو برقرار ضرور رکھا تھا۔ اس سے متعلق ہم صرف یہ کہیں گے کہ حجاج کا یہ فعل لازمی" اور "ضروری" بھی تھا۔ ہر فاتح قوم اپنے کو مفتوحین سے علیحدہ رکھتی آئی ہے اور اسی میں اپنی بقا اور استحکام کا راز سمجھ گیا ہے۔ ہندستان میں اکبر کی ہندو، مسلمانوں کے اختلاط کی پالیسی کو برا کہا گیا ہے کہ اس اختلاط سے مسلمان، ہندوؤں میں گھوے سے "گھنے"۔ رعب حکومت جاتا رہا۔ مساوات کی سوجی تو جلیل القدر مسلمان بڑے ہی گھاٹے میں رہے۔

آپ ذرا انگریزوں ہی کی ہندستانی دور حکومت میں معاشری اور فوجی پالیسی پر غور کیجیے۔ اس کے بعد اگر آپ چاہیں تو بنی امیہ اور حجاج کو بھی برا بھلا کہہ سکتے ہیں۔

سچ ہے کہ اسلام در اصل "اخوت کا پیام" اور "مساوات کی نشان" تھا۔ لیکن اس مساوات سے کام چلنا نہایت ہی مشکل تھا۔ اس لیے کہ حاکم قوم محکوم قوم کو ہر حیثیت سے مساوات اور برابری کا درجہ اور مقام دیدے تو پھر حاکم اور محکوم کا فرق باقی نہ رہے گا

تبدیل مذہب کے تھا ہی فاتح اقوام کی تمام صفات مفتوحین میں نہیں آجاتیں بلکہ اس کے لیے تو پھر وہی کہ کئی "پیڑھی سالہا آزمائشی تربیت" چاہیے۔ تاکہ اخلاق کے وہ جوہر پیدا ہوں جو مدینہ میں

آکر چکے تھے۔ بہرنج گو موالی علم وفضل میں عربوں سے بڑھے ہوئے تھے اور دن بدن ترقی کرتے چلے جارہے تھے لیکن عربوں میں جہاں بھی اور آزادی کے وہ جوہر تھے جس کی وجہ سے وہ حکمرانی کر رہے تھے

شومان کا بادشاہ باغی ہوا تو اطاعت پر واپس لانے فقیہ نے ایک عرب اور ایک ایرانی کو بھیجا۔ شاہ شومان نے اس کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کیا۔ ایرانی نے اس کو قبول کیا اور واپس ہو گیا عرب نے اس کو قبول نہ کیا۔ اور لڑتے ہوئے جان دیدی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کچھ عرصہ پہلے ایک انگریز نے چین میں "کورنش" بجالانے سے انکار کیا۔ اور قتل ہوا تھا لیکن ایک سکھ نے کورنش اور موت میں "کورنش" کو موت پر ترجیح دی۔

مختصر یہ کہ آتنا تو علم ہے کہ فاتح اور مفتوحین میں سخت کشیدگی تھی۔ چنانچہ کسی مورخ نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہ کے وقت سے موالیوں نے حدیث خارجی کے ساتھ حکومت کے خلاف جو بغاوتوں میں اعانتیں شروع کیں تو اس کا سلسلا ابو مسلم خراسانی کے وقت تک برابر جاری رہا۔ اس کا بڑا سبب ایرانیوں کی خدا داد اور حب وطن تھا۔ مصر وشام بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہو گئے۔ ایرانیوں نے صوبے صوبے میں جنگیں لڑیں۔ لیکن حجاج اور اس کے قابل گورنر قتیبہ کی پالیسی موالی سے تعاون عمل حاصل کرنے کی تھی۔ چنانچہ ہم نے اوپر وہ واقعہ لکھا ہے جس میں ہبلہ کا تقرر سجستان سے خراسان پر ایک موالی کے کہنے سے جو حجاج کے نزدیک سوخ رکھتا تھا کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح قتیبہ نے ایرانیوں کو ملا رکھنے کی پالیسی پر ہمیشہ عمل کیا۔ جس کو ہم نے اس کے وسطالیشیا کی فتوحات میں بیان کر دیا ہے۔

(۷) اوپر کامیاب نظم ونسق سلطنت چند اصولوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے تھا۔ دوسرے لفظوں میں حجاج کی حکمرانی کے چند خاص اصول تھے جنہوں نے اس کو کامیاب بنایا۔

حجاج کا حکمرانی کے لیے پہلا اصول اس ابدی حقیقت پر مشتمل تھا جس کو سعدی شیرازی نے "درشتی ونرمی ہم دریست" کے خوب صورت مصرع میں نظم کیا ہے۔ حجاج اگرچہ امور میں سخت تھا تو چند امور میں نرم بھی تھا۔ مثلاً خلیفہ یا اقتدار اعلا کی پوری پوری اطاعت کرانے کے لیے سختی برتتا تھا۔ میدان جنگ سے بھاگ آنے فوجی خدمت سے جی چرانے پر مارشل لا کے مطابق سزائے موت دیتا تھا۔ اور اچھی بات سننے، سپاہ سالاروں اور فوجیوں کے جنگی مشوروں کو اختیار کرنے بہادری دکھلانے والوں کے ساتھ مشفقانہ سلوک کرنے میں کوتاہی نہ کرتا بلکہ اس میں تو ید طولا رکھتا تھا۔ چنانچہ پچھلے صفحات میں اس کی کئی ایک مثالیں دیجا چکی ہیں۔

حجاج کے نزدیک حکمرانی کا دوسرا اصول رعایا میں سے قابل شریف اور علم وفضل والے افراد سے حسن سلوک وران سے اچھا برتاؤ کرنے پر مشتمل تھا۔ چنانچہ ابراہیم بن محمد بن طلحہ کے ساتھ اس کے برتاؤ سے یہ بات نمایاں طور پر ثابت ہے لیکن یہ نہ سمجھیے کہ اس قسم کی صرف یہی ایک مثال تھی۔ حضرت امام شعبی کو منہ اعتراف تھا کہ حجاج ان کی بہت تعظیم کرتا تھا۔ حضرت سعید ابن جبیر سے جب حجاج نے دریافت کیا کہ کیا میں نے تم پر احتاد نہیں کیا؟ کیا میں نے تم کو اپنے رازمیں شریک نہیں کیا؟ کیا میں نے تم کو ذمہ دار یوں کے کام سپرد نہیں کیے؟ تو انہوں نے ان سب کا اعتراف کیا ایسی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں لیکن یہی مثالیں کیا کچھ کم ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ بہتر سلوک کے لیے تو حجاج مشہور ہی ہے۔ مثلاً جریر کو اس نے خلیفہ کے دربار میں یہ کہہ کر بھجوایا کہ "تجھے کما حقہ صلا دینے کی مجھ میں طاقت نہیں"

مالک بن بشیر ادیب کی عزت کی اور اس کے ادیبانہ جوابات کی سر دربار تعریف کی۔ مالک بن بشیر وہی صاحب ہیں جنہوں نے ہبلہ کے بیٹوں کے متعلق وہ مشہور فقرا کہا تھا کہ وہ "مثل ایک دایہ کے ہیں جس کی ابتدا کا پتا نہیں ملتا" اسی طرح حافظ نے بھی چند مثالیں دی ہیں۔ اور طبری نے تو ایسی کئی ایک مثالیں پیش کی ہیں۔ حجاج نے جن شاعروں اور خاص خاص ادیبوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بغیر ضروری یا بے معنی نہیں تھا۔ بلکہ ہر شخص کو کہ اس کی خاص خاص صلاحیتوں کا پھل ملتا تھا اور یہ کہ وہ اسی کے سب اس صلے کے مستحق ہوتے تھے۔

حجاج کا تیسرا اصول حکمرانی سپاہ، سالاروں اور سپاہیوں سے بہادری اور جاں بازی ظاہر ہونے پر قیاضانا اور بیدرانا حسن سلوک پر مشتمل تھا پچھلے صفحات میں اس کی مثالیں "وہابیوں" کے باب میں دی جا چکی ہیں اور یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ حجاج کی یہ پہرست بہت عام اور مشہور تھی۔ یہاں تک کہ اس کے حاسد بھی حضرات کو اس کے لغیر بلائے اس کے پاس بھیجا کرتے تھے اور وہ ان کی عزت کرتا اور حسن سلوک سے پیش آتا تھا۔ جیسا کہ مطرف بن مغیرہ کی بغاوت کے بعد ہوا۔

اس پچھے سلوک کا نتیجہ بھی ہم نے بتایا ہے کہ لوگوں کو ایسی اچھی تربیت ہوئی کہ وہ کوفا اور بصرہ میں فتنا کرنا چھوڑ کر ماوراء النہر میں بہادرین گئے۔

یہ واقعہ کہ حجاج آزادانا گفتگو کو پسند کرتا تھا قتیبہ بن مسلم کے واقعے سے ثابت ہے کہ شعب نے جب امراء کے لشکر کو شکست دی تو حجاج نے ایک فوجی کونسل منعقد کی۔ اس میں قتیبہ نے شکستوں کا سارا الزام حجاج پر رکھا کہ اس کے خدشکل کرنے لڑنے سے اس نے اپنے فرض کی ادائی میں کمی کی۔ اور نہ خلیفا کا حق اطاعت ادا کیا اور نہ اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کی ذمے داری ہی سے باجر رہا۔ اس بے باک گفتگو کے صلے میں حجاج نے قتیبہ بن مسلم کو اسی وقت اپنے لشکر کا علمبردار بنایا۔ اس کی نصیحت پر عمل کیا۔ جنہی روز بعد رے کا عامل پھر خراسان کا والی اور وسط ایشیا کا فاتح بنا دیا۔ یقیناً ان فتوحات میں اسی کا ہاتھ رہا۔ احمد زیلان نے لکھا ہے کہ اس اور وقعا لکھا ہے کہ ابن اشعث کے ساتھی یا غیوں میں دو شخص اور بھی تھے۔ ایک کے قتل کا جب حجاج نے حکم دیا تو اس نے کہا کہ میں نے تیرے ساتھ ایک احسان کیا ہے۔ اس کے صلے میں مجھے چھوڑ دے پوچھنے پر بتایا کہ ابن اشعث نے ایک دفعہ تیری ماں کو گالی دی تھی تو میں نے منع کیا تھا۔ حجاج نے گواہ طلب کیا۔ اس نے دوسرے ساتھی کا نام لیا گواہی دینے پر پوچھا تو نے کیوں منع نہیں کیا تھا اس نے جواب دیا کہ تو میرا دشمن تھا میں کیوں منع کرتا۔ حجاج نے دونوں کو چھوڑ دیا۔ پہلے کو گالی سے روکنے کے شریف فعل کی وجہ سے اور دوسرے کو سچ بولنے پر۔

حجاج جو یہ شناسی کو حکمرانی کا چوتھا اصول مانتا تھا چنانچہ عاملوں کے تقرر سے جن میں مغیرہ بن شعبہ کے تینوں بیٹے تھے یہ ظاہر ہو گیا۔ اس تقرر پر علامہ طبری کی رائے یہ ہے کہ حجاج نے کوفہ آنے کے بعد ان میں قابلیت دیکھ کر تین ولایتوں پر ان کا تقرر کر دیا تھا لیکن حجاج کے دوسرے تقررات اس سے زیادہ بہتر ثابت ہوئے۔ مثلاً مہلب بن ابی صفرہ قتیبہ بن مسلم محمد بن قاسم کے تقررات حجاج کی جوہر شناسی کے درخشاں برہان ہیں۔

پانچواں اصول حکمرانی کا جس پر حجاج عمل کرتا تھا وہ مؤثر مشیروں کو اپنے اطراف رکھنا اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھانا تھا۔ کوئی حکمران طاقت چاہے کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو مفتوحین کے تعاون سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔ حجاج جیسا مدبر بھی اس نظریے سے کس طرح غفلت شعار ہو سکتا تھا۔

حجاج جس چھٹے اصول حکمرانی پر عمل کرتا تھا وہ بہت اہم تھا یعنی زر کا صحیح استعمال، سیاسیات میں زر کا اقتدار ہمیشہ سے ہی رہا ہے اور رہے گا۔ وہ شخص سیاس ہی نہیں جو اس کا صحیح استعمال نہ کر سکے۔ اور نہ سیاسی اغراض کے لیے اس کا استعمال اخلاقی ذم کا پہلو رکھتا ہے۔ اس طبقے مناسب ہو۔ اس موضوع پر جو فاضلانا بحث پرالیس نے کی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے حجاج نے زر کا صحیح استعمال کیا ہے اس بحث کو ہم نے پچھلے صفحات میں مستند مقامات پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالملک نے اس پر اسراف کا الزام لگایا تو حجاج نے جو جواب میں لکھا تھا کہ "میں نے ہرگز اسراف نہیں کیا۔ بلکہ میرے خیال میں میں نے اہل طاعہ کا ابھی حق بھی ادا نہیں کیا۔" اس موقع پر اس کے یہ دو شعر بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اذا انام اون الشفیق
واقفی الذی تسری الی عقادجہ

فمن الذی یرجو لوالی وتبغی
مصادلتی والدھر جم عجائبہ

یعنی اگر میں مخلصوں اور وفاداروں کو حسن سلوک سے اپنے قریب نہ کروں اور برائی چاہنے والوں کو سزا دے کر دور نہ کروں تو اس مختلف حال اور عجیب و غریب زمانے میں کون مجھ سے امید رکھے گا۔ اور کون مری صولت سے ڈرے گا۔

باب (۱۵)

حجاج کی خارجا پالیسی

داخلی پالیسی کی بحث ختم ہونے کے بعد اب ہمیں حجاج کی خارجا پالیسی پر غور کرنا چاہیے۔ خارجا پالیسی کا سب سے اہم کام ہے کہ ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ حجاج کی گورنمنٹ اس میں نمایاں طور پر کامیاب رہی۔

حجاج کے عامل خراسان ہونے کے وقت طخارستان باغی اور خراسان پر نیزک کی ماتحتی میں حملہ آور تھا۔ حجاج نے قتیبہ کو بھیجکر اس کا پورا پورا انسداد کرا دیا۔ سجستان کے قبیلے وشاآزاد تھے۔ حجاج نے خبیش اسطوا ویس کو بھیجکر ان کو مغلوب کرنا چاہا لیکن خدا جزائے عبدالرحمن کو کہ باغی ہو گیا اور حجاج اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ لیکن پھر بھی حجاج نے رتبیل کو مرعوب ہی رکھا۔ حجاج کے بعد کسی دوسرے والی عراق یا خراسان سے وہ مرعوب نہ ہو سکا۔

دوسرا اہم سایا ملک چین تھا۔ چین سے نئے مفتوحہ ترکی ممالک مثل صغد، اتبہ اور زنبانا پر حملے یا ان ممالک کے ماتحت حکمرانوں کو خوجی تائید دینے کا قوی خوف تھا۔ اس کے انسداد اور نیز تجارتی تعلقات قایم کرنے سے حجاج نے چین کو سفارتیں بھیجیں تجارتی تعلقات قایم ہونے کے علاوہ خزانے کی موالی اور تاجر باشندوں کے مفاد کی بہبودی بھی مدنظر تھی جس کی وجہ سے وہ عربی حکومت کے بے حد مطیع تھے۔

ملک سند سے حجاج کے تعلقات دوستانہ تھے لیکن جب اس کے راجا نے علافی قبیلے کے باغیوں کو پناہ دی اور سند کے بحری ڈاکوؤں نے مسلمان تاجروں کو لوٹ لیا تو حجاج نے پیام و سلام کے بعد سندھ کو فتح کرنے کی ٹھہرائی اور اپنے ارادے میں کامیاب بھی ہوا۔

حجاج کی خارجی پالیسی کا ایک بہت بڑا کارنامہ سایا ممالک کے سوا ان ماتحت "دیسی حکمرانوں" کو رام کرنا تھا۔ جو زیرین طخارستان، خوارزم، بخارہ، کش، نسف، شبق، بلخ، شومان، سمرقند، فرغانہ وغیرہ ولیعہد ممالک کے بادشاہ تھے۔ لیکن جن کو قتیبہ نے مغلوب کیا اور سخت کینہ کی تھی۔ افسوس کہ ان حکمرانوں سے متعلق حجاج کے تعلقات کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔

حجاج کی شاہانہ (IMPERIAL) پالیسی کا جواز کیا تھا یہ اگرچہ بہت ہی بحث طلب مسلا ہے تاہم چند جملوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ (FORWARD) یعنی فتوحات کی پالیسی کا تصفیہ حجاج نے نہیں کیا۔ بلکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے کیا تھا۔ یہ اہم کام اس وقت انجام پا چکا تھا جبکہ ان بزرگ خلفاء نے شام، ایران اور خراسان کی فتوحات پر مسلمانوں کو مامور کیا تھا۔ یورپی اور یورپی خیالات کے مورخین اس کو توسیعی اور سامراجی کہہ کہہ کر کہتے ہیں۔ ایچ۔ جی۔ ویلس نے اس کو بدویوں کی حشونیوں پر عارفانہ یورش الاہر کیا ہے۔ مذہبی اور مذہبی خیالات کے مورخین اس کو "اعلاء کلمۃ اللہ" "نشر توحید" کے لیے جہاد کا نام دیتے ہیں۔ خلیفہ ولید پر ایک مضمون میں ہم نے ان مختلف رایوں کا موازنہ کیا ہے۔ اور زاید وزن آخر الذکر میں پایا ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے ہم اس بحث کو چھوڑتے ہیں۔ کیونکہ حجاج کے وقت (FORWARD) پر عمل تقلید کیا جاتا تھا عربوں نے یہ پالیسی حضرت ابوبکر حضرت عمر کے وقت سیکھی تھی اور اس پر عمل کرتے آئے تھے۔ پس چونکہ حجاج کے وقت میں یہ سوال تازہ نہ اٹھا تھا۔ اس لیے ہم جو حجاج کو لکھ رہے ہیں اگر کوئی قطعی رائے طوالت کے خوف

سے نہ دیں تو ہم کو معذور رکھا جائے۔

پرائیس نے ہر مہذب حکومت کے اولین پانچ فرائض گنائے ہیں۔ بیرونی حملوں سے حفاظت۔ داخلی امن عامہ و عدل گستری عمدہ نظم و نسق شہریوں کو ان کے پیشوں میں مدد کرنا ہم نے حجاج کی حکومت اور پالیسی کو داخلی امن عامہ نظم و نسق عدل گستری۔ بڑے بڑے اصلاحات اشتراکی فرائض۔ مفتوحین سے تعلقات۔ اصول حکمرانی۔ بیرونی حملوں سے حفاظت یعنی خارجہ پالیسی کے عنوان کے تحت ظاہر کر دیا ہے اب قارئین کرام خود تصفیہ فرمالیں کہ حجاج کی حکومت مہذب حکومت کے فرائض پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی یا نہیں۔

اب ہمارا کام اس حصے کو ختم کرنے سے پہلے حجاج کی گورنمنٹ پر ایک سوال کرنا ہے جو ہر مہذب حکومت پر کیا جاتا ہے یعنی آیا رعایا خوش حال تھی۔ یا اکبر مرحوم کے الفاظ میں ان کے دل میں خشی بہت تھی یا ریخ و تردد۔ یا پرائیس کے الفاظ میں وہ "اگر ممکن ہو تو پھر ایک نئی زندگی جینا چاہتے تھے"۔ یا سوفلس (SOPHOCLES) کے ہم نوا تھے کہ "انسان کے لیے بہترین بات یہ ہے کہ وہ پیدا نہ ہو۔ اس کے بعد بہترین امر یہ ہے کہ قبضا جلد ہو سکے ایسے اندھیرے میں غایب ہو جائے جہاں سے کہ وہ آیا ہے"۔

کیا ہم مسٹر گولڈ اسمتھ کہ یہ نہ کہیں کہ اس سوال سے حکومتوں کو بے انتہا کم تعلق تھا۔

HOW SMALL OF ALL THAT HUMAN HEART ENDURES THAT PART, WHICH LAWS OR KINGS CAN CAUSE OR CURE.

خشی کیا ہے؟ اس کا تعین دشوار ہے۔ ہر فرد کا اور ہر قوم کا اس کے متعلق ایک جدا خیال ہے اگر افغانی لڑتے مارتے زندگی پر خش ہیں تو مہین تجارت میں مثل پانی میں مچھلی کے خش ہیں۔ بہر حال کیا حجاج کی گورنمنٹ سے "رعایا خش حال تھی"۔ کا جواب اثبات اور نفی دونوں میں مشکل ہے اس کی وجہ مورخوں کی اس مسئلے سے بے اعتنائی ہے۔ اور اسی لیے ہماری معلومات اس امر سے متعلق بہت کم ہیں لیکن کتاب الاغانی کی ضخیم ۲۱ جلدوں کے پڑھنے سے ہم اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ اوپر کے سوال کا جواب اثبات ہی میں زیادہ صحیح ہے۔ کتاب الاغانی سے ایک چھوٹی سی تصویر فان کریمر نے اپنی کتاب "دی اورینٹ" میں بڑے ہی مناسب لفظوں میں کھینچی ہے۔

اگر حجاج کی پالیسی اور حکومت کے نتایج کو تین سطروں میں بیان کرنے کہا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ حجاج کی حکومت ان باتوں میں ناکام رہی یعنی یہ کہ قتیبا۔ بلی عنادی کی آگ کو جو صدیوں قدیم تھی اور میدان مرج راحط میں پھر سے بھڑک اٹھی تھی اس کو بجھا نہ سکی۔ بلکہ صرف عارضی طور پر اس کو دبا دیا تھا۔ اسی لیے عربوں میں اخوت نہ پیدا کر سکی۔ نہ عربوں اور موالی اور دوسرے مفتوحین میں بھی اخوت پیدا نہ کر سکی۔ نیز وہ اطمینان اور قناعت بھی نہ پیدا کی جس سے انقلابوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ ان ناکامیوں کے متعلق تفصیلی بحث اوپر کے صفحوں میں آ چکی ہے۔ جہاں ہم نے دکھایا ہے کہ یہ نہایت ہی مشکل مسایل ہیں اور جو تصفیہ اس وقت ہوا اگر بہت اچھا نہیں تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ آج یہ سوال بعد بھی یہی مسایل یعنی قلیل التعداد فاتح اور کثیر التعداد مفتوحین کا تعلق جماعتی جنگوں (CLASS WAR) کا انسداد اور انقلاب (REVOLUTIONS) کا خاتمہ اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔ اور پرائیس "عمومیت" کی بھی اس میں ناکامی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر بہترین قسم کی حکومت یعنی عمومیت اس میں ناکام رہی ہے تو پھر کسی حکومت سے امید کی جا سکتی ہے اگر پانی ہی اصلق میں اٹکے تو کیا پیئیں" اگر عمومیت کا نور بھی ظلمت ثابت ہو تو آپ کیسی اندھیریاں ہیں! اس اہم ناکامی کا سبب پرائیس نے یوں بیان کیا ہے کہ "کسی قسم کی حکومت فطرت انسانی کے ان رجحانات کو جو عرصے سے مستقل تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ بدل نہیں سکتی"۔

پس اگر حجاج کی پالیسی فطرت انسانی کی وجہ سے اوپر بیان کی ہوئی باتوں میں ناکام رہی تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی کامیابی پر بھی جن پہلوؤں سے کامیابی ہے بھی بیان کر دیں۔ حجاج کی حکومت میں سیاسیات پاکیزہ اور بلند تھی۔ سرکاری ملازمت میں قابل اشخاص تھے۔ افسران رشوت ستانی بالکل ہی نہ تھی۔ عام اخلاق کا معیار بہت ہی بلند تھا اور ان سب امور میں فطرت انسانی، جو ناپاکی اور بے ایمانی کا اپنے میں زبردست رجحان رکھتی ہے۔ اس وقت جو بہت مغلوب تھی وہ تاریخ عالم میں بے مثال اسلام کے مذہبی اثر کی وجہ سے تھا، اور اسی طرح تاریخ عالم کے چوٹی کے مدبروں میں سے ایک مدبر کی ہمہ گیر روشن خیالی عالی دماغی کے سبب تھا اور یہ سب کچھ اصل میں اس بے نظیر مدبر حجاج کے بے مثال مربی خلیفہ عبدالملک جیسے عظیم الشان مربی اور حکمران کے طفیل تھا۔!!

غزل

تو یہی کہدو کہ بس ترک محبت ہو جائے
جھوٹے وعدوں کی نہیں کس لیے عادت ہو جائے

دل بہلنے کی میرے کوئی تو صورت ہو جائے
نہ سہی حسرت دل درد کی حسرت ہو جائے

اس سے پوچھے کوئی طول شب فرقت کا بیاں
شام غم جس کے لیے صبح قیامت ہو جائے

یہ بھی معلوم ہے اے چھیڑنے والے دل کے
بات ہی بات میں پیدا نہ شکایت ہو جائے

کم سے کم آنا تو احسان کرا اے ذوق طلب
کہ میری حسرت دل درد محبت ہو جائے

چاک دامن سے میرا چاک گریباں مل جائے
کچھ کرم اور اگر بخیہ وحشت ہو جائے

وہ محبت بھی بھلا کوئی محبت ہے حمید
کہنے سننے سے کسی کے جو مداوت ہو جائے

(ملیح آبادی)

سوویت یونین کے اخبار

آج کل سوویت یونین میں آٹھ ہزار سے زیادہ اخبارات اور تقریباً ڈیڑھ ہزار رسالے شایع ہوتے ہیں۔ اخباروں کی روزانہ اوسط اشاعت ۱۹۵۲ء میں چار کروڑ تھی یعنی ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں قریب قریب دگنا۔ ملک بھر میں کوئی ایک ضلع ایسا نہیں ہے جس کا اپنا اخبار شایع نہ ہوتا ہو۔

ماسکو سے شایع ہونے والے مرکزی اخبارات خاص طور پر مقبول ہیں۔ "پراودا" سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ترجمان "ازوستیا" سوویت یونین کے محنت کش عوام کے نمایندگان کی سوویتوں کا ترجمان "ترود" مزدور سبھاؤں کی کل یونین مرکزی کونسل کا اخبار "کراسنایا زویزدا" سوویت یونین کی وزارت دفاع کا ترجمان کو سومولسکایا پراودا "نوجوان کمیونسٹوں کا پراودا" نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی اور ماسکو کمیٹیوں کا اخبار، لٹریٹورنایا گزیتا (لٹریری گزٹ) سوویت ادیبوں کی یونین کا ترجمان وغیرہ وغیرہ۔

مرکزی، جمہوری، علاقائی، رقبائی (قومی رقبوں میں) اور اضلاعی اخباروں کے علاوہ بہت سارے ایسے اخبار ہیں جو صنعتی کارخانے سرکاری فارم اور عالا تعلیمی مدارس شایع کرتے ہیں۔ بڑی بڑی تعمیروں کے مرکزوں سے بھی اخبارات شایع ہوتے ہیں۔

بہت سے اخبارات ایسے بھی ہیں جو وزارتیں اور ان سے متعلق مزدور سبھاؤں کی مرکزی کمیٹیاں مشترکہ طور پر نکالتی ہیں مثلاً "اوچی تلسکایا گزیتا" (اخبار مدرسین) وفاقی جمہوریوں کی تعلیمی وزارتیں اور ابتدائی ثانوی اور عالا تعلیمی مدرسوں کے کارکنوں کی یونینیوں کی مرکزی کمیٹیاں مشترکہ طور پر شایع کرتی ہیں۔

سوویت اخبارات اور رسالے سوویت محنت کش عوام کی زندگی کمیونزم کی تعمیر میں ان کی بہادرانہ محنت اور تہذیبی ترقی کی پوری تصویر پیش کرتے ہیں جن قومی معاملات کو کافی جگہ دی جاتی ہے اور تمام نسلوں اور قوموں میں باہمی امن اور میل ملاپ کے نظریات کو مقبول عام کرتے ہیں۔

نیشنل لائبریری آف انڈیا

ڈی۔ ال۔ دت

ہمیں اس بات کا سخت افسوس ہے کہ امرداد ۱۳۶۲ف جون ۱۹۵۳ء کے "ہندستانی ادب" میں "لائبریری آف کانگریس" مضمون پیش کرتے ہوئے ہم نے یہ لکھا تھا کہ "آج سے چند مہینے پہلے" نیشنل لائبریری آف انڈیا" والا مضمون آپ کی سیوا میں پیش کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ یہ نوٹ خلاف واقعہ تھا۔ اس لیے کہ دفتری بھول سے یہ مضمون پیش کرنے سے رہ گیا تھا۔ چونکہ یہ ایک نہایت ہی مفید اور معلوماتی مضمون ہے اس لیے اب حاضر خدمت ہے۔ ایڈیٹر

ہندستان میں لائبریری تحریک کو دن بدن زیادہ مقبولیت ہوتی جا رہی ہے۔ تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ان کی مانگ بھی بڑھ رہی ہے۔ نیچے کلکتہ کی نیشنل لائبریری آف انڈیا کا کچھ حال درج کیا جاتا ہے۔ یہ لائبریری آج سے سو برس پہلے قایم ہوئی تھی ——

کلکتہ کی مشہور لائبریری "دی نیشنل لائبریری آف انڈیا" کو علی پور میں بلو یڈیر منشن کی عمارت میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس کی لمبی تاریخ میں اس طرح ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ چند مہینے پہلے اس کی گولڈن جوبلی منائی گئی ہے۔

اس وسیع عمارت میں برسوں سے جمع کی ہوئی ساڑھے سات لاکھ بیش قیمت کتابیں اور نادر مسودے ہیں۔ ان کتابوں میں بوہر لائبریری کی مشہور عربی فارسی اور ہندستانی کے مسودے اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رجسٹرڈ کے رجسٹر اور کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر آشوتوش مکرجی کا ذاتی کتب خانہ بھی شامل ہے۔

نیشنل لائبریری کو ہر طرح سے جدید طریقوں کے مطابق رکھا گیا ہے۔ کتابیں رکھنے کے لیے گھومنے اور آسانی کھلنے بند ہونے والی الماریاں مہیا کی گئی ہیں۔ ان میں کتابیں رکھنے کی کافی گنجایش ہے اور کتابوں کو دیمک اور دوسرے کیڑوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام ہے۔ اس کے کھلے ہوا دار اور وسیع کمروں میں ریسرچ اور مطالعہ کرنے کے لیے موزوں ماحول پایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے کمروں میں خاصی آرام دہ سامان موجود ہے جس کے باعث یہ لائبریری طالب علموں کے لیے ایک جنت بنی ہوئی ہے۔

ممتاز لائبریرین

اس اہم اور ملکی ادارے کے افسر عالا یعنی لائبریرین مسٹر بی۔ البس کیشون ہیں۔ جو لائبریری سائنس کے متعلق ایک سند سمجھے جاتے ہیں۔

حال کے برسوں میں اس نیشنل لائبریری کو جو نمایاں ترقی حاصل ہوئی ہے اس کا سہرا بڑی حد تک کیشون اور ان کے عملے کے سر ہے۔

بہت سے دوسرے ملکوں کی نیشنل لائبریریوں کے مقابلے میں اگرچہ یہ لائبریری بہت چھوٹی ہے لیکن اس کی توسیع کے پلان بنائے گئے ہیں۔ کتابیں خریدنے کے لیے اس کی سالانا امداد میں حکومت نے پہلے ہی اضافہ کر دیا ہے۔

لائبریری کے دروازے پر ایک کتبے پر مہاتما گاندھی کے نیچے کے مشہور شعر درج ہیں:—

"میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کو ہر طرف سے دیواروں سے محصور اور گھر کیوں کو بھر دیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے گھر میں کلچر کو اتنی آزادی اور بہتات سے پھیلنے دیا جائے۔ جتنا ممکن ہو لیکن میں یہ بات تسلیم نہیں کروں گا کہ میرے پاؤں اکھیڑ دیے جائیں"

یہ شدید اس مقصد کی تمہید ہیں جس کے لیے یہ نیشنل لائبریری قایم کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ صرف کتابوں کے ذخیرا کرنے کی ہی جگہ نہیں بلکہ ایک ایسا مرکز ہے کہ جہاں سے علم اور کلچر کو پھیلایا جاتا ہے

یہ لائبریری ہندستان میں لائبریری تحریک کے اولین رہنماؤں اور عاملوں خاص کر دوار کا ناتھ ٹیگور۔ پیارے چند مترا جیسے بنگالی ناولسٹوں اور مصنفوں کے خاب کی تعبیر ہے۔

ان دو رہین لوگوں نے مل جل کر ایک ایسی لائبریری قایم کرنے کا ارادا کیا۔ جس کی کتابیں کسی جماعتی درجا بندی وغیرا کے امتیازات کے بغیر سب کے استعمال میں آسکیں۔ اور وقت ضرورت ان سے مدد لے سکیں۔

اس طرح سے کلکتا کی یہ لائبریری آج سے ایک صدی سے بھی زیادا عرصے پہلے ۱۸۳۶ء میں قایم کی گئی تھی۔ ہندستان کی موجودا نیشنل لائبریری کی گویا یہی پیش رو تھی۔ کیونکہ جب کلکتا کی پبلک لائبریری ۱۹۰۳ء میں مالی لحاظ سے نازک حالت کو پہنچ گئی تو اس وقت کے وائسرے لارڈ کرزن نے بیچ میں پڑ کر اس لائبریری کے مالکوں سے حکومت ہند کے حق میں ملکیت کے حقوق خریدے اور اسے امپیریل انڈیا کالج کی لائبریری کے ساتھ ملا دیا۔ سارے ملک سے ذخیرا رکھا دوار کتابوں کے مجموعے اکٹھے کیے گئے اور انہیں اس لائبریری میں رکھا گیا اس وقت یہ امپیریل لائبریری کے نام سے مشہور تھی۔

ہندستان کو آزادی حاصل ہوتے ہی یہ لائبریری نیشنل لائبریری بن گئی ہے جیسا کہ حال ہی میں مغربی بنگال کے گورنر ڈاکٹر ہرندر کمار مکرجی نے کہا کہ "یہ لائبریری ہندستان کی لائبریری سسٹم کا دل ہے جس کے پانی سے سارا ملک سیراب ہو سکے اور عالم مردوں اور عورتوں کی فصل حاصل ہو"

پچھلے چند برسوں سے واشنگٹن میں اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن کے ساتھ نیشنل لائبریری کتابوں کا باہمی تبادلا کرتی آئی ہے جو کتابیں اس طرح امریکا سے آئی ہیں ان میں ٹکنیکل کتابوں اور پمفلٹوں کا نہایت مفید مجموعا ہے۔

اس لائبریری میں جتنی کتابیں اور مسودے وغیرا ہیں۔ وہ علم کی جستجو رکھنے والوں کو کسی پابندی کے بغیر مل سکتی ہیں۔

دولت مشترکا کے سائینس دانوں کیلیے وظایف

رایل سوسائیٹی اور نفیلڈ ادارے نے دولت مشترکا کے سائینس دانوں کے لیے وظایف کی ایک نئی اسکیم شروع کی ہے۔ جس کا مقصد سائینس دانوں کے درمیان گہرے تعلقات پیدا کرنا ہے۔ یہ اسکیم تجربے کے طور پر پانچ سال تک جاری رہے گی۔ نفیلڈ ادارا نئی اسکیم کے لیے پانچ ہزار پونڈ کی رقم ہر سال دیا کرے گا۔ جو برطانوی سائینس دان سمندر پار کے کامن ویلتھ ممالک میں ریسرچ کرنا چاہتے ہیں۔ یا دولت مشترکا کے سائینس دان جو ایک دوسرے ملک میں تحقیق کا کام کرنے کے خاہش مند ہیں ان وظایف سے فایدا اٹھا سکیں گے۔ رایل سوسائیٹی نے اسکیم شروع کرنے کے لیے ۲۵۰۰ پونڈ کی رقم دی ہے اسکیم کو عملی جاما پہنانے کے لیے نفیلڈ ادارا اور رایل سوسائیٹی کی ایک مشترکا کمیٹی قایم کر دی گئی ہے۔ مسٹر ایڈورڈ سایر اس کمیٹی کے چیرمین مقرر کیے گئے ہیں۔

دکھا دل

صبا نقوی

(ایک سچا واقعہ)

ڈپٹی نور الدین والد صاحب کے پرانے اور گہرے دوستوں میں سے تھے۔ جانے اس دوستی کی ابتدا تو کہاں سے ہوئی ہوگی لیکن یہ بات مسلم ہے کہ اس ابتدا کا باعث صرف شطرنج ہی ہو سکتا ہے والد صاحب کو تو خیر نہایت فارغ البال زمیندار ہونے کی وجہ سے شطرنج میں دلچسپی اور اس میں کامل مہارت ہونا تعجب کی بات نہ تھی لیکن ڈپٹی صاحب بھی کچھ کم "شطرنجیے" نہ تھے مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب ڈپٹی صاحب کئی کئی ہفتوں کے لیے ہمارے ہاں مہمان ہوتے۔ ہماری کوٹھی اچھی خاصی شطرنج گھر بن کر رہ جاتی اور تمام شہر کے شطرنج باز دن دن بھر دو پارٹیوں میں بٹ کر ہر ہر چال پر لے تماشا شور مچانے کے ساتھ ساتھ پان اور چائے پر بھی پڑ پڑ کر ہاتھ صاف کیا کرتے تھے مجھے ان تمام باتوں کا اور کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن یہ ضرور ہو گیا تھا کہ شطرنج کھیلنے کی بھوٹی سی بہت سوجھ بوجھ آ گئی تھی اور اندھے ہم عمر دوستوں میں بیٹھ کر شطرنج کی چالوں پر انٹی سینٹ رائے زنی کر کے کانا راجا بننے کی کوشش میں کامیاب ہو جایا کرتا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد ابا جان کے قریب قریب تمام دوستوں کا ہی سراغ مل گیا لیکن باوجود انتہائی کوشش کے ڈپٹی صاحب کا کہیں پتا نہ چلا۔ والد صاحب کو تو اس کا جتنا افسوس ہوگا وہ ہوگا ہی خدا مجھے جانے کیوں رہ رہ کر ان کی یاد آ جایا کرتی ہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے افسر ہونے کے باوجود نہایت شریف، خوش اخلاق مخلص۔ اور پابند شریعت۔ پکے مسلمان۔ شاید اس لیے بھی مجھے بہت یاد آیا کرتے ہیں کہ وہ مجھے سب بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور میرے نہایت شاندار مستقبل کی پیشینگوئیاں تو ان کا معمول ہی بن گیا تھا تمام دن شطرنج بازی کے بعد رات کو کھانے کے بعد بستر سے واپس آ کر عشا کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد مجھکو آواز دیتے ہیں جھٹ کو تیار کیے پہلے سے ہی اس آواز کا منتظر ہوتا تھا۔ دوسرے بچے بھی سب ڈپٹی صاحب کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور وہ مجھے سب بچوں سے الگ اپنی گود میں بٹھا کر کوئی نہ کوئی قصا چھیڑ دیتے اور قصا سنانے سے پہلے عام طور پر یہ بتا دیا کرتے تھے کہ "یہ میری آپ بیتی ہے" اور ساتھ ہی ساتھ آپ بیتی کی اہمیت جتانے کے لیے یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ "آپ بیتی کے دہرانے سے جو لطف آتا ہے وہ جگ بیتی سے حاصل نہیں ہو سکتا"

یوں تو انہوں نے کتنی ہی آپ بیتیاں سنائیں اور ہم نے سنکر بھلا ڈالیں لیکن وہ رات اب بھی بالکل کل کے واقعے کی طرح یاد ہے جس دن ہمارے محلے کے ایک کھاتے پیتے شخص کو ڈاکو دن دھاڑے قتل کر گئے تھے۔ دینا والے کسی موقع پر بھی چوکتے نہیں سے باز نہیں رہتے چنانچہ اس قتل کو بھی بعض لوگوں نے دبی دبی زبان میں مقتول کے اعمال کا نتیجہ قرار دیا۔ مجھے اسی دن معلوم ہوا کہ مقتول نے کسی غریب آدمی سے کسی وقت دو سو روپے ادھار لیے تھے جو اس غریب کی تمام عمر کی پونجی تھے۔ اور پھر وہ بے چارا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا لیکن اس کا پتھر دل نہ پسیجا۔۔۔۔ اور ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرنے والے لوگ جو کل تک اسی مقتول کے دوست تھے آج کہہ رہے تھے کہ اسے اس غریب مظلوم کی آہ کھا گئی۔

ڈپٹی صاحب جہاندیدہ آدمی تھے اور ان کے قول کے مطابق پولیس کی ملازمت کی وجہ سے انہیں بارہا مظلومین کی آہوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس رات انہوں نے ایک ایسی ہی آپ بیتی سنائی۔

یہ ان کے پنشن پانے سے چھ سات سال پہلے کا واقعہ تھا۔ ان دنوں وہ ایبٹ آباد میں متعین تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ رات کو گھر کے تمام افراد انگیٹھی کے گرد بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے کہ ایک خبر نے معلوم ہوا کہ ناسک کے کرنسی پریس سے نوٹ چھاپنے کی ایک مشین چوری کر لی

گئی ہے چوری ایک سرنگ کے ذریعے ہوئی تھی۔ جس کا دوسرا سرا ایک کھنڈر میں نکلتا تھا۔ چور بڑی ہشیاری سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب اسی چوری کے متعلق سوچتے سوچتے سو گئے دوسری صبح ابھی بستر نہیں چھوڑا تھا کہ چوری کا سراغ لگانے کے لیے سرکاری حکم نامل گیا۔

مدد کے لیے جتنے آدمیوں کی ضرورت تھی لے لیے گئے اور پوری توجہ کے ساتھ سراغ رسانی شروع ہو گئی۔ چور کو پکڑنے والے کے لیے انعام کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔ اور ڈپٹی صاحب کو انعام کے ساتھ ساتھ ترقی کی امید بھی تھی۔ آخر چار ماہ کی رات دن کی لگاتار کوششوں سے معلوم ہوا کہ چور آگرے میں ہے۔ ڈپٹی صاحب اپنے عملا سمیت فوراً آگرے پہنچ گئے۔ اور بڑی احتیاط اور کوشش کے بعد چور گروہ کو عین ایسے وقت پر گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے جب وہ نوٹ چھاپ رہے تھے۔ اور اس وقت تک ایک لاکھ کے نوٹ چھاپے جا چکے تھے۔ چوروں کو پریس اور نوٹوں سمیت ڈپٹی صاحب کی جائے قیام پر لے آیا گیا۔ رات کافی جا چکی تھی اس لیے بقیہ کارروائی صبح پر ملتوی کر کے چوروں کو ہتھکڑیوں سمیت ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

سب کے سو جانے کے بعد چوروں کے سرگروہ پنجابی نے ڈپٹی صاحب کو کمرے کے جنگلے دار کھڑکی کے قریب بلایا اور بلا تکلف کہنے لگا

"ڈپٹی صاحب! یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ صبح اٹھنے کے بعد پہلا کام کیا کریں گے۔"

"تمہیں معلوم ہونا بھی چاہیے" ڈپٹی صاحب نے رعنی سے بولے

"لیکن آپ سن لیں تو میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہو"

"ہم سب بہت غریب آدمی ہیں۔ تمام دن کی محنت مزدوری کے بعد تمام رات جاگ جاگ کر دو سال میں ہم یہ سرنگ تیار کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے جس کے ذریعے پریس چوری کیا گیا۔ ہم آپ کے ہم مذہب بھی ہیں۔ خدا کے لیے ہمارا نہیں تو ہم سب کے بے سہارا بال بچوں کا خیال کیجیے۔"

"لیکن میں کیا کر سکتا ہوں اس سب"

"آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ چاہیں رہا کرا سکتے ہیں۔ تمام التجائیں اس کی آنکھوں میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔

"سارے عملے کو حقیقت کا علم ہے؟"

"چند نوٹ ہر زبان پر تالا ڈال سکتے ہیں۔ ہم نے کم از کم ایک لاکھ سے زیادہ مالیت کے نوٹ چھاپ چکے ہیں۔ عملہ بہت کم ہے اور ہم سب عمر بھر کے لیے لے دام بے غلام ہو جائیں گے۔"

ڈپٹی صاحب نے اسے عدالت میں پیش ہونے کے لیے لالچ وعدے پر راضی کر لیا کہ وہ مقدمے میں کوئی قانونی نکتہ پیدا کر کے انہیں چھڑا لیں گے لیکن گورنمنٹ کی طرف سے انعام کے لالچ اور ترقی کی حرص نے وعدے کی پرواہ نہ کرنے دی نوٹوں میں سے ساتھیوں کو حصہ دینے کا وعدہ کر کے ڈپٹی صاحب نے چوروں کو پریس سمیت عدالت میں پیش کر کے مقدمہ جیت لیا۔ ڈپٹی صاحب کو تمام ساتھیوں سمیت پچاس ہزار روپے انعام ملا اور ترقی بھی ہو گئی۔ انہوں نے حصوں کو ایک وقت میں تقسیم کرنے کی خاطر انعام کے پچاس ہزار بھی اسی ٹرنک میں رکھ لیے۔

گروہ پر جرم ثابت ہو گیا تھا۔ پنجابی کو پانچ سال قید سمیت کالے پانی کی سزا ہوئی اور دوسروں کو مختلف میعادی سزائیں۔ انہوں نے عدالت میں تو خدا جانے کیوں اس پانچ کا ذکر نہ کیا لیکن فیصلہ سنائے جانے کے بعد انہیں جیل لے جایا جانے لگا اس وقت پنجابی نے ڈپٹی صاحب کی طرف ایسی نظر اٹھائی جو نظروں سے دیکھا کہ ڈپٹی صاحب سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ گئے۔ اور جب ملزم سے گزر گئے تو ڈپٹی صاحب کے کانوں نے پنجابی کے یہ الفاظ سنے۔

خدا کرے تجھے یہ روپیہ نصیب نہ ہو۔"

ملزموں کے سزا پا جانے کے بعد ڈپٹی صاحب کے ساتھی بند ربانٹ کے لیے اکٹھے ہوئے۔ رات کا وقت تھا نوٹوں کا ڈبا تو ڈپٹی صاحب اندھیرے ہی میں اٹھا لائے اور کھول کر بیٹھتے ہوئے نوکر کو لیمپ لانے کے لیے آواز دی لیمپ آنے سے پہلے ان کے ایک ساتھی کو سگریٹ سلگانے کی ضرورت پیش آئی۔ ماچس کی روشنی میں ڈبے کو نوٹوں سے بھرا دیکھ کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ سگریٹ سلگانے والے سگریٹ سلگا کر ماچس کی جلتی ہوئی سلی ایک جھٹکے کے ساتھ ایک طرف پھینک دی اور جوں ہی نوکر لیمپ لے کر

برطانوی اسکولوں میں فلموں کے متعلق تعلیم

ڈجیرڈ

کیا برطانوی اسکولوں کے نصاب تعلیم میں جلد ہی "فلموں کی جانچ" کا مضمون بھی شامل کر دیا جائے گا؟ کیا وہ دن دور ہے جب حکومت اور پڑھنے والے اس تجویز کو منظور کر لیں گے کہ سینما کے آرٹ کے متعلق اسکولوں کے لڑکے لڑکیوں کو تعلیم دی جائے۔

ہمیں وہ سوالات جو آج کل اسکول ٹیچروں اور ماہرین تعلیم کے دلوں میں پیدا ہو رہے ہیں وہ اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ فلموں کے متعلق ان کے شاگردوں کی واقفیت ان کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ وہ اس چیز کو تسلیم کرتے ہیں کہ لڑکے لڑکیاں اکثر سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ مگر استاد شاذ و نادر ہی کوئی فلم دیکھنے جاتا ہے۔

نئی انجمن

دو سال ہوئے "سوسائٹی آف فلم ٹیچرز" کے نام سے ایک انجمن قایم کی گئی تھی جو فلمی تعلیم کے سلسلے میں نہایت سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔ اس انجمن کو تین سو اسکولوں کی حمایت حاصل ہے اور یہ اس انجمن کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اب اسکولوں میں سینما اور ٹیلی ویژن کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ کہیں کی ان ایجادات کا نوجوان طلبا اور طالبات کی زندگیوں پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی طرف پوری توجہ دی جائے۔

اس انجمن کے مقاصد یہ ہیں

(۱) اسکولوں۔ کالجوں۔ اور یونیورسٹی کلبوں میں "فلم کی جانچ" کے متعلق تعلیم کی اشاعت کی جائے۔

(۲) ٹیچروں کو اس مضمون کے پڑھانے کے متعلق تربیت دی جائے

(۳) طلبا کو "عام لیسنس" فلموں کے متعلق تعلیم دی جائے تاکہ انہیں پتا لگ سکے کہ کونسی اچھی فلم ہے اور کونسی بری۔

ابھی وہ دن تو قریب نہیں آیا کہ کوئی طالب علم گھر آ کر اپنے ماں باپ کو یہ بتائے کہ صبح کو اس کی جماعت میں کس فلم پر تبصرا کیا گیا تھا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ چند اسکولوں اور کلبوں نے پہلے ہی سے فلموں کے متعلق بچوں اور نوجوانوں کو تعلیم دینی شروع کر دی ہے اور اس طرح انہوں نے دوسرے اسکولوں کی رہنمائی کی ہے۔ وہ اپنی جماعتوں میں طلبا کو فلمیں دکھلاتے ہیں فلموں کی بابت گفتگو کرتے ہیں۔ اور فلموں کے متعلق تعلیم دیتے ہیں۔

ایک ۲۹ سالا کیمبرج ٹیچر جیک اسمتھ اس مہم کا رہنما ہے اس کی رہنمائی میں اسکول کے طلبا نے "دی ویمبلڈن ہل ماب" (THE WIMBLEDON HILL MOB) کے نام سے چالیس منٹ کی ایک فیچر فلم بنائی ہے۔ جیک اسمتھ "سوسائٹی آف فلم ٹیچرز" کا سکریٹری ہے۔

ان اسکولوں میں سے جو اس انجمن کی حمایت کر رہے ہیں صرف چند اسکولوں نے دلیری سے کام لیتے ہوئے "فلم کی جانچ" کے مضمون کو اپنے نصاب میں باقاعدہ طور پر شامل کر لیا ہے۔ لیکن متعدد دوسرے اسکول انگریزی زبان کی کلاسوں میں اس موضوع پر تبصرا کرتے رہتے ہیں۔ اور کئی اسکول اپنے مقررا اوقات کے بعد اپنی فلم انجمنوں اور بحث مباحثے کے گروپوں میں اس مضمون پر تعلیم دیتے رہتے ہیں۔

ویسٹ ہیم میں واقع پلے اسٹو گرامر اسکول میں ۱۴ - ۱۵ سال کی عمر کے طلبا نے "کیمیا" پر مضامین اور فلمی تبصرے لکھے ہیں اور خود فلموں کے مکالمے تیار کرتے ہیں۔ سرے تھیم میں واقع ڈن ڈون

اسکنڈری ماڈرن اسکول میں "فلم کی جانچ" کے موضوع پر باقاعدہ کلاسس لگائی جاتی ہیں۔ اس اسکول میں طلبا مختصر فلمیں تیار کرتے ہیں اور سنیماؤں میں دکھلائے جانے والی نئی فلموں پر تبصرے بھی کرتے ہیں۔

مسٹر جیک سمتھ کا کہنا ہے کہ میرے اسکول کے لڑکوں کی فلمی معلومات قابل تعریف ہیں۔ وہ فلمی بحثوں سے خوب دلچسپی لیتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت ہم فلمی سیشن منعقد کرتے ہیں جس میں تمام طور پر ایک لڑکا کسی فلم پر پانچ منٹ کا تبصرہ کرتا ہے۔ لیکن سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ پڑھانے والوں کو فلموں کے متعلق تربیت دی جائے۔ اور ہم اس دن کی انتظار میں ہیں جب "فلمی جانچ" کا مضمون ٹریننگ کالجوں کے نصاب میں شامل کیا جائیگا۔

اس سمت میں قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ سٹی آف لیڈز ٹریننگ کالج کا ڈائرکٹر ایس وڈ ہاوس پہلا شخص ہے جس نے "فلمی جانچ" کے موضوع پر ایک مقالا لکھ کر ڈائرکٹر کی ڈگری حاصل کی ہے۔

لیڈز یونیورسٹی میں اسکنڈری اسکول ٹیچروں کے لیے ایک کورس شروع کیا گیا ہے جس کا تعلق فلموں کی تاریخ، فلموں کی پروڈکشن اور پڑھانے کے طریقوں سے ہے۔

ایک سابق استاد اسٹیلے ریڈ نے کہا ہے "بچوں کو اسکولوں میں دنیا کی چالیس یا پچاس بہترین فلمیں دکھانا ہی کافی نہیں ایسی فلمیں دیکھ کر وہ اس قابل نہیں ہو سکتے کہ وہ اچھی اور بری فلم میں تمیز کر سکیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ فلمیں دکھانے کے ساتھ ساتھ انہیں فلموں کی جانچ کے متعلق تعلیم بھی دی جائے۔ تب جا کر وہ اچھی فلموں کا مطالعہ کریں گے اور بری فلموں کو رد کریں گے۔

ہیڈ ماسٹر صاحبان! سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ تعلیمات کے سرکلر کی بنا پر اپنی اپنی لائبریری اور انعام کے لیے ڈائرکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب "دمنی" ضرور خریدیں۔ قیمت عہ آنے۔ ملنے کا پتا ۱۹۹ سے اعظم نور التعمیر، حیدرآباد دکن۔

ایک سوویت اسکول ٹیچر کا شاندار کام

مجھے اسکول میں پڑھانے بچوں کی تربیت کرتے اور نئی پود کو پروان چڑھاتے ہوئے ۲۵ سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے پیشے سے بے حد انس ہو گیا ہے۔ بچوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے اطمینان اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔

سوویت حکومت ہم اساتذہ کو نئے انسان کی پرورش اور تربیت کا کام سپرد کیا ہے جو کمیونسٹ سماج کا معمار ہو گا۔ اس سے زیادہ اور کوئی بات باعث مسرت ہو گی کہ بچوں میں محنت سے محبت کرنے۔ ایمانداری اور اپنے عوام اور اشتراکی مادر وطن کے تئیں وفاداری کے جذبات پیدا کیے جائیں۔

مجھے اکثر وہ دن یاد آتا ہے جب میں نے بطور استانی پہلی بار جماعت کے اسکول کی دہلیز میں قدم رکھا تھا اس وقت میں مجسم جوش بنی ہوئی تھی اور اب بھی اتنے سالوں کے تجربے کے بعد جب میں کلاس روم میں داخل ہوتی ہوں اور بیسیوں آنکھوں کو اپنی طرف مرکوز دیکھتی ہوں تو ایک عجیب احساس کی لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ بعض آنکھیں مستعد اور پرفکر ہوتی ہیں بعض وحشی ہوتی ہیں اور ان میں شرارت کی جھلک ہوتی ہے اور بعض دوسری آنکھیں خیالات میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ بچے کی طرف مختلف رویا اختیار کرنا پڑتا ہے تاکہ اس کی قوتوں کو حرکت میں لایا جائے اور اسے سرگرمی سے کام کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ کوئی سہل کام نہیں ہے لیکن اس وقت کتنی خوشی ہوتی ہے جب یہ خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششیں عوام کے لیے کتنی مفید ثابت ہوتی ہیں اور جن بچوں کو ہم نے پڑھایا ہے وہ ایک خوشحال زندگی کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

حال ہی میں ایک نوجوان جسے اسکول کے اساتذہ نے کہے میں آیا اور اس نے میرے بارے میں دریافت کیا میں نے سوچا ضرور میرے کسی شاگرد کا والد ہوگا میں نے پوچھا "کیا آپ مجھ سے اپنے لڑکے کے بارے میں ملنا چاہتے ہیں؟" دیر صاحب گیا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور اسے پہچان لیا وہ پرشانگر دتھا جس نے دس سال پیشتر اسی اسکول سے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

جسم انسانی کی نشوونما کیلئے معدنیات کی اہمیت

انسانی زندگی اور صحت کے لیے کیلشیم، سوڈیم، فاسفورس گندک میگنیشیم، پوٹاشیم اور آیوڈین ایسی معدنیات نہایت ضروری ہیں کیلشیم ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بنانے کے علاوہ خون کو صاف رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ سوڈیم ہاضمے کے فعل کو تیز کرتا ہے۔ فاسفورس دماغ اور اعصاب کو تقویت پہنچاتا ہے۔ گندک جسم کو توت بخشنے کے علاوہ اس کے گندے مادے سے صاف رکھتی ہے۔ میگنیشیم نظام عصبی اور زرائی شدا قوت کی بحالی کے لیے ضروری ہے۔ پوٹاشیم درد اور قبض کو دور کرتا ہے۔ آیوڈین غدودوں کے فعل کو ٹھیک رکھتی ہے اور جسمانی انسانی شخصیت کو سکون بخشتا ہے۔

زیر نظر مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ان معدنیات کے فائدے کون کونسی چیزیں کھانے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

قدرت نے زمین میں وہ بہت سے معدنی نمک بھر دیے ہیں جو انسانی زندگی اور صحت کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ جو سبزیاں زمین میں بوئی جاتی ہیں وہ اپنی نشوونما کے لیے ان معدنیات سے ضروری خوراک حاصل کرتی ہیں۔ زمین پر اگنے والی ان سبزیوں اناج دانوں کے استعمال سے انسان اپنی خوراک میں وہ معدنی اجزا شامل کر سکتا ہے جو صحت کے لیے ضروری ہیں۔ غذا کی شکل میں جسم میں داخل ہونے کے بعد یہ معدنی نمک جسم انسانی کے مختلف اعضا جیسے خون کا حصہ بن جاتے ہیں۔

تجربے اور تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جسمانی نشوونما کے لیے کیلشیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیلشیم ہڈیوں و دانتوں کو مضبوط بناتا ہے اور خون کو صاف رکھنے معاون ثابت ہوتا ہے۔ کیلشیم ہمیں دودھ، پنیر، سبز ترکاری، سلجم، گوبھی دار میوے، انڈے کی زردی، خشک لوبیا، کاٹے چنے پھول گوبھی، کچی بند گوبھی، پالک، سلاد، سوئی، لیموں، نارنگی، انگور، خشک انجیر، چولائی، میتھی اور تلوں کے استعمال سے میسر آسکتا ہے۔

کیلشیم کے علاوہ سوڈیم فاسفورس، گندک اور میگنیشیم وغیرہ دوسری معدنیات بھی جسمانی نشوونما کے لیے بہت مفید ہیں۔ سوڈیم کی خاصیت ہاضمے کے فعل کو تیز کرنا ہے۔ سوڈیم کی بدولت جسم فولاد کو قبول کرتا ہے۔ جسم میں سوڈیم کی موجودگی ہمیں تزلزل اور بہرے پن سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ خشک پھلوں، دودھ، پنیر، انڈے، کھیرا، سیب، پالک، بند، گوبھی، گاجر، ترلوز، چقندر، ٹماٹر اور گوندنی کے سے چھوٹے چھوٹے پھلوں میں پایا جاتا ہے۔

دماغ و اعصاب کو تقویت پہنچانے اور ہڈیوں، دانتوں اور بالوں کی نشوونما میں مدد دینے کے ضمن میں فاسفورس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دماغی کام کرنے والے اشخاص کی خوراک میں مناسب مقدار میں فاسفورس کا موجود ہونا خاص طور پر ضروری ہے۔ جسم میں فاسفورس کی کمی کا نتیجہ دماغی تھکاوٹ، ضعف اعصاب اور کمزور ہڈیوں کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ ناریل، انڈے کی زردی، خشک دودھ، لوبیا، لینٹل (مٹروں کی قسم) مٹر، ثابت گیہوں، بادام، سیب، پالک اور مچھلی کے استعمال سے ہم فاسفورس حاصل کر سکتے ہیں۔

جسم کو قوت بخشنے میں گندک کو بھی نمایاں اہمیت حاصل ہے اس کی موجودگی جسم کے اندرونی حصوں کو گندے مادے سے پاک و صاف رکھتی ہے اور مختلف اعضائے جسمانی کے فعل کو

ٹھیک رکھتے ہیں معاون ثابت ہوتی ہے اس سے جگر کو دوسرے معدنی نمک ہضم کرنے میں مدد ملتی ہے خوراک میں مناسب مقدار میں گندک نہ ہونے کے سبب جسم میں کئی طرح کے فضلات جمع ہو جاتے ہیں۔ اور جگر اپنا فعل بخوبی جاری نہیں رکھ سکتا۔ گندک حاصل کرنے کے لیے پنیر، انڈے، مچھلی، گری دار میوے، خربوزہ، گوبھی، چاکلیٹ، غلا، خشک کھجور، خشک انجیر، پالک، دودھ پیاز اور آلو استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

نظام عصبی کے کنٹرول اور زایل شدا توت کی بحالی میں مینگنیشیم کی تاثیر قابل ذکر ہے۔ کیمیائی خاصیت کے لحاظ سے یہ خاب آور ہے اور یہ جسم کو تازا دم کرتا ہے۔ مینگنیشیم کی کمی کا نتیجا طبیعت کی بے چینی اور جسم میں تیزابی مادے کی زیادتی کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ گندم کے چھان گری دار میوے، ناریل ٹماٹر، سلاد، پالک، کھجور، انجیر، آلو چا، کشمش۔ لیموں، چقندر، سنگترا، سبز گوبی اور سیب میں مینگنیشیم موجود رہتا ہے۔

ہماری روزمرا کی خوراک میں پوٹاشیم کا شامل ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ کسی بھی درد اور قبض کو دور کرتا ہے مختلف اعضا کے ریشوں کو نرم رکھتا ہے۔ اور جگر کے فعل کو تیز کرتا ہے۔ پوٹاشیم کی کمی کا نتیجا، قبض، پھنسی، پھوڑوں اور جگر کی خرابی کی صورت میں رونما ہوتا ہے پوٹاشیم کی کمی عام طور پر پھنسی پھوڑوں کو جلدی ٹھیک نہیں ہونے دیتی۔ یہ زیتون، ٹماٹر، بینگن، گری دار میوے، بند گوبی، سنگترا، لیموآلو، ترش پھلوں، آلو چا، آڑو، مٹر، خوبانی، دودھ لوبیا، انناس اور کھیرے میں موجود ہوتا ہے۔

غدودوں کے فعل کو ٹھیک رکھنے کے لیے آیوڈین سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جسم کے مختلف اعضا کے فعل سے جو زہریلا مادا پیدا ہوتا ہے آیوڈین دماغ کو اس کے تاثرات سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کی موجودگی جسم کو سوزش کی بعض قسم کی بیماریوں سے محفوظ رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ آیوڈین کی کمی ہونے سے جسم میں زہریلا مادا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غدودوں کے فعل میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ آیوڈین حاصل کرنے کے لیے ٹماٹر، گاجر، گردے، لوبیا، سفید بند گوبی، مٹر، کیلا، سلاد، آلو اور لہسن استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

اوپر کے معدنیات کے علاوا کلورین گیس مختلف اعضا کے جوڑوں اور پٹھوں کے سروں کی نسوں کو لچکدار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ دانتوں کی بیماری پائیوریا اور موٹاپے کو روکتی ہے۔ بجا طور پر کلورین کو انسانی جسم کا دھوبی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ جسم سے گندے مادے کو خارج کر دیتی ہے۔ کلورین۔ دودھ پنیر، ٹماٹر، پالک، انڈے کی سفیدی، کیلا، کھجور، ثابت گیہوں، بند گوبی اور گوندنی کی قسم کے چھوٹے چھوٹے پھلوں میں موجود ہوتی ہے۔

فلورین ایک اور گیس ہے جو جسم کو پھوٹ اور ہڈی کی بیماریوں سے محفوظ رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اسے حوانی کا حافظ کہنا غلط نہ ہوگا غذا میں فلورین کی کمی کا نتیجا بینائی کی کمی۔ دانتوں کی کمزوری اور پھوٹ کی بیماریوں کا شکار ہو جانے کے خطرے کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ اناج کے ثابت دانوں، پنیر، چقندر، لہسن، بند گوبی، پالک، پھول گوبی، انڈے اور دودھ میں فلورین موجود ہوتی ہے۔

مینگنیز اعصاب کو مضبوط کرتا ہے جس سے زندگی پرسکون بنتی ہے مینگنیز کی کمی سے ہسٹریا کا مرض لاحق ہونے کا اندیشا رہتا ہے مینگنیز حاصل کرنے کے لیے بادام، انڈے کی زردی، سبز رائی، لیموں اور سنگترے کا استعمال کرنا چاہیے۔

آرٹ نمایش کے لیے تیاریاں۔ کوالالمپر کے مقام پر پاہنگ میں ایک آرٹ نمایش منعقد کرنے کے سلسلے میں تیاریاں جاری ہیں اسی کا انتظام ملائی فیڈریشن کی آرٹس کونسل کی ایک کمیٹی کر رہی ہے مجوزہ نمایش میں جنوب مشرقی ایشیا کے مختلف آرٹ اسکولوں کی نمایندہ تصاویر پیش کی جائیں گی۔ امید ہے کہ ایک جامع اور عام نمایش ہوگی جو پہلے کبھی بھی ملایا میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

جسمانی نظام کو دوبارا زندا کرنے کے تجربے

جانداروں کے جسمانی نظام کو دوبارا زندا کرنے کے لیے سوویت سائنسدانوں ایک عرصے سے تجربے کر رہے ہیں۔ پروفیسر بریوخونینکو اور اسٹالن انعام یافتہ پروفیسر شنکووسکی کی قیادت میں کام کرنے والے ماسکو کے سائنسدانوں کے ایک جتھے کی سائنسی تحقیقات کو بڑی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ علامتی موت کی حالت سے کسی عضو کو پھر سے زندا کرنے کے لیے جو طریقا نیکووسکی نے تجویز کیا ہے اس پر ہسپتالوں میں عمل بھی کیا جانے لگا ہے۔ اس سے بہت سے مریضوں کی جانیں بچ گئی ہیں۔ یوکرینی سائنسدانوں نے اس سلسلے میں دل چسپ نتیجے حاصل کیے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر یانکووسکی نے یوکرینی سائنسی اکیڈیمی کے ادارہ علم احیام کی تجربا گاہ میں اپنے کئی ساتھیوں کی موجودگی میں کتوں کو زندا کرنے کا پانسو چونواں (۵۵۴) واں تجربا کیا۔ اس تجربے میں حاص آلے استعمال کیے گئے تھے۔ ایک "مصنوعی دل" جو پروفیسر بریوخونیکو نے تیار کیا ہے اور جو اصلی دل کی طرح خون کو شریانوں کے اندر تقسیم کرتا ہے۔ اور ایک اور آلے کے اندر بھیجتا ہے جس کو "مصنوعی پھیپھڑوں" کا نام دیا گیا ہے اس میں جانداروں کی رگوں کے خون کو آکسیجن ملتی ہے۔

کتے کے حلق کی شہ رگ اور دل کے اندر لے جانے والے خون کی رگوں کو مصنوعی دل سے ملا دیا گیا۔ خون مصنوعی پھیپھڑوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔

چار منٹ بعد خون ضایع ہونے سے کتے نے آخری سانس لی اور ساکت ہو گیا۔ آلات میں علامتی موت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ دل اور پھیپھڑوں نے کام بند کر دیا۔ اور فیر شعوری عمل بھی رک گئے۔ علامتی موت کسی جسمانی نظام کی حقیقی موت کی پہلی منزل ہوتی ہے۔

جیسے ہی علامتی موت واقع ہوتی ہے ویسے ہی مصنوعی نظام سے رئیسا جسمانی نظام کو زندگی بخش قوت فراہم کرنا بند کر دیتے ہیں۔ صرف خلیے (CELLS) اور ان کے سلسلے میں انتاجیات بخش عمل جاری رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ضروری اقدامات نہ کیے جائیں تو وہ بھی بگڑ صا لبعد ایسے تبدیل ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں اصلی حالت میں لانا ممکن نہیں ہوتا۔ علامتی موت واقع ہو جانے کے دس منٹ کے بعد ہی پروفیسر یانکووسکی نے مصنوعی دل کو دوبارا حرکت میں لانے کا حکم دیا۔ پانچ منٹ بعد کتے نے سانس لینا شروع کر دیا۔ اس کے مرکزی اعصابی نظام میں بھی آہستا آہستا زندگی بھر نمودار ہونے لگی۔ دل نے خون پھر سے تقسیم کرنا شروع کر دیا

دس منٹ تک علامتی موت کی حالت میں رہنے کے بعد کتا پھر سے زندا ہو گیا۔ یہ کتا اب پہلے کی طرح کھلنڈرا ہے اور اس کو بھوک بھی اچھی لگتی ہے۔

سوویت سائنسدانوں کی راے میں یوکرینی سائنسی اکیڈیمی کے ادارہ علم احیام میں جسمانی نظام کو پھر سے زندا کرنے کے جو تجربے کیے جا رہے ہیں وہ زندگی کو طویل کرنے کا مطالعا کرنے والی سائنسس کے لیے ایک بیش قیمت دین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سمندر پار کے طلبا کے لیے تعطیلاتی کورس۔ برٹش کونسل نے برطانیا میں سمندر پار کے طلبا کے لیے تعطیلات میں مختلف قسم کے ۱۵ کورسوں کا انتظام کیا ہے جن میں ۶۵ ممالک کے ۵۰۰ طلبا شرکت کر رہے ہیں۔ ان طلبا میں سے تقریبا ۳۵۰ کامن ویلتھ طلبا پہلے ہی سے برطانیا میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بہت سے کورس ایک ہفتے تک جاری رہیں گے۔ کورسوں کا انتظام نہایت خوب صورت اور تاریخی مقامات پر کیا گیا ہے۔

انتخاب

شہباز پرویز

کیا غور سے دیکھ رہی ہے رشید نے ہنستے ہوئے کہا۔

سوچ رہی ہوں تو اس قدر موٹی کیسے ہو گئی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

موٹی کیسے ہو گئی یہ عجیب سوال ہے تیرا۔ خیر تیری شادی ہو جانے دے اس وقت معلوم ہو جائے گا۔

مگر مجھے زبیر پسند تو نہیں تھا۔ میں نے وثوق سے کہا۔

کون کہتا ہے زبیر مجھے پسند نہیں تھے۔ خدا میں نے اپنے لیے پسند کیا۔

مگر تو نے تو زبیر سے ٹھیک طریقے سے بات تک نہیں کی اور نہ بتایا کہ تو زبیر کو چاہتی ہے۔ زبیر کو میں چاہتی ہی نہیں ملکے پرستش کرتی تھی۔ اور جس کی پرستش کی جاتی ہے اس کا نام زبان پر بار بار لایا نہیں جاتا۔

آخر تو نے اس میں کیا چیز دیکھی یا تو تیرا یہ حال تھا کہ رفیق کے معمولی جملے پر بھڑک اٹھی تھی۔ شاہد کو یونین کا صدر بنانے کے لیے تو نے رات دن ایک کر دیے۔ جعفری کے اشعار تو مجھے ورد زبان تھے۔ حامد کے بیٹے ٹنٹن کٹس پر تو تو مری جاتی تھی۔ مگر یہ زبیر ..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

صاف کیوں نہیں کہتی کہ تو مجھ پر مر جاتی ہے۔ تو سمجھتی ہے کہ میں نے ہر ایک کو الو بنایا۔ تیرا خیال ہے کہ میں ہر ایک کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔ اور اپنا آخری وار زبیر پر کیا۔

تو برا مت مان۔ حقیقت بھی تو کچھ ایسی ہی ہے۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ بتا تو نے کتنی شامیں زبیر کے ساتھ گذاریں کیا تو نے کبھی زبیر کا انتظار کیا۔ زبیر کی کسی خواہش کو تو نے کبھی پورا کیا۔ تو تعریف کرتی تھی۔ شاہد کی تو معترف تھی۔ رفیق کو تو تسلیم کرتی تھی۔ جعفری کی شاعرانہ صلاحیت کو تو پسند کرتی تھی۔ حامد کے چوڑے چکلے سینے کو اور اگر تو نے کبھی کسی کا نام نہیں لیا تو، تو صرف زبیر کا۔ لیکن آج، آج زبیر کی بیوی بن کر تو دن بدن موٹی ہوتی جا رہی ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ گوشت کی تہہ در تہہ تیرے جسم پر رکھی جا رہی ہے۔ تیرے گال زیادہ سرخ اور تو زیادہ حسین معلوم ہو رہی ہے بتا تجھے اس شادی سے رنج ہوا یا خوشی ہوئی تو درحقیقت خوش ہے یا رنجیدہ۔ میں نے دریافت کیا۔ ..... اپنے آپ کو زبیر کے قدموں پر ڈال کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے زندگی کا سب سے اونچا زینہ طے کر لیا ہے۔ زبیر کو اپنے لیے پسند کر کے میں محسوس کرتی ہوں کہ میں نے اپنے شعور، تعلیم اور آزادی سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ رفیق جیسے مقرر، شاہد جیسے ذہین، جعفری جیسے شاعر اور حامد جیسے اسپورٹس مین کے مقابلے میں نے زبیر کے سر پر اپنی ازدواجیت کا سہرا باندھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے موروں النعام کو اس کے موزوں مقام پر بٹھایا ہے۔ اس کا احساس ہی میری رگوں میں تازہ خون دوڑا دیتا ہے۔ زبیر میرا اور صرف میرا ہے اور میں زبیر کی ہوں۔ وہ جوش میں بے جا رہی تھی۔

زبیر نے جب ہمارے کالج میں شروع داخلا لیا تو اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود وہ ہمارے لیے موضوع بحث بن گیا۔ اس کا ٹھیک دس بجے کالج آنا اور کالج میں کسی سے بات کیے بغیر بیٹھا رہنا اور ٹھیک وقت پر کالج سے نکل جانا یہ وہ حرکات تھیں جنہیں ہم اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے اور تم جانتی ہو کہ میں زمانے میں زبیر نے کالج میں داخلا لیا تھا میں ناسازی مزاج کے باعث کالج نہ آ سکی۔ لیکن حامد۔ شاہد اور رنجنا کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ ہمارے کلاس میں ایک لڑکا آتا ہے جو الو کی طرح آتا ہے بے وقوف کی طرح بیٹھتا ہے اور گدھے کی طرح سر جھکائے کلاس سے نکل جاتا ہے۔ حامد نے ایک مرتبہ کہا کہ وہ ایک آوارا شخص ہے اس کے شاغل بھی

کچ اور میں شاہد نے کہا۔ کہ وہ اس قابل نہیں کہ لڑکیاں اس سے بات کریں۔ اور میں نے عہد کر لیا کہ میں زبیر سے کبھی نہیں ملوں گی اس لیے کہ مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

ایک ماہ بعد جب کالج کھل چکے تو حامد نے دریافت کیا ——— وہ صاحب کہاں ہیں نہ جانے کیوں زبیر کو دیکھنے طبیعت چاہی تھی۔

ابھی آتا ہی ہوگا۔ وہ الو کا پٹھا۔ حامد نے اپنی گھڑی میری طرف کرتے ہوئے کہا۔ گیا۔ بجنے پانچ منٹ کم تھے اور کلاس گیارہ بجے شروع ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک پلاٹینا لڑکا آہستہ سے کلاس میں داخل ہوا۔ اس کا قد متوسط اور رنگ سانولا تھا۔ راشد کی طرح نہ اس کے بال گھنگھرو والے تھے اور نہ حامد کی طرح اس کے بالوں اور کپڑوں میں ترتیبی تھی۔ سیاہ شیروانی جس کی پوری گنڈیاں اور گلے کے کانٹے باقاعدہ لگے ہوئے سفید کرلین دامپا جاما اور پالش زدہ چمکدار جوتا پہنے وہ ۔۔۔۔۔۔ شان سے اپنی کونے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لکچر کے دوران میں اسے قاعدہ دیکھتی رہی۔ لکچر ختم ہونے کے بعد اس نے دو ایک باتیں لکچرار سے کیں۔ اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے حامد اور رفیق جعفری سب جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ شرافت کا یہ مجسمہ سنجیدگی کا یہ مظہر ایسے فحش کردار کا مالک نہیں بن سکتا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے میں بغیر مرئی طور پر زبیر کے قریب ہوتی گئی۔ میرے لاشعور میں زبیر کی یاد انگڑائیاں لینے لگی۔ دل ہی دل میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ میں زبیر کے قریب بیٹھوں اس سے باتیں کروں، اس کے ساتھ شام میں گذار دوں چاندنی رات میں۔۔۔۔۔ اس پر اپنے لانبے بال بکھیر دوں پارک میں اس کے ساتھ چہل قدمی کروں۔ لیکن میں کچھ نہ کر سکی میں جتنا اس کے قریب ہونا چاہتی تھی وہ مجھے اتنا ہی دور معلوم ہوتا۔ کسی خواہش کو دبانے میں اس کے قریب جاتی لیکن تم اسے میری کمزوری سمجھو یا اس کی متانت کا اثر۔ مجھے ناکام ہی لوٹنا پڑتا

شاہد نے جب انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو کینو نگ زبیر کے ذمے ٹھہری۔ شاہد کی انتظامی صلاحیت کی میں معترف تھی اور مذکر شاہد نے خشامدانہ لہجے میں مجھ سے امداد چاہی تھی۔ مجھے ایک ایک ووٹ حاصل کرنا تھا۔ شاہد کو یقین تھا کہ زبیر اسے ووٹ نہیں دے گا۔ میرا خیال ہے کہ زبیر کو نہ شاہد پسند کرتا تھا اور نہ زبیر شاہد کو۔ ایک دن نہ جانے کیسے شرارت سوجھی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ شاہد ہی نے کیا ہوگا۔ زبیر کی سیکل کے ٹیوب میں پنکچر کر دیا اور وہ شام کے وقت اپنی سیکل سنبھالے آہستہ آہستہ کالج کے احاطے سے نکل رہے تھے میں نے اپنی گاڑی ان کے قریب روک دی۔ انہوں نے مڑ کر مجھے دیکھا اور بازو ہٹا کر اپنا رستا لینے لگے۔

دیکھیے غالباً آپ کی گاڑی پنکچر ہو گئی ہے آپ موٹر میں بیٹھ جائیے میں آپ کو گھر چھوڑ دوں گی۔ میں نے موٹر سے اتر کر ان کے قریب جاتے ہوئے کہا۔

زبیر نے مجھے غور سے دیکھا۔ طنز ان کے ہونٹوں سے ان کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔

شکریہ! اس تکلیف کو رہنے دیجیے۔

"اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ میں حیرانی سے کہنے لگی۔ حالانکہ اپنے ملاقاتیوں کی اس اکثریت کو جانتی ہوں جو میرے ساتھ چلنے یا موٹر میں میرے بازو بیٹھنے کے لیے تنے پڑے بہانے تراش رہے تھے۔ کبھی سیکل پنکچر تو کبھی پیر میں درد وغیرہ۔

فرض کیجیے۔ آج یہ سیکل کھو جاتی تو مجھے پیدل ہی آنا پڑتا۔ کم سے کم کوئی دوسرا انتظام ہونے تک اس مدت تک کیا آپ روز مجھے موٹر دے سکتی ہیں۔ اور میرا مکان یوں بھی کوئی زیادہ دور نہیں۔ میں پیدل چلا جاؤں گا۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ آپ کا شکریہ۔ ان کے معذرت بھرے لہجے کو دیکھ کر میں کوشش کے باوجود نہ کہہ سکی کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو روز موٹر لے جا سکتے ہیں۔

دو چار دن بعد دوپہر کے وقفے میں وہ حوض کے پاس کھڑے ہوئے تھے میں خدا جانے کیوں ان کے قریب جا کر کہنے لگی کہ زبیر شاہد کو ووٹ نہیں دیں گے۔

اب ہر جگہ کانا پوسی شروع ہو گئی۔ نہ جانے اس خامش انسان میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ اور اس کے اثرات چپکے چپکے یوں کیسے پھیل گئے تھے کہ راشد کی کامیابی کے امکانات مجھے کم ہوتے معلوم ہو رہے تھے۔ بہرحال زبیر کو ہموار کرنا ضروری تھا۔

"دیکھیے امتحانات قریب آ رہے ہیں آپ اپنا ووٹ کسے دیں گے" میں نے دریافت کیا۔

"ارشاد کو۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ میرا تعلق شاہد کی پارٹی سے ہے۔

"میرا خیال ہے شاہد اس کے لیے زیادہ موزوں ہیں" میں نے کہا۔

"یہ آپ کا خیال ہے میرا نہیں۔ ممکن ہو شاہد صاحب میں انتظامی صلاحیتیں ہوں گی۔ لیکن وہ جذباتی طلبا کو قابو میں نہیں رکھ سکیں گے طلبا کے جذبات آسانی سے بھڑکائے جا سکتے ہیں لیکن بھڑکائے ہوئے جذبات کو سرد کرنا مشکل ہے اور یہ کام شاہد صاحب نہیں کر سکتے۔ اور وہ میرے سامنے سے چلا گیا۔"

زبیر کی صاف گوئی نے مجھے کافی متاثر کیا۔ شاہد کو جیت ہوئی لیکن چند ووٹوں سے اس کے بعد ہماری جو ہڑتال ناکام ہوئی اور جوش میں اندھے ہو کر طلبا نے جو حرکات کیں اور جذبات میں بھر کر طلبا کا جو نقصان ہوا اس کی ذمے داری میرے خیال میں شاہد ہی پر ہے۔ اس لیے کہ اس نے ان کی بروقت رہبری نہیں کی۔

ایک دن کالج آ رہی تھی کہ رستے میں زبیر پر میری نظر پڑی جو پیدل جا رہے تھے۔ خواہش تو ہوئی کہ موٹر روک دوں اور ساتھ لے چلوں لیکن یقین تھا کہ انکاری جواب ملے گا۔ اس لیے انجان ہو گئی۔ جب وہ کلاس میں داخل ہوئے تو حامد ان کی نقل کر رہا تھا۔ زبیر نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی اور ایسے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ شام کو کار میں لے واپس کر دی اور جب وہ کالج سے باہر نکل رہے تھے میں بھی ان کے ساتھ ہو گئی۔

"آپ آج پیدل جا رہے ہیں۔ موٹر کو کیا ہوا" انہوں نے دریافت کیا۔

"جی وہ کسی کام سے گئی ہے" میں نے جواب دیا۔

لیکن زبیر بہت سنجیدہ۔ ان سب سے بلند تھے۔ اس لیے زبیر کو میں نے پسند کیا۔ میں نے زبیر کی پرستش کی۔ وہ تیز تیز کہے جا رہی تھی کہ کسی کے آنے کی آواز

اور آج میری سیکل بھی کچ ہیار ہو گئی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور میں الفاظ پر غور کرنے لگی۔ سیکل بیار ہو گئی اور آپ ہی آپ ہنس پڑی۔ رستے بھر ہم مختلف موضوعات پر بحث کرتے رہے۔

میں حیرت سے غور کرتی رہی کہ اس خامش انسان میں کتنی تیزی اور کتنے جذبات ہیں لیکن کتنی سنجیدگی اور پاکیزگی تھی۔ ان خیالات میں اپنے مکان کے قریب پہنچ کر انہوں نے کہا۔

"کہاں تک پیدل چلیں گی آپ۔ رکشا میں چلے جائیے۔"

"مکان زیادہ دور بھی تو نہیں ہے" میں نے کہا۔

"لیکن اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو تھوڑی دیر تشریف رکھیے۔ پھر میں خود آپ کے مکان تک چھوڑ دوں گا۔"

زبیر نے میری خامش کی روح کو پا لیا تھا۔

ان کی طرح مکان بھی سادگی کا نمونہ تھا انہوں نے اسٹوو پر چائے تیار کی۔ کچھ میوہ اور کچھ بسکٹ وغیرہ سامنے رکھے ان کے پیش کرنے کا وہ پرخلوص انداز ان کی ہر ادا کہہ رہی تھی کہ یہ آپ کے لائق نہیں اور میرے جسم کا رواں رواں کہہ رہا تھا کہ کتنا بڑا احسان کیا آپ نے۔

اس کے بعد ہم ملنے لگے لیکن کبھی حدود سے متجاوز نہیں ہوئی۔ انہوں نے ہمیشہ میرا احترام کیا۔ میں چاہتی بھی یہی تھی۔ میں نے حامد میں۔ شاہد میں۔ جعفری میں اس فطرت کو ڈھونڈنے کی کوشش کی میری خواہش تھی کہ ہر مرد عورت کا احترام کرے۔ اس کی کمزور فطرت کمزور موقف اور کمزور جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھائے اسے اپنی خواہشات کا اپنے جذبات کا اور اپنے ناپاک ارادوں کا نشانہ نہ بنائے میں چاہتی تھی کہ مرد عورت کو کھلونا نہ سمجھے بلکہ اسے سماج کی ایک مقدس امانت سمجھ کر اس کا احترام کرے۔ میں نے ایک ایک کو پرکھا ایک ایک کو جانچا لیکن اس کسوٹی پر سوائے زبیر کے اور کوئی پورا نہ اترا ان میں بعض ایسے تھے جو وقت پڑنے پر تنہائیوں میں مجھے بہن کہتے تھے اور کام نکل جانے کے بعد میری تصویر سینے سے دبائے رکھتے تھے۔ فحش جذباتی اشعار لکھ کر میرے نام منسوب کرتے تھے بعض ایسے تھے جو زبان سے ماں بہن کہتے تھے لیکن ان کی آنکھیں ان کے حرکات ان کے ناپاک جذبات کو ظاہر کرتے تھے۔

ٹیلی فون کا موجد

یوسیس

(بجلی لیمپ، سینما، گراموفون اور ہزاروں ایسی دوسری دریافتوں میں امریکی سائنسدانوں نے کمال کر دکھایا اور اسی طرح امریکی سائنسدان مسٹر بیل نے ٹیلیفون کی ایجاد سے دنیا کی کایا پلٹ دی۔ ذیل میں اس غیر فانی سائنسدان کے کچھ حالات درج کیے جاتے ہیں جنہیں آشا ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔)

آج سے ۷۰ برس پہلے ایک ڈرامائی لمحے میں ٹیلی فون نے ثابت کیا کہ یہ واضح اور صاف طور پر بول سکتا ہے۔ اس وقت اس نے بولنے کی کچھ آوازیں پیدا کی تھیں۔ لیکن وہ ایک توتلے بچے کی جیسی تھیں۔ اور پوری طرح سمجھ میں آنے والے الفاظ سنائی نہیں دیتے تھے۔

ٹیلی فون پر جب سب سے پہلی بار صاف طور پر بات کی گئی تو اس وقت کوئی تقریب نہیں منائی گئی۔ ایک شام کو بوسٹن میساچیسیٹس (امریکا) میں دو نوجوان شخص بیٹھکر اسی بات کا دوبارا تجربہ کر رہے تھے جس کے متعلق وہ پہلے بار ہا کوشش کر چکے تھے۔ وہ یہ کہ بجلی کے تاروں کے ذریعے تمام قسم کی انسانی بول چال کی ترسیل ہو سکے۔

ان دونوں نوجوانوں کے نام کالنی کے ایک کتبے پر کندا ہیں۔ فاصلے اور وقت پر ان کی اس فتح کی ایک سادا سی یادگار ہے اس کتبے کی عبارت میں درج ہے کہ:۔

"اس جگہ الگزینڈر گراہم بیل نے ۱۰ مارچ ۱۸۷۶ء کو تھامس آگسٹس واٹسن کو ٹیلی فون پر پہلا صاف اور سمجھ میں آنے والا پیغام دیا۔"

مسٹر بیل جسے کہ دنیا جانتی ہے ٹیلی فون کا موجد تھا۔ جب اس کی ایجاد ٹیلی فون پر پہلی بار بات کی گئی تو اس کی عمر اس وقت ۲۹ برس اور ایک ہفتے کی تھی۔ دنیا میں سب سے پہلی بار ٹیلی فون جہاں لگایا گیا وہ مسٹر بیل کے بورڈنگ ہاؤس کے کمرے تھے ایک تو اس کے سونے کا کمرا تھا اور دوسرے کمرے میں اس نے لیبارٹری قایم کی تھی۔

پیدایش

اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہونے والے اس امریکی سائنسدان کی ۱۰۶ ویں سالگرہ ۳ مارچ کو تھی جس نے اپنی ایجاد سے دنیا کی کایا پلٹ دی۔

اس کی عالا ذہانت کی وجہ سے اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ نیویارک میں ٹیلی فون اٹھا کر چند منٹوں میں آپ دنیا کے تقریباً کسی بھی مقام پر کسی سے بات کر سکتے ہیں۔

امریکا میں اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ٹیلی فون روز روز کی زندگی کا ایک جزو بن گیا ہے۔

مسٹر بیل کی اس ایجاد کے چند برس بعد ہی بوسٹن کے لوگ ۲۵۰ میل کے فاصلے پر واقع نیویارک شہر اور پھر ۹۰۰ میل کی دوری پر شکاگو کے لوگوں سے ٹیلی فون پر بات چیت کرنے لگے ۱۹۱۵ء تک شمالی امریکا براعظم میں تین ہزار میل تک سان فرانسسکو کیلی فورنیا اور شانت ساگر کے ساحل تک پھیل گیا۔ آج سے تقریباً ۲۲ برس پہلے ٹیلی فون پر سمندر پار پہلی بار جو بات چیت کی گئی وہ نیویارک اور انگلستان کے شہر رگبی کے درمیان ہوئی تھی۔

آج امریکا میں ساڑھے چار کروڑ ٹیلی فون ہیں۔ یعنی اوسطاً ہر چار

آدمیوں کے لیے ایک سے زیادہ ٹیلی فون ہیں۔

۲۴ گھنٹوں کے عرصے میں تقریباً ۱۰ کروڑ بار ٹیلیفون کیا جاتا ہے

ٹیلی فون کا موجد مشہور ماہر صوتیات الگزینڈر میلوے بل کا بیٹا تھا اور ایڈنبرگ میں پیدا ہوا تھا۔ اور ایڈنبرگ کی یونیورسٹی اور یونیورسٹی کالج لندن میں اس نے تعلیم پائی تھی جلد ہی وہ اپنے باپ کے ساتھ لندن میں فن تقریر اور نطقی فزیالوجی سکھانے کا کام کرنے لگا۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ بہرے لوگوں اشاروں سے بولنا سکھانے کے طریق کار کے تجربے کیے۔

۱۸۷۱ء میں پبلک اسکول بورڈ کی دعوت پر مسٹر بل بوسٹن آئے تاکہ وہاں استادوں کو بہرے لوگوں کو پڑھانے کے سلسلے طریق کار کے متعلق تربیت دیں۔ چونکہ امریکا بھر میں معذور اور بہرے لوگوں کو پڑھانے کے اسکولوں سے ان کی خدمات حاصل کرنے کی مانگ بڑھ گئی۔ اس لیے انہوں نے ٹیچروں کو تربیت دینی شروع کر دی

۱۸۷۵ء میں بیل کے دماغ میں خیال آیا کہ آواز یا بات چیت کو بجلی کے ذریعے ترسیل ہونی چاہیے۔ ۱۸۷۵ء میں جب وہ مختلف قسم کے ہارمونک ٹیلی گراف پر تجربے کر رہا تھا۔

آواز کی ترسیل اور اسے دوبارہ ادھر لانے کا اصول اس کے ذہن میں آگیا۔ اس کے دوسرے برس اس کے تجربا تی آلوں میں اس کے اسسٹنٹ نے غلط طور پر یہ جملا سنا "مسٹر واٹسن یہاں آؤ — تمہاری ضرورت ہے!"

مسٹر بل کی اس تاریخی ایجاد کا پہلا تجربا۔ ۱۰ مئی ۱۸۷۶ء کو بوسٹن میں امریکا کی اکاڈیمی آف آرٹس اینڈ سائنسز کے سامنے کیا گیا۔ اور زبردست نمایاں تجربا فلی ڈیفیا کی ۱۰۰ ویں نمائش کے موقع پر اسی برس کیا گیا۔ اور اس طرح ساری دنیا سے متعارف کرایا گیا۔

جولائی ۱۸۷۷ء میں بیل ٹیلی فون کمپنی کی تنظیم کی گئی اور اس کے بعد طویل عرصے تک پیٹنٹ کرانے کے حقوق کے متعلق مقدمے چلتا رہا جس میں امریکا کی سپریم کورٹ نے حسب ذیل کے دعوے کو مکمل طور پر تسلیم کیا۔

ٹیلی فون کے علاوہ مسٹر بل نے فوٹو فون جس سے فلکی شعاعوں کے ذریعے تقریر ہیں ترسیل ہوتی ہیں۔

آڈیو میٹر بہرے لوگوں کے لیے ایک آلا۔ انڈکشن بیلنس جس سے انسانی جسم میں دھات کی چیزوں کا پتا لگایا جاتا ہے۔ اور فونوگراف کے لیے چوڑے اور سلنڈر والے موم ریکارڈر ایجاد کیے۔

مسٹر بل کے بہرے پن کے اسباب اور نوعیت اس کے وراثتی اثر کے متعلق بھی وسیع مطالعا کیا۔

مسٹر بل غیر معمولی طور پر طویل عرصے تک زندہ رہے اور ۲ اگست ۱۹۲۲ء تک امریکی سائنس اور ایجادات کی دنیا میں ایک برد شخصیت رہے۔

ایک نئے فنی کالج کی تعمیر

اس ماہ کوالالمپور میں ۲۴،۰۰۰،۰۰۰ ملائی ڈالر کی لاگت سے ایک ہوسٹل جس میں ۵۰۰ طلبا کی رہائش کا انتظام ہو گا کھولا جائے گا۔ اس ہوسٹل کی تعمیر کا کام جنوری ۱۹۵۳ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اور اس سال ماہ جون میں یہ کام مکمل ہو گیا تھا یہ ہوسٹل جو برطانیا کے نوآبادیاتی تعمیر و ترقی کے فنڈ کی مدد سے تعمیر کیا گیا ہے جلد ہی ملایا کے اس پراجکٹ کا ایک حصا ہے جس کے تحت ملایا میں ایک ٹیکنیکل کالج قایم کیا جائے گا۔ کالج کی تعمیر کا کام جلد شروع ہونے والا ہے امید ہے کہ سارا پراجکٹ ۱۹۵۶ء کے اختتام تک پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اور اس پر پچاس لاکھ ملائی ڈالر کی لاگت صرف ہوگی۔

بچوں کا جمہوریا ——— یوسیس

نیویارک ریاست کے ایک خوب صورت پہاڑی علاقے میں تالاب پالنوا یکڈ پر مشتمل ایک دل چسپ اور ہری بھری بستی ہے۔ یہاں بچوں کی اپنی جمہوریا ہے جسے "جارج جونیر ری پبلک" کہا جاتا ہے۔ اس کے شہری کوئی ۲۵ لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ جن کی عمریں ۱۲ سے لے کر ۱۶ برس تک کی ہیں۔ اس جمہوریا کی بنیاد ۱۹۰۹ء میں ایک شخص ولیم آر جارج نے رکھی تھی جو زیوروں اور جواہرات کے ڈبے تیار کیا کرتا تھا۔

اسے پیار سے "ڈیڈی" یعنی "پاپو" کہا جاتا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا انتقال ہوا۔ جارج نے اس جگہ کو شروع شروع میں صرف موسم گرما کے دنوں میں بچوں کو شہروں کی گلیوں اور گرد و غبار سے بچانے کے لیے تفریح گاہ کے طور پر وقف کر رکھا تھا جب پہلے پہلے لڑکے اور لڑکیاں یہاں آتی تھیں تو وہ خیموں میں رہتی تھیں اور انہیں پہننے کے کپڑے اس علاقے کے کسانوں کی طرف سے دیے جاتے تھے۔

ایک دن دو لڑکوں میں ایک سوٹ پر جھگڑا ہو گیا۔ "پاپو" جارج نے جھگڑا بند کرا دیا۔ اور سوٹ اوپر اٹھا کر کہا "کہ یہ سوٹ حاصل کرنے کے لیے تم دونوں میں سے کون سا لڑکا کام کرے گا۔ لمحا بھر دونوں چپ رہے اور اس انوکھے مسئلے پر غور کرتے رہے آخر ایک لڑکے نے کہا کہ "پاپو میں کام کروں گا" اس پر جارج نے اسے کیمپ کے اردگرد صفائی کرنے اور دوسرے چھٹکل کام کرنے کو کہا جب لڑکے نے کام پورا کر لیا تو وہ سوٹ حاصل کرنے کا مستحق رہے گا۔ چنانچہ جارج نے سوٹ اسے دے دیا۔ اور اس دن سے جمہوریت کا یہ بنیادی اصول قایم کر دیا۔ "محنت کے بغیر کچھ نہیں ملے گا"

آج ۴۰ برس کے بعد بھی جارج "جونیر ری پبلک" میں اسی اصول پر عمل ہوتا ہے نوجوان لڑکوں لڑکیوں کے لیے سورا جیا کا ایک نظام قایم کیا گیا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں سال بھر الگ الگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔

وہ اس کمیونٹی میں کام کرتے ہیں۔ اجرتیں حاصل کرتے ہیں۔ اور انکم ٹیکس دیتے ہیں یہ شہری لوگ انتخابات کرتے اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دینے کے لیے عدالتیں لگاتے ہیں۔ اور عملی کام کے ذریعے تعلیم اور تربیت پانے کے پروگرام کے تحت یہ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ذمے دار پختہ کار شہری بنتے ہیں۔

"جارج جونیر ری پبلک" میں تین طرح کے لڑکے لڑکیاں پائے جاتے ہیں پہلے وہ جو اپنی مرضی سے آتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہیں ماں باپ بھیجتے ہیں۔ تیسرے وہ جنہیں کسی سوشل کام کرنے والی ایجنسی نے بھیجا ہو۔ کسی بچے کو یہاں آنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا۔ اس ری پبلک میں بچوں کو صرف ان کی رضامندی سے داخل کیا جاتا ہے۔

اس جمہوریا کے عہدے دار اسے ایک ایسی جگہ سمجھتے ہیں کہ جہاں اپنے مسایل حل کرنے اور اپنے آپ کو ایسی دنیا کے موافق بنانے کے لیے آتے ہیں۔ جس سے وہ بہت حیران نظر آتے ہیں وہ افسر "بگڑے اخلاق" کا لفظ پسند نہیں کرتے۔ ہارورڈ کے مشہور سائیکیاٹرسٹ ڈاکٹر الیگزینڈر اس جمہوریا کے صدر ہیں وہ کہتے ہیں کہ:—

"بگڑے ہوئے اخلاق کا کوئی بھی بچا نہیں۔ ہاں اگر آپ تمام لڑکوں کو ایک نہ ایک صورت میں بگڑا ہوا کہیں تو بات دوسری ہے اور جہاں تک مشکل میں ڈالنے والے بچوں یعنی ناقابل اصلاح بچوں کا تعلق ہے میں پوچھتا ہوں کہ ناقابل اصلاح بچا کیا ہوتا ہے کیا آپ کا یعنی ہر شخص کا بچا ایسا ہی نہیں ہوتا! تو پھر دوسروں کے بچوں کو آپ بگڑتے ہوئے اخلاق کے بچوں کا برا نام کیوں دیتے ہیں؟"

اس جمہوریا میں ایک بچے پر ۳ ہزار ڈالر سالانہ خرچ ہوتا ہے

جس کا تعلیم احصا والدین یا وہ ایجنسی ادا کرتی ہے جو بچے کو یہاں بھیجے۔ باقی رقم اسی جمہوریا کی طرف سے دی جاتی ہے یہ منافع نہ کمانے والا ایک ادارا ہے جس کے چندا دینے والے چار ہزار ممبر ہیں۔

اس جمہوریا میں بچے مختلف قسم کی طبیعتیں لے کر آتے ہیں۔ مثلاً نیویارک سے ایک لڑکا لیو آیا تو اس نے کہا کہ میں نے اس جمہوریا کا حال پڑا تو مجھے اس سے ایک دلچسپی سی پیدا ہوگئی۔ جس طریقے سے میں وہاں رہتا تھا وہ مجھے پسند نہیں تھا۔ اس لیے میں نے یہاں آنے کا ارادا کیا۔" اور یہاں آکر لیو کا بہت اچھی طرح کام کرنے لگا۔ اور جمہوریا کا اٹارنی جنرل اور فٹ بال کا کھلاڑی اور سٹار بن گیا۔

ایک اور لڑکا جان ایک عدالت کی طرف سے یہاں بھیجا گیا اس پر چوری کا الزام تھا لیکن اس جمہوریا میں آنے کے بعد اس کی تربیت کچھ اس طریقے پر ہوئی کہ اس جمہوریا کے شہریوں نے آخرکار اس کو اپنا وزیر خزانا مقرر کر دیا۔

جب کوئی بچا یہاں داخل ہوتا ہے تو یہ آشا کی جاتی ہے کہ ۲۱ برس کی عمر تک وہ یہاں رہے گا۔

یہاں صوبہ ماساچوسٹ کے کمشنر اور لڑکے لڑکیاں سارے شہریوں کی صحت اور تندرستی کا خیال رکھتے ہیں۔

ان شہریوں کو اسکول میں لازمی طور پر حاضر ہونا پڑتا ہے اور اس جمہوریا کے متعلقا کام کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں کے شہریوں کو اپنی کرنسی میں روپیا ملتا ہے۔ اسے امریکی کرنسی کے ساتھ تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان شہریوں کا ایک اپنا بینک ہے جہاں ان کا روپیا جمع رہتا ہے اور ضرورت کے وقت قرض پر بھی دیا جاتا ہے۔

جارج جونیئر ری پبلک کے پاس اپنی ۲۶ عمارتیں اور دوکانیں گرجا گھر گورنمنٹ ہاؤس اور دوسرے مکانات ہیں۔ اب ۳۵۰ لڑکے لڑکیوں کی تعلیم اور سکونت کا انتظام کیا جا رہا ہے اس قسم کے جمہوری ادارے بنانے کی دوسری جگہ بھی پیروی ہو رہی ہے چنانچہ اسرائیل، چین، برازیل چلی۔ جرمنی اور امریکا کی دوسری ریاستوں کی طرف سے اس کی تفصیلات مانگی جا رہی ہیں۔

باغ گوشا نشینی میں ایک شام

شاید پورے ماسکو میں باغ گوشا نشینی سے زیادا آرام دہ اور خنکوار مقام کوئی اور نہ ہو۔ یہاں کی ہر شے میں تر و تازگی اور سکون ہے۔ یہاں پہنچ کر شکل ہی سے یقین ہوتا ہے کہ ہم ایک بڑے شہر کے بیچوں بیچ بیٹھے ہیں۔

روشوں کے کنارے لگے ہوئے طویل قامت درختوں کی پھننگیں آپس میں مل کر محرابیں بناتی ہیں۔ درختوں کے سایے میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے کیفے اور ریسٹوران ہیں۔ چھوٹی چھوٹی برساتیاں ہیں۔ بید کی بنیریں اور کرسیاں پڑی ہیں۔ آرام دہ بنچیں بچھی ہیں۔ گہری خاموشی صرف نغمے کے ترنم اور آوازوں کی دبی۔ دبی سرسراہٹ سے ٹوٹتی ہے یا پھر کوئی قہقہا یا کبھی کبھی موسیقی کے ہال سے تالیوں کا اچانک شور سحر خاموشی کو ایک لمحے کے لیے توڑ دیتا ہے۔

باغ گوشا نشینی صرف شام کو کھلتا ہے اس میں کوئی تفریحی پنڈال کوئی رقص گاہ کھیلوں کا کوئی میدان نہیں ہے۔ یہاں لوگ فضائی ڈراما دیکھنے موسیقی گانے سننے بینڈ باجے کی دھنیں سننے کھلے کیفے میں کھانا کھانے یا ٹہلنے دوستوں کے ساتھ درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے آتے ہیں گرمیوں کو باغ میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ مرد ہلکے سوٹ پہنے ہوتے ہیں اور عورتیں خوش رنگ چھینٹوں کی فراکیں۔

ماسکو غنائی ڈراما تھیٹر باغ گوشا نشینی کے گرمائی تھیٹر میں پروگرام پیش کرتا ہے ماسکو کے تمام شائیقوں میں اس کے پروگرام بڑے مقبول ہیں اور اکثر شام کو سویرے ہی سے "ہاؤس فل" کا بورڈ لگ جایا کرتا ہے یہی کیفیت موسیقی کے ہال کی ہے۔ جہاں ماسکو فلہارمونک آرکسٹرا اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے فن کاروں کے پروگرام ہوتے ہیں۔

تبصرے

فطری علاج

سائز ۱۹×۱۲ کراؤن حجم ۲۲ صفحے۔ کھائی چھپائی بہتر۔ کاغذ نہایت ہی ناقص دی قسم کا نیوز پرنٹ (جو ایک کتاب کے لیے کسی صورت موزوں نہیں۔) بغیر جلد مگر رنگین مگر دلپوش کے ساتھ (مگر دلپوش کا ڈیزائن مناسب ہے لیکن چھپائی صفر) قیمت دو روپے آٹھ آنے سکہ ہند (جو بہت زیادہ ہے محض تصویروں کی خاطر زیادہ سے زیادہ قیمت عبہم ہونی چاہیے تھی۔ ورنہ صرف معمولی کاغذ پر چھپنے کا پتا عزیز باغ۔ سلطان پورہ۔ حیدرآباد دکن۔

مولف کتاب نے "ابتدائی باتیں" میں بیان کر دیا ہے کہ "اس مختصر سی کتاب میں فطری علاج کی وضاحت کی گئی ہے اور اس کے ابتدائی اصولوں کو علمی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے" چنانچہ چھ باب ۱۔ فطری علاج کیا ہے۔ ۲۔ چند اصطلاحات ان کی تعریف اور توضیحات۔ ۳۔ طبی علاج اور فطری علاج۔ ۴۔ قوانین شفا۔ ۵۔ شفا کے فطری طریقے ـــــ میں فطری علاج کے ان زرین اصولوں کا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے۔ بہ قول مولف "فطری علاج ایک نہایت ہی سیدھا اور دلچسپ علم ہے۔ حالیا زمانے میں اس نے کافی ترقی کی ہے۔ مغربی زبانوں میں اس علم پر بلکے اس کے ایک ایک شعبے پر کئی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں" ان ابواب کے علاوہ ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ "درد کی کہانی درد کی زبانی" بھی موجود ہے۔ کتاب میں فطری علاج کے کئی ایک یورپین ماہروں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

ہمیں مولف کتاب کے اس نظریے سے قطعاً اتفاق نہیں کہ "اس علم کی ترقی سے انسانیت کی ارتقاء کے وسیع امکانات پیدا ہو رہے ہیں" اس لیے کہ سائنس کی لامحدود ترقی نے دنیا کی بڑی قوموں میں ایک مسلسل رسا کشی کی سی صورت پیدا کر دی ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ ایٹم بم کی جگہ ہائیڈروجن بم نے لی۔ نہ معلوم کل اس کی جگہ وہ کونسا خطرناک ہتھیار لے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہائیڈروجن بم کی ایجاد نے قیامت (دنیا کے ایک بڑے حصے کی تباہی اور بربادی) کو زمانے سے قریب تر کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ ایک بڑا ہائیڈروجن بم چار سو مربع میل رقبے کی ہر ایک چیز کو خاکستر اور نیست و نابود کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی ہلاک اور فنا کر دینے والے ہتھیاروں کی جنگ کے بادل فضائے سیاست پر برابر منڈلا رہے ہیں جن کا جلد یا دیر سے برسنا ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس لحاظ سے اس وحشت اور جنگ و جدل کے امکانی دور میں "انسانیت کی ارتقا کے امکانات کا تصور قابل مولف کے محض حسن ظن اور سند پسند کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

"موجودہ تہذیب کا یہ المیہ ہے کہ انسان فطرت سے دور ہوتا جا رہا ہے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری بہت ساری امراض کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم غیر فطری زندگی بسر کر رہے ہیں" غیر فطری زندگی بسر کرنے کا الزام موجودہ تہذیب ہی پر کیوں؟ اس سے پہلے کس دور اور کس زمانے کی تہذیب اس بدعت سے پاک رہی ہے۔ تاریخ کے صفحے گواہ ہیں کہ وحشی تہذیب سامی اور کیانی تہذیب، قدیم آریائی، مصری، یونانی چینی اور رومن تہذیب، مختصر یہ کہ پرانے اور ہر دور کی تہذیب اس "غیر فطری حربے کے وار سے نہ بچ سکی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ غیر فطری زندگی" ہر دور کی تہذیب کا لازمہ رہی ہے جس سے مفر تقریباً ناممکنات سے ہے۔ اس لیے "موجودہ دور کی تہذیب" پر یہ الزام یکلخت شجاعانہ نہیں دیتا۔ مختصر یہ کہ فطری علاج کے مفید یا غیر مفید ہونے کے جھگڑوں میں پڑے بغیر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں "فطری علاج" اور اس کے عملی پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ مولف کتاب نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اس لحاظ سے ہم فطری علاج کے شیدائیوں سے خصوصاً اور عوام سے عموماً اس بات کی پرزور سفارش کریں گے کہ اس کتاب کا ایک بار ضرور مطالعہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی مایوس علاج مریض کو "فطری علاج" کے طریقے سے فائدہ پہنچ جائے۔ جس کے نتیجے کے طور پر اس کے لکھنے والے حسن الدین احمد "مبارک باد" کے مستحق قرار پائیں۔ کاش کہ اس تحفے کو سب سے پہلے پیش کرنے کا موقع ہمیں ہی ملتا مگر افسوس کہ مسلسل ڈیڑھ مہینے تک فعالی عمل کے بعد بھی کوئی فائیدہ نہ ہوا۔"

HYDERABAD (DECC
3 - OCT 1953

ہندستانی ادب

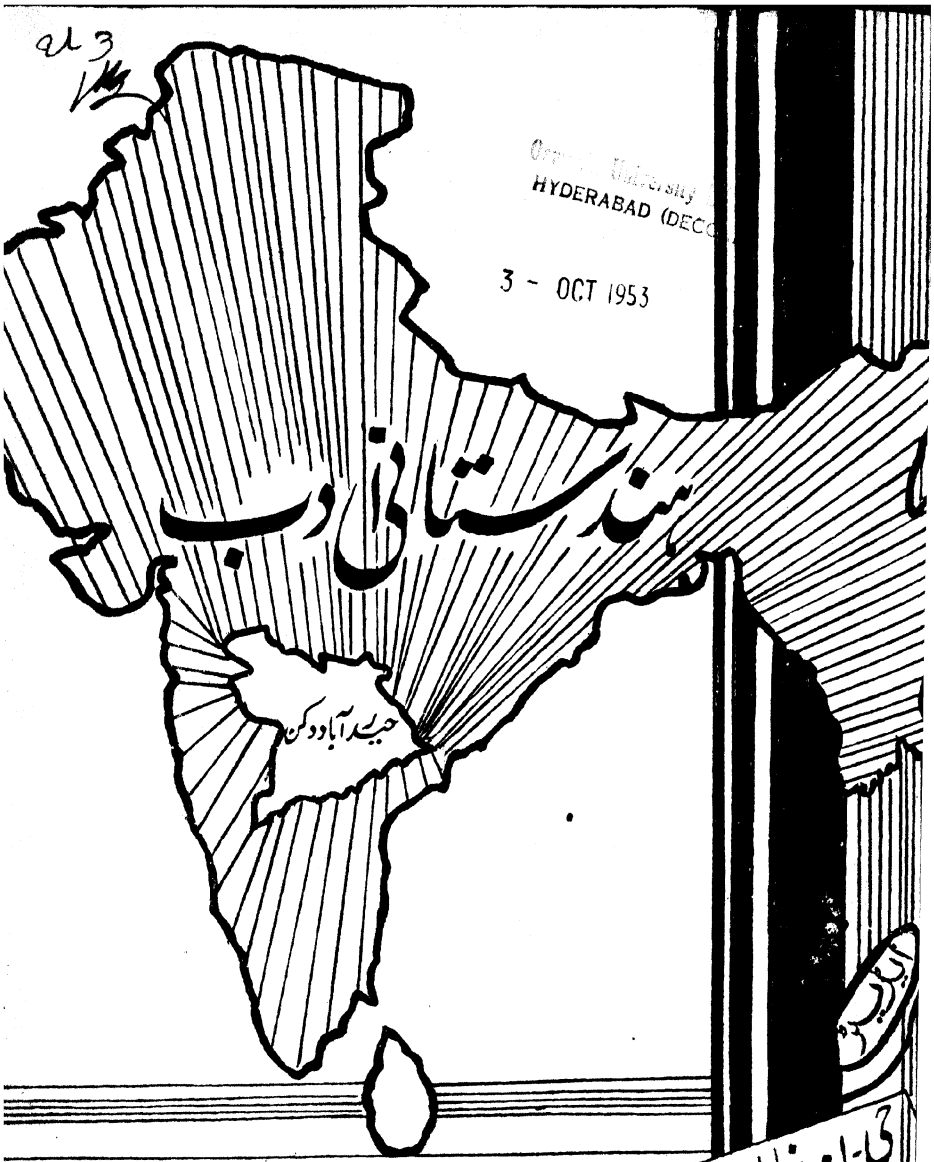

جی۔ ام۔ خان ایم اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے۔اعظم پورہ شرقی۔پی۔او۔جوبلی۔حیدرآباد دکن ۲

حکومت، پنجاب، میسور، اور بھوپال کا منظور

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کیلیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

ج۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

چند سالانا چھ روپے قیمت ایک چار آنے

جلد ۱۳ نمبر ۱۲

آبان ۱۳۶۲ف ستمبر ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
حقایق و معارف	افقر موہانی	۵	
آہنگ جرس	پروفیسر جمیل نظری	۶	
ابھی	صفی احمد (بہاری)	۷	
اور ہند سے اردو کی فریاد	رمز کسمری	۸	
حجاج بن یوسف	ڈاکٹر میر سیادت علی خان	۹	
امریکا میں تعلیم کی رفتار	آر۔جے میک گرانتھ امریکا کے سابق تعلیمی کمشنر	۱۴	
کچی سبزیاں کھانے کے فایدے		۱-۱	۲۱
برطانیا میں کامن ویلتھ کے طلبا کیلیے تعلیمی سہولتیں		ب-۱	۲۲
غزل		اطہر شیر صبا	۲۳
حیات انسانی اور اس کی مدت		قمرالدین قمر	۲۴
ایک کہانی		عصمت آرا عصمت	۲۶
دنیا کی چھت		تماس	۲۸
دیوناگری اور تعلیم		مدن گوپال	۳۰

ہمارے خیالات

حجاج بن یوسف

آذر ۱۳۶۱ف۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ہم نے "حجاج بن یوسف" کی پہلی قسط پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ قول مقالا نگار "دنیا نے حجاج بن یوسف کو ایک ظالم حکمران کی حیثیت سے جانچا ہے۔ مگر وہ اصل میں ظالم نہیں تھا" ساتھ ہی ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ "یہ ایک اچھوتا اور بلکل ہی نیا نظریہ ہے اس لئے کہ حقیقت کا صحیح انداز آپ کو اس وقت ہوگا جیسے جیسے آپ اس اہم تاریخی مقالے کی قسطیں پڑھتے جائیں گے۔"

اس مقالے کی سولہ قسطیں تو آپ پڑھ چکے، آج سترھویں اور آخری قسط آپ کی سیوا میں پیش ہے۔ اس پورے مقالے کے پڑھنے کے بعد یقیناً آپ کو مقالا نگار کے اس دعوے کی تصدیق ہوگئی ہوگی جو انہوں نے اپنے پیش لفظ میں کیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ مقالا نگار تو ہر حالت میں اپنے ہیرو کی تعریف و توصیف اور تائید ہی کرے گا۔ اس لیے اس عام نظریے سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ مثال اس مقالے پر بھی پوری اتر سکتی ہے لیکن اس مقالے کی مدتک حقیقت کچھ اور ہی ہے ——

اس مقالے کے لکھنے والے ڈاکٹر میر ریاست علی خان کے شخصی کردار اور عادات و اطوار سے ہم اچھی طرح سے واقف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کا ظاہر باطن ایک ہے۔ وہ جو بولتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں اور جو ان کے من میں ہے وہی قلم کے ذریعے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کا ثبوت "حجاج بن یوسف" کی کردار نگاری سے ملے گا۔ جن لوگوں نے اس پورے مقالے کو پڑھا ہے انہیں اس کا پورا پورا اندازا ہوگا کہ مقالا نگار نے جگہ جگہ حجاج کی بدعنوانیوں، بداعمالیوں، بے اعتدالیوں اور ظلم و زیادتیوں کو بھی بڑی ہی سادگی سے بے نقاب کیا ہے۔

بعض اوقات "ہیرو و حد شب" کے جذبے نے قابلِ غیر شعوری طور پر پہلو بچا کر نکل جانے پر انہیں مجبور کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حقیقت نگاری کے آگے ان کا قلم لڑکھڑاتا نظر آتا ہے اور اپنی فطری سادگی اور بے ساختہ پن کے ساتھ آخر حقیقت کا اعتراف کر ہی لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مقالا نگار نے حجاج کی واقعی غلطیوں اور زیادتیوں پر کبھی بھی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے کھلے شبدوں میں اس کی مذمت کی ہے۔ ان جزئیات کو چھوڑ کر مقالا نگار نے اپنا پورا زور قلم وہاں صرف کیا ہے۔ جہاں حجاج، بلاوجہ بھی مورخوں کے زہریلے تیروں کا نشانا بنا نظر آتا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس تحقیقی مقالے کا اصل مقصد یہی ہے۔

بہر حال مقالا نگار نے اپنی تحقیقی معلومات کو آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے کھرے یا کھوٹ، اچھے یا برے اور صحیح یا غلط ہونے پر نکتہ چینی کرنے کا حق آپ کو حاصل ہے۔ ہم جہاں تک سمجھتے ہیں اس مقالے کے متن یا مواد میں کافی وزن ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا، اس مقالے میں محض "ہیرو ورشپ" پیش نظر نہیں رہی ہے۔ بلکہ مقالا نگار کے قلم نے ہر وقت حق و صداقت پر چلنے کی کوشش کی ہے جہاں مقالا نگار نے، دوسرے مورخوں کے، اپنے ہیرو پر لگائے ہوئے غلط الزامات کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے ہیں، وہاں انہوں نے حجاج کی بعض بے جا زیادتیوں اور نارواانتختیوں کا بھی پردہ چاک کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے اس مقالے کو ایک طرفدار رکھنے والا نہیں کہا جا سکتا، اور نہ ہم اس کو متوازن ہی کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس کا ایک پلڑا بھاری نظر آتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر مقالا نگار کا دعوا اور اس کی تحقیق بے معنی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس حیثیت سے مقالا نگار اپنی کوششوں میں پورے پورے کامیاب نظر آتے ہیں۔

جس کی بنا پر آج ہم انہیں "مبارک باد" کے مستحق قرار دیتے ہیں۔

عام بے حسی

اس اہم تاریخی مقالے کی ہم نے ستر اقسطیں پیش کیں۔ اس اعتبار سے یہ مقالا ستر اچھینے میں ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ پورے ۴ چھینے میں اختتام کو پہنچا ہے۔ جس کا اصل سبب رسالے کے اشاعت میں دیری ہے یعنی دو سال کے عرصے میں دو دو چھینے کے سات ملے جلے نمبر نکلے ہیں۔ یہ دیری اس لعنت کا نتیجا ہے جو ہمارے علمی ادبی رسالوں کے حق میں "رحمت" بن کر برسا کرتی ہے اس بارے میں ہم اس سے زیادا اور کیا کہیں کہ یہ سب کچھ رسالے کی مالی پریشانیوں کا سبب ہے۔ مالی پریشانیاں خریداروں کی کمی کا نتیجا ہیں۔ اور سب سے بڑکر خریداروں کی کمی نام نہاد تعلیم یافتا ڈھولچیوں کی بدمذاقی اور کور ذوقی کا نتیجا ہے۔ اگر یہ طبقا حقیقی معنی میں تعلیم یافتا ہوتا اور اس طبقے کا ۵۰ فی صد بھی اپنے صحی علمی ادبی مذاق کا ثبوت دیتے ہوئے علمی ادبی رسالوں کی طرف توجہ کرتا تو ان علمی ادبی خدمت گذاروں کو پت جھڑ کی طرح برے دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے سوائے چند پرانے رسالوں کے جنہیں خاص سرپرستیاں حاصل ہیں اور جن کے اداروں کا مالیا استحکم ہے باقی سب سالوں کو "جنت نشان" بنتا پڑتا ہے۔ نئے رسالے تو سال چھ چھینے میں اپنا سفر ختم کرکے عدم آباد کے باسی بن جاتے ہیں۔ بھلا ان ناگوار حالات میں کون کافی علمی ادبی سوجھ کے خیال سے قدم اٹھانے کی جرات کرے گا۔ ان عقل کے اندھوں اور نام نہاد تعلیم یافتا لوگوں سے اس نوبت پر بھی ہماری یہ پرزور اپیل ہے کہ وہ اب بھی آنکھیں کھولیں اور غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر دیکھیں کہ علمی ادبی خدمت گذاروں کا کیا حال ہے۔ سرپرستی وغیرہ نہ سہی اگر ہر تعلیم یافتا شخص ایک سے زیادا رسالوں کا خریدار بن جائے تو پھر علمی ادبی رسالوں کی قسمت کے جاگ اٹھنے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس حوصلا افزائی کے نتیجے کے طور پر اور بھی رسالے وجود میں آجائیں گے اس طرح پر زیادا سے زیادا علمی ادبی خدمت ہو سکے گی اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ "ہندستانی ادب کے حالات کے پیش نظر ہے لیکن ہم اسی کے تھا تھا تمام علمی ادبی خدمت گذاروں کی وکالت کر رہے ہیں، اس لیے کہ ہم بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ ان سب کا حال پتلا ہے، اور ان سب کے حالات ایک سے ہیں جو آج "ہندستانی ادب" پر بیت رہی ہے، اس مصیبت اور پریشانی کا شکار دوسرے رسالے بھی بنے ہوئے ہیں، ہمیں ٹھیک طور سے معلوم ہے کہ بعض رسالے بڑی ہی مشکل سے اپنا خرچ پورا کر سکتے ہیں۔ اور "ہندستانی ادب" کی طرح چند رسالے سراسر نقصان میں چلائے جا رہے ہیں اس کو علمی ادبی سیوا کا جنون کہیے یا پاگل پن، مگر یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض رسالے ان مسلسل مصیبتوں کی تاب نہ لاکر آخرکار دم توڑ دیتے ہیں۔ اور بعض ایسے سخت جان ہوتے ہیں کہ مصایب و ارکا لیف کے بھاڑ کیوں نہ ٹوٹ پڑیں ثابت قدم برابر کیے چلے جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سخت جانی آخر کب تک ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے لیکن یہ بے چارے اور مظلوم تو اپنی حد تحمل و زکر کے انتہا کو بھی پہنچ گئے ہیں۔ مگر افسوس کہ ان کے حال زار پر رحم اور ترس کھانے والا کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

بے حسی کا حل

زمانا موجہ بولی تعریفیں کرنے کے لیے تو تیار رہو جاتا ہے لیکن جیب ڈھیلی کرانے اور دان کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک مانے کو سانپ سونگ گیا ہے۔ یا یہ کہ سارے زمانے کے احساسات مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے سننے کی قوت جاتی رہی ہے۔ اس لیے کسی مظلوم کی آہ و بکا اور چیخ و پکار کا ذرا برابر بھی زمانے کے مردا احساسات پر اثر نہیں ہو رہا ہے۔ یہ ایک قسم کا برفانی جمود ہے جس کو قوت عمل کی گرمی سے پگھلا دیا جانا چاہیے۔ اگر تعلیم یافتا طبقے کا ہر پیکر ہاتی اپنی بے حسی کے سبب ٹس سے مس نہیں ہو رہا ہے تو اس پر ادبی طنزیات کے زہریلے آنکسوں کی بوچھاڑ کر دینی چاہیے تاکہ اس کے احساسات کو ٹھیس لگے اور وہ راہ عمل کی طرف بڑھتا نظر آئے۔ یہ کام آسان نہیں اس کے لیے اتحاد و اتفاق کے علاوہ مسلسل کام کرنے کی ضرورت

ہے۔ کاش کہ ہندستان بھر کے علمی ادبی خدمت گذار اس خصوص میں ایک آواز ہو جائیں!

مقالے

ہم نے اب تک مختلف موضوعات پر کئی ایک مقالے پیش کیے ہیں۔ یہ مقالے ایسے ویسے مضامین نہیں بلکہ تحقیقی علمی یا ادبی کارنامے ہوا کرتے ہیں۔ یہ مقالے یونیورسٹی کے پروفیسروں کی نگرانی میں لکھوائے گئے ہیں۔ علمی ادبی چھان بین کے انہیں کارناموں پر مقالا نگاروں نے ام۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی بھاری ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ آیندہ بھی اسی قسم کے مقالے پیش کیے جاتے رہیں۔ اسی خیال سے ہم نہ صرف عثمانیا یونیورسٹی بلکہ ہندستان اور پاکستان کی ہر یونیورسٹی کے اسکالروں سے اپیل کریں گے کہ وہ اپنے غیر مطبوعہ (مخطوطے) مقالے "ہندستانی ادب" میں چھپنے کے لیے روانا کریں۔ مقالا اسی لکھا ہوا ٹ (رسم خط) میں ٹائپ یا خوش خط لکھا ہو۔ ہر دو صورتوں میں مقالے کی نظر ثانی کر کے ضروری صحت کر دینی چاہیے۔ ہر حالت میں مقالے کی نقل بھجوائی جائے۔ یہ کاپی کسی صورت واپس نہ ہو سکے گی ہم پھر سے ایک بار اس کی وضاحت کیے دیتے ہیں کہ کتابی شکل میں چھپا ہوا مقالا یا اس کا مسودا ہرگز ہرگز نہ بھیجا جائے۔

ہمارے موجودا حالات کے پیش نظر مقالا نگار ہم سے کسی قسم کے معاوضے کی آشا نہ رکھیں۔

تصویریں ہمارا خیال ہے کہ "ہندستانی ادب" میں آیندہ سے تصویریں بھی چھپا کریں مگر یہ کٹھن کام ہم سے ممکن نہیں جب تک کہ مضمون نگار اور شاعر وغیرا اس خصوص میں ہمارا ہات نہ بٹائیں اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ جن صاحبوں کے ہاں اپنا بلاک موجود ہو اپنے مضمون یا کلام کے ساتھ بلاک بھی بھجوا دیں۔ چھپائی کے بعد ہم تکریے کے ساتھ واپس کر دیں گے جن کے ہاں بلاک نہ ہو۔ اور بنوانے میں مجبوری ہے تو وہ اپنے شہر کے آرٹسٹ سے کاپی کے کاغذ پر اور کاپی لکھائی روشنائی سے اپنی تصویر بنوا کر بھیج سکتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض وقت ریڈیو پر مفید و کارآمد مضامین بھی نشر ہوا کرتے ہیں جن لوگوں نے ستا انہیں تھوڑا بہت فائدہ ہوا اور جو دشمن کے

مختلف ملکوں کے انفورمیشن سروسس دیہاڈیں

ہر ملک کے انفورمیشن سروس کے مضامین قبول کیے جا سکتے ہیں اور تکریے کے ساتھ "ہندستانی ادب" میں جگہ پا سکیں گے ملکی اور بیرونی تمام سروسس سے ہماری یہ اپیل ہے کہ وہ اپنی اپنی نیوز سرویس پابندی کے ساتھ اس رسالے کے نام بھجوایا کریں۔ جو مضامین مصور ہوں ان کے بلاک بھی ضرور بھجوائے جائیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے پلاسٹک بلاکس بھجوائے جائیں جن کی واپسی کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو۔ اور اگر پلاسٹک کے سوا دوسرے واپسی کے قابل بلاک ہوں تو کر پاکر کے ان کے بہترین چربے پوری احتیاط کے ساتھ روانا کیے جائیں۔ مضامین اگر بڑی خصوصیتوں پر ہوں تو ہمارا یہ مشورا ہے کہ بلاک یا ان کے صاف چربے حاصل کر کے ضرور بھیجیں

آل انڈیا ریڈیو سے اپیل

آل انڈیا ریڈیو ہمارے دیس کا ایک بہت ہی اہم ادارا ہے اس کے اسٹیشنوں سے نہ صرف خبریں اور گانے نشر ہوتے ہیں بلکہ مضامین افسانے ڈرامے اور فیچر بھی براڈ کاسٹ ہوا کرتے ہیں چونکہ ان مضامین کا معاوضا دیا جاتا ہے اس لیے یہ مضامین وغیر انشر گاہ کی ملکیت نے جاتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ ایک مقررہ مدت تک مضمون لکھنے والے کو بھی اس کے چھپوانے کا حق حاصل نہیں رہتا۔ اس خاص مدت کے ختم پر چاہے تو وہ اپنے مضمون کو چھپوا سکتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کے اس اصول سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے کہ اپنی مصلحت کو وہ بہتر جانتا ہے مگر ہمارا کہنا صرف اس حد تک ہے کہ آل انڈیا ریڈیو اپنے اس کٹھن اصول میں تھوڑی سی لچک پیدا کر دے۔ وہ اس طرح پر کہ اگر علمی ادبی رسالے مضمون نگار کی مرضی حاصل کر کے آل انڈیا ریڈیو سے راست مضامین کا مطالبا کریں تو مدت کا لحاظ کیے بغیر فوری مضامین وغیرا بھجوا دے اس لیے کہ نشر کے بعد مضمون کی چھپائی سے آل انڈیا ریڈیو کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

یہ سچ ہے کہ ریڈیو کے ذریعے کسی چیز کا کافی پروپیگنڈا ہو جاتا ہے لیکن اس کو ہم سو میں سو مکمل تو نہیں کہہ سکتے اگر ریڈیو سے کسی چیز کی نشر گاہ، فی صد مقصد حاصل ہوتا ہے تو باقی ۳۰ فی صدی کی تکمیل کسی رسالے میں اشاعت ہو جانی چاہیے

حقایق و معارف

بسر اسطح اپنی عمر رواں ہو
جبیں ہو مری اور ترا آستاں ہو

ابھی ہاں ابھی انقلاب جہاں ہو
شب ہجر لب پر جو میرے فغاں ہو

میسر جسے یار کا آستاں ہو
اسے کیا ترا خوف اے آسماں ہو

کہے غیر۔ تم مجھ پہ نامہرباں ہو
اگر ہو تو یوں کیوں مرا امتحاں ہو

وہی آستاں یار کا آستاں ہو
کہ جس آستاں کی زمیں آسماں ہو

کہاں تک فلک پھر گرائیگا بجلی
جو ہر شاخ گل پر مرا آشیاں ہو

یہ کیا کہدیا مرنے والے سے تم نے
کہ اک غمزہ اس طرح شادماں ہو

قفس کا بھی در بند میرے لیے ہے
الٰہی نہ یوں کوئی بے خانماں ہو

نہیں تم کو دیکھا تو دنیا مٹی ہے
خدا جانے کیا ہو اگر تم عیاں ہو

غنیمت ہے دم بھر کا مل بیٹھنا یہ
خدا جانے پھر ہم کہاں تم کہاں ہو

چلے آؤ دل سے جو پیش نظر تم
لگا ہوں کا پردا بھی کیوں درمیاں ہو

مٹی جس کی ہستی ہو اک بے نشاں پر
زمانے میں اس کا بھلا کیا نشاں ہو

نشاں دیکھ کر میرے سجدوں کے چلیے
نہ پامال یہ رونق کہکشاں ہو

یہ گور غریباں یہ تاریک منزل
مرے پاس آئے یہاں تم کہاں ہو

ابھی مشکل زیست ہوتی ہے آساں
ترقی ذرا اور درد نہاں ہو

دکھائے نہ مجکو خدا وہ زمانا
کہ میں ہوں کہیں اور کہیں آشیاں ہو

غرض ہے جبیں سائی سے مجکو افقر
کوئی سنگ در ہو کوئی آستاں ہو

افقر
موہانی وارثی

آہنگِ جرس

پروفیسر حبیب مظہری

(۱)

صف باندھ چکا قافلۂ راہ رواں چل
ہے دیر سے آہنگِ جرس مرثیہ خواں چل
سن اس کی فغاں چل
اے مردِ جواں چل

(۲)

جھولے میں عقاید کے خرافات کا اسناد
اور پیٹھ پہ صدیوں کے روایات کا انبار
عادات کا انبار
اے مردِ سفر پھینک کے یہ بارِ گراں چل
اے مردِ جواں چل

(۳)

ماضی کے بیاباں میں نہ کر رہن بسیرا
پوچھتی ہے حالات کی پھٹتا ہے اندھیرا
ہوتا ہے سویرا
اے مردِ جواں چل

(۴)

یہ لوگ جھٹکے ہوئے ضو پاش شرارے
ظلمت کے کلیجے پہ ہیں گھاؤ وہ تمارے
کرتے ہیں اشارے
ہاتوں میں لیے مشعلِ دل نورفشاں چل
اے مردِ جواں چل

(۵)

انداز کہ آوازِ جرس کاہے بگھر میں
ہل چل سی ہے اک قافلۂ شام و سحر میں
لمحے میں سفر میں
دونوں ہی سا فر ہیں زمیں ہو کہ زماں چل
اے مردِ جواں چل

(۶)

افلاس کا نوحہ ہے بغاوت کا کھٹارا گ
چولھا تا ٹھنڈا سہی سینے میں ہے لاگ
اے مردِ جواں جاگ
سلگتے ہوئے تو رہے اٹھنے دے دھواں چل
اے مردِ جواں چل

(۷)

بھیگی ہوئی آنکھوں سے یتیموں کے ہوا ہے
آہ دلِ مظلوم سے تاریک فضا ہے
گھنگھور گھٹا ہے
ساتھ اپنے لیے تو کرمِ ابر رواں چل
اے مردِ جواں چل

(۸)

مزدور کے نغموں سے سنکتی ہیں ہوائیں
تیشے سے رجز کی جو نکلتی ہیں صدائیں
ہلتی ہیں فضائیں
ساتھ ان کے دھڑکتا ہے دلِ کون و مکاں چل
اے مردِ جواں چل

(۹)

عالم کی ہوا آج جنوں خیز ہے تجھ سے
تاریخ کی رفتار کہن تیز ہے تجھ سے
امید ہے تجھ سے
لے عزم کے ہاتوں میں زمانے کی عناں چل
اے مردِ جواں چل

(۱۰)

پھر وعظ سنانے لگا توپوں کا ـــ دہانا
پھر خون کی بارش میں نہانا ہے ـــ زمانا
چھٹنا ـــ ترانا
تلوار کی جھنکار میں بھی زمزمہ خواں چل
اے مردِ جواں چل

(۱۱)

چلتی ہے زمانے میں خیالات کی ـــ آندھی
ساتھ اس کے گرجتی ہوئی حالات کی ـــ آندھی
جذبات کی ـــ آندھی
ہے تیز بہت وقت کا سیلاب رواں چل
اے مردِ جواں چل

(۱۲)

بڑتی ہے کشتی اسی طوفاں کے ـــ سہارے
قابو میں ہوں حالات کے ٹھہرے ـــ دھارے
ہیں دور کنارے
موجوں کے تلاطم میں ہے تقدیرِ جہاں چل
اے مردِ جواں چل

ابھی

صفی احمد (بہاری)

ناآشنائے نکہت گل ہے چمن ابھی
بے رنگ ہو رہی ہے بہا وطن ابھی

سنتا تو ہوں فروزاں ہوئی شمع ضوفشاں
تاریک دیکھتا ہوں مگر انجمن ابھی

کہنے کو مہر صبح تمتنا ہے جلوا ریز
لیکن وہی ہے ظلمت رنج و محن ابھی

یہ شور ہے کہ آئی ہے فصل بہار نو
آئینا دار دشت مگر ہے چمن ابھی

آزاد آج ہم ہیں یہ سنتے تو ہیں مگر
سیکھا ہے حریت کا نہ ہم نے چلن ابھی

بھولا نہیں ہے دست ستم کیش اپنی چال
بدلی نہیں ہے گردش چرخ کہن ابھی

روشن "چراغ نو" تو سر بزم کر دیا
راس آئی ہے نہ اس کو ہوا اے وطن ابھی

کرتا ہوں خون دل سے چمن بندیاں مگر
دست جنوں نواز ہے شعلا فگن ابھی

لیکن اگر دلوں کے ارادے ہیں نوجواں
اک دن منا کے لائیں گے فصل بہاریاں

پرنور اس کو شمع عمل سے کریں گے ہم
بے نور ہو رہی ہے جو یہ انجمن ابھی

طے ہو رہے گی منزل مقصود بے خطر
باقی اگر دلوں میں ہے اپنے لگن ابھی

اک دن بنا ہی لیں گے یہاں اپنا آشیاں
ہاں چن رہے ہیں ہم خس و خار چمن ابھی

ہاں ہاں! چمک اٹھے گا ہر اک گوشہ وطن
چھٹکی ہے "آفتاب سحر" کی کرن ابھی

ہوش آنے دو ملیں گے پھر آپس میں ہم گلے
اترا نہیں ہے نشۂ جام کہن ابھی

کل پاؤ گے تم اس کو در آغوش صد بہار
ویران دیکھتے ہو ہمارا چمن ابھی

ہم بھی کریں گے ناز سمن زار ہند پہ
سلجھا رہے ہیں زلف بہار وطن ابھی

فصل خزاں "چمن" میں نہ آئیگی پھر کبھی
ہاں روٹھ کر بہار نہ جائے گی پھر کبھی

رمز (کشمیری)

مادرِ ہند سے اردو کی فریاد

(شاعر کے خیالات سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کہہ رہی ہے یہ زبانِ حال سے اردو زباں — اے جنم بھومی میری اے مادرِ ہندوستاں

مجھ پہ شفقت تھی تری مجھ پر رہی تو مہرباں — آج کیوں میں دوش پر تیرے ہوں اک بارِ گراں!

بھول بیٹھی تو کبھی تو نے مجھے پالا بھی تھا
کیا ہوئی اب اے پیاری ماں وہ تیری ممتا

یاد کر میں تیری آغوشِ محبت میں پلی — چڑھکے میں پروان تیرے ساتھ میں پھولی پھلی

پچ رہی ہو میری دنیائے سکوں میں کھلبلی — اور تو دیکھا کرے چپ چاپ میری بے کلی

آہ ٹھہرا کر بدیسی مجکو تیرے لونہال
کشتی سمجھیں مجھے کرتے رہیں یہ پائمال

کیا نہیں معلوم ان کو ہے کہاں میرا وطن؟ — کس کے گہوارے کی ہے مرہون میری بانکپن؟

کس کی محفل میں رہی ہیں بن کے شمعِ انجمن؟ — کیا بدل ڈالیں گے یہ اوراقِ تاریخ کہن؟

کاش تو ان کو بتا دیتی "تعصب شرم ہے"
پوچھتی ان سے کہ ہٹ دھرمی کہاں کا دھرم ہے؟

سترہویں اور آخری قسط

ڈاکٹر سید عبادت علیخان

حجاج بن یوسف

پانچواں حصہ

باب ۱۶

حجاج کے خصایل

ہم اوپر کے صفحات میں حجاج کے اخلاق اور عادات و اطوار سے متعلق کافی واضح اور نمایاں طور پر لکھ چکے ہیں۔ چنانچہ ابتداے دور حکومت میں اس کی قابلیت، مستعدی و فاشعاری اور نیک جذبات کا ذکر مقالے کے شروع حصے ہی میں کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ وہ طایف میں معلم تھا۔ یا یہ کہ ابان بن مروان کے "شرطۃ" یعنی کوتوالی کی ملازمت کا دور تھا۔ اپنے مزی روح ابن ابنلع کا ڈیرہ احکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے جلوا دینا شامیوں کو مصعب بن زبیر کی جنگ پر سختی سے تیار کرانا حضرت عبدالملک بن زبیر سے جنگ میں مستعدی دکھانا اور قابلیت سے نہ صرف اس مہتم بالشان مہم کو سر کرنا بلکہ کل عرب کا بے مثال خوبی اور عمدگی سے انتظام کر دینا یہاں تک کہ عرب جیسی سلطنت کے اہم صوبے میں امن و امان کا مستقل طور پر قائم ہو جانا بیان کر دیا گیا ہے۔ ولایت حجاز کے زمانے میں حجاج کی ابراہیم بن طلحہ کی سرپرستی سے اس کی خصلت پر کئی طرح سے روشنی پڑتی ہے۔ یعنی اس کی اصول حکمرانی سے واقفیت، شرفا نوازی، نیک لی جو ہر شناسی کے ثبوت کے ساتھ ساتھ اس کی بدنامی کے اسباب کا بھی پتا چلتا ہے۔ چنانچہ ان اسباب کو ہم نے تفصیل سے لکھا ہے کہ "حجاج سے بیزاری نہ صرف صحابی مہاجر، انصار، مذہبی بزرگوں، صحابہ، تابعین، انصار، موالین، احیاء اور قریش پر حکمرانی کرنے کی وجہ سے اور نیز اپنے فرایض کو نہایت بے باکی سے ادا کرنے کی وجہ سے تھی۔ بلکہ یہ بھی اس کا کچھ کم قصور نہ تھا کہ حرمین الشریفین میں بنی امیہ کے اقتدار کی حمایت کرنا اور اس کو قایم و مستحکم کرنے میں تندہی اور سختی سے پیش آتا تھا۔"

غرض یہ کہ ولایت حجاز کے زمانے تک حجاج نے اپنے کو پیدائشی حکمران۔ ڈسپلنیر۔ منتظم امن کا ہیرو ثابت کر دیا تھا۔ اور اسی وجہ سے عبدالملک جیسے مدبر کی اس کے متعلق یہ راے تھی کہ "عراق کے امور اس کے سوا کوئی دوسرا سنبھال نہیں سکتا۔"

ولایت عراق میں حجاج کا اصل کارنامہ ظاہر ہوا۔ کوفیوں اور بصریوں کو ڈسپلن سکھانے ان فوجی چھاؤنیوں کو حقیقی معنی میں فوجی چھاؤنیاں بنا کر حجاج نے نہ صرف داخلی امن قایم کر دیا۔ بلکہ وسط ایشیا اور سندھ کی بے نظیر فتوحات ان سے حاصل کیں غرض عراقیوں کی تہذیب سے حجاج کی عالا انتظامی قابلیت اور امن پسندی پھر ثابت ہوئی تو بصرہ کی بغاوت کے فرو کرنے میں اس کی بہادری اور استقلال کا پتا چلا۔ اسی طرح خوارج کی خوفناک بغاوتوں کو مستعدی اور استقلال سے فرو کرنے کے بعد اس کی قابلیتوں کا مزید ثبوت ملا۔ نیز جیسا کہ ہم نے شبیب خارجی کی بغاوت کے خاتمے پر تبصرہ کیا ہے۔ سپاہ سالاروں، سپاہیوں اور عاملوں کی بغاوتوں کے فرو کرنے کے طویل عرصے کے برتاؤ سے قطعی اور ناقابل تردید طور پر یہ ثابت ہوا ہے کہ حجاج کی طرف ظلم کا انتساب بجاے خود ظلم ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ مشفق۔ شفیق۔ روشن خیال۔ روشن ضمیر۔ مناسب طور پر سخت گیر۔ نیک دل اور ایک عالا مدبر تھا۔ بھی بات کے مان لینے

میں ان کو کبھی دریغ نہ ہوتا تھا۔ حلب کی کئی مراسلتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے ان ہی خاص جی بغاوتوں کے دوران مال سے حجاج کی خبرگیری کی چند مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً مطرب بن مغیرہ کے واقعات اور عربوں میں حق گوئی اور آزادی کو روا رکھنے اور قدر کرنے کی مثال قتیبہ بن مسلم کی آزادانہ گفتگو سے بیان ہوئی غرض یہ کہ ابن اشعث کی بغاوت پر تبصرے میں ہم نے واقعات سے ثابت کیا ہے کہ اس بغاوت کے دوران حجاج کے طرز عمل سے مستعدی ہشیاری۔ عفو۔ فیاضی۔ غلیفے کی جانب سے اس کی قابلیت کا اعتراف، بہادری تدبر، رعایا سے محبت علما کی تعظیم اور ان کی غلطیوں سے درگذر کرنا یہ صفت پذیری کے عالا خصایل حجاج میں باحسن وجوہ پائے گئے۔ داخلی امن قایم کرنے کے بعد اس کی مالیات کی اصلاح فوجی تنظیم کی اصلاح اور دوسری بھاری اصلاحات میں بے مثال کارناموں کا بھی ذکر ہوا ہے۔ جن سے یہ ثابت ہوا کہ "جس طرح حجاج نے قیام امن میں اپنے لاثانی تدبر کا ثبوت دیا تھا۔ نظم مملکت میں اس نے کوئی کمی نہیں دکھائی" اور جس طرح سکہ سازی اوزان و پیمانہ جات خراج اور زرعی ترقی یعنی مالیات کے متعلق اس کے کام یہ قول پروفیسر وللہوسن یادگار زمانہ ہیں۔ اسی طرح عربی کے دفتری زبان قرار دینے عراق کی فوجی تنظیم کو مکمل کرنے اور دوسرے مدبرانہ امور میں عبدالملک کا ہات قابلیت سے بٹانے میں بھی حجاج کا تدبر ہمیشہ یادگار زمانہ رہے گا۔

یہ ضرور ہے کہ حجاج نے "جریدہ عالم" پر اپنا "دوام" "ثبت" کر دیا کیونکہ اپنی ان بے نظیر خدمات سے کل مشرق کو اس نے منظم اور قوی کر دیا تھا قتیبہ بن مسلم کے ذریعے تاریخ عالم میں بے مثال فتوحات حاصل کیں۔ اسلام کا پھریرا کل وسط ایشیا میں اڑا دیا سمرقند و بخارا اور خوارزم کو اسلامی ممالک بنا دیا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں اسلام کے قدم جمادیے گئے۔ حصہ سوم میں فتوحات کا تفصیل سے بیان گذرا ہے جس میں حجاج کی ہمہ گیری مناسب ہدایتیں بھیجنا منصوبے اور نقشے تیار کر کے دینا قبایلی عناد کو دبائے رکھنا اور کل سند وسط ایشیا میں بے مثال فتوحات حاصل ہو جانے کے بعد چین کی فتح کا سوچنا ہے۔ ان سب سے حجاج کے "علو شان" کا ثبوت ملتا ہے۔ حصہ چہارم میں حجاج کی غارجا پالیسی پر مبسوط بحث کی گئی جس سے حجاج کی عظمت اور وصولت کا ناقابل انکار ثبوت ملتا ہے۔

مختصر یہ کہ حجاج کے خصایل میں نیچے گنائی ہوئی صفات کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔

عالا تدبر امن و اماں کی حمایت کرنا اور اس کے قایم رکھنے میں عالا انتظامی قابلیت دکھانا مفید اصلاحیں کر کے اپنی تنظیمی قابلیتوں کا ثبوت دینا فریقین کے ساتھ ایسی بے مثال رواداری برتنا کہ کسی کو بھی گلے تسکوے کا موقع نہ ملے۔ حق اور انصاف کے موقع پر ظلم و استبداد کو بھلا دینا اس کی خوبیوں کی بہترین مثالیں ہیں

اس آخری صفت یعنی اس کا ظالم نہ ہونے کو اگرچہ ہم نے پورے طور پر ثابت کر دیا ہے لیکن اس کے مزید ثبوت میں اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی بیان کرنے سے رہ گئی ہے یعنی مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر کا قتل کرنا ہمارے خیال میں حجاج کی بدنامی کے متعدد اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب یہ قتل بھی ہے۔ واقعات اس کے یہ ہیں کہ حضرت سعید نے ابن اشعث کے ساتھ بغاوت کی۔ حجاج نے آپ کو نامہ بر بنا کر اس کے پاس بھیجا تھا۔ آپ اپنی نہ آئے بلکہ اسی کے ساتھ ہو گئے۔ جنگ زاویہ کے بعد آپ حجاج کے ہات لگے۔ اس کے باوجود حجاج نے آپ کو معاف کر دیا اور دوبارا نامہ بر بنا کر بھیجا۔ آپ نے پھر سے بغاوت کی اور حجاج کا خط پھاڑ دیا۔ بغاوت ابن اشعث ۸۳ھ میں فرو ہو جانے کے بعد آپ ۹۵ھ تک مکہ شریف میں چھپے رہے۔ حجاج نے آپ کے علم و فضل کا لحاظ کر کے تعرض بھی آپ سے اغماض کیا۔ جب خالد بن عبدالله القسری مکہ کا والی ہوا تو آپ کو حجاج کے پاس بھیجنا چاہا۔ کسی نے کہا حجاج نے جان کر ان سے اغماض کیا ہے۔ اس لیے انہیں نہ بھیجو۔ اس پر عبدالله نے کہا جو امن و امان کو توڑے اور بغاوت کرے اس کا کوئی لحاظ نہ ہوگا۔ غرض جب آپ حجاج کے

پاس آئے تو حجاج نے آپ کے ساتھ نہایت ہی شریفانہ برتاؤ کیا اور پوچھا کہ آپ ایک بار چھوڑ دو بار دو مرتبہ کیوں باغی ہو گئے تھے۔ آپ نے نہایت ہی جرات کے ساتھ یہ معقول جواب دیا کہ آخر میں انسان ہی تو ہوں۔ اور انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ اس پر حجاج خوش ہوا اور خاموش ہو رہا۔ گویا اس نے انہیں معاف کر دیا۔ کسی ایک اور موقع پر بات چیت کے دوران آپ نے یہ کہا کہ میں نے یہ فعل اس لیے کیا تھا کہ ابن اشعث کا حلقہ بیعت میری گردن میں تھا۔ کہتے ہیں کہ اس پر حجاج کو بہت غصہ آیا اور کہا "سعید بن جبیر! کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا میں خلیفہ کی بیعت نہ لی! کیا پھر عراق میں دوبارہ تجدید بیعت نہ کی؟ خلیفہ کی ان دو بیعتوں کا اور میرے فلاں فلاں احسانات کا تو یہ لحاظ اور باغی کی بیعت کا اتنا خیال! بہ خدا میں تمہیں قتل کروں گا۔" اس پر حضرت سعید نے خاموشی اختیار کی۔ انہوں نے حجاج کے واجبی غصے کو کم کرنے کی یا قسم کا کفارہ دینے پر اس کو راضی کرنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کے جوش کو بھڑکانے کے لیے کہا ہے کہ پھر تو میں اسم با مسمّٰی ہوں۔ شہید ہو کر اصل میں سعید بنوں گا۔" اس پر حجاج نے انہیں قتل کرا دیا۔ اور بہ قول امام ابن قتیبہ کہا کہ مجھے ایسے لوگوں کی بد دعا کا خوف نہیں۔ میں اہل جماعت کے مظلوموں کی بد دعا سے ڈرتا ہوں یہ لوگ تو ظالم ہیں۔ کیونکہ انہوں نے جماعت کو چھوڑا۔ اور مسلمانوں کے رستے سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ لیکن فوراً گھبرا ضرور گیا اور "قیود ما قیود ما" کے الفاظ بار بار کہنے لگا۔ اس پر سب مورخوں کا اتفاق ہے کہ مرے دم تک بار اس کے دل سے نہ گیا!

یہ سچ ہے کہ سعید بن جبیر کی "شہادت" کا واقعہ بہت ہی افسوسناک ہے۔ احمد زیلان نے امام احمد کا قول نقل کیا ہے کہ "حجاج نے سعید بن جبیر جیسے جید عالم کو قتل کیا حالانکہ روئے زمین اور ہر دی حیات ان کے علم کا محتاج تھا۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ یہ قتل غلطی پر مبنی تھا اور بغاوت سے نمٹنے کے بعد اس کی کوئی ضرورت اور اہمیت بھی نہ تھی۔ لیکن یاد رہے کہ حضرت سعید نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ حجاج کے پیغام امن سے غلط فائدہ اٹھایا تھا وہ نہ رکے گئے تھے اور نہ عراق ہی واپس ہوئے تھے۔ بلکہ مکہ شریف میں روپوش تھے۔ پس قانوناً تو حجاج آپ کے قتل سے بری نہ تھا لیکن ایسا اوقات قانون کی لفظی پابندی سے "اخلاقی ناانصافی" بھی ہو جایا کرتی ہے جس کی بہترین مثال حضرت سعید کا قتل ہے۔ جیسا کہ کہا گیا حضرت سعید بن جبیر بڑے عالم تھے۔ آپ کو باغی ہوئے تیرا سال گذر چکے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے قتل سے اس وقت کوئی سیاسی ضرورت پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اس لحاظ سے ہم کہیں گے کہ حجاج کا آپ کو قتل کرنا ایک بھاری غلطی ضرور تھی۔ چنانچہ یہی سبب اس کی پریشانی کا باعث بنا وہ مرے دم تک پریشان رہا اور اپنے دل کو بار بار یہ کہہ کر تسلی اور تشفی دیتا رہا کہ سعید "جماعت مسلمین" سے علیحدہ ہو گئے تھے انہیں مسلم جماعت سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا۔ لیکن ان ظاہری باتوں سے اس کو صحیح معنی میں تشفی نہ ہوئی۔ صرف موت ہی نے اس کو اس پریشانی سے نجات دلائی۔

مختصر یہ کہ حضرت سعید بن جبیر کا قتل حجاج کی نہ صرف غلطی زبردست غلطی تھی لیکن یہ کوئی قانونی غلطی نہیں تھی۔ بلکہ اخلاقی غلطی ضرور تھی۔ یہ غلطی اصل میں حجاج کی قانون پسندی کے جذبے کو ٹھیس لگانے یعنی ابن اشعث کے حلقہ بیعت کو یاد دلانے کا سبب تھی۔ نیز حضرت سعید کی بے باکی کے ساتھ گفتگو کرنے کی وجہ بھی بنی۔ کاش! حضرت سعید بن جبیر وہ بدبختانہ جملہ نہ کہتے اور کاش کہ حجاج کے قسم کھانے کے بعد آپ خاموش ہی رہتے۔ قتل کے بعد حجاج کی پشیمانی اس کی فطری نرم دلی اور گہرے احساس کا ثبوت ہے۔

ظاہر ہے کہ صرف اس ایک قتل سے حجاج کا ظالم ہونا ثابت نہیں ہو سکتا! کیونکہ حجاج کو آپ کے قتل پر حسرت ہونے کے علاوہ بعد میں وہ خود بھی پشیمان ہو گیا تھا۔ اور یہ اثرات اس کی موت

تک نہ جا سکے تھے۔ اس واقعے کے بہت جلد بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ البتہ ساری امت کی نظروں میں یہ واقعہ حجاج کی بدنامی کا بڑا بھاری سبب بنا۔ حجاج کی بدنامی کے دوسرے نام نہاد اسباب تو پہلے ہی بیان ہو چکے ہیں۔

حجاج کی سیاسی زندگی کی تصویر تو آپ نے دیکھ ہی لی جو سوائے اس ایک ہلکے سے دھبے کے بلا مبالغے داغ سی دکھائی دیتی ہے۔ ہم کس موضع سے یہ خواہش کرتے کہ کاش اس کی سیاسی تصویر اس داغ سے بھی بے نیاز ہوتی جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ دنیا کی کوئی چیز بھی داغ سے خالی نہیں ہو سکتی۔

اب اگر حجاج کی مذہبی زندگی کی تصویر دیکھنی ہو تو اسکے بھی ہلکے سے نقوش معلوم کر لیجیے۔ اگرچہ یہ زیادہ نہیں تاہم جو بھی ہیں ہم پیش کیے دیتے ہیں۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ حجاج کو ایک شب کے خانگی ہوئی کسی قصے سنانے والے کو لانے کے لیے کہا گیا۔ ایک شخص لایا گیا۔ مگر وہ بے حد مرعوب ہو گیا تھا۔ اس کو واپس کر کے حجاج خود ہی باہر نکل گیا۔ اور رستے میں جو بھی غریب ملے اس کو کچھ نہ کچھ دیتا تھا۔ ایک بڑھیا نے دست سوال دراز کیا حجاج نے اس کو خیرات دینا چاہا مگر بڑھیا نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میری جوان لڑکی گھر بیٹھی ہوئی ہے اس کے عقد شرعی تک کے لیے میرے ہاں پیسا نہیں۔ یہ سنتے ہی حجاج نے دو مٹھی بھر اشرفیاں اس کی جھولی میں ڈال دیں اور چلتا بنا۔ ایک مرتبہ حجاج بیمار رہا اور عرصے تک بیمار رہا۔ بعض شریر النفس اہل کوفہ اس کی سخت حکمرانی سے نجات حاصل کرنے کے خیال سے خوش ہونے لگے لیکن افسوس کہ ان کی یہ مراد بر نہ آئی۔ صحت پانے کے بعد حجاج نے جب خطبا دیا تو ان بدنفسوں کی طرف یوں اشارا کیا کہ "اے گروہ منافق! تم کہتے پھرتے تھے کہ حجاج مرا! حجاج مرا۔! یہ خدا میں تمہیں یاد دلاتا ہوں کہ میں اپنے اعمال اور افعال میں حق بجانب ہوں۔ اور کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی روا نہیں رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں اسی بندے کے زیادہ عرصے تک جینے کو پسند کرتا ہے۔ جو اس کی خلق کی خدمت میں بھی معنی میں بجا لاتا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے۔ میں تو تم سب کی رکھوالی کرتا ہوں۔ میرا کام خلق کی خدمت کرنا ہے۔ مجھکو سوائے خدا کے کسی کا ڈر نہیں ہے۔" اس سے آگے چل کر قبروں کے عذاب کا ذکر کیا اور اعزا و اقربا کی بے ثبات محبت کو بیان کیا۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ حجاج ہمیشہ قبروں کو دیکھ کر روتا تھا۔ نہ صرف خود روتا بلکہ متاثر کر کے دوسروں کو بھی رلاتا تھا۔ ابن عوف کا بیان ہے کہ میں نے حجاج کو جب قرآن شریف پڑھتے سنا تو مجھے یقین آیا کہ اس نے قرآن شریف کا گہرا مطالعا کیا ہے۔ عبدالملک نے حجاج کو اسلم بن عبدالبکری کے قتل کا حکم دیا۔ اسلم نے کہا امیرالمومنین غائب ہیں اور حاضر میں بے قصور ہوں۔ تحقیقات کر لیجیے۔ اس کا بھی خیال رکھیے کہ میں بڑا ہی عیال دار ہوں۔ یعنی چوبیس عورتوں کی پرورش میرے ذمے ہے وہ دروازے پر موجود ہیں۔ بلا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ واقعا سچ ہے۔ اس کی لڑکی نے حجاج کو مخاطب کر کے چند شعر پڑھے۔ حجاج نے رو دیا اور کہا بخدا میں زمانے کو تم پر سختی کرنے نہ دوں گا۔ پھر عبدالملک کو اسلم اور اس کی لڑکی کا حال لکھ بھیجا خلیفہ نے لکھا کہ انعام دو اور لڑکی پر مہربانی کرو۔ حجاج نے ایسا ہی کیا۔ حجاج اکثر نبوی کی ہدایت کرتا تھا جس کے ساتھ ساتھ خلیفہ کی اطاعت پر بھی زور دیتا تھا۔ حجاج کی دعا یہ ہوتی تھی کہ "اللہ! مجھ پر ظاہر کر کہ گمراہی کیا ہے کہ اس سے بچ کر رہوں اور ہدایت دکھلا کہ میں اس کی اطاعت کروں۔"

حجاج کی علمی تصویر کا رخ تو نہایت ہی شاندار ہے اختصار کے مدنظر ہم صرف دو تین ہی واقعات کی طرف اشارا کریں گے مشہور شاعر جریر نے جب اس کی تعریف میں قصیدا کہا تو حجاج اس سے بے حد محظوظ ہوا۔ اور شاعر کی بڑی ہی تعریف کی۔ نیز اس کو انعام سے بھی سرفراز فرمایا۔ چنانچہ اس کی عالی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے شاعر کو عبدالملک کے دربار میں پہنچوا دیا۔ یہ گویا اس کی علمی قدردانی کی بڑی بھاری مثال تھی اسی طرح پر ایک اور عالم فاضل عشی ہمدان کو بھی اس نے عبدالملک

کے حضور میں بھجوا دیا۔ نعمان بن حمزہ حافظ کے الفاظ میں ان اشخاص میں سے ایک ہے جن کو حجاج نے اچھے کلام کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود بے نظیر فقیہہ تھا۔ امام ابوحجر العسقلانی نے کہا ہے کہ "کان فصیحاً بلیغاً۔ فقیہاً" عبدالملک نے مجاہدین سلم الخزوی سے پوچھا سب سے بہتر خطیب کون ہے تو انہوں نے پہلا نام اپنا لیا۔ دوسرا نام روح بن زباع کا۔ تیسرا حجاج کا اور چوتھا عبدالملک کا۔ عبدالملک نے کہا مجھے چوتھا قرار دیا۔ کہا ہاں! میں نے ایسا ہی سنا ہے یعنی یہ تو عام طور پر مشہور ہے۔ ابو عمر العلائی نے فرمایا کہ میں نے حجاج سے اور حسن سے زیادہ فصیح کسی شخص کو نہیں پایا۔ حسن زیادہ فصیح تھے۔" تہذیب التہذیب" میں اس کے محدث ہونے کی طرف اشارا ہے۔ امیہ بن الصلب کے اشعار کے متعلق اس کی رائے تھی کہ اس کے سمجھنے والے اب نہیں رہے۔

حجاج سے متعلق بہت سارے اقوال مشہور ہیں۔ ہم مشتے نمونا از خروارے" کے مصداق ان میں سے چند یہاں پیش کیے دیتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ حجاج کے ایک جملے نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ ابو عبداللہ السقفی نے کہا کہ حجاج کے جملے بڑے ہی پراثر ہوا کرتے تھے۔ میں نے اس کو ان چیزوں سے متعلق بھی اظہار خیال کرتے سنا ہے جس سے اس کو عمر بھر بھی تعلق نہ رہا ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس خصوص میں اس کی رائے بڑی ہی صایب ہوا کرتی تھی۔ اس لیے ہم اس کی شخصی حیثیت اور قابلیت پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

امام شعبی نے فرمایا کہ حجاج کو میں نے ایک ایسی بات کہتے سنا ہے جس کو اس سے پہلے کسی نے نہیں کہا کہ "اللہ تعالیٰ نے دنیا کو فانی اور آخرت کو باقی بنایا۔ فانی باقی اور باقی فانی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دنیا پر خایب آخرت سے دھوکا نہ کھاو۔ بہت سی امیدیں اجل کو بھلا دیتی ہیں۔" خلیفہ ولید کی تخت نشینی پر حجاج نے خط لکھا "خدا نے تو جوانی میں آپ کو خلافت دی ہے شہروں کی حفاظت کیجیے۔ اور دشمنوں کے خلاف ان کو مدد دیجیے۔ اسلام کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیے۔ شرایع اسلامی کو قایم رکھیے۔ لوگوں کی محبت دشمنی اور غصے سے بے فکر ہو جایے کیونکہ ہم بہت جلد ہر شخص کے متعلق بھلا برا کہتے رہتے ہیں۔ والسلام"

حجاج کی ایک تصویر پر آخری حروف خلیفہ عبدالملک ہی کے الفاظ ہو سکتے ہیں۔ خلیفہ عبدالملک نے مرض موت میں لغوی اور اتفاق کی فصیحت کے بعد اپنی اولاد کو حجاج کے متعلق نصیحت کی کہ "حجاج کی عزت کرو۔ کیونکہ یہ حجاج ہی ہے، جس نے تمہارے لیے یہ کام بنایا ہے" یعنی تخت و تاج کو محفوظ کیا ہے" ولید نے خطبہ میں علی الاعلان کہا کہ "امیرالمومنین عبدالملک حجاج کو اپنی آنکھوں کا نور فرماتے تھے۔ حجاج میرے تو کل چہرے کا نور ہے۔"

"تاریرقی کی سو سالا نمایش میں اوپن ایر تھیٹر"

ہندستان میں سلسلہ تاریرقی کا آغاز ہوے ایک سو سال گذر چکے ہیں۔ اور اس تقریب پر تاریرقی کی سو سالا نمایش نو مبر میں نئی دلی میں ہو رہی ہے نمایش کا ایک خاص پہلو یہ ہوگا کہ نمایش سے ملے ہوے میدان میں ایک اوپن ایر تھیٹر کا اہتمام کیا جاے گا۔ اس تھیٹر میں تاریخی اور جدید معیاری ڈرامے پیش کیے جائیں گے اس کے علاوہ عوامی اور کلاسکی ناچ گانے اور تقریریں بھی پروگرام میں پیش کیے جائیں گے تھیٹر میں پانچ سو اشخاص کی بیٹھک کا انتظام کیا جاے گا۔ نمایش کے منتظمین کو آشا ہے کہ وہ ایسا پروگرام پیش کر سکیں گے جو تہذیبی پہلو سے اطمینان بخش ہو اس مقصد کے لیے کچے پیشہ ور تھیٹریکل آرٹسٹوں اور شوقیا طور پر کام کرنے والے فن کاروں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی جاے گی۔

امریکا میں تعلیم کی رفتار

آر۔ جے۔ میک گراتھ
(امریکا کے سابق تعلیمی کمشنر)

حال ہی میں انسانی حقوق کے عالمگیر اعلان کے سلسلے میں امریکا اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے نمایندے آپس میں ملے اور کہا ——————

ہر ایک بچے کو تعلیم پانے کا حق حاصل ہے

اس لیے لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانا کم سے کم جزئی طور پر جمہوری حکومت کی کامیابی کی طرف ایک قدم اور مستقبل کے لیے بھی اس کی استحکامی قوت کی ایک تدبیر ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکا کو تعلیم کی برکت میں جو یقین ہے اسے کس حد تک عملی صورت دی گئی ہے؟

امریکا میں ہر پانچ اشخاص میں سے ایک شخص اسکول میں ان بھر تعلیم پاتا رہتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں امریکا کی ۱۵ کروڑ ۶۰ لاکھ کی آبادی میں سے ۳ کروڑ ۵ لاکھ طلبا ابتدائی اور سکنڈری ہائی اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ کالجوں، یونیورسٹیوں، تجارتی اور نرسنگ اسکولوں میں تقریباً ۲۵ لاکھ طلبا تعلیم و تربیت پا رہے تھے۔ بہت سے طلبا حرفت یا کوئی پیشا سکھانے والے پرائیویٹ اور تربیتی اسکولوں میں پورے وقت کی تعلیم پاتے تھے۔ اور کچھ لوگ نصف وقت کے یا رات کو پڑھانے والے تعلیمی اداروں اور کچھ خط و کتابت ٹائپ اور حساب کتاب سکھانے کے ہر درجے کے تربیتی اسکولوں میں داخل تھے پچھلے برس ہر دس میں سے نو طلبا نے ابتدائی اسکولوں میں آٹھ سال کا کورس پورا کیا اور کامیاب ہو کر نکلے۔

اسی تعداد کے نصف سے زیادہ طلبا نے ہائی اسکولوں کا کورس پورا کیا۔ تعلیم کے اس حیرت انگیز ریکارڈ کا سبب امریکی لوگوں کا بلند معیار زندگی اور ان کی فی کس قوت پیداوار ہے جس پر اس بلند معیار زندگی کی بنیاد ہے۔ جنگ کی صورت حال اب پورے طور پر میکانکی صورت پا چکی ہے۔ حالیہ کامیابی کی ایک وجہ یہی قوت پیداوار تھی۔

امریکا میں جمہوری حکومت کی کامیابی اور بصیرت کی بھی اسی سے تشریح ہوتی ہے۔ ہماری دلیل کے مطابق جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا حکومت عوام کی خدمت بجا لانے کے لیے ہے حصول تعلیم کے لیے انتظامات اور مواقع مہیا کرنا بھی ایک طریقہ ہے جس سے حکومت لوگوں کی خدمت کرتی ہے تاکہ انہیں زندگی کی مسرتیں مکمل اختیارات اور طاقت حاصل ہو سکے۔

مرکز میں اختیارات کی تقسیم

ریاست ہائے متحدہ امریکا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مختلف خود مختار ریاستوں کی ایک متحدہ یونین ہے۔ مرکزی سرکار کو ۱۷۸۹ء کے آئین کے مطابق ریاستوں کی طرف سے عالی اقتدار و اختیار دیا گیا ہے چونکہ اس آئین میں تعلیم کے متعلق کوئی اختیارات مرکز کو نہیں سونپے گئے تھے اس لیے تعلیم کی ابتدائی ذمے داریاں مختلف ریاستوں پر ہیں۔

بہت سے ملکوں میں ایک ملکی وزارت تعلیم اسکولوں کے لیے کورس مقرر کرنے اور انتظامی امور کے اختیارات رکھتی ہے۔ امریکا میں ایسی کوئی وزارت تعلیم نہیں۔ یہاں مرکزی سرکار کی طرف سے ایسی کوئی ہدایات نہیں دی جاتیں کہ تعلیم کس طرح دینی دینی چاہیے۔ امریکی تعلیم میں مقامی میونسپل کمیٹیاں ہی خاص حصا لیتی ہیں۔

امریکا کی ۴۸ ریاستوں میں سے ہر ایک میں محکمہ تعلیم قائم ہے، (شاید جس کا کچھ اور نام ہے) جو دوسرے ملکوں کی وزارت تعلیم

کے جیسے اختیارات رکھتا ہے۔

مرکزی حکومت میں ایک مرکزی دفتر ہے جو ریاستوں کے مابین تعلیمی اطلاعات اور تجربوں وغیرہ کا تبادلہ کرتا ہے۔ یہ محکمہ تمام قسم کے تعلیمی کاموں کے اعداد و شمار جمع کرتا اور انہیں دوسری ریاستوں میں تقسیم کرتا ہے تاکہ وہ دوسری ریاستوں کے تعلیمی پروگراموں کا آپس میں مقابلہ کر سکیں۔ یہ دفتر دوسرے ملکوں میں تعلیمی سرگرمیوں کے متعلق بھی معلومات حاصل کرتا ہے تاکہ امریکا کے سفارتی ایجنٹ ان سے فائدہ اٹھا سکیں یہ دوسری مرکزی ایجنسیوں کی جس میں کانگریس بھی شامل ہے تعلیمی مفادات کی نمائندگی کرتا ہے اور ان مرکزی ایجنسیوں کی اطلاعات و معلومات اسکولوں تک پہنچاتا ہے۔

ریاستوں کی طرف سے درخواست کیے جانے پر یہ دفتر سارے ملک کے تعلیمی تجربے اور ماہرین کے مشورے حاصل کرتا ہے۔ اور اس طرح ریاستوں کو اپنے تعلیمی مسئلے حل کرنے میں مدد دیتا ہے۔

یہ طلبا کے باہمی تبادلوں اور وظیفوں وغیرہ کے تبادلوں کا انتظام بھی کرتا ہے خاص خاص دلچسپی کے مقامات میں یہ مرکزی تعلیمی دفتر مالی امداد بھی دیتا ہے۔

چونکہ ۴۸ ریاستوں میں سے ہر ایک کو یہ اختیار حاصل ہے اور ہر ایک ریاست کی یہ اپنی ذمے داری ہے کہ جس طرح مناسب سمجھے اپنا تعلیمی نظام قایم کرے۔ اس لیے ریاستوں کے تعلیمی عمل اور پالیسیوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شاذ ہی ایسے بیان پائے جاتے ہیں جن میں کہا گیا ہو کہ "امریکا کے تمام اسکول۔۔۔۔۔" کسی ایسے بیان میں استثنا بھی ہے اور فرق بھی۔

تاہم مشترکا اصول پائے جاتے ہیں اور اسکولوں کے نظام میں ایسی یکسانیت پائی جاتی ہے کہ ایک ریاست کا طالب علم دوسری ریاست کے اسکول میں آسانی سے داخل ہو سکتا ہے۔

مشترکا اصولوں کے اثر و رسوخ کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ لوگ آسانی سے ایک دوسری ریاست میں آ جا سکتے ہیں اور ریاستیں اپنے تعلیمی تجربوں کا آپس میں تبادلہ کرتی ہیں۔ اسکول تبدیل کرنے والے طالب علموں کی سہولت کا خیال رکھنا ایک ایسے ملک میں ضروری ہے۔ جہاں ۱۹۴۵ء کی تحقیقات سے یہ پتا چلا کہ صرف ۵۰ فی صد لوگ اسی جگہ اور مکان میں تھے جس میں وہ ۱۹۴۰ء میں رہتے تھے۔

حکومت کے مرکزی ڈھانچے کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بھی ریاست کمیونٹی یا اسکول میں تعلیمی ترقی کے لیے قدم اٹھائے جا سکتے ہیں کسی بھی ریاست کو کسی تعلیمی تجربے کے لیے ایک لیبارٹری یا تجربا گاہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور ان تجربوں سے دوسری ریاستیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ جدا جدا اور الگ تھلگ کمیونٹیز میں بھی اسکول مقامی تحریکوں اور لوگوں کی دلچسپی کے باعث قایم ہیں کمیونٹی اپنے نمائندوں کا ایک بورڈ نامزد کرتی ہے جو ٹیچروں کو ملازم رکھتا اور تعلیمی کورس (نصاب) کا انتخاب کرتا۔ اسکولوں کے لیے مکانات بناتا اور اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیکس لگاتا اور وصول کرتا ہے تاکہ تعلیمی بلاؤں کو عملی صورت دی جا سکے۔ آجکل زیادہ تر اسی طریقے کے اسکول جاری ہیں۔ ریاستوں نے آہستہ آہستہ اسکولوں کے اخراجات کا کچھ حصہ ادا کرنے کی ذمے داری اپنے اوپر لی ہے تاکہ غریب علاقوں کے بچوں کو اسکولوں میں تعلیم کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۲۳۷۳۰۰ مقامی اسکول بورڈ تھے جن میں ۱۰۰۰۰۰ مردوں اور عورتوں نے مفت اور بلا معاوضہ اپنی خدمات اسکولوں کے انتظامات وغیرہ کے لیے پیش کیں۔ امریکا کے لوگ اپنے اپنے علاقوں کے اسکولوں کے انتظامات اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا پسند کرتے ہیں۔ تاکہ مقامی کنٹرول یقینی ہو۔ ابتدائی سکنڈری پبلک اسکولوں کے اخراجات کے فنڈ میں مقامی جائیداد پر ٹیکسوں سے ۵۰ فی صد آمدنی ہوتی ہے جو اسکول بورڈوں کے مقامی نمائندے لگاتے ہیں۔ ریاستوں کی طرف سے آج کل بہتر فی صد اور مرکزی ذرائع سے باقی ۳ فی صد رقم دی جاتی ہے۔

اوسط بچے کی تعلیم

امریکا میں بچوں کو تعلیم کس طرح دی جاتی ہے اس کی ایک مثال

پیش کرتا ہوں۔

جان امریکا کا ایک اوسط لڑکا ہے اب اس کے تعلیم پانے کا حال سنیے۔

جان چھ برس کی عمر میں اسکول میں داخل ہوتا ہے (بہت سی ریاستوں میں بچے اس عمر سے پہلے نرسری اور کنڈرگارٹن اسکولوں بھیجے جاتے ہیں اور بعض جگہ بچے آٹھ برس کی عمر میں تعلیم شروع کرتے ہیں)

جان ابتدائی اسکول میں پہلی جماعت میں داخل ہوگا۔ ۸ سال تک جان اس اسکول میں پڑھنا لکھنا اور حساب وغیرہ سیکھے گا۔ اپنے خیالات کے اظہار کی تربیت بھی پائے گا۔ جغرافیا، دنیا اور اپنے ملک کی تاریخ اور ابتدائی سائنس کا مطالعہ کرے گا۔ اسے جسمانی ورزش کی تربیت روزانہ دیجائے گی۔ وقت وقت پر اس کا جسمانی معاینہ ہوتا رہے گا۔ اور جسم کو درست رکھنے کے لیے اسے ہدایات ملتی رہیں گی۔

جان کسی موسیقی یا آرٹ یا کسی دوسری تخلیقی سرگرمی میں بھی حصا لیتا ہے۔ اس ابتدائی اسکول میں جان ایسی باتیں سیکھتا ہے جو ہر ایک پیشے کے لوگوں کے لیے مفید ہوں۔ جان سال بھر میں ۱۸۰ دن ہفتے میں ۵ دن ہفتے سے جمعہ تک صبح پونے نو بجے اسکول آتا ہے اور شام کے ساڑھے تین بجے تک پڑھتا ہے۔ اس طرح جان ۱۲ برس کی عمر میں اس اسکول کے ان ہر دس طلبا میں سے نو کے ساتھ ہی تعلیم ختم کرتا ہے۔ جنھوں نے اس کے ساتھ ہی پہلی جماعت سے تعلیم شروع کی تھی۔ جب جان پبلک ہائی اسکول میں داخل ہوتا ہے تو اس کے سامنے کئی قسم کے مضامین اور کورس (نصاب) ہوتے ہیں جنھیں وہ اپنی پسند کے مطابق اختیار کر سکتا ہے وہ کالج کے لیے تیاری اور کوئی اور تجارتی اور حرفتی تعلیمی کورس اختیار کر سکتا ہے۔ ٹائپ اور بک کیپنگ (تجارتی حساب کتاب رکھنا) سیکھ سکتا ہے اور اس طرح تجارتی دنیا میں اس کے لیے کام کاج کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

وہ کسی اور پیشے کی تربیت بھی حاصل کر سکتا ہے اور حرفتی آلات اور اوزاروں کا استعمال سیکھ سکتا ہے وہ کھیتی باڑی کے کام یا ہوم میکنگ (گھر بسانے) کی تربیت پا سکتا ہے یا کوئی عام نصاب پسند کر سکتا ہے اور اس طرح چار برس تک کتنے ہی مضامین اور کھیل سرگرمیوں میں اپنے آپ کو ماہر بنا سکتا ہے۔ مثلاً فرض کیجیے اپنے بعض دوسرے ساتھیوں کی طرح جان ایسے مضامین پسند کرتا ہے جو کالج میں داخلے کے لیے ضروری ہوں۔ اور ان سے کالج میں داخل ہونے کا رستہ کھل سکتا ہو تو ان کے ساتھ ہی وہ کوئی حرفتی یا کسی اور پیشے کا کام بھی سیکھ سکتا ہے جس سے وہ کچھ کمانے کے قابل بھی ہو سکے۔ وہ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کر سکتا ہے کیونکہ ایک ہی عمارت میں دونوں طرح کی تعلیم کا انتظام ہے۔

جس طریق کار کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ امریکی نظام تعلیم کا اہم فیچر ہے۔ اور بعض دوسرے ملکوں سے قطعی مختلف ہے۔ امریکا میں نام نہاد خوش حال اور عام آدمی کے لیے الگ الگ طریق تعلیم کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اسکول میں سب کی یکساں اور متحدانہ زندگی اور تعلیم کو بعد کی متحدانہ زندگی اور تربیت کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ امریکا کے لوگ دستی حرفت کاری اور ہنرمندی کو بھی ویسی ہی عزت سے دیکھتے ہیں جس سے تعلیمی اور ذہنی کمال کو۔ امریکا کے صنعتی کارخانے تربیت یافتہ مزدوروں کو بھی اتنا ہی اچھا معاوضہ اور تنخواہ دیتے ہیں جس قدر دوسرے کاروباری تربیت رکھنے والے ماہرین کو۔

اس طرح ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران میں طلبا آسانی سے کئی قسم کی تربیت اور تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اور جو طالب علم کالج میں داخلے کی تیاری کر رہا ہے وہ اس کے ساتھ ہی کلرکی کا کام سیکھ سکتا ہے اور ایک طالب علم جو زراعت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے وہ نظم کا مضمون بھی لے سکتا ہے کیونکہ اسے یہ پسند ہے۔

اس طرح ہائی اسکول میں تعلیم کے چار برسوں میں ۱۴ سے ۱۷ برس تک کی عمر کے ۸۵ فی صد ساتھیوں کے ساتھ جن میں لڑکے لڑکیاں شامل ہیں جان چار خاص مضامین کا روزانہ مطالعہ کرتا ہے ہر مضمون کے لیے الگ ٹیچر ہیں۔ اور وہ ایک کے بعد دوسرے کمرے میں پڑھائی کے لیے جاتا ہے۔ ابتدائی اسکول میں وہ ایک ہی کمرے میں ایک ٹیچر کے پاس تعلیم پاتا رہا تھا۔ دن میں اسے دو

سے تین گھنٹے تک اپنا سبق وغیرہ یاد کرنے کے لیے ملتے ہیں لیکن وہ کچھ کتابیں اپنے ساتھ بھی لے جاتا ہے تاکہ رات کو بھی ایک دو گھنٹے مطالعہ کر سکے۔

سیکنڈری اسکول

ہائی اسکول میں جان کے وقت کا ایک چوتھائی حصہ انگریزی زبان اور اظہار خیالات کے طریقے سیکھنے میں گذرتا ہے اس کے وقت کا ایک اور بڑا حصہ معاشرتی مطالعے کرنے میں صرف ہوتا ہے جس میں عالمی تاریخ۔ امریکی تاریخ اور حکومت کے مسئلے شامل ہیں۔ سیکنڈری اسکول میں جان سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ریاضی اور سائنس کے نصاب اختیار کرے گا۔ اس کے جو ہم جماعت کسی ٹیکنیکل کالج میں داخل ہونا چاہتے ہیں وہ کچھ مزید مضامین کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ جسمانی اور صحت کے متعلق تعلیم کی بھی ضرورت ہے۔ جان نے جو حرفتی کام سیکھنا پسند کیا تھا اس میں اسے کارخانے میں عام قسم کا کام سال بھر کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر دو برس جماعت کے کارخانے میں لگانے پڑتے ہیں۔ باقی اختیاری مضامین میں سے جان شاید ہسپانوی زبان کا مطالعہ پسند کرتا ہے کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ شاید کسی دن وہ میکسیکو جائے گا۔ اور امریکا کے جنوب کی طرف اور ملکوں کو بھی دیکھے گا۔ ہائی اسکولوں میں نصاب کے مطالعے کے علاوہ دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینا امریکنوں کی ایک خصوصیت ہے۔ جان کو کھیل پسند ہیں۔ لیکن کھلاڑی بدن یعنی مضبوط جسم نہ ہونے کے باعث وہ ہائی اسکول کے طلبا کی طرف سے جو ہفتہ وار رپورٹ چھپتا ہے۔ اس میں کھیلوں کے مقابلے اور متعلقہ امور کے مضامین اور حالات لکھتا ہے۔ وہ گلی کلب (GLEE CLUB) میں شامل ہو کر ہر ہفتے گانے بجانے کی مشق کرتا ہے۔ اور بعد میں لڑکوں کے جلسوں میں گیت سناتا ہے ایک برس وہ "کیمرا کلب" میں شامل ہو کر خفیہ تصویریں کھینچتا اور انہیں تیار کرتا اور بڑھاتا ہے۔ آخری برس میں وہ "ڈیبیٹنگ کلب" (تقریریں اور بحث مباحثے کرنے کے کلب) میں شامل ہو کر پبلک میں تقریریں کرنے کا فن سیکھتا ہے۔

اور اس میں اپنی بڑھتی ہوئی قابلیت کا اظہار کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ ان سرگرمیوں کو خود طالب علم ہی شروع کرتے ہیں اور وہی ان کو چلاتے ہیں۔

اسکول انہیں کمروں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور اسکول کے عملے میں سے کچھ اشخاص ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔ طالب علم اپنی پسند کے مطابق ان سرگرمیوں میں سے کسی ایک میں حصہ لینے یا نہ لینے کا مجاز ہے۔

طلبا کے اس طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کو ان کی صحت مند تاعلامت سمجھا جاتا ہے۔ خاص کر اس لیے کہ اس ملک (امریکا) کی حکومت کی ذمے داری اس کے تمام باشندوں پر لاگو ہوتی ہے۔

اس طرح ۱۹۵۱ء میں جان اپنے ۵۰۰ ہم عمر طالب علم ساتھیوں کے ساتھ ہائی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر کوئی کام شروع کرتا ہے۔ اور اپنی روزی آپ کمانے لگتا ہے۔

ہم نے اوسط قسم کے طالب علم جان کا ذکر کیا۔ لیکن ہم اسی طرح مس میری کا بھی ذکر کر سکتے ہیں۔ تقریباً تمام لڑکیاں بھی ان ہی اسکولوں میں پڑھتی ہیں جن میں لڑکے پڑھتے ہیں اور وہ ویسے ہی نصاب اور مضامین پڑھتی ہیں۔ ہائی اسکول کے دنوں میں اکثر لڑکیاں ہم جماعت "گھر چلانے" کی تربیت پاتی ہیں۔ اور لڑکے کوئی اور ہنر یا پیشا سیکھتے ہیں۔

عالا تعلیم

اوسط قسم کے لڑکے کی حیثیت سے جان عالا تعلیم کے لیے کالج میں داخل نہیں ہوا۔ تاہم عالا تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو نظام تعلیم امریکا میں پایا جاتا ہے وہ بہت شاندار ہے ہائی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے والے دس طالب علموں میں سے چار لڑکوں میں سے تقریباً نصف اور لڑکیوں میں سے ایک تہائی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہوتے ہیں۔

۱۹۴۹-۵۰ء میں عالا درجے کے تعلیمی اداروں (کالجوں) کے ۱۸ سے ۲۱ برس کی عمر تک کے ۱۰۰ میں سے ۱۹ طالب علموں کو داخل کیا

اور ان کے علاوہ ۱۳۴۴ سابق فوجی سپاہیوں کو بھی داخل کیا گیا جن کی تعلیم میں جنگ کی وجہ سے رکاوٹ پڑ گئی تھی۔

۱۹۴۹-۵۰ء میں امریکا کے عالا تعلیمی کالجوں میں ۲۴۳۲۴۶۵ طلبا پورے وقت کے تعلیمی نصاب (کورس) کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور اسی عرصے میں گرمائی اسکولوں میں خط و کتابت حساب کتاب سیکھنے اور تو سیعی اور دوسرے قسم کے تربیتی اور تعلیمی اسکولوں غیر میں بیس لاکھ طلبا داخل تھے کئی دوسرے ملکوں میں جتنے طلبا سکنڈری اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں ان سے زیادہ تعداد میں امریکا کے عالا تعلیمی کالجوں میں طلبا داخل ہوتے ہیں۔ ابتدائی اور سکنڈری اسکولوں میں جس طرح لڑکے لڑکیاں مل جل کر تعلیم پاتی ہیں وہ طریقہ کالجوں میں بھی رائج ہے۔ امریکی محکمہ تعلیم نے حال ہی میں جو ڈائرکٹری شایع کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ امریکا میں عالا تعلیم کے جو ۱۸۵۹ کالج ہیں ان میں سے ۲۲۲ ایسے ہیں جن میں صرف لڑکوں کو اور ۲۵۸ ایسے ہیں جن میں صرف لڑکیوں کو داخل کیا جاتا ہے۔ ۴ تعلیمی ادارے ایسے ہیں جن میں نیگرو طلبا کی اکثریت ہے ۱۹۳۹ء سے ان کی تعداد میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ اور اس وقت ان میں ۷۰ ہزار نیگرو طالب علم ہیں۔ بہت سے نیگرو طالب علم ایسے تعلیمی اداروں میں تعلیم پاتے ہیں جن میں سفید فام طلبا کی اکثریت ہے۔

امریکا کی ۴۸ ریاستوں میں سے ۱۷ ریاستیں ایسی تھیں جن میں ریاستی قانون کے سخت نسلی امتیاز کی بنیاد پر الگ الگ تعلیمی ادارے تھے لیکن عدالتوں کے فیصلوں اور مقدموں کی وجہ سے ان میں سے اب ریاستوں میں نیگرو طلبا کو پبلک ہائی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے اور کوئی حرفت سیکھنے کے لیے داخل کیا جاتا ہے ان ریاستوں کے پرائیویٹ تعلیمی اسکولوں اور کالجوں میں بھی اب اس پر عمل ہو رہا ہے۔ عالا تعلیمی ادارے چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی۔ بعض میں تو ایک سو طالب علموں سے بھی کم اور چند ایک میں پچاس ہزار طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔ ہر ایک تعلیمی ادارہ اکثر و بیشتر معاملوں میں اپنی تعلیمی پالیسی خود مرتب کرتا ہے جہاں تک تعلیمی معیار اور قابلیت کا تعلق ہے اس مقصد کے لیے ان سب تعلیمی اداروں نے ایسی انجمن میں اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر منظم کیا ہے جو مطلوبہ تعلیمی معیار رکھنے والے تعلیمی اسکولوں اور کالجوں کی فہرست کا اعلان کرتی ہے۔ طالب علم ایک مستند اسکول سے دوسرے مستند اسکول میں وقت ضایع کیے بغیر آسانی سے داخل ہو سکتے ہیں۔ یا ہر کا جو طالب علم امریکا میں تعلیم پانے کے لیے آتا ہے وہ اچھی تربیت پانے کے متعلق اپنے اطمینان کی غرض سے مستند سمجھا جانے والے تعلیمی اداروں کے متعلق اپنے تعلیمی پلان کے مطابق معلومات حاصل کر سکتا ہے امریکا میں جونیئر کالج جنہیں یونین کمیونٹی کالج بھی کہا جاتا ہے بہت تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ ان میں دو برس کا نصاب ہوتا ہے۔ یہ کالج ہائی اسکولوں کے اوپر کے درجے کے کالج ہیں۔ (جنہیں ہند میں انٹرمیڈیٹ کالج کہا جاتا ہے) اور پبلک ہائی اسکول کا ہی ایک حصہ ہیں۔ یہ کالج تعلیمی سہولتیں دیتے ہیں۔ طالب علموں کے ایک حصے کے لیے ان کے گھروں اور علاقوں کے نزدیک ہی تعلیم حاصل کرنے کا انتظام ہوتا ہے اور بعد میں وہ طالب علم کالج کے چوتھے ساتھ (فورتھ ایئر) اے۔ اے میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح کالج کی تعلیم مکمل کرتے ہیں۔

ان کالجوں میں اکثر کوئی پیشا یا فنی اور ٹیکنیکل تعلیم کمیونٹی میں تجارت وغیرہ کے مواقع کے مطابق دی جاتی ہے۔ عالا تعلیم کے دوسرے شعبوں کی طرح دن کو اور رات کو تعلیم دیے جانے کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ تاکہ طالب علم تعلیم کے اپنی آمدنی کے لیے کوئی کام کاج کرنے کے گھنٹوں کے مطابق عمل کر سکیں۔ یہ اسکول بھی چھوٹے اور بڑے پیمانے کے ہیں۔ بعض میں تو دس ہزار سے بھی زیادہ طالب علم تعلیم و تربیت پاتے ہیں۔ عالا تعلیمی اداروں میں مضامین میں غیر معمولی وسعت اور قسمیں پائی جاتی ہیں۔ کسی مثالیا کالج میں مضامین کی تعداد جس میں بی۔ اے کی ڈگری دی جاتی ہے اتنی ہو سکتی ہے کہ ایک طالب علم پورے وقت کے مطالعے کے بعد تیس برس یا اس سے بھی زیادہ عرصے میں ان سب کو مکمل کر سکے۔ گریجویٹ جماعتوں میں خاص خاص مضامین کی بھاری بہتات پائی جاتی ہے کسی بھی مضمون کا مطالعہ کرنے کے لیے نصاب پائے جاتے ہیں۔ ہائی اسکولوں میں بھی یہی حال

ہے حال ہی کی ایک رپورٹ سے پایا جاتا ہے کہ ۵ یا اس سے زیادہ ریاستوں کے ہائی اسکولوں میں ۱۹ اور ۱۵ سے کم ریاستوں میں ۸۰ قسم کے زاید مضامین پڑھانے کا انتظام ہے۔

خاص خاص مضامین میں مہارت حاصل کرنے کے ردعمل کے طور پر بعض معلم (ٹیچر) یہ مطالبا کر رہے ہیں کہ تمام طلبا کے لیے بنیادی طور پر عام قسم کے زیادہ مضامین رکھے جائیں۔ یہ طریقہ سکنڈری اسکولوں میں بعض بنیادی قسم کے نصاب شامل کرنے سے عمل میں لایا جا رہا ہے اور اس میں معمول کے نصاب (کورس) اور بعض دوسرے مختلف مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اور اس قسم کا طریقہ اونچے درجوں میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض کالج عام قسم کی تعلیم پر زور دیتے ہیں۔

غیر پبلک اسکول

اوسط امریکی طالب علم کی تصویر پیش کرتے ہوئے جان کی مثال دی گئی تھی جو ٹیکسوں کی آمدنی پر چلنے والے مفت پبلک اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ اکثر بچے ایسے ہی تعلیم پاتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں پبلک المنٹری (ابتدائی یا پرائمری) اسکولوں میں ۱۹۴۷۷۹۱ طالب علم تھے اور غیر پبلک ابتدائی اسکولوں میں ۲۷۲۳۸۱۴ طلبا زیر تعلیم تھے۔ اسی برس میں پبلک ہائی اسکولوں میں ۵۷۳۸۴۳ اور غیر پبلک ہائی اسکولوں میں ۶۹۵۱۹۹ طلبا تعلیم پا رہے تھے

جیسا کہ انسانی حقوق کے عالم گیر میں کہا گیا ہے۔ امریکا میں رائے عامہ اس بات کی حامی ہے کہ والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو جس قسم کی تعلیم دینا چاہیں اس کا فیصلا اپنی پسند کے مطابق کریں۔

نصف سے زیادہ غیر پبلک اسکول کلیساؤں (چرچ) کی طرف سے جاری ہیں۔ باقی اسکول انفرادی طور پر منافع کمانے کے لیے اور بعض منافع نہ کمانے والے اداروں کی طرف سے پبلک کی خدمتگزاری کے خیال سے جاری ہیں۔ پرائیویٹ اسکولوں کی آمدنی کا ذریعہ طلبا کی فیس ہے باقی آمدنی چندے اور عطیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ کلیساؤں کی طرف سے جو اسکول جاری ہیں ان کی امداد عموماً متعلقہ کلیسائی اداروں کی طرف سے ہوتی ہے۔

عالا درجے کی تعلیم پانے والے طلبا بھی تقریباً مساوی طور پر پبلک اور غیر پبلک کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ پبلک کے تعلیمی ادارے اوسطاً بڑے بڑے ہیں۔ لیکن کلیساؤں کی طرف سے جو غیر پبلک اور پرائیویٹ کالج ہیں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ دونوں طرح کے کالجوں میں طلبا کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ عالا تعلیمی پبلک کالجوں میں طلبا کی تعداد میں زیادہ تیزی سے اضافا ہو رہا ہے اور شکر کا مقام ہے کہ لوگ اس مقصد کے لیے زیادہ کھلے دل سے ٹیکس دیتے ہیں اور جن طلبا نے تعلیم ادھوری چھوڑ کر جنگ کے دنوں میں فوج میں نوکری کی تھی انہیں اپنی ادھوری تعلیم کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے دیا جا رہا ہے۔

اسکولوں کی نسبتی قابلیت کے متعلق بحث مباحثے جاری رہتے ہیں۔ پبلک یا پبلی اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ کوئی ایک شخص یا ایک جماعت کوئی بھی ایسا اسکول جاری کر سکتی ہے جو ریاست کے تعلیمی معیار کو پورا کر سکے۔

مختلف زبانوں کے جاننے والوں نے اپنی اپنی مادری زبانوں میں تعلیم دینے کے لیے بھی اسکول کھول رکھے ہیں اور ایسے اسکول بعض پبلک اسکولوں کی امداد کرتے یا ان کے متبادل کے طور پر بھی کام دیتے ہیں۔

تصوری یا ذہنی طور پر غیر پبلک اسکولوں میں جو مقابلا ہوتا ہے اسے پبلک اسکولوں کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔ غیر پبلک اسکول تعلیمی بہتری کے لیے نئے نئے تجربے کر سکتے ہیں۔ اور ایسی لیبارٹریوں کے طور پر کام دے سکتے ہیں کہ جن میں نئی تجویزوں اور تجربوں کی خوبیوں کے متعلق پبلک خود فیصلا کر سکتی ہے۔

غیر رسمی اور بالغوں کی تعلیم

رسمی تعلیم کے علاوا امریکا میں غیر رسمی قسم کی تعلیم کے لیے بھی وسیع راستے ہیں۔ ان میں عجایب گھر لائبریریاں میگزین رسالے

فلمیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نصف ارب کے قریب کتابیں شامل ہیں

امریکا میں ۱۰۰۰ پبلک لائبریریاں ہیں جو بہت سے علاقوں میں گشتی کتب خانوں کا انتظام کرتی ہیں۔ کرائے پر کتابیں دینے والی پچاس ہزار سے زیادہ لائبریریاں اور ڈیڑھ ہزار ادارے کتابیں کرائے پر دیتے ہیں جنھیں ڈیڑھ ہزار بڑے بڑے کتب فروش چلاتے ہیں

تجارت اور صنعت کی طرف سے لوگوں کو کارخانوں میں ہی تربیت دینے کا انتظام ہے اور مزدوروں کو بھی لیڈرشپ کی تربیت دیجاتی ہے مزدوروں کی تنظیموں کے اپنے ریڈیو اسٹیشن ہیں اور اپنے اخبارات اور رسالے ہیں۔ زراعت کے توسیعی پروگرام کے تحت ماہرین کھیتوں اور فارموں پر کسانوں کو تربیت دیتے ہیں۔ اپنے آپ تعلیم حاصل کرنے کے دوسرے وسیع اوسیکڑوں ذرائع ہیں۔

مثلاً اپنے گھروں میں (کلیساؤں میں)، اور سیکڑوں معاشرتی تنظیموں کے ذریعے یونین گروپس (نوجوانوں کی تنظیمیں) وممتر کلبس (عورتوں کے کلبوں) شہری اور برادری اور دوسری پروفیشنل تنظیموں کے ذریعے تعلیم دیجاتی ہے۔

پبلک اسکولوں میں تقریباً ۲۵ لاکھ بالغ کسی نہ کسی قسم کی تعلیم کے پروگرام کے مطابق تعلیم حاصل کر رہے اور تقریباً ۸۰ لاکھ بالغ اشخاص ریاستوں کی یونیورسٹیوں اور دوسرے علاوہ درجے کے تعلیمی اداروں کی عام اور خاص خاص جماعتوں میں داخل ہیں ان میں سے بہت سے تعلیمی اسکول اور کالج ادھار یا نقد فیس کی ادائی کے طریقوں سے خط و کتابت کے ذریعے کالج اور سکنڈری درجے کی تعلیم دیتے ہیں۔

۱۹۵۰-۵۱ء میں مرکزی سرکار کی طرف سے امداد پانے والے پیشہ وارانہ تعلیم دینے والے حرفتی اسکولوں میں شام کی جماعتوں میں اور نصف وقت کی تعلیم پانے والوں کی تعداد ۲۱۱۶۳۰۳ تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تین کروڑ بالغ (یعنی ہر چار میں سے ایک سے زیادہ کسی نہ کسی قسم کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔

خاص قسم کی تعلیم

مرکزی سرکار بچوں کی خاص قسم کی تعلیم کے لیے امداد دیتی ہے مثلاً جسمانی طور پر معذور یا کند ذہن معاشرتی طور پر یسیماندہ بچوں کے لیے، یعنی ایسے بچوں کو جن کی بولنے، سننے اور دیکھنے کی قوت ناقص ہوگئی ہو، یا اپاہج۔ دماغی طور پر مفلوج، دل کی بیماری میں مبتلا یا لاغر بدن ہوں۔ ان کو خاص قسم کے سامان کی مدد سے خاص تعلیمی پروگرام کے تحت تعلیم دیجاتی ہے۔ بہت سے شہروں میں اپنے بچوں کو جو گھروں سے باہر نہیں جا سکتے انہیں بستروں پر ہی ماہر استاد تعلیم دیتے ہیں۔ چند ایک شہروں میں خاص قابلیت کے بچوں کے لیے پورے یا ادھے وقت کے اسکول جاری ہیں۔ اور معمولی ابتدائی اور سکنڈری اسکولوں میں بھی ایسے طالب علموں کی قابلیت میں مزید اضافا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔

۱۹۴۹-۵۰ء میں بچوں کے لیے تعلیم کے سماوی مواقع دینے کے لیے، ۷ لاکھ بچوں کو روزانا اسکولوں میں لانے کے لیے بسوں کا استعمال کیا جا رہا ہے اس طرح کھیتوں اور فارموں پر رہنے والے بچوں کو بھی ویسی ہی اچھی تعلیم ملتی ہے جیسی شہروں میں رہنے والے بچوں کو۔

امریکا میں تعلیم کا بہت بڑا کاروبار اور انتظام ہے اس پر سالانا ۲۲۸ ڈالر فی طالب علم پبلک اسکولوں میں روزانا تعلیم حاصل کرنے کے لیے خرچ ہوتے ہیں۔ اس میں سرمایا اور سود وغیرہ شامل نہیں امریکا کے لوگوں نے ۱۹۵۱-۵۲ء میں سکنڈری اور ابتدائی اسکولوں پر ۶ ارب ۹ کروڑ ڈالر اور کالجوں پر ایک ارب ۹ کروڑ ڈالر صرف کیے۔

ہر قسم کے اسکولوں میں ۱۳ لاکھ استاد ہیں جنھوں نے اپنی تربیت میں ۱۲ برس کے علاوہ ابھی مزید تین برس لگائے ہیں (یعنی ٹیچرز کالج میں)

ہم میں سے جو لوگ امریکا کے اسکولوں کے متعلق بہترین معلومات رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہاں کے عظیم تعلیمی کارنامے میں جو بات خاص طور پر نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک طالب علم کو بہترین فرد بنانے کے لیے جاری توجہ دی جاتی ہے اکثر سکولوں میں عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہر مرحلے کے مطابق تعلیمی نصاب میں انفرادیت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی جاتی ہے تاکہ ہر ایک طالب علم کے باطنی جوہر خوب اجاگر ہو سکیں۔

کچی سبزیاں کھانے کے فائدے

ا۔ ا

زبان کی لذت کے لیے سبزیوں کو پکانے اور تلنے کے لیے بیسیوں طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن کسی بھی خوراک سے زیادہ سے زیادہ قوت اسی صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے جبکہ اسے زیادہ سے زیادہ اندرونی حالت میں استعمال کیا جائے۔ ایک سبزی کو پکانے یا تلنے سے اس کے بعض نہایت ضروری وٹامن اور معدنی نمک کے اثرات زایل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آدھ سیر کچی ہوئی بند گوبھی سے آدھ سیر کچی بند گوبھی کی نسبت اس کے صرف آدھے وٹامن میسر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اشیائے خوردنی کو ان کی قدرتی حالت میں استعمال کرنے کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اس کے اندازے کے لیے صرف یہ تصور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک سبزی کو پکانے کے لیے اسے چھیلنے کاٹنے اور گھنٹوں چولھے کے پاس بیٹھکر بنانے میں کس قدر وقت اور قوت صرف ہو جاتی ہے، اور ایندھن پر جو رقم خرچ ہوتی ہے وہ ان کے علاوہ ہے اگر سبزی کو اس کی قدرتی حالت میں کھانے کی عادت ڈالی جائے تو ایندھن پر صرف ہونے والی رقم سے دیگر ضروری اشیا خریدی جا سکتی ہیں۔

لیکن کھانے پینے کے بارے میں لوگوں کی عادتوں کو یکایک نہیں بدلا جا سکتا، اور یہ توقع رکھنا عین عبث ہوگا کہ ملک کے تمام لوگ کل صبح سے سبزیوں کو پکانا اور تلنا بند کر دیں گے۔

اس لیے اس عادت کو شروع کرنے کے لیے دو طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ (۱) پکانے کی ایسی صورتوں سے احتراز کیا جائے جن میں سبزیوں کے حیات بخش اجزا کا انتہائی نقصان ہوتا ہو اور (۲) روزانہ خوراک میں ایسی سبزیوں کا اضافہ کیا جائے جو کچی کھائی جا سکتی ہیں۔

خوراک زندگی کا پشتارہ ہے لیکن اگر اس کے پکانے میں احتیاط نہ برتی جائے تو اس سے صحت کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ تلی ہوئی چیزوں کا استعمال تو صحت کے لیے بہت ہی مضر ہے رسمی چیزوں کے کھانے کا شوق بہت سے لوگوں کو ہوتا ہے کیونکہ یہ خوش ذائقہ ہوتی ہیں۔ ان چیزوں کو مزیدار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انہیں بہت تیز آنچ پر پکایا جائے تیار ہونے کے بعد جب انہیں کڑاہی سے نکالا جاتا ہے تو ان پر گرم تیل یا گھی کی تہ جمی ہوتی ہے اور اگر تلی ہوئی چیزوں کو ان کے ٹھنڈا ہونے پر کھایا جائے تو یہ تہ اور بھی زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے چکنائی کی یہ تہ معدے کے لیے بہت خراب ہوتی ہے۔ تلی ہوئی چیزوں کو ہضم کرنے کے لیے معدے کو بڑی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے لیکن یہاں سب سے زیادہ ضرورت یہ ہے کہ زیادہ تیز آنچ پر تیار ہونے کے بعد ہر چیز کے قوت بخش اجزا کا پورے طور پر یا زیادہ تر تلف ہو جانا یقینی ہے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ سبزیوں کو ہلکی آنچ پر پکایا جائے اور پکانے کے لیے ان میں پانی یا تو بالکل نہ ڈالا جائے یا بہت تھوڑی مقدار میں ڈالا جائے تاکہ وہ اپنے رس سے ہی پر ہو جائیں۔ اور ان کے تمام قوت اجزا سالم صورت میں ان میں محفوظ رہیں گاجر، بند گوبھی، چقندر، مولی، کھیرا، ٹماٹر، پیاز اور سلاد۔ یہ سب کچے کھائے جا سکتے ہیں۔ امرود، سیب، آڑو اور خوبانی یہ سب چھلکے سمیت کھائے جا سکتے ہیں۔ کچی سبزیاں کھانے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ وہ غدیخدوزوں طور پر چبائی جاتی ہیں، اور اس سے دانتوں کو اچھی ورزش ہو جاتی ہے جس سے یہ مضبوط اور صحت مند رہتے ہیں۔ چبانے کے بعد کچی سبزیاں ہضم بھی آسانی سے ہو جاتی ہیں۔

لیکن کھانے سے قبل سبزیوں کو ہمیشہ پانی سے اچھی طرح دھو لینا چاہیے وباؤں کے دنوں میں انہیں جس پانی سے دھویا جائے اس میں پوٹاشیم منگینیٹ ڈال لینا چاہیے۔ یہ کئی وجوہ سے ضروری ہے اکثر سبزیاں گندی زمین یا گندی سطح کے نواحی کھیتوں میں پیدا ہوتی ہیں اس لیے ان کے ساتھ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم کے چمٹ جانے کا امکان ہے ان کے علاوہ جب انہیں فروخت کے لیے بازار میں لایا جاتا ہے تو ان کو کئی لوگوں کے ہاتھ لگتے ہیں جن میں سے بعض پر جراثیم بھی ہو سکتے ہیں اور پھر جب یہ سبزیاں اور پھل کھلی صورت میں بازار میں بکتے ہیں تو ان پر مکھیاں بیٹھتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے ان پر جراثیم اور غلاظت رہ سکتی ہے۔

برطانیا میں کامن ویلتھ کے طلبا کیلیے تعلیمی سہولتیں

ب۔ ڈ

اس وقت کامن ویلتھ میں ایک سو سے زیادہ یونیورسٹیاں یونیورسٹی کالج اور زراعت، آرٹ، کامرس و ٹیکنالوجی وغیرہ مضامین کے عالا مطالعے کے لیے مزید کئی سو ادارے موجود ہیں گو تمام یونیورسٹیاں مذمختار ہیں۔ اور پوری آزادی سے اپنا کام چلاتی ہیں۔ تاہم ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ عالا تعلیم کے لیے ان کا انتظام بہت اچھا اور سادا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ملک کے طلبا بغیر کسی دقت کے دوسرے ملک کے اداروں میں داخل ہو سکتے ہیں۔

کسی ایک ملک کی متعدد یونیورسٹیوں کے اندر بھی نصاب تعلیم مشترک نہیں ہوتا۔ اس لیے طلبا کے داخلے کے لیے تعلیمی شرائط کا فیصلہ ہر یونیورسٹی ہی کرتی ہے نہ کہ کوئی مرکزی ادارہ۔ طلبا عموماً اسکول چھوڑنے یا ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہی دوسرے ملک میں عالا تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔

کامن ویلتھ کے تمام حصوں سے برطانیا آنے والے طلبا کی تعداد پہلے کی بہ نسبت آج کل بہت بڑھ گئی ہے انڈر گریجویٹ طلبا زیادہ تر محکوم علاقوں سے آتے ہیں یا پھر ایسے ممالک سے جہاں عالا تعلیم کی سہولتیں پوری طرح موجود نہیں لیکن گریجویٹ طلبا کامن ویلتھ کے تمام ممالک سے آتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ برطانیا میں موجود ریسرچ کے خاص ساز و سامان اور سہولتوں سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔

آکسفورڈ اور کیمبرج کی دونوں پرانی یونیورسٹیاں اور ان کا عالا تعلیمی انتظام غیر ملکی طلبا کے لیے کشش کا بھاری باعث ہے۔ لیکن ان یونیورسٹیوں میں جگہ صرف خاص قسم کے طلبا ہی کو ملتی ہے لندن میں ہر قسم کے غیر ملکی طلبا کی بھرمار ہے لندن اور ایڈنبرا یونیورسٹیوں کے میڈیکل اسکولوں میں داخلے کی مانگ ان کی عالمگیر شہرت کے باعث بہت زیادہ ہے۔

۱۹۵۱-۵۲ء میں برطانوی یونیورسٹیوں میں کامن ویلتھ کے ۴۲۰۰ طلبا داخل تھے ان میں ہندستان کے ۸۳۱ مغربی افریقی علاقوں کے ۷۰۵ آسٹریلیا کے ۴۵۱ کینیڈا کے ۳۸۰ اور ویسٹ انڈیز کے ۳۱۴ طلبا تھے۔

عالا تعلیم کے شیدائی صرف برطانیا کی طرف ہی نہیں بھاگتے بلکہ دوسرے کامن ویلتھ ممالک کے درمیان بھی ان کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر کولمبو پلان کے تحت۔ ہندستان، پاکستان سیلون اور ملایا کے بہت سے طلبا عالا تعلیم کے لیے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھیجے گئے ہیں۔ خود برطانیا کے کئی طالب علم پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے سمندر پار ممالک میں جاتے رہتے ہیں۔ کامن ویلتھ یونیورسٹیوں کے اداروں کی متعدد گوناگوں دلچسپیاں اس لحاظ سے کامن ویلتھ کے شہریوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔

ان یونیورسٹیوں میں کامن ویلتھ سے باہر کے طلبا بھی تعلیم پا رہے ہیں لیکن زبان کے علاوہ کئی اور باتیں ایسی ہیں جن کے باعث کامن ویلتھ کے طلبا کامن ویلتھ کے اندر ہی رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کامن ویلتھ کی قریب قریب ہر یونیورسٹی کے اسٹاف میں کامن ویلتھ کے دوسرے ممالک کے پروفیسر اور لکچرار تعینات ملیں گے۔ کامن ویلتھ کے ممالک کے درمیان داخلی اور خارجی آسامیوں پر ٹیچروں کا تبادلہ ہوتا ہی رہتا ہے۔

طلبا کی راہ میں اگر کوئی چیز حایل ہے تو وہ اخراجات کا سوال ہے۔ اگرچہ بہت سے طلبا اپنے خرچ پر دوسرے ممالک میں بھیجا جاتے ہیں گے۔ تاہم اس سلسلے میں حکومت اور پرائیویٹ

فنڈوں سے مالی امداد اور وظیفے بہت کام آتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ چیز بھی بہت اہم ہے کہ طلبا کو غیر ممالک میں وظیفے کی سہولتوں کے بارے میں اطلاعات آسانی سے مل سکیں اس غرض کے لیے کامن ویلتھ کی یونیورسٹیوں نے سرکاری امداد کے بغیر ہی لندن میں اپنا ایک دفتر کھول رکھا ہے جو اس قسم کی اطلاعات تقسیم کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی یونیورسٹیوں نے اور خصوصاً ان یونیورسٹیوں نے جو طلبا کو پوسٹ گریجویٹ مطالعے کے لیے باہر بھیجتی رہتی ہیں۔ اپنے اپنے اسکول یا کالج میں دفتر اطلاعات کھول رکھے ہیں۔ اور جو یونیورسٹیاں اپنے ہاں غیر ملکی طلبا کو داخل کرتی ہیں انہوں نے اکثر غیر ملکی طلبا کے لیے ایک مشیر مقرر کر رکھا ہے جو طلبا کی آمد سے پہلے ان کے ساتھ خط کتابت کرتا ہے اور انہیں ہر قسم کا مشورہ دیتا ہے۔

غرض کہ کامن ویلتھ کا آج کل کا طالب علم جب اپنے ملک کو واپس لوٹتا ہے تو اسے اکثر حکومت یا صنعت میں خوب دار آسامی کی جاتی ہے اور اسے دوسرے ممالک کے لوگوں کے طرز زندگی کا ذاتی تجربا بھی ہو جاتا ہے۔

پریوں کے قصے

شمالی آئرلینڈ میں پریوں کے وجود کے متعلق بہت زیادہ یقین پایا جاتا ہے۔ اور ان کے متعلق قصے اور کہانیاں اتنی زیادہ پسند کی جاتی ہیں کہ آئرلینڈ کی روایات اور عقاید کا مطالعہ کرنے والے کمیشن نے ان کہانیوں پریوں کے کارناموں کہاوتوں وغیرہ کو جمع کرنے کے لیے مسٹر مائیکل جے مرفی کی خدمات حاصل کی ہیں مسٹر مائیکل کو اس قسم کی باتوں سے بہت زیادہ دلچسپی ہے

غزل

اطہر شیر صبا

منگوں کے رنگیں اشاروں سے کھیلا
جوانی کے پرشور دھاروں سے کھیلا
عجب شوق منزل کی رنگینیاں تھیں
کہ میں پرخطر رہگذاروں سے کھیلا
مرے سوز غم کی کہانی ہے اپنی
کہ الفت سے اٹھتے شراروں سے کھیلا
امیدوں کا مدفن بنانے چلا ہوں
ہمیشا میں جن کے سہاروں سے کھیلا
رکی منجدھار میں اپنی ناؤ کشتی
عجب کھیل میں نے کناروں سے کھیلا
وہ بکھرائیں زلفیں وہ سرکائے آنچل
میں پہروں ترے ان نظاروں سے کھیلا
بگولوں سے الجھا لڑا آندھیوں سے
میں طوفان کے تیز دھاروں سے کھیلا
چمن میں صبا یوں گذرتی ہے اپنی
نہ گل ہات آئے تو خاروں سے کھیلا
دل داغ داغ اپنا رشک چمن ہے
قفس میں بھی میں لالہ زاروں سے کھیلا
ملی فطرت دل کو ایسی شگفت
خزاں میں بھی رہ کر بہاروں سے کھیلا
کہوں کیا کہ اے دوست فرقت میں تیری
میں الجھوں میں نے ستاروں سے کھیلا
صبا تیرا یہ شغل کتنا حسیں ہے
ہمیشا جو تو گلعذاروں سے کھیلا

قمرالدین قمر

حیات انسانی اور اس کی مدت

حیات انسانی کے متعلق بیشتر کتابیں لکھی گئی ہیں اور جدید اور قدیم محققین نے اپنے وسیع مطالعے اور تجربے کے بعد اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں ہندستانی میں اب تک کوئی ایسی مستند کتاب نہیں لکھی گئی اور نہ کسی زبان سے ترجمہ کی گئی جس میں حیات انسانی پر مدلل بحث کی گئی ہو۔ میں نے اپنے تحقیقی مضمون میں اس موضوع پر پوری وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی اور سہل طریقے پر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں "حیات" اور اس کی "مدت" کیا ہے۔

انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان ہمیشہ کسی نہ کسی مشغلے کی تلاش میں کھویا رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ایک تلاش مکمل ہو جاتی ہے تو ہم بغیر انتظار کیے پھر کسی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ختم ہونے والا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہ تقاضا ہر دل میں چٹکیاں لیتا اور ہر دماغ اس کی کسک محسوس کرتا ہے۔ کوئی دماغ اس کا معمول ہوتا ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ماحول کے متعلق کھوج لگائے۔ وہ سوچتا ہے اور غور و فکر کے بعد کسی فیصلا کن نتیجے پر پہنچتا ہے کوئی دماغ سرے سے کچھ سوچنا ہی پسند نہیں کرتا اور آنکھ بند کر کے پرانی لکیر پر چل پڑتا ہے اسی کا نام اندھی تقلید ہے۔

اندھی تقلید

اندھی تقلید ہمیشہ ناکارا ثابت ہوتی ہے بعض اوقات تو یہ خطرناک نتائج کا سبب بن جاتی ہے اندھی تقلید ہمیشہ وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دماغی قوا نشو و نما سے محروم رہتے ہیں۔ یا جن کے ذہن غور و فکر کو کفر سمجھتے ہیں۔ وہ ہوش سنبھالتے ہی مقلد انا ذہن رکھتے اور قدم قدم پر تقلید ہی کو اپنا شعار بناتے ہیں یہ ضرور ہے کہ اس میں فوائد ہیں لیکن فوائد سے زیادہ ہمیں نقصان کا خطرہ رہتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ ماں روزہ رکھ رہی ہے ہم نے بھی رکھنا شروع کر دیا۔ باپ کو مسجد جاتے دیکھا ہم نے بھی ادھر کا رخ کر دیا۔ لیکن کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ نماز اور روزہ کیا ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے اور یہ کیوں فرض قرار دیے گئے ہیں۔ کیونکہ اس سلسلے میں کچھ تو خوف مانع رہا اور کچھ بزرگوں کی طرف سے حسن ظن۔ یہی اندھی تقلید آگے چل کر خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور ہم زہر کو امرت سمجھ کر پی جاتے ہیں۔

دماغ اور اس کا ارتقا

ہر دماغ ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہے اور اس میں کام کرنے والے پرزے بھی ایک ہی قسم کے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی آدمی نہایت بیوقوف ہوتا ہے اور کوئی بڑا عقل مند، کوئی جاہل اور کوئی تعلیم یافتہ۔ دماغ کی مثال اگر ہندی کی پتیوں سے دوں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ جس طرح پسینے کے بعد مہندی میں رنگ آتا ہے اسی طرح دماغ پر بھی جب تک چوٹ نہیں پڑتی اس میں بھرنے اور وسعت پذیر ہونے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لیے ضروری ہے کہ ہم غور و فکر کے ذریعے دماغ پر چوٹ دے کر اسے اس کی ارتقائی منزل پر پہنچائیں۔ جس طرح انسانی زندگی اپنی اصلی غذا حاصل کر کے نشو و نما پاتی ہے دماغ بھی بتدریج پرورش پاتا اور اس میں نیک و بد کے تمیز کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹے بچے کو لے لیجیے۔ وہ کبھی اپنے دماغ پر زور نہیں ڈالتا۔ وہ جو کچھ ہمیں کرتے دیکھتا ہے وہی خود کرنے لگتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کا دماغ ابھی ناپختہ ہے اور وہ کسی چیز پر حکم لگانے سے قطعی قاصر ہے۔

انسان کیوں سوچتا ہے

یہ انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ ہر چیز کے متعلق سوچے

ہمارے پیدا ہوتے ہی اس کرہ اور اس کے اوپر اور نیچے عوام کا ذرا ذرا ہمارے سامنے ایک سوال بن کر آتا اور پوچھتا ہے۔ تو میں کون ہوں۔ میں کیا ہوں اور میں کیوں ہوں ہم اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں کہ ایک ایک سوال کا تشفی بخش جواب دیں۔ کبھی ہم چاند اور ستاروں کے متعلق سوچتے ہیں۔ کبھی زمین کی گردش، آسمان کی بلندی، سمندر کی گہرائی اور نظام شمسی پر قیاس آرائی کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارا ذہن انسانی جسم کی مشنری اور اور اس کے پرزوں کی طرف بھی لوٹتا ہے۔ یہ مشنری جو مختلف پرزوں کے ذریعے حرکت کر رہی ہے یہ کیا ہے اور کہاں سے زندگی حاصل کر رہی ہے؟

جسم انسانی کیا ہے

جسم انسانی اجزائے ترکیبی "آب، آتش، خاک، باد" کا مرکب ہے ان ہی سے پیدا ہوا۔ ان ہی سے زندگی حاصل کرتا اور فنا ہو کر ان ہی میں مل جاتا ہے۔ یہ عناصر اربعہ زندگی کے ضامن اور نشو و نما کے مددگار ہوتے ہیں۔ آگ ہمیں حرارت بخشتی۔ ہوا میں سانس لیتے پانی پیتے اور مٹی سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ اگر ان میں کے ایک جز سے بھی ہم محروم ہو جائیں تو شاید ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی کی طلب ہوتی ہے۔ سوچیے تو ایسا کیوں ہوتا ہے اور موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہمیں ضروریات زندگی میں بھی کیوں رد و بدل کرنا پڑتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہر جز دوسرے جزو کی ضد ہے اور یہ کلیہ ہے کہ جب تک ایک ضد کے مقابل دوسری ضد نہیں رکھی جاتی تشفی ناممکن ہے۔ علم کیمیا کے ماہرین کا قول ہے کہ ایک ضد کے خواص دوسری ضد کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو کسی عربی فلاسفر نے یوں کہا ہے "الاشیاء تعرف باضدادھا۔"

ہماری قیاس آرائیاں

حیات انسانی کیا ہے اور ہمیں اس کرہ عالم پر کتنے عرصے تک زندہ رہنا چاہیے۔ اس کے متعلق اکثر قیاس آرائیاں ہوتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ انسانی حیات کی موت۔ جذاذل کاتب تقدیر نے اس کی قسمت میں لکھ دی ہے جس سے کم اور نہ زیادہ انسان زندہ رہتا ہے کوئی عالم وقت بن کر یہ فتوا صادر فرماتا ہے کہ "خدا تک چاہتا فلاں کو زندہ رکھتا اور جب چاہتا اٹھا لیتا ہے" کوئی کہتا ہے کہ انسان اگلے جنم میں جیسے افعال کرتا ہے دوسرے جنم میں اسی حساب سے زندگی پاتا ہے گویا ؎ ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد

کرغیزیا میں تعلیم عام کی ترقی

سوویت عہد حکومت میں کرغیزیا کے عوام نے سرمایہ دارانہ دور ارتقا سے دامن بچا کر براہ راست مذہبی و جاگیر دارانہ نظام کا تختہ الٹ کر سوشلزم کی راہ اختیار کر لی۔ آج کرغیزیا ایک نہایت عالی ترقی یافتہ صنعتی اور پنچایتی کاشتکاری والی جمہوریا ہے۔ عہد عوام میں سے کرغیزی دانشوروں کی ایک بڑی تعداد ابھر کر آئی۔

سوویت عہد حکومت سے پہلے کرغیزی اسکولوں میں سات ہزار کے قریب بچے پڑھتے تھے یعنی اسکولی عمر کے تمام بچوں میں سے چار فیصدی سے بھی کم۔ اسکول جانے والے ان بچوں میں بھی اکثریت روسی افسروں اور مقامی امرا کے بچوں کی تھی۔ آج مزدوروں پنچایتی کاشتکاروں اور دانشوروں کے تین لاکھ سے زیادہ بچے اسکول جاتے ہیں۔ جمہوریا میں ہر چوتھا فرد تعلیم حاصل کرتا ہے۔ پہلے دو سو سے کچھ ہی زیادہ مدرسے تھے۔ آج کل ستر ہزار سے زیادہ ہیں۔

سابقہ ترکستان کے علاقے میں کل بجٹ کا دو فی صدی حصہ تعلیم پر صرف کیا جاتا تھا اور آج جمہوریا کے کل بجٹ کا تیس چالیس فیصدی حصہ بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم پر صرف کیا جا رہا ہے۔ سوویت اسکول بچوں کو بنیادی علم سکھاتے ہیں۔ وہ انہیں اپنے آس پاس کی حقیقتوں کو سمجھنا سکھاتے ہیں۔

ایک کہانی

عصمت آراعصمت

"آج پانچ بجے۔ پانچ شہنائی ہمارے انگنا" فلم شہنائی کا ریکارڈ گراموفون پر چڑھا کر ساجد چٹکیاں بجا بجا کر گنگنا رہا تھا۔

خالد گرجیں "کیوں رے موے! یہ کیا زنخوں جیسی حرکت" اور وہ بے چارا تو سٹ پٹا گیا۔ "نئی زندگی" میں پاؤں رکھنے کی خوشی نئے لوگوں سے ملاپ کا مبہم خوف۔ سنجیدگی اور شرمیلے پن کے ملے جلے اثرات اور کپکپا دینے والی پھپھی یاد دیں پوری طرح دل و دماغ پر قبضا جمائے ہوئے تھیں۔ مگر میرے حلق سے ایک کھی کھی ابل ہی پڑی اور پاس کھڑی ہوئی ستارا چہک کر بولی "لو ابھی منو کے دل میں ابھی سے لڈو پھوٹنے لگے۔"

"چل مردار" میں قدرے لجا گئی "میں تو موے ساجد کی چمک ٹمک پر ہنس پڑی تھی۔"

"اجی بس رہنے بھی دو۔۔۔۔۔"

"اچھا چپ۔۔۔۔ بڑی آئی لال بھجکڑ" اور ستارا مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"ہونہہ! لڈو پھوٹنے لگے۔۔۔۔۔ مال زادی! میں آپ ہی آپ سوچنے لگی۔ ادھر تو دم پر بنی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اف! کتنے ہی اندھیرے حصاروں کو عبور کر کے یہ خوشی کی گھڑی، شادی کی منزل آ رہی تھی ——— زندگی میں خوشی کی ایک چمک اس وقت ابھری تھی جب میرے بابا سے انہوں نے وعدا کیا تھا۔ میں روشن سے شادی کروں گا۔ میں وعدا کرتا ہوں" ——— مگر جیسے یہ بجلی کوند کر روپوش ہو گئی۔ آسے دن نئے نئے شوشے چھوٹنے لگے۔ ارے بھائی "تاج میاں ٹھہرے بڑے گھر کے چشم و چراغ۔ انہیں یا ولے کتے نے تو کاٹا نہیں ہے کہ ایک غریب لڑکی کو اپنی شریک حیات بنالیں۔ بھائی جان کوئی دوسرا گھر دیکھو، آخر تم کیا کھا کر تاج کا مقابلہ کرو گے اور نہ جانے کیا کیا۔ اور میں تھی کہ کانپ کانپ اٹھتی۔

باہر وہ سہرا ریکارڈ بج رہا تھا "قسمت بنانے والے ذرا سامنے تو آ" میں بھی اس وقت سچ مچ سوچنے لگ جاتی کہ گر دنیا بنانے والا میرے سامنے آجائے تو میں اس کا دامن پکڑ کر پوچھوں "ایسے ہی انسانوں کو تو بنا کر تو اتار رہا ہے جو صرف وعدا کرنا جانتے ہیں نباہنا نہیں" اور میں خیالات کی گہرائی میں ڈوبنے لگتی۔ ڈوبتی جاتی کہ ایک جملا میرے کانوں میں گونج کر مجھے سہارا دیتا "میں وعدا کرتا ہوں کہ میں روشن ہی سے شادی کروں گا۔ میں وعدا کرتا ہوں"! ان کا کیا ہوا وعدا میرا دامن پکڑ کر چیختا "میں وعدا کرتا ہوں! میں وعدا کرتا ہوں" اور نسوانی فطرت کان میں پھنک جاتی "پگلی! مردوں کا کیا وعدا توڑنے انہیں دیر کتنی لگتی ہے" اور میرے جی میں آتی خوب پھوٹ پھوٹ رونے لگ جاؤں کہ ان کا تخیل میں لٹا ہوا چہرا آنکھوں کے سامنے آکر دلاسا دیتا۔

ساجد نے ایک اور ریکارڈ چڑھایا "رلا کے تو رلا لے دنیا" ہنانے والا ہنا ہی دے گا" سچ مچ دنیا نے رلانے کی کم کوشش نہیں کی۔ مگر ہنانے والا ہنا ہی دیا۔ باکے پڑمردہ اور متفکر چہرے پر خفگی کی موٹی تہ کے ساتھ غم کا ہلکا سا سایا دیکھ کر میں سمجھ گئی۔

"ضرور کوئی بات ہے"

"بابا۔۔۔۔۔" میں پوچھتے پوچھتے رہ گئی اور بابا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے "بیٹی۔۔۔۔۔" میں نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ان کا چہرا آنسوؤں سے تر بتر ہو چکا تھا "میری بیٹی" اور وہ کچھ بول نہ سکے۔ چپکے سے ان کا مرسلا خط میری طرف بڑھایا اور باہر چلے گئے ———

محترم بزرگ!

کئی بار ارادا کیا کہ اپنے خیال سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ مگر کسی خیال نے قلم تھام لیا۔ آج میرے سامنے خطوط کی ایک ڈھیری پڑی ہوئی ہے۔ روشن آوارا ہے ——— روشن کئی لوچا لوں سے

محبت کرتی ہے۔ رکشن انتہائی بدصورت ہے۔ رکشن سے شادی کرکے میری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔" یہ الفاظ کسی بھی نوجوان کو اپنے وعدے سے پلٹا سکتے ہیں۔ باپ بھائی دوست احباب سب یہی صالح مشورا دے رہے ہیں کہ میں شادی سے انکار کردوں۔ آپ خود سوچیں۔ ایسی نازک صورت حال میں تاخیر کہاں تک مناسب ہے۔ میں ہفتے عشرہ میں پہنچ رہا ہوں۔ آپ قطعی کوئی تیاری نہ کریں۔ شادی بالکل سادی سیدی ہوگی۔

خادمِ تاج"

خط ختم ہوگیا۔ میرے ہلکے سے چیخ نکل گئی "تاج" ستارا دوڑی ہوئی کمرے میں آئی "لوا بی۔ بی آگئے۔ تمہارے ....." اور میں قدرے سکڑ گئی۔

پڑوس کی عورتوں نے انگنائی میں گانا شروع کیا۔

"آیا ری نیا۔ ہریالا بنا"

باہر رکیارڈ بج رہا تھا۔

"چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کی نگر آج جانا پڑا"

اور بابا سے جدائی کے خیال پر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ـــــ اور میں سوچنے لگی۔

تاج سچ مچ اسم با مسمّا ہیں۔ آنکھوں نے اپنی اور اپنے نام کی بڑائی کی لاج رکھ لی۔ لاکھوں کے جہیز کو ٹھوکر مار کر انہوں نے گندی گلیوں میں اپنا دا ایک لوہیدا سے مکان میں بسنے والی ایک غریب لڑکی کو اپنا کر غلط رسم و رواج بنانے والوں کے موٹھ پر ایک تھپڑ مار دیا ہے۔

اگر آپ مصنف ہیں اور اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیے۔ اس لیے کہ یہی وہ بے باک رسالا ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ دیے بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے۔ تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنے چاہئیں۔

ایورسٹ کی فتح کے یادگاری ٹکٹ

ہندستان کے محکمہ ڈاک و تار کی طرف سے ایورسٹ کی چوٹی کی فتح کی یادگار میں جو ٹکٹ تیار کیے جا رہے ہیں انہیں ۲ر اکتوبر کو گاندھی جینتی کے موقع پر جاری کیا جائے گا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مختلف ممالک میں ٹکٹوں کی فراہمی اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص نے اکتوبر میں عالمگیر یادگاروں پر ایورسٹ کو سر کیے جانے پر خوشی منانے کا فیصلا کیا ہے۔

ہندستان کے محکمہ ڈاک کی طرف سے دو آنے و چھ آنے کے ٹکٹ جاری کیے جائیں گے۔ ان ٹکٹوں پر ایورسٹ کی تصویر اور چوٹی کے سر کیے جانے کی تاریخ یعنی ۲۹ر مئی ۱۹۵۳ء کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں ترتیب وار "CONQUEST OF EVEREST" اور "ایورسٹ وجے" کے الفاظ چھاپے جائیں گے۔ بھارتی ہوائی فوج کے پائلٹ نے ماؤنٹ ایورسٹ کے جو فوٹو لیے تھے ان کے برابر ان ٹکٹوں کا نمونہ تیار کیا گیا ہے دو آنے کے ٹکٹوں کا رنگ بنفشی اور دو سرے ٹکٹوں کا رنگ سرخی مائل ہوگا۔

ان ٹکٹوں کی فروخت تب تک جاری رہے گی جب تک ان کا اسٹاک ختم نہیں ہوگا۔

اسکول کے بچوں کیلیے ریڈیو پروگرام

بی۔ بی۔ سی۔ نے بچوں کے لیے جو خاص پروگرام مرتب کیے ہیں انہیں برطانیا کے ۲۵۰۰ اسکولوں میں باقاعدا طور پر سنا جاتا ہے ان پروگراموں کو دولت مشترکا کے بچے بھی سنتے ہیں۔

دنیا کی چھت ـــــ تاس

تبت میں ایک قدیم روایت تھی۔ شمال سے ایک نئی زندگی آئے گی۔ اس زندگی میں غم یا آنسو نہ ہوں گے اور پھر سارے ملک پر مسرتوں کا سورج جگمگائے گا۔ یہ تو ایک روایت تھی صدیوں کے بعد صدیاں گذرتی گئیں۔ نسلوں کے بعد نسلیں آئیں اور اس سنگلاخ پہاڑی دیس میں مغلسی اور جاگیرداری ظلم و تشدد کا دور دورہ رہا۔

تبت ایک بہت بڑی گہری طشتری جیسا ہے اور اتنا بڑا کہ اس میں برطانیا ایئرلینڈ۔ فرانس۔ ڈنمارک، ہالینڈ اور بلجیم ایک ساتھ سما سکتے ہیں۔ پہاڑوں کے سلسلے تبت کی اس طشتری کی لکیریں بنا سکتے ہیں۔ بحر ہند سے آنے والی گرم اور مرطوب ہواؤں کو ہمالیا روک لیتا ہے اور اگرچہ یہ ملک اسی عرض البلد پر واقع ہے جس پر بحیرہ روم اور شمالی افریقا لیکن آب و ہوا انتہائی سرد ہے سردیوں میں "دنیا کی چھت" پر درجہ حرارت صفر سے بھی چالیس گرمی سینٹی گریڈ کم ہو جاتا ہے اور ہوا عام طور پر تیسرے پہر تک تیز ہو کر آندھی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ گرمیوں میں درجہ حرارت کبھی کبھی چھ میں بیس ڈگری سینٹی گریڈ تک چڑھ جاتا ہے مگر سائے میں پھر بھی انجماد سے کم ہی رہتا ہے۔

تبت میں نباتات کی بڑی ہی قلت ہے صرف جنوب ہی میں وادی برہمپتر میں صنوبر بید اور درخت صور اور کہیں کہیں خوبانی آڑو اور ناشپاتی کے درخت بھی ملتے ہیں۔

ملک کی آب و ہوا تو واقعی بہت تند و تیز ہے مگر آزادی سے پہلے تبت کے عوام کی تباہ حال زندگی کی وجہ اصل میں خراب آب و ہوا نہ تھی سماجی صورت حال ہی پر اس کی ذمے داری ڈالی جا سکتی ہے۔ روز نجات تک تبت میں جاگیرداری کا دور دورا تھا اور سرحدی اضلاع میں تو بعض قبیلوں میں غلام رکھنے تک کا رواج تھا۔ تیس فی صدی زمین جاگیرداروں کے قبضے میں تھی۔ بیس فی صدی خانقاہوں کے پاس اور چالیس فیصدی حکومت کے پاس جو کہ وہ تنخواہ کے عوض بڑے بڑے سرکاری افسروں کو دیدیتی تھی۔ اس طرح کسانوں کے پاس دس فی صدی سے زیادہ رقم نہیں تھی۔

حقیقت میں یہ کسان غلام کسان تھے۔ زمین کے فروخت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بھی ایک مالک کے پاس سے دوسرے مالک کے پاس منتقل ہوتے رہتے تھے۔ کسان اپنے مالک جاگیردار کی اجازت کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتا تھا۔ اگر کوئی کسان چوری چھپے بھاگ گئے کی کوشش کرتا تو اس کے کان یا ہاتھ کاٹ دیے جاتے تھے۔ دوسری بار کوشش کرنے کی سزا موت تھی۔ جاگیردار ہمیشہ آپس میں فوج کشی کرتے رہتے تھے۔ اور پھر ان غلام کسانوں ہی کو فوج کا سپاہی بنا دیا جاتا تھا۔

تبت کی زراعت حد سے زیادہ پچھڑی ہوئی تھی کھینچی جانے والی ہاڑی کا طریقہ بہت پچھڑا ہوا تھا۔ فصلیں بڑی کم ہوا کرتی تھیں۔ ملک کا خاص پیشا مویشی پالنا تھا۔ لیکن ملک کے تمام مویشی ـــ تقریباً چار لاکھ یا کہ دس لاکھ بکریاں اور پچاس لاکھ پہاڑی بھیڑیں جاگیرداروں اور خانقاہوں کی ملکیت ہیں۔ کسان جاگیرداروں سے ضرورت کے مویشی کرائے پر لیتے تھے۔ اور مقررہ مدت کے بعد انہیں واپس کر دینا پڑتا تھا۔ اس دوران میں ان کے جو بچے پیدا ہوتے تھے وہ بھی ساتھ ہی واپس چلے جاتے تھے۔

صنعت کے نام پر وہاں صرف چند دستکاری کے مرکز اور ایک ٹکسال تھی۔

تبت کی زندگی میں خانقاہیں حاوی تھیں۔ ایک رواج چلا آتا تھا کہ ہر کنبے کا دوسرا یا تیسرا لڑکا لامائیت کے لیے کسی خانقاہ میں بھیجا جاتا تھا۔ لفظ "لاما" کے معنی "عقلمند آدمی" کے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ ایک قابل احترام خطاب ہوا کرتا تھا۔ جو معزز

درویشوں اور عالموں کو ملتا تھا لیکن بعد میں یہ رحمت کے تمام ہی راہب لاما کہلانے لگے۔ آج کل تبت میں تین ہزار چار سو خانقاہیں اور تقریباً تین لاکھ لاما ہیں۔ لاما کسی قسم کا محصول یا ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ اور نہ فوجی خدمات ان سے لی جا سکتی ہیں لوگ اپنی خوشی سے نذرانے دیتے ہیں۔

اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے تہذیبی پسماندگی ملک میں عام تھی۔ پورے دیس میں جس کی آبادی ۳۷ لاکھ ہے ایک بھی ہسپتال نہ تھا۔ حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ تبت کی دیسی دوائیاں بہت مشہور ہیں اور بعض بیماریوں کا حیرت انگیز علاج ہو جاتا ہے لیکن چھوت کی بیماریوں کا کوئی علاج نہ تھا حقیقی معنوں میں اچھے طبیبوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن نیم حکیموں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ ہر تیسرے آدمی کو چیچک نکلتی تھی اور بچوں کی شرح اموات چالیس فی صدی تک پہنچ گئی تھی۔

پورے ملک تبت میں عالا تعلیم دینے والے کل تین اسکول تھے۔ ان میں تعلیم کا مقصد رئیسوں اور امیروں کے بچوں کو حکومت کا افسر بنانے کے لیے "تیار" کرنا تھا۔ ان کے علاوہ کئی نجی اسکول تھے جہاں طالب علموں کو لکھنا۔ پڑھنا اور معمولی حساب لگانا سکھایا جاتا تھا۔ اور چند دعاؤں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ خانقاہوں میں لاما قدیم مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور دعائیں رٹا کرتے تھے۔ اور اکثر ان کے معنی بھی نہ سمجھتے تھے۔

انگریز جغرافیہ دانوں نے تبت کو ایشیا کا مردہ دل کہا ہے لیکن تبت مردہ کبھی بھی نہ تھا۔ اس کے دل کی حرکت ہمیشہ جاری رہی۔ اگرچہ نبض سست اتنی پڑ گئی تھی کہ مشکل سے ملتی تھی۔ آج آزادی کی گرم سانسوں نے اس دل کی حرکت تیز کر دی ہے اور طاقت ور بھی۔ یہ ملک اب بھرپور اور جاندار زندگی بسر کرنے لگا ہے "دنیا کی چھت" کو اب پھر سے نیا کیا جا رہا ہے تاکاشت زمین جوتی جا رہی ہے۔ آبپاشی کی نہریں اسکول اور ہسپتال تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

اب تبت میں نئے ہسپتال اور شفاخانے ہیں۔ اگست ۱۹۵۲ء میں ایک بڑا ہسپتال لہاسا میں کھولا گیا۔ اس میں تشخیص عمل جراحی بچوں کے امراض اور مستورات کے امراض کے الگ الگ شعبے ہیں۔ لہاسا پاند وا اور دوسرے شہروں میں نئے سرکاری اسکول کھولے جا رہے ہیں۔ لہاسا کے اسکول میں ۱۹۰ لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں تعلیم تبتی زبان میں دی جا رہی ہے۔ اسکول کے پروگرام اور نصابی کتابیں تبتی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک خاص دفتر قایم کر دیا گیا ہے۔

تبتی لڑکے اور لڑکیاں آج کل پیکنگ میں واقع قومی اقلیتوں کے مرکزی علمی ادارے اور اس کی شاخوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

تاریخ میں پہلی بار تبت میں اخبارات شایع ہو رہے ہیں اور وہ بھی تبتی لوگوں کی اپنی مادری زبان میں نئی کتابیں شایع ہو رہی ہیں۔ ۳۰ سالا تبتی ادیب آوا چا تسولنے "تبت اور چین کے باہمی تعلقات کی مختصر تاریخ" لکھی ہے۔

تبت کے قدیم پائے تخت لہاسا میں زبردست تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ دریائے لہاسا کے کنارے کنارے دلائی لاما کی سرکاری قیام گاہ عالی شان پوتالا محل کے مقابل نئے مکانات تعلیمی ادارے اور ایک سینما گھر کی تعمیر ہو گی۔

ہر سال تبت میں جشن لوروز بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اور پورے دو ہفتوں تک یہ جشن جاری رہتا ہے طرح طرح کے ناچ اس جشن کا لازمی جز ہوتے ہیں۔ ناچنے والے روایتی سورماؤں یا جانوروں کے نقلی چہرے لگا کر ناچتے ہیں لیکن اس سال کی طرح شاندار جشن پہلے کبھی نہ منایا گیا تھا۔

مسرتوں کا وہ سورج جس کا مدتوں سے انتظار تھا تبت کے افق پر طلوع ہو چکا ہے۔

ہندستانی زبان
اور ادب کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے

دیوناگری اور تعلیم

مدن گوپال

اکثر آدمیوں کا تجربا تو یہ ہی کہنا ہے کہ دیوناگری لکھنے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ انگریزی یا اردو لکھائی میں کم۔ مجھے کچھ آدمی ایسے ضرور ملے ہیں جو دعوے سے کہتے ہیں کہ جتنا وقت مجھے انگریزی یا اردو لکھنے میں لگتا ہے اس سے بھی کم وقت میں وہ دیوناگری لکھ سکتے ہیں۔ میری کبھی ہمت نہیں بڑی کہ میں ان کا مقابلا کروں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جتنا وقت مجھے ایک میل چلنے میں لگتا ہے اس سے بھی کم وقت میں کچھ لوگ دو میل آسانی سے طے کر لیتے ہیں۔ ان کے دو میل طے کر لینے سے مجھے کبھی یہ شک نہیں ہوا کہ ان کے دو میل میرے ایک میل کے دگنے سے کم ہیں۔

یہ ثابت کرنا کہ دیوناگری ہی نہیں جتنی ہندو لپیاں ہیں وہ انگریزی یعنی رومن لپی اور اردو لپی سے لگ بھگ دوگنی زیادہ لمبی ہیں کوئی مشکل کام نہیں۔ ایک آسان طریقا تو یہ ہے کہ لفظوں کی گنتی کیجائے۔ ایسی چھپائیوں میں جہاں چھاپنے والے کی کوشش ہوتی ہے کہ چھپائی کم جگہ بھی کم لے۔ اور ساتھ ہی اتنی روشن ہو کہ آسانی سے پڑی جائے جیسا کہ اخباروں ڈکشنریوں اور انسائیکلوپیڈیوں کے چھاپنے والوں کی کاغذ بچانے کے لیے ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ٹائپ چھوٹا ہو اور لکھائی گنجان ہو لیکن اتنی چھوٹی اور گنجان بھی نہ ہو کہ پڑھنے میں زیادہ تکلیف ہو۔ ساتھ ہی ان کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ کاغذ بھی کچھ بہت قیمتی نہ لگایا جائے۔

اس نقطے کی درستی ہر ایک شخص آسانی سے جانچ سکتا ہے۔

	چار انچ کالم ایک سطر میں کتنے لفظ	چار انچ کالم ایک سطر میں لفظوں کی گنتی
ہندی۔ ہندستانی دلی	۶	۱۳۲
ہندی۔ امرجاتا دلی	۶	۱۰۸

ہندی۔ وشوامتر۔ دلی	۱۸	۵	۹۰
گجراتی۔ ہندستانی۔ بمبئی	۲۴	۵½	۱۳۲

چار انچ کالم ایک سطر چار انچ کالم میں سطروں میں کتنے میں لفظوں کی گنتی

	لفظ		کی گنتی
گجراتی جنم بھومی۔ بمبئی	۲۴	۵½	۱۳۲
بنگالی۔ جگنتر۔ کلکتا	۲۶	۵	۱۳۰
بنگالی۔ آنند بازار۔ پتریکا کلکتا	۲۶	۵	۱۳۰
مرہٹی۔ نوشکتی۔ بمبئی	۲۰	۴½	۹۰
گرمکھی۔ پنتھ سیوک۔ جالندھر	۱۶	۴½	۷۲
گرمکھی۔ اکالی پتریکا۔ امرت سر	۱۶	۴½	۷۲
اریا۔ پرجا نتتر	۲۰	۴	۸۰
تامل۔ دینا منی	۳۵	۴	۱۴۰
ملیالم۔ ساتری بھومی	۲۹	۴	۱۲۶
ملیالم۔ گومتی	۲۰	۴	۸۰
اردو۔ ملاپ۔ دلی	۲۱	۱۱	۲۳۱
اردو۔ ویر بھارت دلی۔	۲۱	۱۰	۲۱۰
اردو۔ تیج۔ دلی	۱۸	۱۰	۱۸۰
انگریزی ٹائمس مین۔ دلی	۳۸	۶	۲۲۸

۳۲ سے ۴۰ سطریں

اوسط

انگریزی۔ ہندستانی۔ دلی

۳۰ سے ۴۰ سطریں

اوسط	۳۸	۶	۲۲۸

ان انسائیکلوپیڈیوں کے کالموں کی لمبائی چوڑائی برابر ہے۔

	کالم میں سطریں	سطر میں لفظ	کالم میں لفظ
ہندی۔ وشو بھارتی	40	10	400
چیمبرز انسائیکلوپیڈیا	78	10	780
امریکن انسائیکلوپیڈیا	74	10	740
انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا	83	10	830

یہاں یہ جتا دینا ضروری ہے کہ اردو اخباروں کے کاغذ اور زبانوں کے اخباروں کے کاغذوں سے کم قیمت اور گھٹیا قسم کا ہوتا ہے۔ ممکن ہی نہیں نشچت ہے کہ اگر وہ بھی ویسا ہی کاغذ استعمال کرتے تو ان کے لفظوں کی گنتی اور زیادہ ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ انگریزی کے چھے فضول لمبے ہیں۔ مثلاً (WERE, ARE) کی آخری E فضول (BOUGHT) کے چھ حرفوں کی جگہ (BOT) تین حروف کافی تھے۔ حساب لگانے والوں نے لگایا ہے کہ انگریزی کی عبارت میں 7/1 حرف فضول دکھاوے کے ہیں یعنی 13 فیصدی آسانی سے کم کیے جا سکتے ہیں۔ اگر چاہو تو تم بھی اس حساب کو پرکھ سکتے ہو۔ انگریزی کی کوئی عبارت لے لو۔ اس کے حرف گن لو اور اس میں فضول حرفوں کو بھی گن لو یہ 13 فی صدی کا تخمینا بہت کچھ درست ہی پاؤ گے۔

ہندی، ہندستان، اور انگریزی ہندستان ٹائمس دونوں دلی کی ایک ہی کمپنی کے اخبار ہیں اور ایک ہی چھاپے خانے میں چھپتے ہیں۔ ہندی کے (132) لفظوں کی جگہ انگریزی ہندستان 228 لفظ چھپتے ہیں۔ اگر ان 228 میں 228 کا 7/1 اوڑا جائے تو 200 ہو جاتے ہیں اور یہ 200 ہندی 32 کے دگنے سے ذرا ہی کم ہوتے ہیں۔ سوچو تو سہی اگر ہم دیوناگری کی جگہ کسی طرح رومن لپی یا اس جیسی کوئی اور چھوٹی لپی تجویز کر لیں تو آسانی سے ہندی کتابوں اور اخباروں کی قیمت آدھی رہ جائے۔ یہاں یہ جتا دینا ضروری ہے کہ رومن لپی کو اور بھی چھٹیا یا اور ہندی کے مناسب بنایا جا سکتا ہے اگر کوئی ذرا بھی اس طرف دھیان دے۔

اسکول کی فیسوں کے علاوہ آج کل پڑھائی جانے والی کتابوں اور کاپیوں کا خرچ ہی مان نہیں۔ آج کل تو خیر پڑھائی کچھ انگریزی کچھ ہندی کچھ اردو میں ہوتی ہے۔ اب جمہوری سرکار کے خیر خواہ چاہتے ہیں کہ آئندہ ساری پڑھائی لکھائی دیوناگری میں ہو اس کا نتیجہ صاف ہے۔ جو کتابیں آج کل انگریزی یا اردو میں پڑھائی جاتی ہیں وہ بھی دیوناگری میں چھپینگی۔ اور اس لیے ان کی قیمت دگنی ہو جائیگی اور کاپیاں بھی دگنی برتی جائیں گی۔ اب رہا یہ سوال کہ ہندستان جیسے غریب ملک میں پڑھائی لکھائی کا خرچ پڑھانا کہاں تک مناسب ہے ان غریبوں سے پوچھو جن کے بچے پڑھنے جاتے ہیں۔

یہ تو مجھے بہت دنوں سے معلوم تھا کہ دیوناگری لکھنے میں وقت بہت زیادہ لگتا ہے۔ اس کی وجہ نہ میں نے سوچی اور نہ سوچنے کی کوشش کی۔ وجہ یہ کہ لکھائی کا کام اسکولوں میں کم ہی کرنا پڑتا ہے اس لیے لکھائی میں کچھ دیر لگنے سے تعلیم میں کچھ بہت فرق نہیں لگتا ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جو لکھائی زیادہ جگہ گھیرتی ہے اور جسے لکھنے میں دیر لگتی ہے اور اسے پڑھنے میں بھی ممکن ہے زیادہ وقت لگتا ہو۔ خیال آنا تھا کہ پوی ڈھونڈ اپنا امتحان لیا اپنے دوستوں کا امتحان لیا اور یہ بات سولہ آنے پوری سچی معلوم دی لیکن اس کی وجہ دسوچھی انگریزی میں لپیوں پر اور چھاپے پر کچھ کتابیں ملیں۔ ان کے پڑھنے سے وجہ سے تو کچھ معلوم ہوئی۔ لیکن دل کی تسلی نہ ہوئی۔ ممکن ہے کہ میری اور میرے دوستوں کی تعلیم میں ہی کچھ نقص ہو یا ہماری آنکھ میں ہی نقص ہو۔ یہ تو صاف ہے کہ جس لپی کے پڑھنے کی زیادہ مشق ہو وہ جلدی پڑھی جاتی ہے ایسے آدمی کہاں سے ڈھونڈے جائیں جنہیں دونوں لپیوں کے پڑھنے کی برابر مشق ہو۔ اور پھر میں بوڑھا آدمی کس کس کے گھر جاؤں۔ کس کس کی منت کروں۔ سوچ سوچ کے یہ فیصلہ کیا کہ یہ کام اصل میں تعلیم کے محکمے کا ہے۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا پتا لگائیں۔ ان کے پاس اس کی پوری جانچ پڑتال کرنے کے لیے ہزار آسانیاں ہیں جو کسی نجی آدمی کو میسر نہیں ہو سکتیں لہذا میں نے ایک لمبی چھٹی لکھی۔ جس میں جہاں تک مجھ سے ہو سکتا تھا میں نے اپنی تکلیف اور خیال کو ظاہر کیا اور یہ التجا کی کہ وہ

اس بات کی پوری پوری جانچ کریں کیونکہ جہاں تک میری سمجھ تھی دیوناگری سے پیچیدہ اور زیادہ وقت لینے والی اور کوئی لپی نہیں اور اس لیے اس کے اپنانے سے دیس کی آنے والی سمجھتا اور خوش حالی پر بہت برا اثر پڑے گا۔ ڈیڑھ سو لپی اس چھتی کی دیس کے ہر صوبے کے گورنر بڑے وزیر شکشا وزیر ڈائرکٹر ہر یونیورسٹی کے چانسلر اور وائس چانسلر اور کالجوں کے پرنسپلوں اور پروفیسروں کو بھیجی گئیں لیکن واہ رے ہمارے دیس کی سمجھتا اور حکومت کا نشا کہ باوجود میری ازحد خشامد اور لجاجت کے ان ڈیڑھ سو اونچے افسروں میں صرف دو نے چھٹی کی رسید دی اور وہ بھی کوری رسید کسی نے نہ میری پراتھنا سنی اور نہ دیس کی سمجھتا اور خوش حالی کا خیال تھا۔

چونکہ اتر پردیش دیوناگری پر بہت زور دیتا ہے اس لیے میں نے کم سے کم پچاس چھٹیاں یو۔پی کے تعلیمی افسروں جن میں ہندی انگریزی سنسکرت کے پروفیسر خاص شامل تھے بھیجیں تاکہ اگر میرا خیال غلط ہے تو وہ آسانی سے میرے خیال کو درست کر سکیں لیکن یو۔پی کا باوا آدم ہی نرالا معلوم ہوتا ہے محال ہے کہ کسی کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔ خیر چٹھی تو بھیجی گئی تھی اگست ۱۹۵۲ء میں اس کے بعد میں سے خدبہت کچھ دیکھ بھال کی۔ اور اب میں ڈنکے کی چوٹ کہہ سکتا ہوں کہ جتنے دیوناگری کے بڑے بڑے ڈھنڈورچی یعنی یو۔پی وزیر کے کانگریسن دھان گورنر، جج۔ یونیورسٹیوں کے چانسلر وائس چانسلر پروفیسر تعلیم کے ڈائرکٹر، سکولوں کے انسپکٹر ہیں یہ سب دیوناگری سے انگریزی لپی بیس فی صدی جلد پڑ سکتے ہیں۔ اور انہیں جنہوں نے کبھی اردو لپی سیکھی تھی وہ بھی آج پچاس فی صدی نہیں تو کم سے کم تیس فی صدی اردو لپی دیوناگری سے جلد پڑ سکتے ہیں۔ ان میں سے جسے میری بات میں شک ہو چاہیے کہ آپ اپنا امتحان لے لے۔

اس میں تو شک کی گنجائش نہیں کہ جو لپی جلدی پڑھی جا سکتی ہے اس میں پڑھائی زیادہ ہو سکتی ہے اگر ۲۵ فیصدی کا فرق ہو تو جو تعلیم اسکول میں دیوناگری میں چار برس میں دی جاتی ہے وہ دوسری لپی میں تین برس میں بچا حاصل کر لے گا۔ اگر بیس فیصدی کا فرق ہو تو دیوناگری کے پانچ برس برابر ہوتے ہیں۔ دوسری لپی کے چار برس کے۔ اسکول میں ہی نہیں۔ ساری عمر بھر یہ فرق رہے گا۔ پچاس برس کی عمر تک جو ایک دیوناگری میں پڑھے گا دوسرا چالیس برس کی عمر میں اتنا علم حاصل کر لے گا۔ وہ زمانہ لد گیا جب ہندستان ایک الگ تھلگ ملک تھا جسے دنیا کے اور ملکوں سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ آج کل ہمارا دنیا کی سب قوموں سے مقابلہ ہے اس دیوناگری کے برتے پر ہم کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں جب تک ہمیں دیوناگری کے پھندے پڑنے کا علم نہ تھا تب تک اپنی پرانی لپی سیکھ کر اس کا سراہنا برا نہ تھا۔ اب جبکہ یہ بات صاف دکھائی دیتی ہے کہ دیوناگری ہر طرح سے پھندا اور گھاٹے کا سودا ہے اس کو وہی سراہا سکتا ہے جو دیش کا دشمن ہونا چاہے وہ اپنے آپ کو کانگریس ہی نہیں لیس بھگت کہتا ہو۔

دیوناگری سے تو گجراتی اور بنگالی لپی سستی ہیں اور ان سے بھی زیادہ تامل لپی۔ لیکن اردو اور رومن کے مقابلے میں وہ بھی بہت مہنگی پڑتی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں اردو لپی یا آج کل کی انگریزی رومن کے حق میں ہوں۔ میری رائے میں اردو کا بڑا بھاری نقص یہ ہے کہ اس کے سیکھنے کے اصول ہونے کی وجہ سے اردو اچھی طرح سیکھنے میں دیوناگری یا رومن کے مقابلے میں شروع میں دو برس زیادہ لگتے ہیں کسی قوم کے لیے بچپن کے دو برس ضائع کرنے ایک بہت بھاری قربانی ہے لیکن پھر بھی قوم کی ساری عمر کا چوتھائی یا پانچواں حصہ قربانی کرنے سے بہت کم رومن لپی جو انگریزوں نے ہندستانی کے لیے بنائی ہے وہ کچھ ٹھیک نہیں جچتی لیکن اسے ٹھیک کرنا کچھ مشکل کام نہیں معلوم ہوتا۔

انگریزی میں کچھ ایسی کتابیں ہیں جن میں کسی لپی کی اچھائی یا برائی جانچنے کے اصول درج ہیں۔ ان اصولوں کے مطابق اگر کوئی لپی بنائی جائے جو ہماری بولی کے موافق ہو تو بہت اچھا ہو میرے خیال میں رومن ہی ایک ایسی لپی ہے جس کو ہم اتنا آسان بنا سکتے ہیں کہ اس کے پڑھنے میں دیوناگری کے مقابلے میں آدھا وقت خرچ ہو۔

(نیا ہند سے شکریہ کے ساتھ)